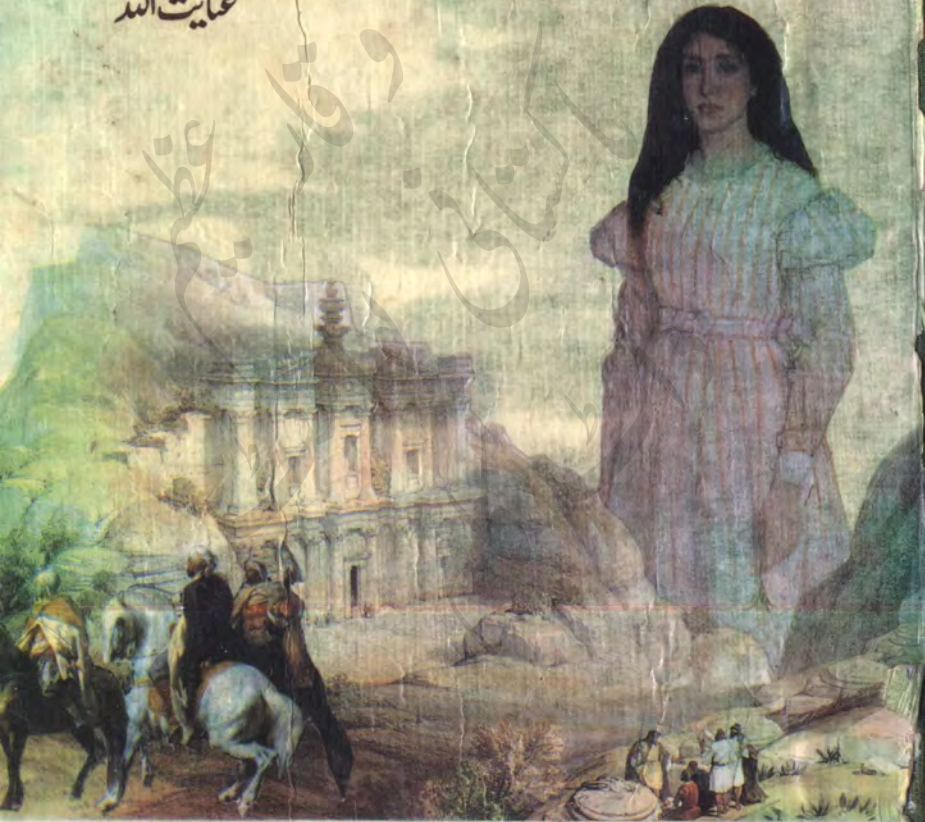


نیل اور یس بہتارا

حصہ اول

عنایت اللہ



فتحِ مصر۔ فرعونوں کی پراسرار ریت، نیل کے توہمات

پیش لفظ

خلفائے راشدین کی فتوحات کا ذکر آتا ہے تو بات یہیں پر ختم کر دی جاتی ہے کہ ان اولین مجاہدین اسلام نے قیصر و کسریٰ کا نام و نشان مٹا دیا تھا.... اس میں ذرا سے بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ قیصر روم اور کسریٰ ایران کی جنگی طاقتیں اُس دور کی ہیبت ناک طاقتیں تھیں۔ آج کے تاریخ نویس اور مبصر کہتے ہیں، اور ٹھیک کہتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو شکست دینا تو دُور کی بات ہے کوئی بادشاہی اسے لٹکانے کی بھی جرات نہیں کر سکتی تھی۔ افواج کی افراط کے علاوہ یہ دونوں قومیں جنگجو تھیں۔ ان کی فتوحات اور شجاعت کے کارناموں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔

آخر ایک قوم اٹھی جسے ایرانیوں اور رومیوں نے عرب کے بدو کہا اور اس قوم کے خلاف نفرت و حقارت کا اظہار کیا۔ یہ تھی اُمّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس کے مٹھی بھر مجاہدین نے کسریٰ ایران کی دہشت ناک جنگی طاقت کے پرچے اڑا دیئے۔ پھر ان رومیوں کو جن کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی عرب کی سرزمین (فلسطین اور شام) سے بھگایا اور ان کی سلطنت کو بحیرہ روم کے پار تھوڑے سے علاقے میں محدود کر دیا۔ عموماً بات یہیں پر ختم کر دی جاتی ہے اور مجاہدین کی ایک معجزہ نما فتح کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہ ہے فتح مصر۔ مصر میں ہی اللہ کے شہروں نے رومیوں کو فیصلہ کن شکست دی تھی اور قیصر روم ہرقل کو جو ذاتی شجاعت، جنگی قیادت اور فطری فرعونیت کے لحاظ سے دہشت کا ایک نام تھا، اس حال تک پہنچا دیا گیا تھا کہ وہ بحیرہ روم کے اُس پار بزنطیہ میں جا بیٹھا اور وہاں سے مصر میں اپنی فوج کو احکام بھیجتا رہا حتیٰ کہ وہ انتہائی مایوسی کے عالم میں انتقال کر گیا۔

ہرقل کو اس کی اپنی ملکہ نے شاہی طبیب کے ہاتھوں زہر دے کر مروایا تھا۔ اس کتاب میں آپ کو یہ مکمل کہانی ملے گی جو سنسنی خیز اور پُر اسرار ڈرامہ ہے۔ مصر کی فتح سپہ سالار عمرو بن عاص کا کارنامہ ہے۔ تاریخ نویس و قابع نگار اور مبصر آج بھی حیران ہیں کہ آٹھ دس ہزار مجاہدین نے ہرقل رومی کی اتنی طاقتور فوج کو جس کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی، کس طرح ہر میدان اور ہر قلعے میں شکست پہ شکست دے کر مصر سے بھگا دیا تھا۔

اکثر مؤرخوں نے لکھا ہے کہ مصر کی فتح کو معجزے کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جا

سکتا۔ میں نے اس کتاب میں بہت سے مستند مؤرخوں کی تحریروں کے حوالے سے وہ واقعات اور وہ پس منظر پیش کیا ہے اور مجاہدین کے عزم، بے خوفی اور جذبے کی تفصیلات بیان کی ہیں جو اس معجزے کا باعث بنیں۔

کہنے کو تو میری یہ کاوش — ”.... اور نیل بہتارہا“ — بھی ایک اسلامی تاریخی ناول ہے اور اسے پڑھے بغیر ان ہی تاریخی ناولوں کے زمرے میں ڈال دیا جائے گا جو ایک عرصے سے بے دریغ لکھے جا رہے ہیں اور جذباتی قسم کے قارئین میں مقبول عام ہیں۔ ہمارے ہاں چونکہ تعلیم کی کمی ہے اس لئے لوگ یہ جان ہی نہیں سکتے کہ ان تاریخی ناولوں میں تاریخ برائے نام ہے باقی سب ناول ہے یعنی انفسانہ۔

ایسے ناول لکھنے والوں نے ایک جہزبانہ حرکت یہ کی ہے کہ ناول کو دلچسپ، سنسنی خیز اور مقبول عام بنانے کے لئے تاریخ کو مسخ کر دیا ہے۔ ان ناول نگاروں کی دلچسپی صرف کہانی کے ساتھ ہوتی ہے جسے وہ جذباتی مکالموں اور خود ساختہ رومانی واقعات سے پُر اثر بناتے ہیں۔

اگر آپ نے میرے اسلامی تاریخی ناول — ”جہاز کی آمدھی“، ”شمشیر بے نیام“، ”دشمن کے قید خانے میں“، ”ستارہ جو ٹوٹ گیا“ اور ”ایک بُت شکن پیدا ہوا“ — پڑھے ہیں تو آپ ”.... اور نیل بہتارہا“ کے متعلق یہی رائے قائم کریں گے کہ یہ صحیح اور مستند تاریخ ہے جو ناول کے انداز سے لکھی گئی ہے۔

میں نے ہمیشہ یہ دعویٰ کیا ہے کہ میرے تاریخی ناول پڑھ کر تاریخ کے طلباء امتحان میں پاس ہو سکتے ہیں۔ آپ کو مستند تاریخ بھی ملے گی اور ناقابل فراموش کہانی بھی۔ ”.... اور نیل بہتارہا“ میں تو آپ کو بہت ہی پُر اثر اور پُر اسرار کہانیاں ملیں گی جو تاریخ کے دامن میں محفوظ ہیں۔ ان میں قیصرِ روم کی بھلائی سازشیں بھی ہیں اور لوگوں کی توہم پرستی بھی، فرعونوں کے کھنڈرات کے بھید بھی ہیں اور مجاہدینِ اسلام کے معجزاتی کارنامے بھی جو ایمان تازہ کر دیتے ہیں۔

کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ خود بھی پڑھیں اور اپنے بچوں کو بھی پڑھنے کو دیں۔ اگر اس میں کوئی خامی دیکھیں تو براؤ کرم مجھے لکھیں۔ ممنون و مشکور ہوں گا۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ ”حکایت“ لاہور

مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت کے بہت بعد کا واقعہ ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم زندہ و سلامت تھے۔

مکہ اور مدینہ کے درمیان پھیلے ہوئے، جلتے جھلساتے ہوئے ریگزار میں ایک مسافر گھوڑے پر سوار، مدینہ کی طرف جا رہا تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ صرف گھوڑا ہی اس کا مسافر تھا جس پر وہ سوار تھا۔ اُس زمانے میں کوئی مسافر اکیلے سفر نہیں کیا کرتا تھا۔ لوگ قافلوں کی صورت میں سفر کرتے تھے، کچھ اس لئے کہ رہزموں اور قزاقوں کا خطرہ ہر قدم پر موجود رہتا تھا اور زیادہ تر اس لئے کہ قافلوں کے ساتھ کٹھن مسافت بھی سہل لگتی تھی۔ ہر سہولت مل جاتی تھی۔ بیماری کی صورت میں سفر ہر طرح دیکھ بھال کرتے تھے۔

پھر وہ مسافر اکیلا کیوں جا رہا تھا؟ کہاں جا رہا تھا؟

اُس کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا۔ وہ قافلے سے ٹھٹھا ہوا یا بھٹکا ہوا راہی لگتا تھا لیکن اس کے چہرے پر اور اس کے انداز میں ان تاثرات کا نام و نشان نہ تھا جو گم کردہ راہ مسافر کے ہوا کرتے تھے۔ سفر کی صعوبت کے آثار تو چہرے مہرے پر نمایاں تھے لیکن وہ مطمئن و مسرور تھا۔ کبھی کوئی من پسند گیت گنگٹانے لگتا اور کبھی گھوڑے سے یوں باتیں کرنے لگتا جیسے گھوڑا اس کی بات سمجھ رہا ہو۔

اُس نے گھوڑے کو تھکنے نہیں دیا تھا۔ دو پڑاؤ کر چکا تھا۔ اُس کے ساتھ کھانے کا جو سامان تھا اور اُس کا جو لباس تھا اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ تلاش روزگار میں مارا مارا پھرنے والا کوئی بدو نہیں اور وہ کوئی غریب ساعرب بھی نہیں۔ اشیائے خورد و نوش اور لباس سے ہی نہیں، چہرے کا جلال اور اُس کا پُر وقار سرپایا بتاتا تھا کہ اپنے قبیلے کا سرکردہ فرد

ہے۔ اُس کے سفر کا ایک اور سورج غروب ہونے کو تھا۔ وہ اُس وقت ریت اور مٹی والے اونچے نیچے ٹیلوں کی بھول بھلیوں میں سے گزر رہا تھا۔ اُسے شاید معلوم تھا کہ قریب ہی چھوٹا سا ایک نخلستان ہے۔ وہ بڑے اطمینان سے چلا جا رہا تھا جیسے اسے اپنے آپ پر پورا پورا اعتماد ہو۔

وہ نخلستان تک پہنچ گیا۔ اُس نے گھوڑے کو روکنا چاہا لیکن گھوڑے نے لگام کا اشارہ نظر انداز کر دیا اور پانی پر جا کر رکا۔ گھوڑا دن بھر کا پیاسا تھا، بے تابی سے پانی پینے لگا۔ سوار گھوڑے سے اتر اور وہ تھکلا کھولا جس میں کھانے پینے کا سامان تھا۔

○

صبح ابھی گہری دھندلی تھی جب وہ پھر گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا۔ صحرا کی رات کی خنکی نے اسے اور اس کے گھوڑے کو تروتازہ کر دیا تھا۔

سورج اوپر آگیا تھا جب وہ ٹیلوں ٹیکریوں کے علاقے سے نکل گیا تھا۔ یہ علاقہ پیچھے ہی پیچھے ہٹا جا رہا تھا۔ کچھ دُور آگے ٹیکریاں تھیں۔ یہ بھی ریت اور مٹی کی تھیں۔ ان پر کہیں کہیں خشک جھاڑیاں تھیں.... کچھ وقت گزرا وہ ان ٹیکریوں کے اندر جا رہا تھا۔ ان میں سے گزرنے کے راستے صاف نظر آ رہے تھے لیکن ان میں آکر وہ راہ رو بہک جاتے ہیں جو صحرا کے بھید نہیں جانتے اور وہ ٹیکریوں کے اندر ہی چلتے چلتے تھک کر شل ہو جاتے ہیں۔ وہ فاصلہ تو بہت سادے کر لیتے ہیں لیکن پہنچتے کیس بھی نہیں۔

یہ سوار صحرا کا بھیدی معلوم ہوتا تھا۔ اُسے جدھر سے راستہ ملتا تھا بے خوف و خطر گزرتا جا رہا تھا۔ پھر ٹیکریاں کم ہونے لگیں اور بار بار دائیں بائیں مڑنے اور بہک جانے کا خطرہ ختم ہو گیا۔ کچھ آگے جا کر ریت اور مٹی کی یہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ایک دوسری سے اور زیادہ دُور دُور ہو گئیں۔

وہ آخری ٹیکری سے گھوم کر آگے گیا تو اس کے سامنے ریت کا سمندر اُن کی تک چلا گیا تھا اور سورج سر پر آگیا تھا۔ ریت جل رہی تھی اور اس سے اٹھنے والے شعلے آگ جیسے نہیں بلکہ شیشے اور چشمے کے پانی کی طرح شفاف تھے۔ ان سے پرے کی چیزیں ان میں سے اس طرح نظر آتی تھیں جس طرح شیشے میں سے نظر آیا کرتی ہیں لیکن جھلمل جھلمل کرتی نظر آتی ہیں۔

اس سوار کو بائیں طرف سے ہلکی ہلکی دھمک سنائی دینے لگی۔ اُس نے اُس طرف دیکھا۔ کوئی سوار آ رہا تھا لیکن یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ شتر سوار ہے یا گھوڑا سوار کیونکہ وہ جھلملا رہا تھا۔ دھمک سے شک ہوتا تھا کہ وہ گھوڑے پر سوار ہے۔ اونٹ بے آواز پا چلا کرتا ہے، تاہم ابھی اتنا ہی کہا جا سکتا تھا کہ کوئی سوار آ رہا ہے۔

وہ رک گیا اور اس کا ایک ہاتھ اپنی تلوار کے دستانے پر چلا گیا۔ آنے والا کوئی رہزن ہی ہو سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لوگ لمبے سفر پر اکیلے اکیلے نہیں نکلا کرتے۔ یہ اُس جیسا کوئی مسافر نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس کے پاس کوئی دولت نہیں تھی، زر و جواہرات نہیں تھے کہ اُسے لٹ جانے کا خطرہ ہو۔ البتہ اس کا گھوڑا ایسی دولت تھی جس سے وہ دستبردار نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس کی منزل نہ جانے ابھی کتنی دور تھی۔

○

جوں جوں سوار کا عکس واضح ہوتا آ رہا تھا اس گھوڑا سوار کی تلوار آہستہ آہستہ نیام سے باہر آتی جا رہی تھی۔ اس نے گھوڑا روک لیا تھا۔ وہ آنے والے سوار کو ایسا موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ اس پر اچانک وار کر دے یا عقب سے حملہ کر دے۔

ریت کے شفاف شعلوں میں سے آنے والا قریب آگیا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ چہرے کو پیش سے بچانے کے لئے اُس نے سر اور چہرے پر کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ آنکھیں ذرا ذرا سی نظر آ رہی تھیں۔ ایسے ہی اس کے انتظار میں رکے کھڑے سوار نے بھی اپنا چہرہ چادر میں چھپا رکھا تھا۔

اس سوار نے اُس سوار کے سامنے آکر گھوڑا روک لیا اور کچھ دیر دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

”کیا ہمیں ایک دوسرے کے لئے اجنبی رہنا چاہئے؟“ — آنے والے سوار نے پوچھا — ”اکیلے سفر پر کیوں نکلے ہو؟“

”اور تم اکیلے کیوں نکلے؟“ — اس سوار نے پوچھا — ”کہاں سے آئے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟“

”تمہاری آواز جانی پہچانی سی لگتی ہے“ — آنے والے سوار نے کہا۔
”کچھ ایسا ہی میں نے بھی تمہاری آواز میں محسوس کیا ہے“ — اس سوار نے کہا۔
— ”آؤ ہم ایک دوسرے کو پہچان لیں۔“

یہ کہہ کر اُس نے اپنا چہرہ بے نقاب کر دیا۔

”خدا کی قسم ابن ولید!“ — دوسرے سوار نے اپنا چہرہ بے نقاب کر کے گھوڑے سے کود کر اترتے ہوئے کہا — ”میں نے ٹھیک پہچانا تھا.... یہ آواز میرے یار خالد بن ولید کی ہے۔“

”عمرو بن عاص!“ — خالد بن ولید نے گھوڑے سے اتر کر حیرت سے کہا — ”کیا تو حبشہ نجاشی کے پاس نہیں چلا گیا تھا؟“

دونوں بغلیں ہو گئے اور کچھ دیر ایک دوسرے کو بازوؤں میں جکڑے رکھا۔

○

یہ تھیں تاریخ اسلام کی دو شخصیتیں.... خالد بن ولید جنہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیف اللہ (اللہ کی تلوار) کا خطاب عطا فرمایا تھا اور دوسرے تھے عمرو بن عاص جنہوں نے فاتح مصر کا اعزاز حاصل کیا۔ دونوں نے قیصر روم کو فیصلہ کن شکست دے کر اس کی جنگی طاقت کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ قیصر روم کی جنگی طاقت دہشت کا دوسرا نام تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس ہیبت ناک طاقت کو کوئی شکست دے سکتا ہے۔ ہر قل جو طاقت کا دیو کہلاتا تھا، اسلام کے ان تاریخ ساز سالاروں کے آگے آگے بھاگا پھر ہاتھ تھا۔ جنگ یرموک آخری معرکہ تھا جس میں ہر قل کو فیصلہ کن شکست ہوئی تھی۔ اب اسے کہیں پناہ نہیں مل رہی تھی۔ پناہ ملی تو مصر میں ملی لیکن عمرو بن عاص وہاں بھی جا پہنچے۔

ان دونوں عظیم سالاروں کی یہ فتوحات ایمان کی قوت، جذبہ جہاد اور شجاعت کی الگ الگ داستانیں ہیں.... ایمان افروز، ولولہ انگیز.... خالد بن ولید کی داستان فتوحات و شجاعت ہم پہلے سنا چکے ہیں۔ (دیکھئے مکتبہ داستان کی کتاب ”شمشیر بے نیام“)۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دونوں نامور سالار وہاں کیا کر رہے تھے جہاں لقمہ و دق صحرا تھا اور زندگی کا نام و نشان نہ تھا؟

وہ بہت پہلے کی بات ہے جب ان کی وہاں اتفاقیہ ملاقات ہو گئی تھی۔ اُس وقت دونوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ دونوں مکہ کے قریش میں سے تھے۔ دونوں کی معاشرتی اور معاشی حیثیت اہل قریش میں بڑی بلند اور نمایاں تھی۔ خالد بن ولید امیر کبیر تاجر کے بیٹے تھے۔ انہوں نے اسلام قبول کرنے سے پہلے شہزادوں جیسی زندگی گزاری

تھی لیکن وہ جنگجو تھے اور نامور تیغ زن۔ عسکریت ان کے رگ و ریشے میں رچی بسی ہوئی تھی اور فن حرب و ضرب میں انہیں خصوصی مہارت حاصل تھی۔

خالد پیدائشی سپہ سالار تھے۔ انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کا عہد کر رکھا تھا لیکن اہل قریش جس میدان اور معرکہ میں مسلمانوں کے مقابل آئے، منہ کی کھائی اور اگلے معرکہ کی تیاری کرنے لگے۔ خالد نے اپنے قبیلے کی شکست خوردگی اور مسلمانوں کی عسکری ذہانت اور الہیت اور ان کا نظم و نسق دیکھا تو اپنے قبیلے سے ان کا دل اُچاٹ ہو گیا۔

خالد بن ولید کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔ عسکریت کے علاوہ انہوں نے مسلمانوں کے کردار میں کوئی ایسی نمایاں جھلک دیکھی جو انہیں اپنے قبیلے میں نظر نہیں آتی تھی۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر تو خالد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے لئے چل پڑے تھے۔ آنحضرتؐ اس سے بے خبر تھے۔ آپؐ نے قریش کے ساتھ ان ہی کی شرائط پر معاہدہ کر لیا جو خالد بن ولید کے لئے غیر متوقع تھا۔

خالد تو پہلے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار سے متاثر تھے، صلح حدیبیہ سے ایسے متاثر ہوئے کہ ایک روز کسی کو بتائے بغیر مکہ سے نکلے اور مدینہ کا رخ کر لیا۔ ان کے آگے ساڑھے تین سو کلومیٹر انتہائی دشوار مسافت تھی۔ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کر کے اسلام قبول کرنے جا رہے تھے۔ راستے میں انہیں عمرو بن عاص مل گئے اور خالد انہیں وہاں دیکھ کر حیران رہ گئے۔

○

خالد بن ولید کی حیرت اس پر نہیں تھی کہ عمرو بن عاص انہیں آبادیوں سے بہت دُور اس ویرانے میں مل گئے تھے بلکہ وہ حیران اس پر ہوئے تھے کہ عمرو بن عاص عرصہ دو سال سے حبشہ (افریقہ) چلے گئے تھے۔ اگر عمرو بن عاص انہیں مکہ میں ملتے تو خالد بن ولید حیران نہ ہوتے۔

”پہلے تو یہ بتا اے ابن عاص!“ — خالد بن ولید نے پوچھا — ”تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ کیا تو حبشہ نجاشی کے پاس نہیں چلا گیا تھا؟“

”ہاں ابن ولید!“ — عمرو بن عاص نے کہا — ”میں حبشہ ہی چلا گیا تھا لیکن تجارت کے لئے نہیں بلکہ کسی اور وجہ سے وہاں گیا تھا۔ اچانک واپسی ہو گئی اور یوں

سمجھ لے کہ بھٹکتا ہوا یہاں آن پہنچا ہوں۔ تُو مل گیا ہے تو شاید کوئی راستہ دکھا دے۔ میں تو سوچ سوچ کر تھک گیا ہوں۔

”پہلے اپنی وہ سوچ تو بتا“ — خالد بن ولید نے کہا — ”اگر تُو سوچوں میں بھٹک سکتا ہے اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا پھر کَمَہ کے قریش تو اندھیروں میں گم ہو جائیں گے۔“

عمرو بن عاص نے جو جواب دیا وہ تاریخ اسلام کا ایک فکر انگیز باب ہے۔ اُن کا جواب سننے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ عمرو بن عاص اصلاً ”کون تھے؟ کیا تھے اور ان کا خاندانی پس منظر کیا تھا۔۔۔ قریش بت پرست تھے اور اُنہوں نے بُتوں کے کچھ نام رکھے ہوئے تھے۔ یہ ان کے دیوتا تھے۔ ان دیوتاؤں کا ایک خاص اوقاف تھا اور اس اوقاف کا نگران بنو سہم تھا۔ اوقاف کے تمام تر انتظامات اور مالی معاملات بھی بنو سہم کی ذمہ داری میں تھے۔ اس وجہ سے عمرو بن عاص کے والد عاص بن وائل سہمی کو قریش میں خاصا اونچا اور قابل تعظیم مقام حاصل تھا۔ قبیلے پر ان کے فیصلے اور حکم چلتے تھے اور ان کی تعمیل ہوتی تھی۔ خالد بن ولید کے خاندان کی طرح عمرو بن عاص کا خاندان بھی دولت مند تھا۔ دولت مندی کا ذریعہ تجارت تھا۔

عمرو بن عاص کے والد اتنے صاحب اقتدار تھے کہ حضرت عمرؓ بن خطاب کے قبول اسلام سے پہلے ان کے قبیلے بنو عدی کو بنو عبد الشمس نے ان کے گھروں سے جو صفاء کے قریب تھے، نکال دیا تو بنو سہم نے انہیں اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ پھر حضرت عمرؓ بن خطاب نے اسلام قبول کیا تو اسی بنو سہم نے انہیں قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس پر خطر صورت حال میں عمرو بن عاص کے والد عاص بن وائل سہمی نے انہیں اپنی حفاظت میں رکھا تھا۔

عاص بن وائل اتنے دولت مند تھے کہ ریشم کا لباس پہنتے تھے۔ عمرو بن عاص پر اس دولت مندی کا اور اپنے خاندان کی حیثیت کا بہت زیادہ اثر تھا۔ ایک اثر تو یہ تھا کہ وہ عزت نفس کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے اور دوسرا اثر یہ کہ اقتدار پسندی میں کسی اور کو اپنے آگے یا اپنے اوپر برداشت نہیں کرتے تھے۔

عمرو بن عاص بھی خالد بن ولید کی طرح اور قریش کے ہر سردار کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن تھے اور آپ کے قتل کے درپے رہتے تھے لیکن عمرو

بن عاص نے یہ بھی دیکھا کہ قریش کسی بھی معرکے میں مسلمانوں کو شکست نہ دے سکے۔ عمرو بن عاص مسلمانوں کے خلاف غزوہ احزاب میں شامل تھے۔ وہ خالد بن ولید کی طرح جنگجو، شہسوار اور شمشیر زن تھے۔ انہوں نے اپنی بے جگری اور بہادری کے جوہر دکھائے، جم کر لڑے لیکن اس معرکے کا انجام بھی وہی ہوا جو وہ پہلے دیکھتے آ رہے تھے۔ قریش جو صلہ ہار بیٹھے اور بڑی طرح میدان چھوڑ گئے۔

مشہور یورپی مؤرخ ایلفرڈ ہٹلر نے یہ واقعہ بیان کیا ہے جس کی تائید ایک مستند مسلمان تاریخ نویس ابن عبد الحکم نے کی ہے۔ یہ واقعہ سنانے سے پہلے یہ بتادنا ضروری ہے کہ تمام مسلم اور غیر مسلم مورخوں نے عمرو بن عاص کے متعلق لکھا ہے کہ وہ جس قدر بہادر تھے اور شہسزاری اور شمشیر زنی میں جتنی شہرت رکھتے تھے، اس سے کہیں زیادہ ذہانت و فطانت، وقار و تمکنت، دانائی اور زبان آوری اور سخن فہمی میں خاص مقام رکھتے تھے۔ زور استدلال ایسا کہ ان کے سامنے کوئی اور اپنی دلیل بازی کی جرات نہیں کرتا تھا۔ وہ حقیقت اور خوش فہمی کے فرق کو نہایت اچھی طرح سمجھتے تھے اور مکمل طور پر حقیقت میں تھے۔ غزوہ احزاب میں قریش کی شکست دیکھ کر عمرو بن عاص نے قبیلہ قریش کے چند آدمیوں کو اپنے ہاں بلایا۔

”اے اہل قریش!“ — عمرو بن عاص نے کہا — ”خدا کی قسم، محمدؐ کے معاملے میں ہم سب خوش فہمیوں میں مبتلا ہیں۔ کسی ایک بھی معرکے میں ہم ان کے مقابلے میں نہیں جم سکے۔ کیوں نہیں ہم لوگ تسلیم کر لیں کہ محمدؐ کا ستارہ عروج پر پہنچ رہا ہے۔ وہ وقت تیزی سے چلا آ رہا ہے جب مسلمان ہم پر غالب آجائیں گے۔“

”ہم تمہیں دانشمند سمجھتے ہیں!“ — ایک آدمی نے کہا — ”جو تُو نے کہا ہے وہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ تُو ہم سب میں عقل و دانش زیادہ رکھتا ہے۔ یہ بتاؤ چاہتا کیا ہے اور ہم کیا کریں۔“

”تم سب میرے دوست ہو“ — عمرو بن عاص نے کہا — ”میں جو چاہتا ہوں وہ اور کوئی نہیں مانے گا، تم سب میرے دوست ہو، مجھے اپنی اور تمہاری عزت کا خیال ہے۔ میرے سامنے ایک ہی راستہ ہے۔ تم میں سے جو میرا ساتھ دینا چاہے وہ میرے ساتھ حبشہ چلا چلے اور ہم حبشہ کے بادشاہ نجاشی کی پناہ میں رہیں گے۔“

”کب تک وہاں پڑے رہیں گے؟“ — ایک نے پوچھا — ”وہاں کریں گے

کیا؟“

”تجارت!“ — عمرو بن عاص نے جواب دیا — ”تجارت نہ ہو سکی تو نجاشی ہمارے لئے کوئی نہ کوئی ذریعہ معاش پیدا کر دے گا۔ اگر مسلمان قریش پر غالب آگئے تو میں مسلمانوں کی غلامی سے نجاشی کے زیر سایہ رہنا بہتر سمجھتا ہوں۔ اگر قریش مسلمانوں پر غالب آگئے تو محمد کا یہ نیا مذہب ختم ہو جائے گا اور ہم لوگ واپس آجائیں گے۔“

○

”ابن ولید!“ — عمرو بن عاص نے خالد بن ولید کو یہ ساری بات سنا کر کہا — ”تو چپ چاپ میری بات سن رہا ہے۔ تیری اس خاموشی سے اس کے سوا اور کیا سمجھ سکتا ہوں کہ تجھے میری یہ باتیں اچھی نہیں لگیں۔“

”میری خاموشی پر مت جا میرے عزیز دوست!“ — خالد بن ولید نے کہا —

”مجھے بھی کچھ کہنا ہے جو میں کسی اور سے نہیں کہہ سکتا۔ پہلے تیری پوری بات سن لوں تو اپنی سناؤں گا۔“

”میں نے بتایا ہے ناں، چند آدمی میرے ساتھ تیار ہو گئے۔“ عمرو بن عاص نے کہا — ”ہم نے تجارت کو ہمانہ بنایا اور چل پڑے۔ تجھے شاید حبشہ کا راستہ معلوم ہی ہو گا۔ ہم یہاں سے چلے اور سمندر (بحیرہ قلزم) کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں میں داخل ہو گئے اور پھر عدن جا پہنچے۔ عدن کے قریب اُس جگہ گئے جہاں سمندر بہت ہی کم چوڑا ہے۔ بڑی بادبانی کشتی پر ہم نے سمندر پار کیا اور پھر خشکی کا سفر شروع ہو گیا اور پھر تین چار پڑاؤ کر کے حبشہ کے دارالحکومت عدیس ابلیا پہنچ گئے۔ تجھے یہ اندازہ ہو گا کہ یہ سفر کتنا طویل ہے اور کتنی بھی لیکن ہم خیریت سے اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے دربار میں گئے اور اُس سے پناہ مانگی اور یہ بھی کہا کہ ہم تجارت پیشہ لوگ ہیں اس لئے اُس پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ڈالیں گے اور پناہ کے سوا کوئی مدد نہیں مانگیں گے۔۔۔ نجاشی نے ہمیں شاہی مہمانوں کی طرح رکھا اور ہمیں ایسی رہائش دیا کہ وہاں جو شاہی خاندان جیسی رہائش تھی۔“

”مجھے ان باتوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں“ — خالد بن ولید نے کہا — ”میں یہ سننا چاہتا ہوں کہ تم واپس کیوں چلے آئے اور اب کہاں کا ارادہ ہے؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ تو اگر حبشہ سے ہی آیا ہے تو مکہ کیوں نہ رُک گیا؟ مکہ پیچھے بہت دُور رہ گیا ہے.... کیا تو

کوئی خاص بات مجھ سے چھپا رہا ہے؟“

”نہیں ابن ولید“ — عمرو بن عاص نے کہا — ”تو میرا دوست ہے اور اہل قریش میں تجھے وہی برتر حیثیت حاصل ہے جو مجھے حاصل ہے۔ میں نے مکہ سے روانہ ہونے سے پہلے تجھے نہیں بتایا تھا کہ میں یہاں سے ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں۔ یہ تو میں نے کسی کو بھی نہیں بتایا تھا اور اپنے ساتھیوں سے بھی کہا تھا کہ وہ بھی کسی کے ساتھ ذکر نہ کریں لیکن اب دل میں ایسی بات آگئی ہے جس کے متعلق میں فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اچھا ہوا تو مل گیا ہے۔“

”تیرے ساتھی کہاں ہیں؟“ — خالد بن ولید نے پوچھا۔

”انہیں وہیں چھوڑ آیا ہوں“ — عمرو بن عاص نے جواب دیا — ”میں جو ارادہ لے کر وہاں سے آیا ہوں، میرے ساتھیوں کو یہ ارادہ پسند نہیں آیا اور میں ان کا ساتھ چھوڑ آیا ہوں۔“

”میں سمجھتا تھا کہ تو راستے سے بھٹک گیا۔“ — خالد بن ولید نے کہا — ”لیکن تیری باتوں سے شک ہوتا ہے کہ تیری عقل صحیح سوچوں سے بھٹک گئی ہے۔ اتنی لمبی بات نہ کر ابن عاص! مجھے صحیح بات بتا دے تیرا ارادہ کیا ہے اور تو کس منزل کا مسافر ہے۔“

”ابن ولید!“ — عمرو بن عاص نے کہا — ”جب تک بات پوری نہ سنا لوں، اپنا ارادہ نہیں بتاؤں گا کیونکہ تو غلط سمجھ لے گا.... یہ تو تجھے معلوم ہے ہمارے تاجر حبشہ جاتے رہتے ہیں۔ ہم وہاں تقریباً ایک سال رہے۔ ایک روز عربی تاجروں کا ایک قافلہ عدیس ابلیا پہنچا۔ اس میں میری جان پہچان کے لوگ بھی تھے۔ ان سے پتہ چلا کہ محمدؐ نے حدیبیہ کے مقام پر قبیلہ قریش کے ساتھ ایک معاہدہ کیا ہے اور اس معاہدے کی رو سے قریش اور مسلمان دس سال تک جنگ نہیں کریں گے۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ محمدؐ نے قریش کی ساری شرطیں مان لی ہیں اور طے پایا ہے کہ وہ ایک سال بعد عمرہ کرنے آئیں گے۔ میں نے تسلیم نہیں کیا کہ ایسا معاہدہ ہوا ہو گا لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد مکہ سے آیا ہوا ایک اور آدمی ملا۔ اس نے بتایا کہ مسلمان اپنے رسول محمدؐ کے ساتھ ایک سال بعد عمرہ کرنے آئے تھے اور انہوں نے پُر امن طریقے سے عمرہ کیا اور واپس چلے گئے....

”میں نے مکہ سے آنے والے اس شخص سے اور کئی باتیں پوچھیں تو میں اس نتیجے

پر پہنچا کہ اہل قریش نے مسلمانوں کا غلبہ قبول کر لیا ہے اور ان کی برتری کو بھی تسلیم کر لیا ہے۔ ابن ولید! تجھے میری بات اچھی لگے نہ لگے، میں اپنے دل اور دماغ کی بات کرتا ہوں۔ میں محمدؐ کے کردار کا قائل ہو گیا اور سوچ سوچ کر میں اس رائے پر پہنچا کہ محمدؐ کا ستارہ اقبال کے عروج پر پہنچ گیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ مدینہ جا کر اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔ پھر مجھے یہ پتہ چلا کہ قریش مدینہ پر یلغار کرنے گئے تھے لیکن مسلمانوں نے ایک نئی رکاوٹ سوچ لی اور قریش کی یلغار ناکام ہو گئی۔ سنا ہے مسلمانوں نے مدینہ کے ارد گرد خندق کھودی تھی۔“

خالد بن ولید بھی اس یلغار میں شامل تھے اور انہوں نے گھوڑے سے یہ خندق پھلانگنے کی کوشش بھی کی تھی اور ناکام رہے تھے اس لئے وہ جنگ خندق کی ہر بات عمرو بن عاص کو سنا سکتے تھے۔ انہوں نے جنگ خندق کی پوری تفصیل سنائی اور مسلمانوں کی اس دانشمندی کو خراج تحسین پیش کیا کہ انہوں نے خندق کھود کر قریش کا حملہ ناکام کر دیا تھا۔

”پھر تو ہی پتا میرے عزیز دوست!“ — عمرو بن عاص نے کہا — ”میں مسلمانوں کی عسکری برتری کیوں نہ تسلیم کروں؟ میں نے یہ ساری تفصیل حبشہ میں سنی تھی اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہمارے اہل قریش کے پاس کچھ نہیں رہا۔ میں یہ خیال لے کر آیا ہوں کہ محمدؐ میں وہ عظمت موجود ہے جو ہمارے قبیلے کے کسی بڑے بزرگ کو ابھی تک حاصل نہیں ہوئی۔ میں جنگجو ہوں، تو بھی جنگجو ہے۔ کیا ہم اپنے لوگوں کے ساتھ مل کر کہیں اپنے جوہر دکھا سکتے ہیں؟.... نہیں، کبھی نہیں.... اب میں وہ بات کہنے لگا ہوں جو تجھے مشتعل کر دے گی اور ہو سکتا ہے تو مجھے قتل کر دینے کو تلوار نکال لے۔“

”اپنے دل کی بات مجھ سے سن لے“ — خالد بن ولید نے کہا — ”تو اسلام قبول کرنے کے ارادے سے آیا ہے۔ کیا میں نے غلط کہا ہے؟“

”خدا کی قسم! تو میرے دل کا بھید پا گیا ہے“ — عمرو بن عاص نے کہا — ”لیکن میں اس ارادے کے باوجود ہٹک جاتا ہوں اور خیال آتا ہے کہ میرا یہ فیصلہ صحیح نہیں۔ شاید میں اپنے قبیلے سے رشتہ توڑنا نہیں چاہتا لیکن اپنے لوگوں کو دکھاتا ہوں تو افسوس ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف کچھ بھی نہ کر سکے اور میں کہتا ہوں کہ وہ اسی قابل ہیں کہ مسلمان ان پر غالب آجائیں.... ابن ولید! مجھے بتا، کیا میں ٹھیک فیصلے پر پہنچا ہوں؟ اگر

میرا فیصلہ غلط ہے تو خدا کی قسم، تجھے اجازت دیتا ہوں کہ میرا سرتن سے جدا کر دے۔“

خالد بن ولید نے آسمان کی طرف منہ کر کے بڑا ہی جاندار قہقہہ لگایا پھر عمرو بن عاص کی طرف دیکھ کر اپنے دونوں ہاتھ ان کے کندھے پر رکھے۔ اُس وقت خالد بن ولید کے چہرے پر کچھ ایسی رونق تھی جسے جلال کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔

”ابن عاص!“ — خالد بن ولید نے عمرو بن عاص کو کندھوں سے ہلکا سا جھٹکا دے کر کہا — ”تیرا فیصلہ برحق ہے۔ اپنے ارادے سے بھٹکتا نہیں۔ میں اس سفر میں تیرا ہمسفر ہوں اور ہم دونوں کی منزل ایک ہے.... میں اسلام قبول کرنے کے لئے مدینہ جا رہا ہوں۔ مکہ میں کسی کو بتا کر نہیں آیا۔ آ، میرے ساتھ چل!“

تاریخ لکھنے والوں کی شہادت موجود ہے کہ خالد بن ولید اور عمرو بن عاص اکٹھے مدینہ پہنچے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور حاضری دی۔

یہ بتانا ممکن نہیں کہ ان دونوں کو دیکھ کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فوری ردِ عمل کیا تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اگر کچھ لوگ بیٹھے تھے تو ان کے دلوں میں یہ شک ضرور پیدا ہوا ہو گا کہ یہ دونوں اچھی نیت سے نہیں آئے۔ سب جانتے تھے کہ خالد بن ولید نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا عہد کر رکھا تھا۔ اتنا ضرور ہی ہوا ہو گا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس پر سناٹا طاری ہو گیا ہو گا۔ یہ دونوں کوئی عام قسم کے آدمی ہوتے تو اور بات تھی، سب ان دونوں کے متعلق جانتے تھے کہ انہیں اپنے اپنے قبیلے میں کتنی اونچی اور برتر حیثیت حاصل ہے۔ اچھا ہوا خالد بن ولید جلدی بول پڑے اور محفل پر جو کھپاؤ طاری ہو گیا تھا وہ ختم ہو گیا۔

”میں آپ کے دست مبارک پر بیعت کرنے آیا ہوں“ — خالد بن ولید نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا — ”میں دل و جان سے آپ کی رسالت کو تسلیم کرتا ہوں۔“

آنحضورؐ نے خالد بن ولید کی بیعت قبول فرمائی اور انہیں حلقہ بگوش اسلام کر لیا۔ پھر آپؐ نے عمرو بن عاص کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔ عمرو بن عاص سرک کر آنحضورؐ کے قریب ہو گئے۔

”میں بھی آپ کو اللہ کا رسول تسلیم کرتا ہوں“ — عمرو بن عاص نے کہا — ”لیکن بیعت سے پہلے یہ عرض ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے پچھلے تمام گناہ معاف کر

دیئے جائیں اور آئندہ محتاط رہوں گا کہ اسلام کے دائرے میں رہوں اور اپنے آپ کو گناہوں سے پاک رکھوں۔“

مصر کے مشہور تاریخ نویس محمد حسنین بیگل مختلف حوالوں سے لکھتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن عاص سے کہا کہ گناہ معاف کرنے والا اللہ ہے اور جو توبہ کر کے اسلام میں داخل ہو جاتا ہے اس کے پچھلے تمام گناہ اسی طرح دھل جاتے ہیں جس طرح ہجرت سے پچھلی تمام مصیبتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ آپ نے عمرو بن عاص سے کہا کہ وہ بیعت کر لیں اور وہ اپنے آپ میں خود ہی تبدیلی محسوس کریں گے.... اس طرح عمرو بن عاص نے بھی اسلام قبول کر لیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خالد بن ولید اور عمرو بن عاص کو کتے سے جانتے تھے۔ آپ ان دونوں کی خوبیوں، صلاحیتوں اور کردار سے خوب واقف تھے۔ آپ نے ان دونوں کو اعتماد میں لے لیا بلکہ مورخ لکھتے ہیں کہ آنحضور نے ان دونوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کیا لیکن دونوں اس اعتماد پر پورے اترے اور اسلام کو دو عظیم سپہ سالار مل گئے۔



چونکہ یہ داستان فتح مصر کی ہے اس لئے ہم اپنے آپ کو اسی کا پابند رکھیں گے اور ان ہی سالاروں کا ذکر نمایاں طور پر کریں گے جنہوں نے فرعونوں کی زمین پر اسلام کے جھنڈے گاڑے تھے۔ ان سالاروں کے سپہ سالار عمرو بن عاص تھے۔ فتح مصر کا خیال اور عزم عمرو بن عاص کے دماغ میں ہی آیا تھا اور انہوں نے ہی امیر المومنین حضرت عمرؓ کو قائل کیا تھا کہ مصر پر فوج کشی کی جائے۔ امیر المومنین رضامند نہیں ہو رہے تھے اور عمرو بن عاص کی تجویز کو ٹالتے چلے آ رہے تھے۔ آخر ایک روز وہ قائل ہو ہی گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے عمرو بن عاص مصر کو سلطنت اسلامیہ میں شامل کرنے کے لئے ہی دنیا میں آئے تھے۔

یہ ساری تفصیلات اس داستان میں تفصیل سے سنائی جائیں گی۔ ان تفصیلات میں کچھ دلچسپ ہیں، کچھ فکر انگیز ہیں، کچھ دلولہ انگیز ہیں اور کچھ دردناک بھی ہیں لیکن جو حقیقت ہمارے سامنے کھل کر آتی ہے وہ قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ اللہ جو کلام کرنا چاہتا ہے اس کے لئے حالات خود ہی پیدا کر دیتا ہے۔ خالد بن ولید اور عمرو بن عاص کا خود ہی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور قبول اسلام کے لئے پہنچ جانا کوئی اتفاق نہ تھا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اسلام کو دو تاریخ ساز اور عظیم سپہ سالار عطا کر دیے تھے۔ ان کے ہاتھوں رومیوں کی طاقت کو فنا کروانا تھا اور پھر عمرو بن عاص کے ہاتھوں مصر کو سلطنت اسلامیہ میں شامل کرنا تھا۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عمرو بن عاص کے متعلق ایک واقعہ بیان کر دیا جائے جسے زیادہ تر مؤرخوں اور بعد کے تاریخ نویسوں نے تاریخ کے دامن میں محفوظ کر دیا تھا۔ ان میں بلاذری، مقریزی اور ابن عبدالحکم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

واقعہ یوں ہے کہ عمرو بن عاص تجارت اور سیاحت کے سلسلے میں عراق، شام، فلسطین اور مصر تک جایا کرتے تھے۔ یہ ان کے قبول اسلام سے بہت پہلے کا واقعہ ہے۔

ایک بار عمرو بن عاص چند ایک اہل قریش کے ساتھ تجارت کے سلسلے میں بیت المقدس گئے۔ انہیں وہاں بہت دن رکنا تھا اور انہوں نے شہر کے باہر ایک کھلی جگہ ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ان کے ساتھیوں میں سے ایک آدمی ہر روز اونٹوں کو چرانے کے لئے قریب ہی جنگل میں لے جایا کرتا تھا۔

ایک روز اونٹوں کو چرانے پھٹنے کے لئے لے جانے کی باری عمرو بن عاص کی تھی۔ دن کا پچھلا پھر تھا اور وہ اونٹوں کو کھول کر لے گئے اور ایک پہاڑی کے دامن میں لے جا کر کھلا چھوڑ دیا۔ وہاں گھاس اور جھاڑیوں کی بہتات تھی اور درخت ہرے بھرے تھے۔ موسم گرمیوں کا تھا اور ان دنوں گرمی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔

انہوں نے دیکھا کہ ایک آدمی پہاڑی سے اتر رہا ہے۔ اس کے اترنے کا انداز بتا رہا تھا کہ اُس کی ٹانگیں لڑکھڑاہی ہیں اور کسی بھی قدم پر وہ گر پڑے گا اور لڑکھٹا ہوا نیچے آئے گا اور شاید زندہ نہ ہی رہے۔ عمرو بن عاص ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے اور اس آدمی کو بڑی غور سے دیکھ رہے تھے۔

وہ آدمی پہاڑی سے تو اتر آیا لیکن اُس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ کبھی وہ اپنے دونوں ہاتھ اپنے گلے پر رکھ لیتا اور کبھی وہ رکتا اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ قدم گھسیٹتا، ڈولتا اور جھولتا عمرو بن عاص تک پہنچ گیا اور ان کے سامنے گر پڑا۔

”پانی!“ — اس آدمی کے منہ سے سسکی سی نکلی — ”پانی.... مر جاؤں گا۔“

عمرو بن عاص کے پاس پانی کا چھوٹا مشیرہ بھرا ہوا تھا۔ گرمی اتنی کہ تھوڑی تھوڑی

دیر بعد پیاس لگتی تھی اور حلق میں کانٹے چبھنے لگتے تھے۔ اسی لئے عمرو بن عاص نے پانی کا مشکیرہ اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک دو گھونٹ پانی پی لیتے تھے۔ اس آدمی نے پانی مانگا تو عمرو بن عاص نے مشکیرہ کھولا اور پھر اس شخص کو سہارا دے کر بٹھایا اور مشکیرے کا منہ اُس کے منہ کے ساتھ لگا دیا۔ وہ شخص اتنا پیاسا تھا کہ آدھا مشکیرہ پانی پی گیا۔

”تم نے مجھے پانی نہیں نئی زندگی دی ہے“ — اس آدمی نے کہا — ”میں حضرت عیسیٰؑ کی اس سرزمین کی زیارت کی خاطر پہاڑی پر چڑھ گیا تھا کہ دُور دُور تک اس علاقے کو دیکھوں گا لیکن میری حماقت کہ پانی ساتھ نہ لے گیا۔ یہ تو ایک معجزہ ہے کہ میں تم تک زندہ پہنچ گیا ہوں۔“

اس شخص نے اپنا نام شمس بتایا اور یہ بھی کہ وہ مصر کے بہت بڑے شہر اور بندرگاہ اسکندریہ کا رہنے والا تھا۔ اُس وقت اسکندریہ مصر کا دار الحکومت تھا اور مصر میں ایرانیوں کی حکومت تھی۔

○

شمس کو پانی ملا جو اُس نے پیٹ بھر کر پیا تو اس کے جسم میں تازگی آگئی۔ وہ تھکا ہوا بھی تھا۔ اُسے غنودگی محسوس ہونے لگی۔ عمرو بن عاص کا شکریہ ادا کر کے وہ اٹھا اور قریب ہی ایک درخت کے نیچے لیٹا اور لیٹتے ہی اُس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ خراٹے لینے لگا۔ عمرو بن عاص اُس سے بے خبر ہو گئے اور اپنے اونٹوں کو دیکھنے لگے کہ کوئی اونٹ ادھر ادھر نہ ہو جائے۔ انہوں نے ویسے ہی اپنا مشکیرہ دیکھا کہ اس پیاسے انسان نے اس میں کوئی قطرہ چھوڑا بھی ہے یا نہیں۔ مشکیرے میں دو چار گھونٹ پانی رہ گیا تھا۔ عمرو بن عاص کو دلی اطمینان محسوس ہو رہا تھا کہ انہوں نے ایک پیاسے کی جان بچالی ہے۔ وہ شخص جس نے اپنا نام شمس بتایا تھا بیت المقدس شہر تک نہ پہنچ سکتا۔

عمرو بن عاص نے سوئے ہوئے شمس کی طرف دیکھا تو اُن کے اوسان خطا ہو گئے۔ ایک بڑا لمبا سانپ جس کا رنگ سیاہی مائل تھا، آہستہ آہستہ سوئے ہوئے شمس کی طرف رینگتا آ رہا تھا۔ گرمی کی شدت میں سانپوں میں ذہر بہت ہی تیز ہو جاتا ہے اور فوراً اثر کرتا ہے۔ سانپ اور شمس میں ایک دو قدموں کا ہی فاصلہ رہ گیا تھا۔ عمرو بن عاص اتنی جلدی وہاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے کہ سانپ کو شمس تک پہنچنے سے پہلے مار ڈالتے یا بھاگ

دیتے۔

اُس زمانے میں گڈریے اپنے ساتھ تیر اور کمان ضرور ہی رکھا کرتے تھے۔ تلوار اور برچھی بھی ان کے پاس ہوتی تھی لیکن تیر و کمان کو اس لئے زیادہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ مویشی یا بھیڑ بکریاں چرتی بچکتی کچھ دور نکل جاتی تھیں۔ کوئی درندہ آنکھتا تو گڈریے دور سے اسے تیر مار سکتے تھے۔ عمرو بن عاص اونٹ چرانے کے لئے لے گئے تھے اس لئے تیر و کمان بھی ساتھ لے گئے تھے۔ انہوں نے سانپ کو دیکھا تو فوراً ”کمان میں تیر ڈالا اور سانپ کے سر پر تیر چلایا۔ فاصلہ بہت تھوڑا تھا اس لئے تیر سانپ کے سر میں سے گزر کر زمین میں گڑ گیا۔ سانپ وہیں لوٹ پوٹ ہوتا رہا اور مر گیا۔ انہوں نے شمس کو جگانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ بڑی گہری نیند سویا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد شمس کی آنکھ کھلی اور وہ اٹھ بیٹھا۔ سب سے پہلے اُس کی نظر سانپ پر پڑی اور وہ بدک کراٹھا اور سانپ سے دور ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ اُس نے سانپ کے سر میں سے گزرا ہوا اور کچھ زمین میں گڑا ہوا تیر دیکھا تو گھوم کر عمرو بن عاص کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی۔ عمرو بن عاص مسکرا رہے تھے۔

”مر گیا ہے“ — عمرو بن عاص نے کہا — ”اب ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارے پاس پہنچ گیا تھا۔ میرے تیر نے اسے آگے نہیں آنے دیا۔“

شمس آہستہ آہستہ عمرو بن عاص کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ وہ انہیں دیکھتا ہی رہا جیسے اُس کی زبان بولنے سے عاری ہو گئی ہو۔ عمرو بن عاص بھی اسے دیکھتے رہے اور منہ سے کچھ بھی نہ بولے۔

”تم مجھے انسان نہیں لگتے“ — شمس نے کہا — ”خدا نے تمہیں میری حفاظت کے لئے آسمان سے اتارا ہے۔ کیا تم آسمانی مخلوق نہیں ہو؟“

”خدا کی قسم“ اتنی زیادہ حیرت کی بات تو نہیں تھی — عمرو بن عاص نے کہا — ”انسان ہی تو انسان کے کام آیا کرتا ہے۔ میں آسمان سے نہیں اترا“ مکہ سے بغرض تجارت آیا ہوں اور میں قبیلہ قریش کا آدمی ہوں۔“

”میں مصر کے سب سے بڑے شہر اسکندریہ کا رہنے والا ہوں“ — شمس نے کہا — ”یہ مت سوچ کہ میں مصری ہوں اس لئے تمہارے ملک عرب کے رسم و رواج سے نواقف ہوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ ملک عرب میں ایک انسانی جان کا خون بہا ایک سو

اونٹ ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ایک سوا اونٹوں کی قیمت ایک ہزار دینار ہوتی ہے۔
کیا میں نے غلط کہا ہے؟

”نہیں دوست!“ — عمرو بن عاص نے کہا — ”تم نے غلط نہیں کہا۔ عرب میں ایک انسانی جان کی قیمت ایک سوا اونٹ ہی ہے اور یہ قیمت اتنی زیادہ ہے کہ ہر کوئی اتنی قیمت نہیں دے سکتا اس لئے کوئی کسی کو قتل نہیں کرتا.... لیکن انسانی جان کی قیمت کا خیال تمہیں کیوں آیا ہے؟“

”یہ مت پوچھ کہ مجھے یہ خیال کیوں آیا ہے“ — شمس نے کہا — ”میں تمہیں اپنے ملک لے چلوں گا۔ خدا کی قسم، میں تمہیں دو جانوں کی قیمت دوں گا۔ یہ تمہارا حق ہے جو میں نے ادا نہ کیا تو خدا مجھ سے ناراض ہو گا۔ یہ نبیوں اور پیغمبروں کی مقدس زمین ہے، میں ان کی مقدس روحوں کو ناراض کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔“

”لیکن یہ تو بتاؤ“ — عمرو بن عاص نے پوچھا — ”وہ کون سے دو انسان ہیں جنہیں تم نے قتل کیا ہے؟ اور میں کون ہوتا ہوں جو ان کا خون بہا وصول کروں؟“

”عرب کے لوگ اتنے کم عقل تو نہیں ہوتے جتنے تم لگ رہے ہو“ — شمس نے کہا — ”تم نے دو بار میری جان بچائی ہے۔ پیاس نے تو میری جان لے لی تھی۔ تم اگر کچھ ہی دیر اور مجھے پانی نہ پلاتے تو میں مر چکا ہوتا۔ پھر تم نے مجھے اس اتنے زیادہ زہریلے سانپ سے بچایا۔ تم تیر چلانے میں ذرا سی بھی کوتاہی کر جاتے تو سانپ مجھے دس لیتا اور میں بیدار ہونے سے پہلے ہی مر چکا ہوتا۔ پھر بتا مجھ پر دو جانوں کی قیمت واجب ہوتی ہے یا نہیں؟“

عمرو بن عاص بڑے معزز اور برتر خاندان کے فرد تھے۔ انہوں نے شمس سے کہا کہ ان کا اس پر کوئی حق نہیں بنتا، انہوں نے تو اپنا فرض ادا کیا ہے۔

”میرے عربی دوست!“ — شمس نے کہا — ”تم نہیں جانتے تم نے کس کی جان بچائی ہے۔ خدا نے مجھے اتنی دولت دی ہے اور ایسا رتبہ دیا ہے کہ میرے دوستانہ تعلقات شاہی خاندان کے ساتھ اور وہاں کے امراء اور حکام کے ساتھ بڑے گہرے ہیں اور ان حلقوں میں مجھے بڑی ہی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ میرے پاس یہاں دو ہزار دینار ہوتے تو میں تمہارا حق بیس دے دیتا۔ میں تمہیں اسکندریہ لے جاؤں گا اور تم انکار نہیں کرو گے۔ جہاں تم نے مجھ پر دو احسان کئے ہیں وہاں تیسرا احسان یہ کرو کہ

میرے ساتھ چلو۔“

عمرو بن عاص مالدار باپ کے بیٹے تھے اور تجارت بھی وسیع پیمانے کی تھی اس لئے سیر و سیاحت کا ذوق و شوق بھی تھا۔ وہ جہاں چاہتے، بڑے آرام سے جا سکتے تھے۔ شمس کی پیشکش قبول کرنے میں وہ اس لئے پس و پیش کر رہے تھے کہ وہ احسان کا صلہ نہیں لیتا چاہتے تھے۔ ویسے شمس کی یہ پیشکش عمرو بن عاص کی خواہش کے عین مطابق تھی۔ انہوں نے اسکندریہ کی بہت شہرت سنی تھی اور کئی بار انہیں اسکندریہ جانے کا خیال آیا تھا۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ آج کیا واقعہ ہوا ہے اور یہ شخص انہیں کیا صلہ دے رہا ہے۔

اپنے ساتھیوں کی اس جماعت کے وہ سربراہ تھے۔ ساتھی انہیں روک نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس عیسائی کی پیشکش قبول کر لیں اور اُس کے ساتھ چلے جائیں۔ عمرو بن عاص نے اپنی پسند اور مرضی کا ایک ساتھی اپنے ساتھ تیار کر لیا اور اگلے روز وہاں گئے جہاں شمس ٹھہرا ہوا تھا۔ اسے بتایا کہ وہ اس کے ساتھ اسکندریہ جائیں گے۔ انہوں نے روانگی کا دن اور وقت طے کر لیا۔

اُس دور میں نہرویز نہیں ہوا کرتی تھی اس لئے خشکی سے بھی مصر جایا جاسکتا تھا اور اسکندریہ تک جانے کے لئے بحری راستہ بھی تھا۔ یہ بتانا ممکن نہیں کہ یہ لوگ خشکی کے راستے گئے یا سمندر کے راستے، تاریخ نے اتنا ہی لکھا ہے کہ عمرو بن عاص اپنے ایک ساتھی کے ساتھ شمس کی ہمراہی میں اسکندریہ پہنچ گئے۔ بیت المقدس سے اسکندریہ کا فاصلہ پانچ سو کلومیٹر ہے۔

عمرو بن عاص نے جب اسکندریہ شہر کی شان و شوکت اور حُسن و جمال دیکھا تو وہ حیران رہ گئے۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ انہوں نے بے ساختہ کہا — ”شمس! میں نے ایسا شہر اور اتنی دولت کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی جس کی ریل پیل یہاں دیکھ رہا ہوں۔“

مؤرخوں نے ایک واقعہ لکھا ہے جو دلچسپ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ واقعہ یوں ہے کہ ان ہی دنوں اسکندریہ میں ایک جشن منایا جا رہا تھا۔ تاریخ میں یہ پتہ نہیں ملتا کہ یہ کیا جشن تھا جس میں صرف شہر کے لوگ ہی شامل نہیں تھے بلکہ شاہی خاندان بھی اس

میں شامل تھا اور امراء و وزراء اور حاکم بھی اس میں شریک تھے۔ شہسواری، تیراندازی، تیغ زنی اور کشتیوں کے مقابلے بھی ہو رہے تھے۔ لوگوں نے بڑے ہی قیمتی کپڑے پہن رکھے تھے۔

شمس عمرو بن عاص کو بھی اس جشن میں لے گیا۔ شمس نے عمرو بن عاص کے لئے ریشمی لباس تیار کروا کے انہیں پہنایا تھا۔ عمرو بن عاص نے دیکھا کہ شاہی افراد اور حکام بالا میں شمس کو خصوصی پذیرائی حاصل تھی۔ اُس روز اس جشن کی ایک خاص تقریب منائی جا رہی تھی۔

لوگ ایک دائرے میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ شاہی افراد کے لئے آگے بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی گئی تھی۔ لوگوں کے جھوم کے درمیان جو جگہ خالی تھی وہاں ایک آدمی کھڑا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں ایک سنہری گیند تھی۔ وہ بار بار گیند کو پوری طاقت سے اوپر کو پھینکتا تھا اور گیند اوپر بھاگ کر زمین پر گر جاتی تھی۔

شمس نے عمرو بن عاص کو بتایا کہ جب کبھی یہ جشن منایا جاتا ہے، اس میں یہ تقریب ضرور منعقد ہوتی ہے۔ ایک آدمی آنکھیں بند کر کے گیند اوپر پھینکتا ہے اور ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ گیند جس شخص کے ایک بازو پر گرے وہ شخص بادشاہ بنے بغیر مر نہیں سکتا۔ عمرو بن عاص نے دیکھا کہ گیند زیادہ تر زمین پر گر جاتی تھی اور اگر کسی آدمی پر گری تو اُس کے بازو پر نہ گری، سر پر یا کندھے یا پیٹھ پر گری۔ شمس چونکہ صاحب حیثیت اور رتبے والا آدمی تھا اس لئے اسے آگے بیٹھنے کو جگہ ملی اور وہ عمرو بن عاص کو بھی آگے لے گیا۔

گیند پھینکنے والے نے ایک بار پھر گیند اوپر کو پھینکی تو گیند عمرو کے دائیں بازو پر آ پڑی اور عمرو نے گیند کو وہیں پکڑ لیا۔ شاہی خاندان کے افراد اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ اس شخص کو اچھی طرح دیکھنا چاہتے تھے جس کے بازو پر گیند گری تھی۔

شمس نے اٹھ کر اعلان کیا کہ اس شخص کا نام عمرو بن عاص ہے اور یہ مکہ سے یہاں آیا ہے۔ تماشائیوں میں کئی لوگ قہقہہ لگا کر ہنسنے اور کسی کی بڑی بلند آواز آئی — ”یہ سب غلط ہے۔ عرب کا یہ بدو ہمارا بادشاہ نہیں ہو سکتا۔“

جھوم میں سے کئی آوازیں اٹھیں — ”نہیں..... ہرگز نہیں..... یہ چھوٹا سا بدو مصر کا بادشاہ کیسے ہو سکتا ہے!“

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ عمرو بن عاص عرب کے عام لوگوں کی طرح دراز قد نہیں تھے۔ ان کا قد چھوٹا، سر بڑا، ہاتھ اور پاؤں کچھ زیادہ ہی بڑے تھے۔ ان کی بھوین کھنی تھیں، منہ بھی کچھ زیادہ چوڑا تھا، دائرہ لمبی رکھتے تھے، سینہ تو خاص طور پر چوڑا تھا۔ یہ کسی دلکش آدمی کی تصویر نہیں بنتی لیکن ان کی سیاہ چمیلی آنکھوں میں اور چہرے پر بشاشت اور زندہ دلی کا تاثر رہتا تھا۔ غصے والی بات پر بھی انہیں غصہ نہیں آتا تھا۔ ان کا یہ جسم دیکھ کر اسکندر یہ والوں نے ان کا مذاق اڑایا اور کہا کہ یہ شخص ان کا بادشاہ نہیں ہو سکتا۔

اللہ کے بعید کوئی نہیں پاسکتا۔ کوئی بھی نہ سمجھ سکا، خود عمرو بن عاص بھی نہ سمجھ سکے کہ یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ایک اشارہ ہے جو کچھ ہی عرصہ بعد عملی شکل میں سامنے آ جائے گا اور آج جو لوگ اور شاہی خاندان کے جو افراد اس عربی بدو کا مذاق اڑا رہے ہیں، یہ انقلاب بھی دیکھیں گے کہ یہی عربی بدو مصر کے بادشاہوں کا تختہ الٹ دے گا اور فاتح مصر کہلائے گا اور ان ہی لوگوں پر اس کا حکم چلے گا۔

گیند کی رسم ادا ہو چکی تھی اور گیند نے ان کے عقیدے کے مطابق فیصلہ دے دیا تھا لیکن تماشائیوں کا جھوم اور خصوصاً ”شاہی خاندان کے افراد اور حکام اس فیصلے کو منظور نہیں کر رہے تھے۔ اس رسم کا یہ مطلب نہیں تھا کہ جس پر گیند گری ہو اُسے اُسی وقت بادشاہ بنا دیا جاتا تھا بلکہ مطلب یہ تھا کہ وہ آنے والے وقت میں بادشاہ بن سکتا ہے لیکن جھوم نے ہنگامہ بپا کر رکھا تھا۔

شمس نے عمرو بن عاص کا بازو پکڑا اور انہیں وہاں سے اٹھا کر اپنے ساتھ لے آیا اور گھر لے گیا۔ دو تین دن اور انہیں اسکندر یہ کی سیر کروائی اور پھر بوقت رخصت دو ہزار دینار پیش کئے جو عمرو بن عاص نے کچھ پس و پیش کے بعد لے لئے۔ شمس نے عمرو بن عاص اور ان کے ساتھی کے ساتھ اپنا ایک آدمی روانہ کیا اور اسے کہا کہ انہیں بیت المقدس چھوڑ کر واپس آجائے۔

ابن عبد الحکم لکھتا ہے کہ عمرو بن عاص مصر سے تو آئے لیکن مصر اور اسکندر یہ ان کے ذہن پر ایسا سوار ہوا کہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ وہ مصر میں ہی جا کر آباد ہونا چاہتے ہیں۔

چونکہ یہ باب اس داستان کا تعارفی باب ہے اس لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عمرو بن عاص کی شخصیت اور جنگی فہم و فراست کی ایک دو جھلکیاں دیکھ لی جائیں۔۔۔۔۔ یہ تو بیان ہو چکا کہ عمرو بن عاص نے اسلام کس طرح قبول کیا تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر کس طرح اعتماد کیا اور انہیں جنگی امور میں اعلیٰ رتبہ دیا تھا۔ ہم آپ کو اس داستان کے اُس دور میں تھوڑی سی دیر کے لئے لے جاتے ہیں جب ابو عبیدہؓ خالد بن ولیدؓ شرجیل بن حسنہ اور عمرو بن عاص نے شام سے رومیوں کے پاؤں اکھاڑ دیئے تھے اور رومی پسپائی کی کیفیت میں داخل ہو چکے تھے۔

ہم کسی معرکے کو تفصیل سے بیان نہیں کریں گے ورنہ اصل داستان دھری رہ جائے گی۔ رومیوں کا مشہور جرنیل تو ہرقل تھا لیکن ان کا ایک انتہائی چالاک، عیار اور مکار جرنیل اطربون تھا۔ اُس کی عسکری فہم و فراست اور میدان جنگ میں نظروں کی گہرائی کا تو کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ وہ ہرقل کا ہم پلہ اور ہم رتبہ تھا لیکن اس کے مقابلے میں طفل کتب لگتا تھا۔ تاریخ حیرت کا اظہار کرتی ہے کہ مسلمان سپہ سالاروں نے اطربون کو کس طرح شکست دے دی تھی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انتقال فرما چکے تھے۔ خلیفہ اول ابو بکر صدیقؓ بھی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اور اب خلیفہ المسلمین حضرت عمرؓ بن خطاب تھے۔ عمرؓ عمرو بن عاص کے جو ہر دیکھ چکے تھے اور ان کی خوبیوں سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے۔ عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ خالد بن ولید خطرے مول لے لیا کرتے ہیں اور شجاعت میں دوسروں کو حیران کر دیتے ہیں لیکن عمرو بن عاص سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے ہیں اور آگ میں بھی کود جاتے ہیں۔ جنگی مبصروں نے لکھا ہے کہ عمرو بن عاص دشمن کو دھوکہ دینے کی پالیسی پر عمل کیا کرتے تھے اور ان میں شجاعت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ دُوبدو معرکوں میں دشمن تو ان کے سامنے کبھی ٹھہر ہی نہیں سکتا تھا اور انہوں نے ایسی مثالیں پیش کر کے دکھائی تھیں۔

رومی فوجیں شام سے پسپا ہوئیں اور فلسطین میں مختلف مقامات پر پھیلا دی گئیں۔ یہ رومیوں کی ایک چال تھی جو انہوں نے مسلمانوں کی قلیل تعداد دیکھ کر چلی تھی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کا لشکر کسی ایک مقام پر حملہ کرے گا تو یہ تمام بکھری ہوئی فوج اس طرح اکٹھی کر لی جائے گی کہ مسلمانوں کے اس تھوڑے سے لشکر کو ہر طرف سے

گھیر لیا جائے گا۔

عمرو بن عاص کے ذمے بیت المقدس کی فتح لگا دی گئی۔ ان کے مقابل رومیوں کا انتہائی چالاک جرنیل اطربون تھا۔ وہ اُس وقت اپنی فوج اجنادین کے مقام پر لے جا رہا تھا۔ عمرو بن عاص نے اپنے لشکر کی نفری اور جسمانی کیفیت دیکھی تو امیر المومنین حضرت عمرؓ کی طرف پیغام بھیجا کہ مکہ بھیج دیں کیونکہ مقابلہ اطربون سے ہے۔

حضرت عمرؓ نے پیغام ملتے ہی اچھی خاصی نفری کی مکہ بھیج دی اور (تاریخ میں آیا ہے) حضرت عمرؓ نے ایک بڑا دلچسپ جملہ کہا۔ انہوں نے فرمایا — ”ہم نے عرب کے اطربون کو روم کے اطربون سے ٹکرا دیا ہے۔ اب دیکھتے ہیں اس کا نتیجہ کیا سامنے آتا ہے۔“

حضرت عمرؓ اچھی طرح جانتے تھے کہ اطربون جنگی کیفیت میں لومڑی جیسی چالاک اور عیاری کو ایسی خوبی سے استعمال کرتا ہے کہ اپنے دشمن کو چکر دے کر بھگا دیتا ہے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ کچھ ایسے ہی اوصاف عمرو بن عاص میں بھی تھے۔

○

امیر المومنینؓ کی بھیجی ہوئی مکہ فلسطین عمرو بن عاص کے پاس پہنچ گئی۔ عمرو بن عاص نے یوں نہ کیا کہ ساری مکہ اپنے پاس رکھ لیتے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اپنا لشکر تین چار حصوں میں بٹ گیا تھا اور مکہ کی زیادہ ضرورت تھی۔ انہوں نے دو مقامات پر آدمی مکہ بھیج دی اور کچھ اپنے ساتھ رکھی لیکن جب آگے بڑھے تو دیکھا کہ اطربون نے اپنی فوج قلعہ بند کر لی ہے اور چاروں طرف گہری خندق کھود رکھی ہے۔ عمرو بن عاص نے دیکھ لیا کہ محاصرہ کیا تو برا ہی لمبا ہو جائے گا اور خندق کی وجہ سے یہ قلعہ سر کرنا اگر ناممکن نہیں تو بہت ہی دشوار ضرور ہو گا۔ طریقہ ایک ہی ہے کہ اطربون کو دھوکے میں لایا جائے۔

انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ دو اپنی اطربون کی طرف بھیجے جن کے لئے ہدایت یہ تھی کہ وہ اطربون کے ساتھ صلح کے معاہدے کی بات چیت کریں جو وہ یقیناً نہیں مانے گا لیکن اصل مقصد یہ ہے کہ قلعے کے اندر اچھی طرح دیکھیں کہ یہ قلعہ کس طرح سر کیا جاسکتا ہے اور رومیوں کی فوج کی نفری کتنی ہے وغیرہ وغیرہ۔ عمرو بن عاص کا مقصد صلح نہیں تھا بلکہ جاسوسی تھا۔

دونوں اپنی گئے اور بات چیت کر کے واپس آ گئے۔ عمرو بن عاص نے جب ان سے اپنے ذہن کے مطابق پوچھنا شروع کیا کہ انہوں نے کیا فلاں چیز دیکھی تھی؟ یہ بات کی تھی؟ اطربوں کے اس سوال کا کیا جواب دیا تھا اور تم لوگ دیکھ کر کیا آئے ہو؟ عمرو بن عاص نے دیکھا کہ یہ دو اپنی نکتے ثابت ہوئے ہیں اور وہ اطربوں سے مرعوب ہو کر آئے ہیں اور انہوں نے جاسوسی پوری طرح کی ہی نہیں۔

عمرو بن عاص نے اپنے ماتحت سالاروں سے کہا کہ وہ خود اپنی بن کے جانیں گے اور یہ ظاہر ہوئے ہی نہ دیں گے کہ مسلمانوں کے اس لشکر کے سپہ سالار وہی ہیں اور ان کا نام عمرو بن عاص ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اطربوں کو ذرا سا بھی شک ہو گیا تو وہ پکڑ کر قتل کروادے گا یا کال کوٹھڑی میں پھینک دے گا۔

عمرو بن عاص نے ہمیں بدلا، اپنے سالاروں سے رائے لی اور ان کی رائے کے مطابق اپنے ہر وہم میں کچھ تبدیلیاں کیں اور اللہ کا نام لے کر چل پڑے۔

قلعے کے دروازے پر جا کر انہوں نے بتایا کہ مسلمانوں کے سپہ سالار نے انہیں اپنی کے طور پر بھیجا ہے اور اطربوں سے بات چیت کرنی ہے۔ اطربوں کو اطلاع ملی تو اس نے انہیں فوراً بلا لیا۔ عمرو بن عاص اطربوں کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور ایسی اداکاری کی جیسے وہ صرف اپنی ہیں اور اپنے لشکر میں ان کا کوئی ایسا اونچا رتبہ اور عمدہ نہیں۔ اطربوں نے انہیں اتنی ہی تعظیم دی جتنی ایک اپنی کو دی جایا کرتی تھی۔

صلح کے مذاکرات شروع ہوئے۔ عمرو بن عاص نے یہ تو سن رکھا تھا کہ اطربوں بہت ہی چالاک آدمی ہے لیکن انہیں یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ کس حد تک چالاک ہے اور اس کی نظریں کتنی گہرائی تک پہنچ جایا کرتی ہیں۔ عمرو بن عاص آخر سپہ سالار تھے اور اپنے قبیلے میں بھی انہیں برتری حاصل تھی اور یہ برتری ان کی شخصیت کا بنیادی جزو تھا۔ انسان شعوری طور پر تو بہت کچھ کر سکتا ہے لیکن لاشعور پر پردہ ڈالنا ممکن نہیں ہوتا۔ شاید باتیں کرتے کرتے عمرو بن عاص کے منہ سے کچھ ایسی بات نکل گئی ہوگی یا انہوں نے لب و لہجے میں کوئی ایسا تاثر پیدا کر دیا ہو گا کہ اطربوں چونکا۔

”میری نظروں نے مجھے کبھی دھوکہ نہیں دیا“ — اطربوں نے مسکراتے ہوئے کہا — ”میرا خیال ہے کہ میں کسی اپنی سے نہیں بلکہ عرب کے سپہ سالار کے ساتھ بات کر رہا ہوں.... کیا تم عمرو بن عاص نہیں ہو؟“

”نہیں!“ — عمرو بن عاص نے جواب دیا — ”اگر میں عمرو بن عاص ہوتا تو اپنے اوپر جھوٹا پردہ ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہمارے سپہ سالار عمرو بن عاص اتنے بڑے اور بے خوف انسان ہیں کہ انہوں نے کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں۔“

تاریخ میں لکھا ہے کہ اطربوں ہنس پڑا جیسے وہ عمرو بن عاص کی بات مان گیا ہو اور انہیں اپنی ہی سمجھ رہا ہو۔ جنگ کے بعد جنگی قیدیوں سے پتہ چلا تھا کہ اطربوں نے عمرو بن عاص کو صحیح پہچانا تھا اور انہیں دھوکہ یہ دیا تھا کہ اسے غلطی لگی ہے اور واقعی اپنی ہے۔

عمرو بن عاص اس کے جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور سوچنے لگے کہ یہاں سے کس طرح نکلا جائے۔ انہیں شک اس طرح ہوا کہ مذاکرات کے دوران اطربوں کسی بہانے باہر نکلا اور جلدی واپس آ گیا اور مذاکرات شروع کر دیئے۔ اس کی اس حرکت سے عمرو بن عاص کو پکا شک ہو گیا کہ ان کی خیر نہیں۔ بعد میں جو اصل بات کھلی تھی وہ یہ تھی کہ اطربوں نے باہر جا کر اپنے ایک محافظ سے کہا تھا کہ وہ فلاں جگہ جا کر انتظار کرے اور یہ عربی جو اندر بیٹھا ہے، واپس جا رہا ہو تو پیچھے سے اس کی گردن پر ایسا وار کرے کہ سر تن سے جدا ہو جائے۔ وہ محافظ اس جگہ چلا گیا تھا جو اس کام کے لئے موزوں تھی۔

عمرو بن عاص نے ایک طریقہ سوچ لیا۔ انہوں نے مذاکرات کا رنگ ہی بدل ڈالا اور یوں ظاہر کرنے لگے جیسے وہ رومیوں کی طاقت سے ڈرتے ہوں اور ان کی شرائط مان لیں گے۔ اس روایت کا اطربوں پر خاطر خواہ اثر ہوا۔

”اب میں آپ کو اپنی اصل حیثیت بتاتا ہوں“ — عمرو بن عاص نے کہا — ”میں سپہ سالار عمرو بن عاص کا بھیجا ہوا اپنی نہیں ہوں بلکہ ہم اپنے امیر المومنین حضرت عمرو بن خطاب کے بھیجے ہوئے دس شیر ہیں اور ہمیں آپ کے ساتھ صلح کی بات چیت کے لئے بھیجا گیا ہے اور ہمارے لئے حکم یہ ہے کہ قابل قبول شرائط مان لیں۔ ہم مدینہ سے سیدھے آپ تک پہنچے ہیں۔ عمرو بن عاص کا ان مذاکرات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ میں نے آپ کی شرائط سن لی ہیں۔ میرے باقی نو ساتھی قلعے سے کچھ دور میرے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں ان سب کو یہاں لے آؤں گا اور آپ چاہیں تو میں جا کر انہیں بتاؤں گا کہ یہ بات ہوئی ہے اور پھر ہم یہیں فیصلہ کر کے آپ کو بتا دیں گے۔ مجھے یہی توقع ہے کہ میرے ساتھی آپ کی شرائط مان لیں گے۔“

”یہ تو اور زیادہ اچھا ہے“ — اطربون نے کہا — ”بہتر ہے تم انہیں یہیں لے آؤ۔“

اطربون پھر کسی کام کے ہمانے باہر نکلا اور ایک محافظ کو یہ حکم دیا کہ فلاں محافظ فلاں جگہ کھڑا ہوگا، اُسے کہہ دو کہ تمہیں جو پہلے کام بتایا تھا وہ اب نہیں کرنا اور واپس آ جاؤ۔ عمرو بن عاص وہاں سے اٹھے اور بخیر و بخوبی قلعے سے نکل آئے پھر پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ اطربون شام تک انتظار کرتا رہا۔

”یہ عربی سپہ سالار مجھے دھوکہ دے کر زندہ نکل گیا ہے“ — اطربون نے کہا — ”میں نے اس سے بڑھ کر عیار آدمی کبھی نہیں دیکھا۔“

اس کے بعد میدان میں بڑی ہی خونریز لڑائی ہوئی جس میں دونوں طرف کا بے پناہ جانی نقصان ہوا اور اطربون اپنی بچی بچی فوج کو ساتھ لے کر بیت المقدس چلا گیا اور وہاں فوج کو قلعہ بند کر لیا۔ عمرو بن عاص اور ایک دو اور سالاروں نے بیت المقدس کو محاصرے میں لے لیا۔

ایک روز عمرو بن عاص کو اطلاع دی گئی کہ اطربون کا ایلچی کوئی پیغام لایا ہے۔ انہوں نے ایلچی کو فوراً بلا لیا اور پیغام لے کر پڑھا۔ اطربون نے لکھا تھا:

”تم میرے دوست ہو اور تمہاری قوم نے تمہیں وہی رتبہ دیا ہے جو میری قوم نے مجھے دے رکھا ہے۔ میں تمہیں کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ تم نے اگر اجنادین ہم سے لے لیا ہے تو اس خوش فہمی میں مبتلا نہ رہنا کہ تم فلسطین کا کوئی اور حصہ فتح کر لو گے۔ تم فلسطین میں اب کوئی اور کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ تمہارے لئے بہتر یہ ہے کہ یہیں سے واپس چلے جاؤ اور اپنے آپ کو تباہی سے بچالو۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تمہارا انجام اُن ہی جیسا ہو گا جو بیت المقدس کو فتح کرنے آئے تھے اور پھر زندہ واپس نہ جاسکے۔“

عمرو بن عاص نے اطربون کے ایلچی کے ہاتھ اس کے پیغام کا جواب بھیج دیا۔ انہوں نے جواب میں لکھا:

”میں فلسطین کا فاتح ہوں۔ میں تمہیں دوستانہ مشورہ دیتا ہوں کہ اپنے مشیروں کے ساتھ تبادلۂ خیالات کر لو۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں تباہی سے بچانے کے لئے کوئی دانشمندانہ مشورہ دے سکیں۔“

اجنادین اور بیت المقدس کی فتح ایک الگ داستان ہے، یہاں ایک دلچسپ بات سامنے آتی ہے جو تاریخ کے دامن میں محفوظ ہے.... مورخ طبری نے لکھا ہے کہ اطربون نے عمرو بن عاص کا پیغام پڑھا۔ اُن کے یہ الفاظ پڑھ کر وہ ہنس پڑا کہ میں فلسطین کا فاتح ہوں۔

ابھی بیت المقدس فتح نہیں ہوا تھا۔ اطربون نے عمرو بن عاص کا یہ پیغام اپنے مصاحبوں اور مشیروں کو پڑھ کر سنایا اور کہا کہ عمرو بن عاص بیت المقدس کا فاتح نہیں ہو سکتا۔ اُس نے ایسے لہجے میں یہ بات کہی کہ سننے والوں کو یہ خیال آیا کہ بیت المقدس ضرور فتح ہو گا لیکن فاتح عمرو بن عاص نہیں ہوں گے۔ ان میں سے کسی نے اطربون سے پوچھا کہ اس نے ایسی بات کیوں کہی ہے۔

”بیت المقدس کے فاتح کا نام عمر ہے“ — اطربون نے یہ عجیب بات کہی — ”توریت میں لکھا ہے کہ بیت المقدس کے فاتح کے نام میں صرف تین حروف ہوں گے۔... یہ تین حروف عمر ہو سکتے ہیں۔ پھر توریت میں عمر کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں جن میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ توریت میں صاف لکھا ہے کہ بیت المقدس مسلمانوں کے قبضے میں چلا جائے گا۔“

طبری لکھتا ہے کہ اطربون نے یہ بات حتم و یقین کے لہجے میں کہی اور اس کی اس مجلس پر سناٹا طاری ہو گیا۔ بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ اطربون بغیر لڑے بیت المقدس سے اپنی فوج نکال کر مصر کو بھاگ گیا۔

○

بات جب فتح مصر پر آتی ہے تو لامحالہ یہ سوال اٹھتا ہے کہ اُس وقت مصر میں حکومت کس کی تھی، اور جب تاریخ یہ جواب دیتی ہے کہ اُس وقت رومی مصر پر قابض تھے اور حکمران ہرقل تھا تو یاد آتا ہے کہ ہرقل تو ملک شام میں تھا اور یہ سارا خطہ اُس کی حکمرانی میں تھا پھر ہرقل مصر کس طرح پہنچ گیا؟

شام سے ہرقل اپنی مرضی سے مصر نہیں گیا تھا، اسے مسلمانوں نے شام سے بھگایا تھا۔ اُس وقت دنیا میں دو ہی جنگی طاقتیں تھیں۔ ایک آتش پرست ایرانی اور دوسرے رومی۔ بہت مدت پہلے رومیوں نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ یہ دونوں طاقتیں مشرق وسطیٰ میں ایک دوسری سے برسرِ پیکار رہتی تھیں۔ کبھی ایرانی شام اور مصر پر

جاتے اور کبھی رومی انہیں شکست دے کر ان سے یہ علاقے چھین لیا کرتے تھے۔

ان دونوں طاقتوں کے کبھی تصور میں بھی نہیں آیا تھا کہ اُفق سے ایک تیسری طاقت بھی ابھرے گی جو ان دونوں طاقتوں کو ریزہ ریزہ کر کے بکھیر دے گی۔ عربوں سے تو یہ لوگ کوئی ایسی توقع رکھتے ہی نہیں تھے۔ عربوں کو وہ جاہل اور پسماندہ بدو کہا کرتے تھے لیکن اسی عرب کے ایک غاری تاریکی سے اللہ کا نور پھوٹا جس کی کرنیں بڑی تیزی سے پھیلتی چلی گئیں اور لوگوں کے دل و دماغ کو منور کرتی گئیں۔

اس غار کو غارِ حرا کہتے ہیں۔ یہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہوئی تھی اور آپ کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے رسالت عطا فرمائی تھی۔

یہاں سے تیسری جنگی طاقت ابھرنے لگی لیکن ایک فرق کے ساتھ.... اس تیسری طاقت کو صرف جنگی ہتھیاروں پر بھروسہ نہیں تھا بلکہ یہ طاقت ایک عظیم نظریے سے لیس تھی اور اس نظریے میں اللہ کی طاقت شامل تھی۔ ایرانیوں اور رومیوں کو اپنے بے انداز گھوڑوں اور تیر و تفنگ پر ناز تھا لیکن جب ان کے بڑے بڑے لشکر مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے لشکروں کے مقابلے میں آئے تو ان کے لئے میدان میں ٹھہرنا محال ہو گیا۔ یہ ایک نظریے کا اور عقیدے کا کرشمہ تھا جسے آج تک اللہ کا دین کہا جاتا ہے۔

تاریخ آج بھی حیران ہے کہ جن رومیوں نے ایرانیوں جیسی طاقت کو پے در پے شکست دی تھیں وہ مٹھی بھر مسلمانوں کے ہاتھوں کس طرح پٹ گئے اور بچے بھی ایسے کہ مسلمانوں نے انہیں شام سے بے دخل ہی کر ڈالا اور ان کی فوجوں نے مصر میں جا دم لیا۔

تاریخ حیرت کا اظہار بھی کرتی ہے اور اس سوال کا جواب بھی تاریخ کے دامن میں موجود ہے۔ ایک ایک لمحے کی داستانِ مُسلم اور غیر مُسلم مورخوں نے قلبند کر کے تاریخ کے حوالے کر دی تھی اور وہ آج بھی دنیا کے سامنے موجود ہے۔ یہ تفصیلات جنگی نوعیت کی ہیں۔ مورخوں نے مسلمانوں کی جنگی اہلیت، جذبے اور فنِ حرب و ضرب کے معجزہ نما کارنامے لکھے ہیں۔ انہوں نے مسلمان سپہ سالاروں کی جنگی چالوں پر، قیادت پر اور لشکروں میں ڈسپلن قائم رکھنے پر خراجِ تحسین پیش کیا ہے لیکن ایک پہلو ایسا ہے جو مورخوں نے نظر انداز کیا ہے یا وہ اس سے واقف ہی نہیں تھے۔ اس کی صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

○

جب مسلمان ابو عبیدہؓ، خالد بن ولید اور عمرو بن عاص کی قیادت میں رومیوں سے برسرِ بیار تھے اور ہر میدان سے رومیوں کے پاؤں اکھڑتے جا رہے تھے اُس وقت اُس علاقے کا ایک بڑا قلعہ بند شہر بہت شہرت یافتہ تھا۔ یہ تھا فہنسرین۔ اس کی دفاعی پوزیشن بڑی ہی مضبوط تھی۔ یہ ایک الگ داستان ہے کہ حضرت خالد بن ولید نے فہنسرین کو کس طرح فتح کیا تھا۔ یہاں بات ایک شخصیت کی سامنے آتی ہے جس کے حوالے سے ہم اسلام کی بنیادی تعلیمات اور عظمت واضح کریں گے۔

اس علاقے میں ایک شخص جبلہ بن الہم غسانی تھوڑے سے علاقے کا بادشاہ بنا ہوا تھا۔ یہ اس کا اپنا قبیلہ تھا جو بنو غسان کے نام سے مشہور تھا۔ وہ رومیوں کا دوست تھا اور جبلہ بن الہم رومیوں کے شانہ بشانہ لڑنے کے سوا انہیں ہر طرح کی مدد دیتا تھا۔ جبلہ بے پناہ دولت اور خزانوں کا مالک تھا اور موقع پرست بھی تھا۔ وہ رومیوں کا تو دوست تھا لیکن مسلمانوں کو وہ اس طرح دشمن نہیں سمجھتا تھا جس طرح رومی سمجھتے تھے۔

جبلہ بڑے ہی صاف ستھرے ذوق و شوق کا مالک تھا۔ اسے عرب کے شاعروں کے ساتھ دلی محبت تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر حضرت حسان بن ثابت انصاری تو اُسے سب سے زیادہ عزیز تھے اور ان کے کلام پر وہ وجد میں آ جالما کرتا تھا۔ اس کے باوجود وہ رومیوں کا حلیف تھا جو اس کی مجبوری تھی کیونکہ اس کی چھوٹی سی سلطنت رومیوں میں گھری ہوئی تھی۔

ہر قل جب مسلمانوں سے شکست کھا کر بھاگا تو جبلہ بن الہم نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ اسلام قبول کر لے۔ اس علاقے میں مجاہدین کے جو لشکر لڑ رہے تھے ان کے سپہ سالار ابو عبیدہؓ تھے۔ جبلہ بن الہم نے ان کی طرف اپنا لپچی اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ وہ اپنے تمام تر قبیلے غسان کے ساتھ اسلام قبول کرنا چاہتا ہے۔

ابو عبیدہؓ کی نگاہ میں یہ ایک بڑی فتح تھی۔ انہوں نے اپنے اُن دو تین آدمیوں کو جبلہ کے پاس بھیجا جو غیر مسلموں کو حلقہِ بغوش اسلام کرنے کے طریقے سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہ آدمی وہاں گئے اور جبلہ اپنے پورے قبیلے کے ساتھ مسلمان ہو گیا۔ ابو عبیدہؓ نے یہ اطلاع امیر المومنین حضرت عمرؓ بن خطاب کو بھیجی۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ اس اطلاع پر اتنے خوش ہوئے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جبلہ کو سرزمین عرب کی یاد ستارہی تھی۔ وہ اپنے محبوب شاعروں کے وطن کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں اپنا ایک ایلچی اس درخواست کے ساتھ بھیجا کہ وہ ان کے حضور حاضری دینا چاہتا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ فریضہ حج بھی ادا کرے۔

حضرت عمرؓ نے اسے اجازت دے دی۔ امیر المومنین جانتے تھے کہ جبلہ بن الہم کس پائے کا آدمی ہے اور وہ حج کر کے پکا مسلمان بن جائے گا۔ اس کا پورا قبیلہ مسلمان ہو کر مسلمانوں کا ایک بازو بن گیا تھا۔

○

ایک روز امیر المومنین حضرت عمرؓ کو اطلاع دی گئی کہ جبلہ بن الہم غسانی آ رہا ہے۔ یہ مدینہ کا واقعہ ہے۔ مدینہ شہر میں تو ہنگامہ برپا ہو گیا۔ جبلہ بن الہم اپنے چند ایک مصاحبوں کے ساتھ نہیں آ رہا تھا بلکہ اس کے ساتھ پانچ سو افراد تھے جن میں اکثریت اس کے شاہی خاندان کی تھی اور باقی قبیلہ غسان کے سرکردہ افراد تھے اور ان سب کی عورتیں بھی ساتھ تھیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ مدینہ کے لوگ باہر نکل کر جبلہ اور اس کے ہمراہیوں کا استقبال کریں اور اسے پوری تعظیم دیں۔ لوگ پہلے ہی گھروں سے نکل آئے تھے اور عورتیں منڈیروں پر کھڑی ہو کر اس قافلہ کو دیکھنے لگیں۔

جبلہ نے اپنے دو سو سواروں کو خصوصی لباس پہننے کو کہا۔ اس مقصد کے لئے یہ قافلہ مدینے سے کچھ دور رک گیا۔ ان سواروں نے جب لباس پہنا تو دیکھنے والے حیران رہ گئے کیونکہ یہ بڑے ہی قیمتی ریشم کا لباس تھا۔ ہر سوار اپنی اپنی جگہ بادشاہ اور شہزادہ لگتا تھا۔ ان کے گھوڑوں کے گلوں میں سونے اور چاندی کے ہار ڈالے ہوئے تھے۔ گھوڑوں پر رنگا رنگ ریشمی چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ جبلہ نے اپنے سر پر تاج رکھ لیا۔ اس کا اپنا لباس تو انتہائی قیمتی تھا۔ وہ آخر بادشاہ تھا خواہ اس کی بادشاہی محدود سے علاقے میں تھی۔

یہ قافلہ جب شہر میں داخل ہوا تو شہر کے لوگوں پر ستانا سا طاری ہو گیا۔ بعض نے حیرت سے انگلیاں دانتوں تلے دبائیں۔ انہوں نے اتنے قیمتی لباس کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ اس لئے بھی حیران ہو رہے تھے کہ یہ لوگ مسلمان ہو گئے ہیں پھر بھی انہوں نے اپنے شاہانہ انداز نہیں چھوڑے۔

حضرت عمرؓ جبلہ کے استقبال کے لئے باہر نہ آئے۔ جبلہ ان کے ملاقات کے کمرے

میں داخل ہوا۔ تب امیر المومنین نے اٹھ کر اسے گلے لگایا اور جس طرح خود فرش پر بیٹھا کرتے تھے اسی طرح اسے اپنے پہلو میں بٹھالیا اور اسے مبارکباد دی کہ اس نے اللہ کا چادرین قبول کر لیا ہے اور اب کوئی طاقت اسے شکست نہیں دے سکتی۔

جبلہ اپنے ان پانچ سو ہمراہیوں کے لئے نہایت خوبصورت اور قیمتی خیمے ساتھ لایا تھا۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے اسے ایک نہایت اچھی جگہ دے دی جہاں اس کے آدمیوں نے ترتیب سے خیمے گاڑ لئے اور وہاں ایک الگ تھلگ بستی آباد ہو گئی۔ یہ بستی شہر سے کچھ دور تھی۔

روزِ حج قریب آ رہا تھا۔ ایک روز امیر المومنین حضرت عمرؓ بن خطاب نے اسے ساتھ لیا اور حج کے لئے مکہ کو روانہ ہو گئے۔ اُس وقت مکہ سلطنت اسلامیہ میں شامل ہو چکا تھا۔ اب صلح حدیبیہ کی پابندیاں ختم ہو گئی تھیں..... جبلہ حج کے لئے چلا تو اس کے ساتھ چند ایک ہی اپنے آدمی تھے باقی سب کو وہ مدینہ چھوڑ گیا۔

فریضہ حج ادا کرنے کے لئے جبلہ نے جو احرام باندھا تھا وہ اس کے ٹخنوں سے نیچے چلا گیا تھا۔ خانہ کعبہ کے طواف کے دوران پیچھے آنے والے ایک آدمی کا پاؤں اس کے احرام پر جا پڑا اور احرام کھل گیا۔ جبلہ آخر بادشاہ تھا۔ اس نے اُس شخص کی اس حرکت کو اپنی توہین سمجھا اور پیچھے مڑ کر اس آدمی کی ناک پر بڑی زور سے مٹکا مارا۔ اس آدمی کی ناک سے خون بننے لگا۔

اُس وقت حضرت عمرؓ اس کے ساتھ نہیں تھے۔ انہیں بعد میں اطلاع ملی کہ جبلہ نے یہ حرکت کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس آدمی کو بلایا اور اس آدمی نے بھی شکایت کی کہ جبلہ نے اس کی ناک پر مٹکا مارا ہے جس سے اس کی ناک سے خون بننے لگا تھا اور وہ طواف مکمل نہیں کر سکا تھا۔

اس شکایت کے بعد حضرت عمرؓ کی حیثیت بالکل ہی بدل گئی۔ وہ اب جبلہ کے میزبان نہ رہے بلکہ وہ خلیفۃ المسلمین بن گئے اور اس کے ساتھ ہی ان پر قاضی کے فرائض بھی آ پڑے۔ انہوں نے حبلہ بن الہم کو طلب کیا۔ جبلہ فوراً پہنچا۔ اس کا انداز شاہانہ تھا اور وہ حضرت عمرؓ کے پہلو میں بیٹھنے لگا۔ خلیفہ یہ اعزاز کسی بڑے ہی اہم مہمان کو دیا کرتے تھے کہ اسے اپنے ساتھ بٹھاتے۔ جبلہ کو بھی انہوں نے یہی مقام دیا تھا لیکن اب صورت حال کا تقاضہ کچھ اور تھا۔

”تم یہاں سے اٹھو اور وہاں سامنے بیٹھو“ — حضرت عمرؓ نے جہلہ کو اپنے پہلو سے اٹھاتے ہوئے کہا — ”تم اب میرے مہمان نہیں ملزم ہو“ —
 جہلہ بادل نخواستہ اٹھا اور وہاں جا بیٹھا جہاں حضرت عمرؓ نے بیٹھنے کو کہا۔ اُس کے چہرے پر غصے کا تاثر آگیا اور کچھ حیرت بھی۔
 ”جہلہ بن اسمٰ“ — حضرت عمرؓ نے پوچھا — ”کیا تم نے اس شخص کی ناک پر مٹکا مارا ہے؟“

”ہاں!“ — جہلہ نے نڈر ہو کر جواب دیا — ”میں نے اس کی ناک پر مٹکا مارا ہے کیونکہ اس نے میرے احرام پر پاؤں رکھ دیا تھا۔“
 ”اس شخص کا بیان ہے کہ بھیڑ کی وجہ سے اس کا پاؤں تمہارے احرام پر آگیا تھا“ — حضرت عمرؓ نے کہا — ”اور طواف کے دوران ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس نے دانستہ تمہارے احرام پر پاؤں رکھ دیا تھا تو یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ حق کس نے دیا کہ اسے تم نے سزا دی؟ تم نے یہ معلوم کرنے کی زحمت کیوں گوارہ نہ کی کہ اس شخص سے پوچھ لیتے کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی ہے؟“

”میں تو میں نے اسے ایک مٹکا مارا ہے“ — جہلہ نے کہا — ”اگر یہ میرے ہاں ہو تا تو میں اسے ایسی سزا دیتا جو دوسروں کے لئے باعث عبرت ہوتی۔“
 ”وہاں تمہارا اپنا قانون چلتا ہو گا“ — حضرت عمرؓ نے کہا — ”تم نے اسلام قبول کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اسلام کے عدل و انصاف کے اصول بھی قبول کر لئے ہیں۔ اسلام کے قانون کے مطابق تمہیں اس کی سزا بھیگنی ہو گی۔“

”میں نے آپ کو امیر المومنین تسلیم کر لیا ہے“ — جہلہ نے ناگواری کے لہجے میں کہا — ”لیکن میں حیران ہوں کہ آپ کیسے امیر المومنین ہیں کہ چھوٹے بڑے کے فرق کو بھی نہیں پہچانتے۔ میں اپنے خطے کا بادشاہ ہوں اور یہ ایک معمولی سا آدمی ہے۔ کیا یہ میری توہین نہیں کہ آپ نے مجھے ایک معمولی آدمی کے ساتھ بٹھا دیا ہے اور میرے ساتھ ایک ملزم جیسا سلوک ہو رہا ہے۔“

”اسلام نے تم دونوں کی حیثیت ایک کر دی ہے“ — حضرت عمرؓ نے کہا — ”صرف زہد اور تقویٰ ہے جو کسی کو کسی پر فضیلت دے سکتا ہے۔ چھوٹے بڑے کے لئے دولت اور بادشاہی کا پیمانہ اسلام میں نہیں چل سکتا۔ اللہ نے سب کو ایک جیسا پیدا

کیا ہے.... تمہارا ایک جرم یہ ہے کہ تم نے خانہ کعبہ میں بدتمیزی کی اور دوسرا جرم یہ کہ ایک آدمی کو مٹکا مار کر اس کا خون بہایا جس کی وجہ سے وہ طواف مکمل نہ کر سکا۔“
 ”معلوم ہوتا ہے میں غلط جگہ آگیا ہوں“ — جہلہ نے کہا — ”میں تو سمجھا تھا کہ مسلمان کوئی امیر کبیر لوگ نہیں بلکہ ان میں اکثریت غریبوں کی ہے اس لئے مجھے یہاں زیادہ احترام ملے گا۔“

”اگر احترام چاہتے ہو تو ایک طریقہ ہے“ — حضرت عمرؓ نے کہا — ”اس شخص سے معافی مانگ لو، اگر یہ تمہیں معاف کر دیتا ہے تو میں تمہیں کوئی سزا نہیں دوں گا۔“
 ”تو کیا اس سے بہتر نہ ہو گا کہ میں عیسائی مذہب میں چلا جاؤں؟“ — جہلہ نے کہا — ”عیسائیوں میں تو میرے ساتھ ایسا سلوک کبھی نہ ہو۔“

”میں تمہیں اسلام کا یہ قانون بھی بتا دیتا ہوں“ — حضرت عمرؓ نے کہا — ”کہ اگر تم سزا سے بچنے کے لئے عیسائیت میں چلے جاؤ گے تو میں تمہارے قتل کا حکم دے دوں گا۔“

”یہ بھی سوچ لیں امیر المومنین!“ — جہلہ نے کسی حد تک رعوت سے کہا — ”اگر آپ میرے ساتھ یہ سلوک روا رکھیں گے تو میری اور میرے اتنے بڑے قبیلے کی دوستی سے محروم ہو جائیں گے۔ میرا قبیلہ اتنا دولت مند ہے کہ زر و جواہرات میں کھیلتا ہے۔ پھر میرا قبیلہ ایک طاقت ہے۔ کیا آپ اپنا اتنا زیادہ نقصان پسند کریں گے؟“

”ہم صرف اسلام کا نقصان برداشت نہیں کر سکتے“ — حضرت عمرؓ نے کہا — ”ہم اپنا مال و متاع اپنے بچے اور اپنی جائیں اسلام پر قربان کرنے والے لوگ ہیں۔ ہمیں اگر کسی کی دوستی کی ضرورت ہے تو وہ صرف اللہ تبارک و تعالیٰ ہے.... میں اس معاملے کو اور زیادہ طول نہیں دوں گا۔ اس شخص سے معافی مانگو۔ اگر یہ تمہیں معاف کرتا ہے تو تمہارے لئے کوئی سزا نہیں ورنہ تمہیں سزا لینا پڑے گی۔“

جہلہ گہری سوچ میں کھو گیا۔
 ”امیر المومنین!“ — آخر اُس نے سراٹھا کر کہا — ”مجھے صرف آج رات کی مہلت دے دیں۔ میں صبح ہوتے ہی بتا دوں گا کہ میں اس شخص سے معافی مانگوں گا یا سزا بھگتوں گا۔“

حضرت عمرؓ نے اسے سوچنے کی مہلت دے دی اور اسے یہ اجازت بھی دے دی کہ

وہ اپنی قیام گاہ میں چلا جائے اور کل صبح پھر پیش ہو جائے۔

یہ معاملہ اتنا مشہور ہو گیا کہ جب جبلہ باہر نکلا تو حاجیوں کا ایک ہجوم باہر کھڑا تھا۔ یہ سارا ہجوم انصاف کا مطالبہ کر رہا تھا۔ آخر ہجوم کو بتایا گیا کہ فیصلہ کل ہو گا۔

اگلے روز کی صبح طلوع ہوئی تو جبلہ نہ آیا۔ اسے نماز پڑھتے بھی نہ دیکھا گیا۔ سورج طلوع ہوا اور پھر اوپر آنے لگا۔ تب امیر المومنین نے حکم دیا کہ جبلہ کو پکڑ کر لایا جائے۔ کچھ آدمی دوڑے گئے تو دیکھا کہ جبلہ وہاں نہیں تھا۔ خیمے لگے ہوئے تھے لیکن خالی تھے۔ جبلہ اور اس کے ساتھیوں کے گھوڑے غائب تھے۔ جبلہ بھاگ گیا تھا۔

اس کے پانچ سو رشتہ دار اور دیگر افراد مدینہ میں موجود تھے۔ اُس کا تعاقب بیکار تھا کیونکہ ایک رات سے زیادہ وقت گزر گیا تھا اور جبلہ یقیناً ”بست دور“ نکل گیا تھا۔ وہ اپنے ان چند ایک ساتھیوں کے ساتھ مدینہ پہنچا اور اپنے تمام ساتھیوں کو بڑی عجلت سے تیار کروایا اور مدینہ سے بھاگ گیا۔ مدینہ والوں کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ جبلہ کیوں واپس جا رہا ہے اور امیر المومنین مکہ میں کیوں رہ گئے ہیں۔

اُس وقت ہر قل رومی قسطنطنیہ میں تھا۔ جبلہ اس کے پاس گیا اور اس سے معافی مانگی کہ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا اور یہ واقعہ ہو گیا اس لئے وہ وہاں سے بھاگ آیا ہے۔ ہر قل بہت خوش ہوا کہ اتنا طاقتور قبیلہ پھر اس کا حلیف بن گیا ہے۔ ہر قل نے اسے کچھ اور جاگیر دے دی۔

یہ تھی اسلام کی وہ قوت جس نے آتش پرست ایرانیوں اور رومیوں کو شکست دی تھی۔

○

اب ہم ہر قل کی طرف آتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ تاریخ کیا بتاتی ہے کہ وہ شام سے کس طرح بھاگا تھا۔ اسے اپنی طاقت پر اس قدر ناز تھا کہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کی بادشاہی کو کبھی زوال نہیں آئے گا اور روم کی سلطنت وسیع ہوتی چلی جائے گی لیکن مسلمانوں نے اس کے لئے ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی کہ وہ پیچھے ہٹا ہوا، حس شر میں پہنچتا وہاں مسلمان پہنچ جاتے اور اس شہر کو محاصرے میں لے لیتے تھے۔ آخر وہ انطاکیہ کے قلعہ بند شہر میں جا پہنچا لیکن ابو عبیدہؓ نے اسے وہاں بھی کھنسنے نہ دیا۔ آخر وہ چھوٹے سے ایک شہر براء میں جا پناہ گزین ہوا۔ ابلغرڈ بٹلر لکھتا ہے کہ اسے توقع تھی کہ

اپنی بکھری ہوئی فوج کو وہاں یکجا کر لے گا اور مسلمانوں کا جم کر مقابلہ کرے گا، ہو سکتا ہے وہ مسلمانوں کو شکست دے دے لیکن وہ جدھر بھی پیغام بھیجتا تھا اور ہر سے کوئی جواب آتا ہی نہیں تھا اور اگر جواب آتا بھی تھا تو وہ مایوس کن ہوتا تھا۔ اسلام کے عظیم سپہ سالاروں نے رومیوں کی بکھری ہوئی فوج کے مطابق اپنی فوج کو بھی تقسیم کر دیا تھا اور رومیوں کے لئے ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ اپنی فوج کو کسی ایک مقام پر یکجا کر لیتے۔

ہر قل نے رباع میں قیام کیا۔ اس کا شاہی خاندان اس کے ساتھ تھا۔ دو جوان بیٹیاں تھیں اور بیویوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ وہ بیویاں تو برائے نام تھیں، سب داشتائیں تھیں۔ اس کے علاوہ تمام تر شاہانہ لوازمات اس کے ساتھ تھے۔ اس حالت میں بھی وہ فرعون جیسا بادشاہ تھا۔

اُس نے دربار منعقد کیا جیسا وہ کیا کرتا تھا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ اُس نے بڑے ہی قابل جو تشریف اور نجومی اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ مسلمان اپنے اللہ پر یقین رکھتے تھے اور اسی کی خوشنودی کی خاطر لڑتے اور جانیں قربان کرتے تھے لیکن ہر قل اگلا قدم اٹھانے سے پہلے جو تشریف اور نجومیوں سے پوچھتا تھا کہ اسے یہ قدم اٹھانا چاہئے یا نہیں اور اگر اٹھانا ضروری ہے تو اس کے لئے کون سا دن اور کون سا وقت موزوں ہو گا۔

اُس نے دربار منعقد کیا اور حکم دیا کہ اس کے نجومی کو حاضر کیا جائے.... نجومی پیغام ملتے ہی دوڑا آیا اور ہر قل کے سامنے جا کر آداب بجالایا۔ وہ خوش ہو رہا ہو گا کہ ہر قل اس سے پوچھے گا کہ اب ستاروں کا حساب بتا کہ میں کہاں جاؤں لیکن ہر قل کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

”اب بتاے ستاروں کے بھیدی!“ — ہر قل نے شاہانہ عتاب کے لہجے میں پوچھا — ”تیرے ستارے کیا کہتے ہیں؟....“ تو نے ہر بار مجھے بتایا کہ اب میں یوں کروں تو ایسا ہو جائے گا اور مسلمان اندھے ہو کر بھاگ جائیں گے۔ اپنی پیش گوئیوں کو یاد کر اور بتا کہ مجھے یہ کیوں نہ بتایا کہ میری قسمت میں در بدر چھپتے پھرنا لکھ دیا گیا ہے اور میرے لئے کوئی پناہ نہیں.... مجھے فوراً“ جواب دے۔“

نجومی نے علم نجوم کی اصطلاحوں میں بات کی اور پوری کوشش کرنے لگا کہ ہر قل کو قائل کر لے کہ غلط پیش گوئیوں کا قصور وار نجومی نہیں بلکہ ستارے ہیں جو خفاکی و سعتوں میں گردش کر رہے ہیں۔

”مجھے تمہاری ایک بھی بات سمجھ نہیں آرہی“ — ہرقل نے کہا — ”تو نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ میری قسمت میں اپنی ہی سلطنت میں در بدر چھپتے پھرتا اور پناہیں ڈھونڈنا لکھ دیا گیا ہے؟ یہ حقیقت مجھ پر اب کھلی ہے کہ جس طرح میں بھٹکتا پھر رہا ہوں اسی طرح یہ ستارے افلاک کی وسعتوں میں بھٹک رہے ہیں اور دوسری حقیقت یہ کہ تو مجھے دھوکے دے دے کر اور مجھے خوش فہمیوں میں مبتلا کر کے دولت بنوڑا رہا ہے۔“
نجوی کو کوئی بات سوجھ نہیں رہی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ہرقل اٹھا اور آہستہ آہستہ نجوی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ سارے دربار پر ستانا طاری ہو گیا۔ سب جانتے تھے کہ ہرقل ویسے ہی اٹھ کر نجوی تک نہیں گیا۔

ہرقل ایک بڑا ہی خوبصورت خنجر جس کے دستے میں ہیرے جڑے ہوئے تھے اس طرح اپنی کمر کے ساتھ لٹکائے رکھتا تھا جس طرح عورتیں زیور پہنتی ہیں۔ بجلی کی تیزی سے ہرقل کا ہاتھ خنجر کے دستے پر گیا، خنجر نیام سے باہر آیا اور دوسرے لمبے نجوی کے پیٹ میں اتر اٹھا۔ نجوی پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ایک دو قدم پیچھے ہٹا اور اس کا جسم ڈولنے لگا پھر وہ گر پڑا۔ ہرقل نے خنجر ایک طرف پھینکا جو ایک آدمی نے پکڑ لیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ خنجر صاف کر کے اسے واپس دے دیا جائے۔

ہرقل اپنے تخت پر جا بیٹھا۔ باہر سے کچھ آدمی دوڑے آئے اور وہ مرے ہوئے نجوی کو اٹھا کر لے گئے۔

”شاہ مردین کو لے آؤ“ — ہرقل نے حکم دیا — ”آج میں ان دونوں کی قسمت کا فیصلہ کرنا چاہتا ہوں جو مجھے میری قسمت کا جھوٹا عکس دکھایا کرتے تھے۔“

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ہرقل کی عمر کے ہی ایک آدمی کو اس کے دربار میں لایا گیا۔ سب درباری اسے دیکھ رہے تھے اور سب کی نظروں میں اس کے لئے رحم تھا۔ وہ یقیناً ”سوچ رہے تھے کہ اس شخص کو اگر بتایا جائے کہ اس کی زندگی دو تین منٹ ہی رہ گئی ہے تو اس پر کیسی بے رحم کیفیت طاری ہو جائے گی۔ صرف ہرقل تھا جس کی نظروں میں اور جس کے دل میں اس وقت کوئی رحم نہیں تھا۔ ایک درباری نے اس کا خنجر صاف کر کے اس کے حوالے کر دیا۔ ہرقل نے خنجر نیام میں ڈال لیا۔ شاہ مردین نام کا یہ شخص جو اس کے سامنے کھڑا تھا، شاہی جو تھی تھا۔ ہرقل ہر جنگ اور ہر ہتشدی سے پہلے اس شخص سے زانچہ بنوایا کرتا تھا۔

”اے میری قسمت کے زانچے بنانے والے!“ — ہرقل نے شاہ مردین سے پوچھا — ”کیا تو جانتا سکتا ہے تیری قسمت میں کیا لکھا ہے؟“

”وہی جو میں نے چاہا تھا“ — شاہ مردین نے جواب دیا — ”آج جب مجھے موت کی دہلیز پر کھڑا کر دیا گیا ہے تو میں مرنے سے پہلے سچ بولنا چاہتا ہوں۔ اے روم کے طاقتور بادشاہ! جب بھی تو نے مجھے زانچہ بنانے کے لئے کہا تو میں نے زانچے میں وہی کچھ لکھا جو تو چاہتا تھا۔ میں نے تجھے خوش فہمی میں مبتلا رکھا اور یہی مرثوہ سنا رہا کہ تو انسان نہیں دیوتا ہے اور تیرے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔“

”مطلب یہ کہ تو مجھے دھوکہ دیتا رہا اور انعام و اکرام وصول کرتا رہا۔“ — ہرقل نے کہا — ”تیرے زانچوں کے عوض تجھے شاہی رتبہ دینے رکھا اور تجھ پر دولت لٹاتا رہا۔ تو اسی دولت اور رتبے کی خاطر مجھے دھوکے دیتا رہا۔“

”دولت کی خاطر نہیں!“ — شاہ مردین نے کہا — ”انتقام کی خاطر.... میں نے تجھ سے انتقام لیا ہے۔ تجھے اُس مقام تک پہنچا دیا ہے جہاں سے اب تو واپس ملک شام میں حکومت کرنے کے لئے نہیں جاسکتا۔“

”انتقام!“ — ہرقل نے حیرت کے لہجے میں پوچھا — ”انتقام کیسا؟ میں نے تیرا کیا نقصان کیا تھا؟“

”ہاں.... انتقام!“ — شاہ مردین نے بڑی دلیری سے کہا — ”اب سن میں نے تیرے اس گناہ کا انتقام لیا ہے۔ ستائیس اٹھائیس برس پہلے کا ایک دن یاد کر.... تجھے وہ دن یاد نہیں آئے گا کیونکہ تیری اس شاہانہ زندگی کا ایک ایک دن ایسا ہی گزرا ہے۔ تو کچھ دور جنگل میں شکار کھیلنے گیا تھا۔ مصاحبوں اور ملازموں کا ایک ہجوم تیرے ساتھ تھا۔ میں اپنی چھوٹی اور نوجوان بہن کے ساتھ اس جنگل سے گزر رہا تھا۔ میری وہ بہن بہت ہی خوبصورت تھی اور مجھے اس کے ساتھ اتنا زیادہ پیار تھا جتنا اپنے مذہب کے ساتھ بھی نہیں تھا۔ تیرے دو محافظوں نے میری بہن کو دیکھ لیا اور اسے پکڑ لیا۔ میں نے اُسے بچانے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھے مارا پیٹا اور کہا کہ بادشاہ ہرقل کے لئے اس قسم کی ایک خوبصورت لڑکی چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ ہرقل تین چار دن جنگل میں قیام کرے گا اور اسے اس لڑکی کی ضرورت ہے۔ وہ میری روتی چیختی بہن کو تیرے پاس لے گئے۔ میں تیرے پاس آنا چاہتا تھا لیکن مجھے کوئی آگے نہیں جانے دیتا تھا....

شاہ مردین کو حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔

○

”اے ہرقل!“ — شاہ مردین کہہ رہا تھا — ”اپنے آپ کو طاقت کا دیوتا سمجھنا چھوڑ دے اور یہ بھی دل سے نکال دے کہ رعایا کی بہنیں اور بیٹیاں تیری ملکیت ہیں اور سب تیرے حکم کے غلام ہیں۔ تجھے اپنے گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ میں نے تجھ سے اس طرح اپنی بہن کی بے عزتی اور موت کا انتقام لیا کہ بڑے ہی دلکش اور طلسماتی زانچے تیار کر کر کے تجھے دکھاتا رہا اور دوسرا کلام یہ کیا کہ اس نجوی کو جسے تو نے ابھی ابھی قتل کیا ہے، میں نے اپنے ساتھ ملا لیا اور مجھے جو دولت تجھ سے ملتی تھی وہ میں آدمی اس نجوی کو دے دیتا تھا۔ اس کے عوض میں اس سے یہ کام کرواتا تھا کہ وہ تجھے کسی خطرے سے قبل از وقت خبردار نہ کرے بلکہ ایسی پیش گوئیاں تیرے کان میں ڈالتا رہے کہ تو آگے ہی آگے خطرے کی طرف بڑھتا ہی چلا جائے اور تباہی کی کھائی میں جا گرے۔ آج اپنا انجام دیکھ لے....

”میں جانتا ہوں آج کا دن میری زندگی کا آخری دن ہے۔ میں چاہتا ہوں کم از کم ایک صحیح اور سچی بات تیرے دماغ میں ڈال دوں، شاید اس سے تیرے دن پھر جائیں۔ بات دانشمندی کی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر انسان کی قسمت اُس کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ نجوی اور جو توشی لوگوں پر نشہ طاری کر دیا کرتے ہیں۔ یہ نشہ انسان کے دماغ کو اور جسم کو بھی بیکار کر دیتا ہے۔ کامیاب وہ ہوتا ہے جس نے اپنے پیدا کرنے والے پر اور اپنے آپ پر اعتماد اور بھروسہ کیا۔ زانچے اور پیش گوئیوں کے سارے چلنے والے اسی انجام کو پہنچا کرتے ہیں جس انجام کو تو پہنچ گیا ہے۔ دیکھ لے، عرب کے بدو اور گڈریئے ایک طاقت بن کر تجھے شکست پہ شکست دیئے چلے جا رہے ہیں اور تو پناہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہے....“

”اٹھ اور مجھے اپنے ہاتھوں قتل کر دے۔ میرے قتل سے پہلے میری ایک سچی پیش گوئی سن لے۔ میں نے زندگی میں پہلا زانچہ تیار کیا ہے جو ہر لحاظ سے صحیح اور سچا ہے۔ مرتے مرتے میں تیرے ساتھ ایک نیکی کرنا چاہتا ہوں۔ میرا زانچہ کہتا ہے کہ اب تو پھر کبھی شام میں نہیں جائے گا اور تیرا ٹھکانہ مصر ہے جہاں تیری قوم کی حکومت ہے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد عرب کے مسلمان تجھ پر آسمانی بجلی کی طرح گریں گے۔ اتنا خون

”میں وہیں رکا رہا اور جب تو اپنے خیمے سے شکار کے لئے نکلا تو میں دوڑتا ہوا تیرے قدموں میں جا کر اپنی پیاری بہن کی بھیک مانگی۔ تو نے مجھے پاؤں سے بڑے زور سے ٹھوکر ماری اور کہا کہ اسے اٹھا کر دور پھینک دو۔ تیرے آدمیوں نے مجھے مار مار کر بہت دُور جا چھوڑا۔ میں پھر بھی وہیں بیٹھا رہا۔ تین چار دن وہیں بھوکے پیاسے گزار دیئے اور جب تو شکار سے واپس چلا گیا تو میں اُس جگہ گیا جہاں تیرے خیمے لگے ہوئے تھے۔ وہاں میری بہن کی برہنہ لاش پڑی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ تو نے اور تیرے ہمراہیوں نے میری بہن کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے....

”میں نے اُسی وقت عہد کر لیا تھا کہ ہر قل سے انتقام لوں گا۔ میرا باپ علم نجوم اور علم جو توش کی سوجھ بوجھ رکھتا تھا اور وہ لوگوں سے پیسے لے کر زانچے بھی بتاتا تھا۔ اُس نے یہ فن مجھے بھی سکھادیا تھا لیکن میں نے اس میں دلچسپی نہ لی اور پھر میرا باپ اپنی بیٹی کا صدمہ دل میں لئے دنیا سے رخصت ہو گیا۔ میں ہر وقت اس سوچ میں گم رہنے لگا کہ تجھ سے انتقام کس طرح لوں....

”ایک طریقہ میرے دماغ میں آگیا۔ لوگ میرے باپ کی کرامات کی وجہ سے مجھے بھی عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ میں نے اپنے متعلق مشہور کر دیا کہ میں باپ کی گڈری پر بیٹھ گیا ہوں اور جو توش اور نجوم کا کام شروع کر دیا ہے۔ میں نے باپ والا علم تو نہ سیکھا اس کی بجائے کچھ فریب کاریاں اور شعبہ بازی سیکھ لی۔ میری شہرت پھیلنے لگی اور میں ضرورت محسوس نہیں کرنا کہ تجھے یہ بتاؤں کہ سات آٹھ برس بعد میں نے کس طرح تجھ تک رسائی حاصل کی اور تو نے مجھے اپنے محل میں رکھ لیا۔ میں نے انتقام لینا شروع کر دیا۔“

ہر قل بڑا ہی ظالم اور درندہ صفت حکمران اور جرنیل تھا۔ درباریوں کو توقع ہی تھی کہ ابھی ہر قل اٹھے گا اور شاہ مردین کو اسی طرح پیٹ میں خنجر گھونپ کر قتل کر دے گا جس طرح اس نے نجوی کو قتل کیا تھا لیکن مؤرخ لکھتے ہیں کہ عجیب بات ہوئی کہ ہر قل بت بن گیا تھا اور آنکھیں پھاڑے شاہ مردین کو دیکھے جا رہا تھا۔ غالباً اس لئے کہ اُس کے منہ پر کبھی کسی کو سچ بولنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ اس حالت میں جب کہ وہ شکست کھا کر بھاگا پھر رہا تھا، اُس کے اس دربار میں کینیرس اور دو تین شہزادیاں موجود تھیں اور منظر وہی بنا ہوا تھا جو اُس کے محل کے دربار میں بنا کرتا تھا۔ شہزادیاں اور کینیرس بھی

سے لاکھ دریائے نیل سرخ ہو جائے گا۔ پھر تیری رومی بادشاہی کا بوریہ بستر گول ہو جائے گا اور بحیرہ روم میں ڈوب جائے گا۔ مصر سلطنت اسلامیہ میں شامل ہو جائے گا اور ایسی سنسنی خیز کہانیاں جنم لیں گی جو تا قیامت تاریخ ساری دنیا کو سناتی رہے گی۔ تو چاہے تو مجھے ابھی قتل کر دے، چاہے تو مجھے قید خانے میں ڈال دے اور میری پیش گوئی غلط ثابت ہوئی تو مجھے قتل کر دیتا، یا صحیح ثابت ہوئی تو مسلمان مجھے رہا کر دیں گے۔“

شاہ مردین خاموش ہو گیا۔ پورے دربار پر خاموشی طاری ہو گئی۔ ہر قل بھی چپ چاپ بیٹھا رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں جتنے انسان تھے وہ پتھر کے بُت بن گئے ہیں۔ آخر ہر قل اٹھا۔

”شاہ مردین!“ — ہر قل نے اپنی شہانہ آواز میں کہا — ”میں نے کبھی کسی سے معافی نہیں مانگی۔ جاؤ، تم آزاد ہو۔“

شاہ مردین کچھ دیر ہر قل کے منہ کی طرف دیکھتا رہا جیسے اُسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔ ہر قل نے ایک بار پھر کہا — ”چلے جاؤ۔“ شاہ مردین کورٹش بجالایا اور اُلٹے قدم چلتا دربار سے نکل گیا۔

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے جیسے اُس وقت ہر قل کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا اور ذہنی طور پر وہ نارمل لگتا ہی نہیں تھا۔ اُس نے ایک اور عجیب حرکت کی۔ اپنے محافظ دستے کے کماندار کو بلایا اور اُس کے کان میں کچھ کہہ کر کماندار کو ڈرتا ہوا باہر نکل گیا۔ ہر قل نے مختلف حاکموں کو باری باری احکام دیئے شروع کر دیئے۔ اُس کے سامنے مسئلہ یہی ایک تھا کہ وہ رہا میں اپنی بکھری ہوئی فوج کو اکٹھا کر سکتا ہے یا نہیں مورخ لکھتے ہیں کہ شکست اُس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔

کچھ وقت گزر گیا تو محافظ دستے کا کماندار دربار میں داخل ہوا۔ ہر قل کے اشارے پر وہ باہر گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک قیدی تھا جس کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں اور ہاتھ زنجیر میں بندھے ہوئے تھے۔ وہ کوئی مسلمان تھا جو ان اور خورہ تھا۔ اُس کی تراشی ہوئی چھوٹی چھوٹی داڑھی اس کے چہرے پر پھب رہی تھی اور اُس کے مردانہ حُسن میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ قیدی تھا لیکن اس کے کپڑے صاف ستھرے تھے اور منہ سر دھلا دھلایا لگتا تھا۔ ہر قل کے حکم پر اُسے دربار کے وسط میں کھڑا کر دیا گیا۔

اُس وقت تک مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان جو جنگیں ہوئی تھیں، ان میں ہزار ہا رومی جنگی قیدی بنائے گئے تھے اور مسلمانوں نے انہیں پیچھے بھیج دیا تھا۔ کچھ مسلمان بھی جنگی قیدی ہوئے تھے جن کی تعداد بہت ہی تھوڑی تھی۔

ہر قل کے حکم سے دو یا تین مسلمان قیدیوں کو قید خانے میں رکھا گیا تھا اور باقی قیدیوں کے ساتھ اس قدر بُرا سلوک ہو رہا تھا کہ وہ بھوکے پیاسے مر رہے تھے۔ مسلمان قیدیوں کو انسان سمجھا ہی نہیں جاتا تھا۔ کوئی بھی نہ سمجھ سکا کہ ہر قل نے ان دو تین قیدیوں کو قید خانے میں کیوں رکھا ہے۔ اب ان میں سے ایک قیدی اس کے دربار میں لایا گیا۔ اس کے لباس سے اور حال چلنے سے پتہ چلتا تھا کہ ان کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا جاتا ہے، ان کی دیکھ بھال بھی ہوتی ہے اور انہیں کھانا بھی بہت اچھا دیا جاتا ہے۔

”تم جنگی قیدی ہو“ — ہر قل نے اس قیدی سے کہا — ”تم جانتے ہو گے کہ جنگی قیدیوں کے ساتھ یہاں کیا سلوک ہوتا ہے۔ آدھے سے زیادہ قیدی مر چکے ہیں اور باقی جو ہیں وہ بڈیوں کے ڈھانچے بن گئے ہیں لیکن تمہیں ہم نے اپنا معزز مہمان بنا کر رکھا ہے۔ قید خانے کی کوٹھڑی میں صرف اس لئے رکھا ہے کہ تم فرار نہ ہو جاؤ۔ میرے حکم سے تمہاری جو عزت کی گئی ہے اور تمہیں جو سولتیں دی گئی ہیں، اس کے عوض میں تم سے راز کی ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ تم مجھے یہ بات بتا دو گے۔ پھر میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔ تم نہیں بتاؤ گے تو اور قیدی میرے پاس ہیں، وہ بتا دیں گے اور تمہیں میں قتل کروا دوں گا۔ تم ایک ذمہ دار آدمی ہو۔ میں جانتا ہوں ایک جانباز گروہ کے کماندار ہو۔ تم جو بات جانتے ہو وہ کوئی اور نہیں بتا سکتا۔“

”تم بادشاہ ہو یا سپہ سالار، مجھ پر ان عہدوں اور رتبوں کا کچھ اثر نہیں ہو گا۔“ — مسلمان قیدی نے کہا — ”تمہارے جلاؤ کی تلوار میری گردن پر ہوگی تو بھی راز کی کوئی بات نہیں بتاؤں گا۔ ان خوبصورت اور دلکش کینزوں اور شہزادیوں میں سے ایک مجھے دے دو گے اور اس کے ساتھ خزانہ میرے قدموں میں ڈھیر کر دو گے تو راز کی بات میری زبان پر نہیں آئے گی۔ میں اپنے مجاہد ساتھیوں کے خلاف اور اپنی قوم کے خلاف غداری نہیں کروں گا۔ اگر ہم قتل سے ڈرنے والے ہوتے تو آج تم جیسے طاقتور بادشاہ ہم سے شکست نہ کھا سکتے۔ ہم نے اپنی جانیں اللہ کے سپرد کر رکھی ہیں۔ ہمارے جسم کٹ جاتے

ہیں تو ہماری روحیں لڑتی ہیں۔“

”میں تم سے کوئی فوجی راز نہیں پوچھ رہا۔“ ہرقل نے کہا۔ ”میں کوئی جنگی راز نہیں لینا چاہتا۔ تو میری فوج کے خلاف لڑا ہے اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم لوگوں نے ہم پر فتح پائی ہے۔ تو عقل والا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ مجھے صرف بتا دے کہ تیری فوج میں وہ کون سی خوبی ہے جو میری فوج میں نہیں اور میری فوج میں وہ کون سی خالی ہے کہ یہ اتنی زیادہ تعداد میں ہوتے ہوئے بھی تھوڑی سی نفری کی فوج سے شکست کھا گئی ہے۔ اس فوج نے تو ایرانیوں کی فوج کو کئی میدانوں سے بھگایا ہے، حالانکہ ایرانی بہت بڑی جنگی طاقت رکھتے تھے۔“

”ہاں، یہ راز تجھے دے سکتا ہوں۔“ مسلمان قیدی نے کہا۔ ”ہم متحد اور دیندار قوم ہیں۔ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں اور اس جسم میں دماغ صرف ایک ہے جس کا حکم سارا جسم مانتا ہے۔ اگر تو نے ہمیں کبھی نماز پڑھتے دیکھا ہو تو اسی سے سمجھ جائے گا کہ ہم اللہ کے حضور جھکتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں تو بھی ایک جسم کی مانند کرتے ہیں۔ ہم ایک امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ تو شاید نہیں جانتا کہ میدان جنگ میں ہمارا سپہ سالار امامت کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ پھر ہماری یہ خوبی ہے کہ ہم لوگ زندگی سے کم اور موت سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور تکبر و غرور کی بجائے ہم عجز و انکساری کو پسند کرتے ہیں۔ ہماری تنظیم ایسی ہی ہے جیسی تیری فوج میں ہے۔ سپہ سالار ہے، اس کے ماتحت سالار ہیں، ان کے ماتحت کماندار ہیں اور اس طرح چھوٹے چھوٹے عہدے بھی ہیں لیکن ہم جب اکٹھے بیٹھتے ہیں تو ہم میں کوئی حاکم اور کوئی محکوم نہیں ہوتا۔ اُس وقت ہمارے رُتبے ختم ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں کوئی بادشاہ نہیں اور کوئی رعایا نہیں۔ ہمیں کوئی قتل کی دھمکی دے یا دولت کا لالچ دے، ہم سب سے پہلے اللہ کی طرف دیکھتے ہیں اور اس کی ذات کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔۔۔۔

”تو نے اپنی فوج کی خامیاں پوچھی ہیں۔ تیری فوج کی سب سے بڑی خالی تیرا وجود ہے۔ اگر تو اپنے دماغ سے حکمرانی کا غرور نکال دے اور ذہنیت کے لحاظ سے اپنے آپ کو سپاہی سمجھنے لگے تو دیکھ تیری قوم اور تیری فوج میں وہی طاقت پیدا ہوتی ہے یا نہیں جو ہم میں ہے۔ ہم اللہ کی خوشنودی کے لئے لڑتے ہیں اور تیری فوج تیری خوشنودی کے لئے

لڑتی ہے۔ تو پیچھے ہٹ گیا تو تیری ساری فوج تیرے پیچھے ہو گئی۔ ہمارا اللہ پیچھے نہیں ہٹا کرتا۔ ہم اس کے نام پر بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ہم میں جو شہید ہو جاتے ہیں، ان کی جگہ اور مجاہدین آ جاتے ہیں۔ ہمارا سپاہی اگر میدان جنگ میں اکیلا رہ جائے گا تو وہ اپنا سالار خود بن جائے گا اور اپنے آپ کو یہ حکم کبھی نہیں دے گا کہ تم اکیلے ہو اس لئے بھاگ جاؤ۔“ یہ مسلمان قیدی اسی قسم کی باتیں کرتا رہا۔ ہرقل نے ان باتوں کے بعد اس سے پھر فوجی راز معلوم کرنے شروع کر دیئے اور یہ بھی پوچھا کہ تمہارے سپہ سالاروں کا اگلا پلان کیا ہے۔ اس قیدی نے ایسے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ابھی قید میں پڑے رہنا چاہتے ہو۔“ ہرقل نے کہا۔ ”جب تک میرے ان سوالوں کا جواب نہیں دو گے، قید میں ہی پڑے رہو گے اور تمہارے ساتھ وہی سلوک ہونے لگے گا جو ہم دشمن کے جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔“ ہرقل نے حکم دیا۔ ”اسے ابھی اسی کوٹھڑی میں رہنے دو۔ دو روز بعد اسے پھر پیش کرنا۔“

قیدی کو دربار سے لے گئے۔ اگلی صبح ہرقل کی ایک جوان سال شہزادی گھوڑے پر سوار قید خانے میں آئی۔ قید خانے کے حاکم کو پتہ چلا تو دوڑتا ہوا باہر نکلا اور شہزادی کے آگے بھج گیا۔ وہاں تو شاہی خاندان کے ہر فرد کا حکم چلتا تھا۔ یہ تو شہزادی تھی۔ شہزادیوں کا تو اور ہی زیادہ احترام کیا جاتا تھا۔ وہاں ایک نہیں کئی شہزادیاں تھیں۔ اس شہزادی نے اس مسلمان قیدی کا نام لیا اور کہا کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے جانے آئی ہے اور اسے ہرقل کے دربار میں پیش کرنا ہے۔

اگر کوئی اور قیدی ہوتا تو حاکم یہ ضرور سوچتا کہ ایک قیدی کو ہرقل کے دربار میں پیش کرنے کے لئے ایک شہزادی کیوں آئی ہے لیکن اس حاکم کو معلوم تھا کہ اس مسلمان قیدی کے ساتھ امتیازی سلوک ہو رہا ہے اور یہ برائے نام قیدی ہے۔ ایک روز پہلے اسے ہرقل کے دربار میں لے گئے تھے۔ حاکم نے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ شہزادی اس قیدی کو ساتھ لے جانے کیوں آئی ہے۔

حاکم اس شہزادی کے ساتھ ہو لیا اور چابیاں لے کر مسلمان قیدی کی کوٹھڑی تک پہنچا۔ کوٹھڑی کھول کر قیدی کو باہر نکالا اور شہزادی کے حوالے کر دیا۔

”یہ آج شہنشاہ ہرقل کا مہمان ہو گا۔“ شہزادی نے قید خانے کے حاکم سے کہا

— ”حکم ہے کہ اس کی بیڑیاں اور زنجیریں اتار دینی جائیں۔ اسی لئے شاہ ہرقل نے یہ حکم بھیجا ہے۔“

حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔ قیدی کی بیڑیاں اور زنجیریں اتار دی گئیں۔ شہزادی اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ خود گھوڑے پر سوار ہوئی اور قیدی سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ پیدل چلے۔

وہ کچھ دور تک اسی طرح چلتے گئے کہ شہزادی گھوڑے پر تھی اور قیدی اس کے ساتھ پیدل جا رہا تھا۔ کچھ اور آگے گئے تو شہزادی نے گھوڑا روک لیا۔ ”میرے پیچھے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ“ — شہزادی نے قیدی سے کہا — ”ایڑلگاؤ اور گھوڑے کو کھلا چھوڑ دو۔ آگے تمہیں الگ گھوڑا مل جائے گا۔ مجھ سے یہ نہ پوچھنا کہ میں تمہیں کہاں لے جا رہی ہوں۔“

قیدی بلا چون و چرا شہزادی کے پیچھے گھوڑے پر چڑھ بیٹھا اور ایڑلگا دی۔ اس سے آگے گھنا جنگل اور پہاڑی علاقہ تھا۔ شہر سے دور نکل گئے تو قیدی نے شہزادی سے پوچھا کہاں جانے کا ارادہ ہے۔

”تم میرے ساتھ نہیں جا رہے، میں تمہارے ساتھ جا رہی ہوں۔“ — شہزادی نے کہا — ”مجھے اپنی فوج میں لے چلو۔ میں واپس آنے کے لئے نہیں جا رہی۔ اسی لئے تمہیں قید خانے سے نکلوالائی ہوں۔“

قیدی نے لگام کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ گھوڑا چل پڑا۔ قیدی کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کا لشکر کہاں ہو گا اس لئے پکڑے جانے کا خطرہ ابھی سر پر موجود تھا۔ اُس نے گھوڑے کی رفتار ذرا تیز کر دی۔

دن کی صبح شہزادی مسلمان قیدی کو قید خانے سے رہا کروا کے لے گئی تھی، اُس جس دن کی شام ہونے کو آگئی۔ اس شہزادی کا نام شاریتا تھا۔ وہ کسی معمولی سے گھرانے کی لڑکی نہیں تھی کہ گھٹنے ڈیڑھ گھٹنے بعد ہی گھر والے پریشان ہونے لگتے کہ لڑکی گھر سے نکلی تھی اور ابھی تک نہیں آئی۔ وہ شہزادی تھی اور ماں کو معلوم تھا کہ وہ گھوڑے پر گئی ہے اس لئے کچھ وقت لگا کر ہی آئے گی لیکن پورا دن گزر گیا تھا۔ شاریتا وہاں اکیلی لڑکی تو نہیں تھی، وہ شاہی محل تھا جس میں اُس جیسی کئی لڑکیاں تھیں۔ ان میں کچھ دانشنامیں تھیں اور کچھ بیویاں۔ ایک لڑکی کا ذرا زیادہ وقت کے لئے ادھر ادھر ہو جانا کوئی پریشان کن واقعہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔

ماں نے دن کے دوران تو اپنی بیٹی کی غیر حاضری محسوس ہی نہ کی۔ محسوس نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اُن دنوں محل کے اندر کے ماحول میں بے تحاشا کھچاؤ پایا جاتا تھا۔ ہر قل بھاگا بھاگا پھر رہا تھا اور اُس کی افواج شکست خوردگی کے عالم میں بکھر گئی تھیں۔ ہر قل فرعون قسم کا بادشاہ تھا۔ اپنی شکست پر وہ غصے سے پاؤں ہلکا ہوا گیا تھا۔ اُس کی بیویاں اور دانشنامیں اور محل میں رہنے والے دوسرے لوگ چھپتے پھرتے تھے کہ ہر قل غصے میں آکر کسی کو ذرا سی بات پر قتل کر دے گا۔ کسی کے قتل کا حکم دے دینا اس طرح معمولی بات تھی جیسے بیکاری کوئی چیز اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دی جائے۔

شارینا کی ماں شام سے بہت پہلے ہی پریشان ہونے لگی تھی لیکن وہ ہر قل کو بتانے سے ڈرتی تھی کہ ہر قل پہلے ہی غصے کی حالت میں ہے لیکن جب سورج غروب ہونے کو آگیا تو وہ ہر قل کے اُس کمرے میں جا پہنچی جس میں ہر قل جاسوسوں سے رپورٹیں لیا

تھا۔ مسلمانوں نے اسے شام سے بے دخل کر دیا تھا۔ رُہاء میں تو اُس نے آکر پناہ لی تھی۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ اپنی بکھری ہوئی فوج کو یہاں اکٹھا کر لے گا اور مسلمانوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑے گا۔ ایک شہزادی کا کہیں غائب ہو جانا اُس کے لئے ذرا سی بھی پریشانی کا باعث نہیں بن سکتا تھا۔ شارینا کی ماں نے ہرقل کی باتیں سنیں اور اس کی ذہنی حالت دیکھی اور پھر اُس کا ایسا سرد رویہ دیکھا تو کچھ اور کئے بغیر وہاں سے نکل آئی۔

○

اُسے کسی نے بتایا تھا کہ اُس کی بیٹی کو قید خانے کی طرف جاتے دیکھا گیا تھا۔ ماں اس سوچ میں پڑ گئی کہ قید خانہ آبادی سے کچھ دور ہے اور اس کے ارد گرد تمام علاقہ ویران اور خنجر ہے۔ اُس طرف کوئی سیرگاہ نہیں نہ کوئی لور ایسی جگہ ہے جہاں شارینا گئی ہو۔ قید خانہ تو کوئی ایسی جگہ نہ تھی نہ دیکھنے کے لئے شارینا گئی ہو۔ اگر وہ قید خانے میں ہی گئی تھی تو شام تک اس کا وہاں رکنا محض بے معنی اور ناقابل یقین تھا۔

وہ آخر ماں تھی۔ اس کے ذہن میں وہم اور دوسو سے پیدا ہونے لگے۔ اُسے خیال آیا کہ شارینا قید خانے میں قیدیوں کو تفریحاً دیکھنے گئی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کسی خطرناک قیدی نے اسے مار ڈالا ہو اور قید خانے کے عملے نے اس کی لاش اندر ہی کہیں دبا دی ہو تاکہ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہو سکے۔

شارینا کی ماں ہرقل کی دوسری بیویوں کی طرح ایک بیوی تھی، ملکہ نہیں تھی نہ ہی ہرقل نے اپنی کسی بیوی کو ملکہ عالیہ کا درجہ دیا تھا۔ پھر بھی اس کی بیویاں حکم چلا سکتی تھیں اور شاہی اختیارات کا آزادانہ استعمال کرنے کی بھی انہیں اجازت تھی۔ شارینا کی ماں نے اپنے خاص ملازم کو قید خانے کی طرف دوڑایا کہ داروغہ کو ساتھ لے آئے۔

اُس نے سوچا یہ تھا کہ داروغہ معلوم کرے کہ شارینا قید خانے کے اندر گئی تھی اور اگر نہیں گئی تو کسی نے اسے قید خانے کے قریب سے گزرتے دیکھا ہو گا۔ ان سے ایسی توقع تھی ہی نہیں کہ سارا سراغ داروغہ سے ہی مل جائے گا۔

قید خانے کا داروغہ حکم ملتے ہی پہنچ گیا۔ شارینا کی ماں نے پریشانی کے عالم میں اس سے شارینا کے متعلق پوچھا کہ وہ قید خانے کے اندر گئی ہوگی، اسے قید خانے کے قریب سے گزرتے کسی نے دیکھا ہو گا.... داروغہ نے شارینا کی ماں کے منہ کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جن میں سوال بھی تھا اور حیرت بھی۔ شارینا کی ماں نے جب یہ کہا کہ

کر تا تھا اور اپنے فوجی افسروں اور دیگر حاکموں کو بلا کر ان سے کام کی باتیں کیا کرتا اور احکام دیا کرتا تھا۔ اپنی ایک بیوی کو اس کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو غصے سے اُس کا چہرہ دہکنے لگا۔ اُس وقت ہرقل اکیلا نہیں تھا، اس کے پاس کسی اور شہر سے آیا ہوا ایک قاصد بیٹھا ہوا تھا۔

”کیوں آئی ہو؟“ — ہرقل نے شاہانہ اور غصیلی آواز میں پوچھا — ”کیا تمہیں معلوم نہیں....“

”سب معلوم ہے“ — شارینا کی ماں نے ہرقل کی پوری بات سننے بغیر التجا کے لہجے میں کہا — ”آپ کی مصروفیت اور آپ کی پریشانی بڑی اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ آپ کی ہی نہیں، یہ ہم سب کی پریشانی ہے.... میں اس طرح کبھی نہ آئی لیکن ماں ہوں...“

”اصل بات بتاؤ کیا ہے!“ — ہرقل نے اس قدر گرج کر کہا جیسے کمرے کی چھت بھی کانپ اُٹھی ہو۔

”شارینا صبح گھوڑے پر نکلی تھی“ — شارینا کی ماں نے کہا — ”ابھی تک واپس نہیں آئی۔“

”تو کیا میں اُسے جا کر ڈھونڈوں؟“ — ہرقل نے بڑی تلخ طنز کی اور کچھ دیر شارینا کی ماں کے منہ کی طرف دیکھتا رہا، آخر بولا — ”اپنی اپنی اولاد پر تم سب خود ہی نظر کیوں نہیں رکھا کرتیں.... کیا محل کے ملازموں، محافظوں اور دیگر کارندوں نے تمہارا حکم ماننا چھوڑ دیا ہے؟ تمہیں میرے پاس آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔“

”آپ جانتے ہیں، یہ میری ایک ہی بیٹی ہے“ — شارینا کی ماں نے بھکاریوں کی طرح کہا — ”معلوم نہیں کہاں چلی گئی ہے۔ ملک کے حالات بھی تو ٹھیک نہیں۔“

”تم ایک بیٹی کو رو رہی ہو“ — ہرقل نے کہا — ”یہاں پورا ایک ملک اپنی سلطنت سے نکل گیا ہے اور تم ایک بیٹی کو ڈھونڈ رہی ہو۔“

ہرقل کی یہی ایک بیٹی یا دو چار بیٹیاں ہوتے تو وہ پریشان ہوتا کہ ایک بیٹی کہاں چلی گئی ہے۔ اسے تو یاد ہی نہیں ہو گا کہ اس کی کتنی باقاعدہ بیویاں ہیں اور داشتائیں کتنی ہیں۔ اُسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اُس کے کتنے بیٹے اور کتنی بیٹیاں ہیں۔ اُن دنوں تو اسے اور کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ پچھلے باب میں بیان ہو چکا ہے کہ ہرقل بھاگا بھاگا پھر رہا

شاربنا صبح کی گئی ہوئی ابھی تک واپس نہیں آئی تو داروغہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔
 ”ملکہ عالیہ!“ — ہرقل کی بیوی ہونے کی وجہ سے اس نے احتراماً ”ملکہ عالیہ“ کہنا ضروری سمجھا اور بولا — ”کل صبح شہنشاہ ہرقل نے ایک مسلمان قیدی کو طلب کیا تھا۔ آج صبح شہزادی قید خانے میں آئیں اور اُس مسلمان قیدی کو رہا کروا کے اسے اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ باہر شہزادی کا گھوڑا کھڑا تھا جس پر وہ سوار ہوئیں اور قیدی ساتھ ساتھ پیدل چل پڑا تھا۔“

شاربنا کی ماں اس مسلمان قیدی کے متعلق اچھی طرح جانتی تھی کہ اسے اور اس کے دو تین ساتھیوں کو مہمانوں کی طرح قید خانے میں کیوں رکھا ہوا ہے۔ اب اُسے پتہ چلا کہ اس کی بیٹی ایک قیدی کو چھڑوا کر لے گئی ہے تو اس نے ضرورت محسوس کی کہ اس کی اطلاع ہرقل کو ہونی چاہئے۔ یہ کوئی سازش ہو سکتی تھی۔ شاربنا کی ماں کو ڈر یہ تھا کہ ہرقل سے یہ بات چھپالی گئی اور کچھ دنوں بعد کسی اور ذریعے سے اسے پتہ چلا تو وہ اسے بھی اور داروغہ کو بھی قتل کروا دے گا۔ یہ سوچ کر اُس نے داروغہ کو ساتھ لیا اور پھر ہرقل کے کمرے میں جا پہنچی۔ اب تو ہرقل نے اسے ایسی قہر بھری نظروں سے دیکھا جیسے خود اٹھ کر اُس کے پیٹ میں خنجر گھونپ دے گا لیکن قید خانے کے داروغہ کو ساتھ دیکھ کر اسے شک ہوا کہ بات کچھ اور ہے اور کوئی خاص واقعہ ہو گیا ہے۔

شاربنا کی ماں نے اسے بتایا کہ شاربنا اُس مسلمان قیدی کو رہا کروا کے نہ جانے کہاں لے گئی ہے جس قیدی کو کل صبح دربار میں بلایا گیا تھا۔

ہرقل کی آنکھوں میں جو قہر اتر اٹھا وہ آنکھوں میں ہی گم ہو گیا اور ہرقل پر خاموشی طاری ہو گئی۔ کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ اس خاموشی میں سے کیسا ہولناک طوفان اٹھے گا۔ ہرقل کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی کہ ایک شہزادی ایک قیدی کو قید خانے سے نکلوا کر اس کے ساتھ چلی گئی ہے، اسے پریشانی اس سے لاحق ہوئی کہ یہ مسلمان قیدی ایک خاص اہمیت کا حامل تھا۔ وہ کوئی ادنیٰ سپاہی نہیں تھا، مسلمانوں کے لشکر میں اسے کوئی عہدہ حاصل تھا اور وہ اچھا خاصا عقلمند بھی تھا۔

”اور تم نے ایک شہزادی کے کہنے پر اسے رہا کر دیا“ — ہرقل نے داروغہ سے کہا — ”اُس کی بیڑیاں اور ہتھکڑی بھی اتار دی۔۔۔۔۔ یہ میری گرفتاری کی سازش ہو سکتی ہے اور میرے قتل کی بھی۔“

قید خانے کا داروغہ چپ چاپ کھڑا تھا۔ اُس نے ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا کہ اُس کی زندگی چند منٹ رہ گئی ہے۔ ہرقل کے ہاں سزائے موت سے کم کوئی سزا نہیں تھی۔ ”کیا تمہیں قتل نہ کروا دیا جائے؟“ — ہرقل بولا — ”اگر یوں شہزادی کی مدد سے فرار ہونے والا قیدی عیسائی ہو تا تو میرے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ فرار ہونے والا مسلمان تھا۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ ان مسلمانوں نے ہمیں کس انجام تک پہنچا دیا ہے؟ کیا تم صرف ایک وجہ بتا سکتے ہو جس کی بنا پر تمہارا یہ اقدام صحیح سمجھا جائے؟“

جس طرح جو تیشی نے اپنے آپ کو موت کے سامنے کھڑا دیکھ کر ہرقل کو ہچکچاتی اور کھری کھری باتیں سنا دی تھیں، ویسی ہی کیفیت قید خانے کے داروغہ پر طاری ہو گئی۔ اُسے یقین تھا کہ اب وہ زندہ باہر نہیں جاسکے گا۔
 ”شہشاہ روم!“ — داروغہ نے کہا — ”اگر میں شہزادی کا حکم نہ مانتا تو وہ مجھے قتل کروا دیتی۔ اُس کا حکم مانتا ہے تو آپ مجھے سزائے موت سنا رہے ہیں۔ مجھے آپ کی یہ سزا قبول ہے۔ قبول نہ ہوتی تو بھی آپ نے مجھے معاف نہیں کر دیتا تھا۔ میں نے روم کی شہنشاہی کا نمک کھایا ہے۔ مجھے یہ عہدہ اس شہنشاہی نے دیا تھا۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ مرنے سے پہلے آپ کا کھانا بھوکھ لال کر جاؤں۔ یہی ایک صلہ ہے جو میں آپ کے قدموں میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کوئی سونے اور چاندی کا خزانہ نہیں، چند ایک الفاظ ہیں جو آپ نے قبول کر لئے تو آپ کے لئے اور آپ کی سلطنت کے لئے بھی سودمند ہوں گے۔“

ہرقل اُسے چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔ اُس کی اس خاموشی کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ داروغہ کو معاف نہیں کرے گا۔ موت نے داروغہ پر خوف اور تأسف طاری کرنے کی بجائے اس میں جرأت پیدا کر دی۔

”میں زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا“ — داروغہ نے کہا — ”حکم مانتا ہوں لوگوں کا فرض ہے۔ میں حکم ایک فرد سے نہیں ملتا بلکہ شہنشاہ خاندان کے تمام افراد سے کئی طرح کے حکم ملتے ہیں اور ہم لوگ کسی کی بھی حکم عدولی کی جرأت نہیں کر سکتے۔ میں جانتا ہوں تین چار مسلمان قیدیوں کو آپ نے مہمانوں کے طور پر قید خانے میں رکھا ہوا ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کیوں ان کے ساتھ اتنا اچھا سلوک ہو رہا ہے۔ آپ ان سے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ان مسلمانوں نے اتنی قلیل تعداد میں ہوتے ہوئے روم

کی ایسی عظیم اور دہشت ناک جنگی طاقت کو کس طرح شکست دے دی ہے کہ رومی فوج بکھر کر پسا ہو رہی ہے اور کہیں بھی اس کے پاؤں جم نہیں رہے۔ شاید آپ ان خصوصی قیدیوں کو کسی اور مقصد کے لئے بھی استعمال کرنا چاہتے ہوں گے، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ میں نے اُن سے دوبارہ یہی بات پوچھی تھی۔ انہوں نے جو جواب دیا وہ میرے دل نے قبول کیا اور یہ میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں....

”انہوں نے کہا اسلام میں کوئی بادشاہ نہیں ہوتا نہ کوئی شاہی خاندان ہوتا ہے۔ بادشاہی صرف اللہ کی ہے اور مسلمان اُسی کا حکم مانتے اور اسی کے راستے پر چلتے ہیں۔ ان قیدیوں نے مجھے بتایا کہ وہ لڑتے بھی ہیں تو اللہ کو حاضر ناظر جان کر اور اُسی کی خوشنودی کی خاطر۔ دو یا تین مسلمان بھی کہیں اکٹھے ہو جائیں یا سفر پر نکلیں تو ایک کو اپنا امیر بنا لیتے ہیں اور پھر اُسی کے حکم پر چلتے ہیں۔ ان کا سالار لشکر کا امیر بھی ہوتا ہے اور امام بھی۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کرتے تھے۔ اب ان کا ایک خلیفہ ہے جس کا ہر حکم سر و چشم مانا جاتا ہے لیکن خلیفہ بھی مشورے کے بغیر کوئی حکم جاری نہیں کرتا۔ کسی خلیفہ کی، کسی امیر کی اور کسی سپہ سالار کی بیوی یا بیٹی یا بیٹا کوئی حکم نہیں دے سکتے۔ اگر وہ کوئی جرم کر بیٹھیں گے تو انہیں بھی ویسی ہی سزا ملے گی جیسی ایک عام اورادنی مرویا عورت کو دی جاتی ہے....

”شہنشاہ معظم! اب اپنے ہاں دیکھیں شاہی خاندان کے افراد کی تعداد دیکھیں۔ ہمارے لئے کوئی ایسا حکم نہیں کہ ہم ان میں سے کسی کا کوئی بھی حکم نہ مانیں۔ اگر میں ان میں سے کسی کا کوئی حکم نہیں مانوں گا تو وہ مجھے اسی قید خانے کی کال کوٹھری میں بند کر دے گا جس کا آج میں داروغہ ہوں.... یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ آپ نے شہزادی کے ساتھ نکل جانے والے قیدی کو ممان کی حیثیت سے رکھے کا حکم دیا تھا۔ اسے شہزادی شارینا اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آئی اور کہا کہ شاہ ہرقل نے اسے طلب کیا ہے تو میں اس حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا تھا۔“

”باقی تینوں مسلمان قیدیوں کی یہ سولتیں ختم کر دو“ — ہرقل نے کہا —
”انہیں تہ خانے کی کوٹھڑیوں میں بند کر دو۔ انہیں گل سڑک مرنے دو۔“

ہرقل نے یہ حکم ایسے لہجے میں دیا جیسے نیند میں بول رہا ہو۔ یہ شک بھی ہوتا تھا جیسے اُس نے داروغہ کی پوری بات سنی ہی نہ ہو۔ اُس پر شکست کا پہلا زلزلہ پڑا تھا۔ شام ایک

بردا ملک تھا جو اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور مسلمانوں کی جھولی میں چلا گیا تھا۔
”کیا آپ ان کے تعاقب کا حکم نہیں دیں گے؟“ — شارینا کی ماں نے پوچھا۔
”نہیں!“ — ہرقل نے بے جان سے لہجے میں کہا — ”صبح کے نکلے ہوئے اب تک وہ دُور نکل گئے ہوں گے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ گئے کس سمت کو ہیں۔“

شارینا کی ماں کچھ نہ کچھ بولتی رہی۔ ہرقل اُس کی کسی بات کا ادھر اور اس کا جواب دے دیتا یا صرف اتنا کہ اس کے منہ کی طرف دیکھ کر منہ پھیر لیتا۔ داروغہ کو ہرقل نے کوئی اشارہ کیا تھا یا داروغہ نے فرض کر لیا کہ اس کا چھٹکارہ ہو گیا ہے، وہ اُلٹے قدم چلتا دروازے تک گیا اور پھر باہر نکل گیا۔

”وہ چلا گیا ہے“ — شارینا کی بیوی نے کہا — ”اس کی جان بخشی نہ کریں۔“
”جانے دو اسے!“ — ہرقل نے کہا — ”میں آنے والوں کا انتظار کر رہا ہوں۔“
پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ہرقل نے اپنی پسا ہوتی ہوئی فوج کو شام کے مختلف مقامات پر بکھیر دیا تھا اور اُس نے یہ چال اس توقع پر چلی تھی کہ اس کے مطابق مسلمانوں کا لشکر بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا اور یہ اس کی کمزوری کا باعث بنے گا۔ پھر ہرقل اپنی بکھری ہوئی فوج کو کسی ایک موزوں مقام پر یکجا کر کے مسلمانوں کی ٹکڑوں میں بنی ہوئی فوج پر زور دار حملے کرے گا اور پھر مسلمان اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکیں گے۔ ہرقل اب گرہاء میں آگیا تھا اور اپنی فوج کو یہیں اکٹھا کرنا چاہتا تھا لیکن کہیں سے بھی اسے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا کہ وہاں کی فوج کب اس تک پہنچے گی۔ یہ تھا وہ انتظار جس کی پیتابی نے اُس کا دماغ جکڑ رکھا تھا۔

○

سورج کبھی کا غروب ہو چکا تھا اور رات گہری ہو گئی تھی۔ اُس وقت شارینا گرہاء سے بہت ہی دور پہنچ گئی تھی اور اس کے سفر کا ایک دن گزر گیا تھا۔ مسلمان قیدی کا نام حدید بن مومن خزرج تھا۔ خزرج عرب کا ایک بڑا ہی مشہور قبیلہ تھا۔

پہلے تو ہم یہ دیکھ لیں کہ شارینا اور حدید اس شہر سے نکلے کس طرح۔ قید خانہ آبادی سے کچھ دور تھا اور آگے ویران اور بیابان علاقہ تھا۔ کچھ دور تک شارینا گھوڑے پر سوار رہی اور اس کے کہنے سے حدید نے گھوڑے کی باگ پکڑے رکھی۔ کوئی اجنبی دیکھ لیتا تو وہ یہی سمجھتا کہ وہ کسی امیر و زیر کی بیٹی ہے اور باگ اس کے نوکر نے پکڑ رکھی

ہے۔ حدید نے راستے میں بھی شاریتا سے پوچھا کہ وہ جا کہاں رہے ہیں۔ شاریتا نے اسے کہا تھا کہ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا چلے۔ حدید پر کسی قسم کا خوف اور خدشہ طاری نہیں تھا۔ وہ بڑا خوبصورت جوان آدمی تھا اور اُس کے جسم میں طاقت بھی تھی اور پھرتی بھی۔

قید خانے سے کچھ ہی دُور گئے ہوں گے کہ وہ دونوں دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ سطح مرتفع علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ چھوٹے بڑے نشیب تھے اور کہیں کہیں زمین اوپر کو ابھری ہوئی تھی اور اس سے آگے باقاعدہ ٹیکریاں آئیں۔ درخت بھی تھے اور جھاڑیاں بھی۔ وہاں کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ کوئی پگڈنڈی نہیں تھی اور صاف پتہ چلتا تھا کہ اوہر سے مسافر کم ہی گزرتے ہیں۔

ذرا اور آگے گئے تو ایک آدمی نظر آیا جس کے ساتھ ایک گھوڑا کھڑا تھا۔ اس آدمی نے گھوڑے کی باگ پکڑ رکھی تھی۔ شاریتا نے اس کے قریب جا کر گھوڑا روک لیا۔ وہ کوئی ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ شاریتا اپنے گھوڑے سے اتر رہی تھی اور وہ گھوڑے کو اور قریب لے آیا۔

”تم اس گھوڑے پر سوار ہو جاؤ“ — شاریتا نے حدید سے کہا۔

حدید کے لئے یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں تھا کہ یہ وہی گھوڑا تھا جس کے متعلق شاریتا نے قید خانے سے نکل کر کہا تھا کہ آگے چل کر الگ گھوڑا مل جائے گا۔ یہ ادھیڑ عمر آدمی یقیناً شاریتا کا ملازم تھا۔ حدید اس گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

حدید نے سوار ہو کر شاریتا کی طرف دیکھا۔ شاریتا ابھی اپنے گھوڑے پر سوار نہیں ہوئی تھی۔ ادھیڑ عمر آدمی اس کی تعظیم میں اتنا جھک گیا تھا کہ رکوع کی حالت میں چلا گیا۔ شاریتا آخر شہزادی تھی اور یہ شخص اس کا نوکر یا سائیں تھا۔ اس کے علاوہ اس نوکر کو توقع ہوگی کہ شہزادی اس کو انعام دے گی۔

شاریتا شہزادی نے اسے انعام یہ دیا کہ وہ ابھی رکوع سے اٹھا نہیں تھا کہ شاریتا نے بڑی تیزی سے اپنے کپڑوں کے اندر ہاتھ کر کے خنجر نکالا اور خنجر بلند کر کے بڑی زور سے خنجر اس آدمی کی پیٹھ میں گھونپ دیا۔ اس سے پہلے کہ یہ آدمی سیدھا ہوتا، شاریتا نے اس کی پیٹھ سے خنجر نکال کر ایسا ہی ایک اور وار اسی مقام پر کیا۔ پیٹھ کا یہ وہ مقام تھا جہاں دل ہوتا ہے۔ وہ بد قسمت آدمی سیدھا ہو ہی نہ سکا اور ایک پہلو پر زمین پر گر پڑا۔ شاریتا اُس

کے پاس کھڑی دیکھتی رہی۔ موت نے اپنا کام بڑی تیزی سے مکمل کر لیا۔ شاریتا نے خون آلود خنجر لاش پر جھک کر اس کے کپڑوں پر صاف کیا اور نیام میں ڈال دیا۔ اس آدمی نے کمر کے ساتھ چڑے کی پٹی سے تلوار باندھ رکھی تھی۔ شاریتا نے پٹی کھول کر تلوار اور پٹی کھینچی اور پھر حدید کو دے کر کہا کہ یہ اپنی کمر سے باندھ لے۔

”اب تم نیتے نہیں رہو گے“ — شاریتا نے سنجیدگی سے کہا — ”میرے پاس تو خنجر ہے!“

”اسے کس گناہ کی سزا دی ہے؟“ — حدید نے پوچھا۔

”یہاں رکنا نہیں“ — شاریتا نے کہا — ”ابھی ہم خطرے میں ہیں“ — وہ گھوڑے پر سوار ہو گئی اور لگام کو جھٹک دیا۔ گھوڑا چل پڑا تو وہ بولی — ”یہ شخص ہمارے لئے بہت بڑا خطرہ بن سکتا تھا۔ یہ محل کا نوکر تھا۔ یہاں سے دوڑتا جاتا اور میری ماں کی خوشنودی اور انعام حاصل کرنے کے لئے اسے بتا دیتا کہ میں ایک آدمی کے ساتھ فلاں طرف نکل گئی ہوں۔ ماں فوراً ہمارے تعاقب میں گھوڑا سوار بھیج دیتی۔ میرا کسی نے کیا بگاڑ لیا تھا، تم قتل کر دیئے جاتے۔“

”یہ تو بتا دو تم ہو کون!“ — حدید نے پوچھا — ”تمہیں میرا نام مجھ سے پوچھے بغیر معلوم ہے اپنا نام ہی بتا دو۔ یہ بھی یقیناً پوچھنا چاہوں گا کہ مجھے لے جا کہاں رہی ہو؟“

”میرا نام شاریتا ہے“ — شاریتا نے کہا — ”میں شاہ ہرقل کے خاندان کی شہزادی ہوں۔ میری ماں شاہ ہرقل کی بیوی ہے لیکن میں اس کی بیٹی نہیں بلکہ اس سے پہلے روم کا بادشاہ فوکس ہوا کرتا تھا، میں اُس کی بیٹی ہوں.... پوچھے ہو میں تمہیں کہاں لے جا رہی ہوں؟ تمہیں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ میں تمہیں نہیں لے جا رہی بلکہ تمہارے ساتھ جا رہی ہوں۔ ایک بار پھر سن لو، مجھے اپنی فوج میں لے چلو۔“

”لیکن کیوں؟“ — حدید نے پوچھا — ”میرے ساتھ تمہارا تعلق ہی کیا ہے؟ کیا میں ایسا شک نہ کروں کہ تم مجھے کسی ایسے مقصد کے لئے کہیں لے جا رہی ہو جو میرے لئے ٹھیک ہو ہی نہیں سکتا؟“

”تم مرد ہو، تمہارے پاس تلوار ہے“ — شاریتا نے مسکراتے ہوئے کہا —

”جہاں کہیں خطرہ محسوس کرو گے، مجھے وہیں قتل کر دینا“ — اُس نے اپنے گھوڑے کو ہلکی سی ایڑ لگا کر کہا — ”کچھ دور تک گھوڑوں کو دوڑنے دو۔ آگے ایسا علاقہ آرہا ہے جہاں گھوڑے ٹھیک طرح دوڑ نہیں سکیں گے نہ انہیں دوڑانا ہے۔ آگے چل کر بتاؤں گی میں کون ہوں اور پھر تم مجھے بتانا کہ میں پاگل تو نہیں!“

○

زمین کچھ اوپر اٹھتی جا رہی تھی۔ آگے چٹانیں بھی تھیں اور گھاس، پودوں اور درختوں سے لدی ہوئی خوبصورت ٹیکریاں بھی تھیں۔ کچھ آگے جا کر شارینا نے گھوڑا روک لیا اور پیچھے دیکھا۔ حدید نے بھی گھوڑا روک کر پیچھے دیکھا۔ درختوں کے اوپر سے رہاء کا قلعہ بند شہر نظر آرہا تھا۔ وہ اس شہر سے دور نکل آئے تھے۔

”دور اُفق تک دیکھو“ — شارینا نے جذباتی سے لہجے میں کہا — ”کتنا خوبصورت علاقہ ہے۔ اب یہ علاقہ تمہارا ہے۔ روم کی شہنشاہی سے نکل گیا ہے۔ روم کے بادشاہ اور مجھ جیسی شہزادیاں ماضی کا قصہ بن جائیں گی.... کیا مجھے سمجھنے کی کوشش کرو گے حدید؟.... تم مجھے روم کے شاہی خاندان کی شہزادی سمجھتے ہو لیکن مجھے شاہ ہرقل کی فحشی اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی جتنی اس کی پسائی سے ہو رہی ہے.... چلو زیادہ رکتا ٹھیک نہیں۔“

انہوں نے گھوڑے موڑے اور اپنے سفر پر چل دیے لیکن ابھی دونوں کو معلوم نہیں تھا کہ ان کی منزل کہاں ہے۔

”اب تم میرے رہنما ہو“ — شارینا نے کہا — ”یہ اندازہ کر لو کہ تم کہاں سے پکڑے گئے تھے اور تمہاری فوج کہاں ہو گی۔ اب مجھے اپنی ملکیت سمجھو، قیدی سمجھو یا ہم سفر۔ میری زندگی کا سفر تمہارے ساتھ گزرے گا۔“

وہ اب چٹانوں اور اونچی نیچی ٹیکریوں کے علاقے میں داخل ہو چکے تھے۔ وہاں کوئی سیدھا راستہ نہیں تھا۔ حدید ویلے ہی اندازے پر جا رہا تھا۔

”محل میں لوگ مجھے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے“ — شارینا نے اپنی بات شروع کی — ”بعض مجھے کم عقل کہتے ہیں اور مجھے پاگل کہنے والے بھی کچھ کم نہیں۔ وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ میری باتیں اور میری عادتیں ہی کچھ ایسی ہیں۔ میں شہزادی ضرور ہوں لیکن اُن شہزادیوں میں سے نہیں جن کی لوگ کہانیاں سنتے سنتے رہتے ہیں۔ شاید

میرے خون میں کوئی خرابی ہے۔“

”تم اصل بات سناؤ شارینا!“ — حدید نے کہا — ”میں تمہیں بتاؤں گا کہ خرابی تمہارے خون میں ہے یا دماغ میں۔“

”میری ماں کو تم نے نہیں دیکھا“ — شارینا نے کہا — ”بہت ہی خوبصورت عورت ہے۔ میں اس کی واحد اولاد ہوں۔ وہ نسلا ”شاہی خاندان“ سے نہیں۔ عرب کے کسی بہت ہی امیر تاجر خاندان کی لڑکی تھی۔ تم جانتے ہو تاجر تجارت کے معاملے میں ملک ملک پھرتے رہتے ہیں اور قافلوں کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ میری ماں کی عمر سولہ سترہ سال تھی جب ایک بار اس کے باپ نے کہا کہ وہ تجارت کے لئے مصر جا رہا ہے اور سب کو ساتھ لے جائے گا۔ اس طرح وہ اپنے پورے کنبے کو ساتھ لے گیا۔ میری ماں تھی، اس کے چھوٹے دو بھائی تھے اور اس کی ماں تھی اور ایک چچا بھی ساتھ تھا۔ مجھے یہ باتیں ماں نے سنائی تھیں....

”بہت بڑا قافلہ تھا اور اس قافلے میں زیادہ تعداد تاجروں کی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ اس قافلے کے ساتھ دولت بھی بہت جا رہی تھی اور مختلف قسم کے تجارتی مال کا تو کچھ شمار نہ تھا۔ صحرائی قزاق ایسے قافلوں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ انہیں اس قافلے کی بھی خبر ہو گئی ہو گی۔ کچھ دنوں بعد یہ قافلہ ملک شام میں داخل ہوا تو ایک جگہ قزاقوں نے اسے روک لیا۔ قافلے تو اب بھی لٹتے ہیں اور تم جانتے ہو گے انہیں کس طرح لوٹا جاتا ہے....

”ماں بتاتی ہے کہ قزاق کوئی تھوڑے تو نہیں تھے۔ یوں پتہ چلتا تھا جیسے آسمان سے گلدھوں کے غولوں اور زمین سے سینکڑوں بھیڑیوں نے حملہ کر دیا ہو۔ میری ماں نوجوان بھی تھی اور خوبصورت اتنی کہ اُس پر لگی ہوئی نظر ہتی نہیں تھی۔ ایک قزاق نے میری ماں کو اٹھالیا۔ وہ دن اور آج کا دن، میری ماں کو معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کے ماں باپ کا اور بھائیوں کا کیا انجام ہوا تھا۔ قزاق ماں کو اغوا کر کے لے گئے....

”میں تصور میں لاسکتی ہوں کہ اس کمرنی میں میری ماں کس قدر قیمتی بہیرے جیسی ہو گی۔ وہ کوئی عام سی لڑکی ہوتی تو کھلی منڈی میں فروخت ہو جاتی لیکن وہ امراء کی بھی نہیں بلکہ بادشاہوں کی پسند کی چیز تھی۔ اُس وقت مصر اور شام پر رومیوں کی حکومت تھی اور بادشاہ فوکاس تھا۔ وہ بادشاہوں جیسا بادشاہ تھا۔ شاہانہ عیاشیوں میں ڈوبا ہوا۔ اپنے

آپ کو خدا سمجھتا تھا اور لوگ اس کے آگے سجدے کرتے تھے....

”قزاقوں نے اس تک رسائی حاصل کر کے میری ماں کی جھلک اسے دکھائی۔ وہ تو جیسے میری ماں پر مر رہی مٹا ہو۔ وہ آخر بادشاہ تھا۔ منہ مانگے دام دے کر اُس نے میری ماں کو خرید لیا۔ بادشاہ شادی کے جھنجھٹ میں پڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کیا کرتے، انہیں جو لڑکی اچھی لگتی ہے، اسے عارضی یا مستقل داشتہ بنا کر اپنے محل میں رکھ لیتے ہیں۔ میری ماں کے حسن اور نوجوانی سے شاہ فوکاس ایسا متاثر ہوا کہ اُس نے میری ماں کے ساتھ باقاعدہ شادی کر لی۔ بادشاہوں کی شادیاں بھی برائے نام ہوا کرتی ہیں۔ ماں کو ذرہ بھر خوشی نہ ہوئی کہ وہ اتنی وسیع بادشاہی کے بادشاہ کی ملکہ بن گئی ہے۔ اس کی عمر ہی کیا تھی۔ اسے باپ اور بھائی یاد آتے تھے اور تنہائی میں رو رو کر اپنی حالت بگاڑ لیا کرتی تھی....

”اُسے دوسرا صدمہ یہ پہنچا کہ وہ مسلمان تھی۔ اس کے ماں باپ نے تھوڑا ہی عرصہ پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ اس کا باپ کسی لالچ یا کسی بھی قسم کے دباؤ میں نہیں آیا تھا بلکہ اس مذہب سے وہ دلی طور پر متاثر ہوا اور اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اُس وقت میری ماں بہت چھوٹی تھی۔ اُس نے مجھے سنایا کہ وہ جب اچھا بچہ سمجھنے کی عمر میں داخل ہوئی تو اسے مذہب کے سبق دیئے جانے لگے۔ اسلام اُس کی رگ رگ میں سما گیا لیکن اُس کی قسمت اتنی بُری نکلی کہ قافلے سے اغوا ہوئی اور ایک عیسائی بادشاہ نے اسے اپنی بیوی بنا لیا۔ بادشاہوں کا تو کوئی مذہب ہوتا ہی نہیں، میری ماں کو دکھ یہ ہوا کہ وہ مسلمان بھی نہ رہی اور اُس نے عیسائیت کو بھی قبول نہ کیا....

”میں پیدا ہوئی اور شہزادیوں کی طرح مجھے پالا پوسا گیا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ میں تھی ہی شہزادی.... تین چار سال کی عمر کو میں بچپنی تو یاد ہے کہ میں نے ماں کو چوری چھپے نماز پڑھتے دیکھا تھا لیکن میری عمر پانچ چھ سال کی ہوئی تو میں نے ماں کو شراب پیتے دیکھا اور اس کی نمازیں ختم ہو گئی تھیں۔ شیطانوں کے شاہی ماحول میں رہ کر میری ماں کی فطرت ہی بدل گئی اور وہ بھی شیطان فطرت بن گئی۔ میں تمہیں وہ سازشیں اور سیاست بازیاں نہیں سنارہی جو بادشاہوں کے محلات کا معمول ہوا کرتی ہے۔ ماں نے مجھے یہ ساری ابلیلیں حرکتیں، اپنی بھی، شاہ فوکاس کی دوسری بیویوں کی بھی، تفصیلاً سنائی تھیں....

”تم جانتے ہو کہ ایرانی آتش پرست ہیں اور روم کی نکر کی جنگی طاقت ہیں۔ میں حیران ہوں کہ تم مسلمانوں نے کس طرح ان ایرانیوں کو عراق سے بے دخل کر کے انہیں گھنٹوں بٹھادیا ہے۔ انہوں نے اچانک رومی سلطنت پر حملہ کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مصر اور شام پر قابض ہو گئے۔ شاہ فوکاس اپنے وطن بھاگ گیا....

”ہرقل رومی فوج کا جرنیل تھا۔ جرنیل تو چند اور بھی تھے لیکن ہرقل کا نام سب سے زیادہ اونچا اور مشہور تھا کیونکہ جنگی فہم و فراست کے لحاظ سے کوئی اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ اس کی شہرت اور عزت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کا تعلق شاہی خاندان کے ساتھ تھا۔ وہ برداشت نہ کر سکا کہ ایرانیوں نے رومیوں کو شکست دی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ شکست کا اصل باعث فوکاس کی عیاش شہنشاہیت ہے۔ اُس نے ایرانیوں کو ہمیشہ نظر انداز کئے رکھا تھا اور اپنی سلطنت کی طرف سے بے خبر رہا....

”میری عمر چھ سات سال تھی۔ اس عمر میں بچہ اتنی زیادہ باتیں نہیں سمجھ سکتا جو میرے دماغ میں بیٹھ گئی تھیں۔ میرے ساتھ کے بچوں کو پرواہ ہی نہیں تھی کہ دشمن نے ہمیں وسیع و عریض ملکوں سے بے دخل کر دیا ہے لیکن مجھے اس شکست کا اتنا ہی صدمہ ہوا تھا جتنا ہرقل محسوس کر رہا تھا۔ ہرقل میرے ساتھ بہت پیار کیا کرتا تھا۔ اس کا میل جول میری ماں کے ساتھ تھا۔ پہلے جب کبھی ماں ہرقل سے ملنے جاتی یا وہ ماں سے ملنے آتا تو ماں مجھے ساتھ رکھتی تھی لیکن کچھ دنوں بعد ماں نے مجھے اپنے اور ہرقل کے درمیان سے ہٹا دیا۔ بڑے ہو کر مجھے پتہ چل گیا تھا کہ میری ماں نے ہرقل کے ساتھ ناجائز دوستی لگا رکھی ہے۔ یہ کوئی عجیب اور انوکھی بات نہیں تھی۔ شاہی محلات میں یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔ شاہ فوکاس اپنی کون کون سی بیوی کا خیال رکھتا....

”اب میں تمہیں جو بات سنانے لگی ہوں مجھے بڑے ہو کر معلوم ہوئی تھی۔ بات یہ تھی کہ ہرقل شاہ فوکاس کو اکساتا رہتا تھا کہ ایرانیوں پر جوابی حملہ کیا جائے لیکن فوکاس ٹالتا چلا جا رہا تھا۔ ہرقل نے اس بادشاہ کا تختہ الٹنے کا ارادہ کر لیا۔ اس مقصد کے لئے اس نے دوسرے جرنیلوں کو ساتھ ملا لیا۔ دوسرے جرنیل اس وجہ سے بغاوت کے لئے تیار ہو گئے کہ شاہ فوکاس شکست کی ذمہ داری ان جرنیلوں پر ڈال رہا تھا....

”ہرقل نے تمام جرنیلوں کو تیار کر لیا تو پتہ چلا کہ دو تین جرنیل دراصل شاہ فوکاس کے حامی ہیں اور فوج کی خاصی نفری کو انہوں نے شاہ فوکاس کی ذاتی فوج بنا رکھا ہے۔

سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے ہرقل کی منت سماجت کی کہ وہ اس کا علاج کروائے۔ وہ کہتا تھا کہ اس کا جسم اندر سے کٹ رہا ہے۔ وہ تو زندہ لاش بن گیا تھا اور طبیب اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اور یہ پتہ چلتا ہی نہیں تھا کہ یہ کیسی بیماری ہے جو بادشاہ کو اندر ہی اندر کھائے چلی جا رہی ہے۔ ہرقل نے اسے کہا کہ وہ اس کا علاج کرائے گا اور وہ ٹھیک بھی ہو جائے گا لیکن شرط یہ ہے کہ فرمان جاری کر دے....

”ایک دن اور گزرا تو شاہ فوکاس یوں محسوس کرنے لگا جیسے اس کے جسم کے اندر آگ لگ گئی ہو۔ اس کیفیت میں ہرقل نے اس سے فرمان لکھوا لیا اور اس فرمان کو لوگوں تک بذریعہ منادی پہنچا دیا گیا۔ ہرقل تخت نشین ہو گیا اور بادشاہ کو شاہانہ مراعات دے کر محل میں ہی رہنے دیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ بادشاہ دو چار دنوں کا ہی مسمان ہے۔ ایسے ہی ہوا۔ ایک روز شاہ فوکاس نے آخری پگلی لی اور ہمیشہ کے لئے دنیا سے اٹھ گیا۔ ہرقل نے روم کا تخت و تاج سنبھال لیا اور فوکاس کے شاہی خاندان کو محل سے نکال دیا....

”ہرقل نے میری ماں کے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہرقل نے شادی کر لی۔ اس شادی سے صرف اتنی تبدیلی آئی کہ ہرقل کی بیویوں کی تعداد میں ایک اور بیوی کا اضافہ ہو گیا۔ یہ شادی بھی ایک بادشاہ کی شادی تھی لیکن میری ماں کو اس شادی پر بڑا فخر تھا۔ ہرقل نے کچھ عرصہ اسے اہمیت دینے رکھی جس کی وجہ یہ تھی کہ میری ماں شاہ فوکاس کو زہر نہ دیتی تو ہرقل کے لئے اس کا تختہ الٹنا ممکن نہ تھا....

”میرا شعور بیدار ہو چکا تھا اور مجھ پر سب سے زیادہ اثر اپنی ماں کا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ہرقل کی ملکہ عالیہ سمجھنا شروع کر دیا تھا اور وہ اٹھتے بیٹھتے یہی کہتی تھی کہ ایرانیوں پر جو اب حملہ کر کے مصر اور شام کو دوبارہ سلطنت روم میں شامل کرنا ہے۔ ہرقل کا تو عزم ہی یہی تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اسی مقصد کے تحت شاہ فوکاس کا تختہ الٹا تھا۔ اس کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ مجھ میں قومی غیرت پیدا ہو گئی اور اس کے ساتھ ایسا جذبہ ابھرا کہ میں یہ خواہش کرنے لگی کہ میں مرد تو بن نہیں سکتی اور میں فوج میں نہیں جاسکتی۔ میں جوان ہو کر اپنے جیسی جوان لڑکیوں کی فوج بنائوں گی اور اسے ایرانیوں کے خلاف لڑائوں گی۔ اس طرح مجھ میں عسکریت پیدا ہوتی چلی گئی اور یہی میری فطرت بن گئی....

”میں اُس وقت لڑکپن کی عمر سے آگے نکل رہی تھی جب ہرقل نے بے پناہ فوج

”اُن دو جرنیلوں کو خبر مل گئی جو بادشاہ کے حامی تھے۔ انہوں نے فوج کی اس نفری کو ساتھ لیا جو ان کے زیر اثر تھی اور اس نفری سے انہوں نے محل کو محاصرے میں لینے والی نفری پر حملہ کر دیا۔ ہرقل کے دستوں نے جم کر مقابلہ کیا....

”ہرقل دیکھ رہا تھا کہ بادشاہ کے جسم میں زہر کا اثر شروع ہو گیا تھا۔ وہ اپنے اندر کوئی تکلیف محسوس کرنے لگا تھا، ہرقل نے اسے کہا کہ اس کی زندگی چند دن رہ گئی ہے اور بہتر یہ ہے کہ وہ ہرقل کے حق میں فرمان جاری کر دے اور عزت کی موت مرے۔ اس نے پس و پیش کی تو اس کی لاش سارے شہر میں گھسیٹی جائے گی اور پھر جنگل میں پھینک دی جائے گی۔ ہرقل نے سوچا یہ تھا کہ بغاوت اُس وقت شروع کی جائے جب بادشاہ اندر سے کمزور ہونا شروع ہو جائے....

”جو فوج ہرقل کے زیر اثر تھی، اس کی نفری زیادہ تھی۔ اس نے شاہ پرست دونوں جرنیلوں کو الگ بلایا اور انہیں کہا کہ اسے پتہ چل گیا ہے کہ بادشاہ ایسی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے جس کا کوئی علاج نہیں اور آٹھ دس دنوں تک بادشاہ مر جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ دونوں جرنیل اس کے ساتھ مل جائیں اور آپس میں خون خرابہ نہ کریں۔ دونوں جرنیلوں کو بادشاہ پر بھروسہ تھا اور اس کی حمایت کے صلے میں انعام و اکرام کی توقع بھی تھی اس لئے ہرقل کی کوئی بات اُن پر اثر نہ کر سکی....

”وہ شاید بھول گئے تھے کہ ہرقل کا دماغ بہت ہی تیز ہے اور اس کا بچھایا ہوا جال کسی کو نظر نہیں آتا اور جو بھی آتا ہے اس کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ ہرقل نے ایسی چل چلی کہ دونوں جرنیل اس کے پھندے میں آ گئے اور دونوں کو گرفتار کر کے قید خانے میں پھینک دیا۔ ان جرنیلوں کی جو نفری تھی وہ ان دونوں کے بغیر بیکار ہو گئی۔ ویسے ہی ہرقل نے اس نفری کو خبردار کیا کہ ہتھیار نہ ڈالے تو کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ فوج کے یہ دو چار دستے کر ہی کیا سکتے تھے جب کہ ان کا کوئی کمانڈر رہا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے....

”تین چار دن اور گزرے کہ شاہ فوکاس کی جسمانی اور ذہنی حالت زہر کے اثر کی وجہ سے اتنی خراب ہو گئی کہ وہ بستر سے اٹھنے سے معذور ہو گیا۔ آخر ہرقل نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اس کے حق میں شاہی فرمان جاری کر دے....

”شاہ فوکاس تو صحت اور زندگی کی ہبک مانگ رہا تھا۔ عیش پرست انسان اس دنیا

ہرقل نے سوچا کہ اس نے بادشاہ کا تختہ الٹنے کی کوشش کی تو خانہ جنگی ہوگی جو روم کو لے ڈوبے گی۔ خانہ جنگی کے بغیر تختہ الٹنے کا ایک ہی ذریعہ تھا کہ شاہ فوکاس کو کسی نہ کسی طریقے سے قتل کر دیا جائے....

”بادشاہ کو قتل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ وہ اپنی عیاشیوں میں ڈوبا رہتا تھا اور اس کے ارد گرد محافظوں کا حصار قائم کر دیا گیا تھا۔ میرا خیال ہے بادشاہ کو پتہ چل گیا تھا کہ اس کا تختہ الٹنے کی سازش ہو رہی ہے۔ ہرقل کے ساتھ اس کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔ بادشاہ یقیناً ہرقل سے ڈرتا تھا....

”میری ماں ہرقل سے ملتی رہتی تھی اور ان کی دوستی پہلے کی طرح چل رہی تھی۔ ہرقل نے میری ماں کے ساتھ کبھی ذکر تک نہ کیا تھا کہ وہ شاہ فوکاس کا تختہ الٹنا چاہتا ہے۔ ایک روز میری ماں نے شک کی بنا پر ہرقل سے پوچھا تو ہرقل نے ماتہ میری ماں نے اسے بتایا کہ اس کے اپنے دل میں بادشاہ کے خلاف اتنا زہر بھرا ہوا ہے کہ وہ بادشاہ کو قتل کرنے تک سوچ چکی ہے لیکن اسے کسی کی پشت پناہی کی ضرورت ہے۔ تب ہرقل نے اسے اپنا راز دے دیا اور یہ وعدہ کیا کہ وہ شاہ فوکاس کو کسی نہ کسی طریقے سے قتل کر دے تو....

”ماں تیار ہو گئی۔ قتل کے طریقوں پر غور ہونے لگا۔ آخر یہ طے پایا کہ میری ماں بادشاہ کو زہر ملا دے اور ہرقل کو فوراً اطلاع دے دے.... میری ماں کے لئے یہ طریقہ آسان تھا۔ ہرقل نے ایسے زہر کا انتظام کر کے میری ماں تک پہنچا دیا جو فوراً اثر نہیں کرتا تھا بلکہ آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھاتا ہے اور جسم کو اندر ہی اندر سے کھاتا چلا جاتا ہے اور بارہ چودہ دنوں تک آدمی مرجاتا ہے۔ اس زہر کا سراغ لگایا ہی نہیں جاسکتا۔ بڑے بڑے قابل طبیب بھی اسے کوئی پراسرار بیماری کہہ دیتے ہیں....

”ایک رات میری ماں نے یہ زہر شراب میں ملا کر شاہ فوکاس کو پلا دیا۔ اگلے روز ہرقل کو اطلاع دے دی کہ زہر بادشاہ کے پیٹ میں چلا گیا ہے۔ ہرقل فوج کا کمانڈر انچیف تھا۔ ساری فوج پر اس کا حکم چلتا تھا۔ اس نے فوج کی کچھ نفری کو الگ کر کے حکم دیا کہ بادشاہ کے محل کو محاصرے میں لے لیا جائے.... اس کے حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔ ہرقل شاہ فوکاس کے سامنے گیا اور اسے کہا کہ وہ فرمان جاری کر دے کہ وہ تخت سے دستبردار ہو گیا ہے اور ہرقل کو اس نے اپنا جانشین مقرر کیا ہے....

تیار کر لی تھی اور اس نے ایرانیوں پر حملہ کر دیا۔ بہت کشت و خون ہوا۔ ہرقل بڑا ہی مضبوط عزم لے کر نکلا تھا۔ اُس نے اپنی فوج کو کئی سال صرف کر کے خوب تیار کیا تھا۔ آخر ایرانیوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ پسا ہوتے ہوئے مصر بھی خالی کر گئے اور شام بھی۔ دونوں ملک ایک بار پھر سلطنت روم میں شامل کر لئے گئے....

”ہرقل کی نظروں میں میری ماں کی حیثیت ختم ہو چکی تھی۔ ہرقل کو شاید اتنا ہی یاد رہ گیا تھا کہ اس عورت کے ساتھ اس نے شادی کی تھی۔ پسا ہوتے ایرانیوں کی بہت سی حسین و جمیل اور نوخیز لڑکیاں رومیوں کے ہاتھ لگی تھیں۔ ان میں سے کئی ایک کو ہرقل کے حرم میں داخل کر دیا گیا تھا۔ میری ماں کی جوانی ڈھل رہی تھی۔ ہرقل تھا تو بادشاہ لیکن فوکاس جیسا نہیں تھا۔ وہ جرنیل بھی تھا اور جنگی امور اور جنگی چالوں میں اس نے ایسا نام پیدا کر لیا کہ وہ ایک بہت ناک طاقت بن گیا۔ میں اپنی ماں کو افسردہ اور اداس دیکھنے لگی۔ شاید یہ اسی کا اثر تھا کہ مجھے یاد آنے لگا جب ماں چوری چھپے نماز پڑھا کرتی تھی۔ ایک تو یہ جذبہ یا احساس تھا اور دوسرا احساس یہ کہ مجھ میں عسکریت پیدا ہو گئی تھی اور میں صرف یہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی خوبصورت شہزادہ میرے ساتھ شادی کر لے اور میں کسی کی ملکہ بن جاؤں۔ میں پوری طرح بیان نہیں کر سکتی کہ میرے وجود میں کیسی آگ لگ گئی تھی۔“



شارینا کا دل اس آگ کو سمجھنے سے قاصر تھا جو اس کے وجود میں بھڑک اٹھی تھی۔ حدید اُس کی یہ روئیداد سنا چلا جا رہا تھا۔ گھوڑے درمیانی رفتار سے چل رہے تھے۔ سورج اپنا سفر پورا کر رہا تھا اور افق کے قریب جا پہنچا تھا۔ ہری بھری ٹیکریاں ایک دوسری سے دور ہوتی جا رہی تھیں۔ حدید نے اپنے ذہن میں افلاکیہ کی سمت رکھی ہوئی تھی۔ ہر چالیس پچاس قدموں پر ٹیکریاں گھوڑوں کا رخ موڑ دیتی تھیں لیکن حدید اپنے ذہن سے صحیح سمت کو نکلنے نہیں دے رہا تھا۔

شارینا رولنی سے بولتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی آواز میں جلتنگ جیسے ساز کا ترنم بھی تھا اور جذبات کا سوز بھی لیکن جب وہ اس آگ کا تجزیہ کرنے لگی جو اس کے وجود میں بھڑکی تھی تو اس کی زبان رکنے لگی۔ اس نے اپنا سارا ماضی بیان کر دیا تھا لیکن اس کی سوجھ بوجھ میں جو انقلاب آیا تھا اسے وہ صحیح طور پر بیان کرنے سے قاصر ہوئی جا رہی تھی۔

شام پر ایسی یلغار کی کہ ایرانیوں کو وہاں سے بھگا دیا اور ان دونوں ملکوں کو سلطنت روم میں شامل کر لیا۔

اس کے بعد ایرانیوں نے رومیوں سے ٹکر لینے کی جرأت نہ کی۔ ایران اور روم جنہیں تاریخ اسلام میں قیصر روم اور کسریٰ ایران کہا گیا ہے، یہ طاقتیں آپس میں ٹکراتی رہیں اور لوگ پتے پتے رہتے اور ان کا خون بہتا ہی رہتا تھا۔

اُس وقت کے وقائع نگار اس قسم کی تحریریں چھوڑ گئے ہیں کہ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ان دو طاقتوں میں سے کسی ایک کو بھی کوئی اور طاقت اٹھ کر کمزور کر سکے گی لیکن ایک تیسری طاقت ابھرتی چلی آ رہی تھی۔ یہ صرف ایک جنگی طاقت نہیں تھی بلکہ ایک نظریہ تھا۔ ابتدا میں ایرانیوں اور رومیوں کے حملات میں اس کی خبریں پہنچیں تو ان دونوں قوموں نے کہا کہ یہ صحرائے عرب کے لیرے بدو ہیں۔ انہوں نے مذاق اڑا کر ان خبروں کو نظر انداز کر دیا۔

یہ تیسری طاقت افق سے اس طرح اٹھی جس طرح طوفان باد و باران کی کالی گھٹائیں بجلیوں سے لدی ہوئی اٹھا کرتی ہیں یا وہ صحرائی طوفان اٹھتا ہے جو ٹیلوں اور ٹیکریوں کو اپنے ساتھ اڑا لے جاتا ہے۔ یہ تیسری طاقت ہتھیاروں سے کم اور ایک ایسے جذبے سے زیادہ لیس تھی جو اللہ نے وحی کے ذریعے ان پر اتارا تھا۔ یہ ایک ایسا لشکر تھا جس کی نفی بہت ہی تھوڑی تھی لیکن اسے اللہ نے ایسی قوت عطا کی تھی جسے ایمان کی قوت کہا جاتا ہے۔

عرب کے ریگزاروں میں سے یہ جو لشکر اٹھا تھا، اس کے سپہ سالاروں کے دلوں میں ملک گیری کی ہوس نہیں تھی بلکہ وہ اللہ کا یہ پیغام لے کر نکلے تھے کہ رُوءے زمین پر حکمرانی صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہے اور اللہ کا کوئی بندہ کسی بندے کو اپنا غلام نہیں بنا سکتا۔ اللہ نے اپنا یہ پیغام اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اتارا تھا۔ اللہ کے یہ پُر اسرار بندے باطل کو نیست و نابود کرنے کے لئے، انسانوں کو آزاد کرانے کے لئے، بنی نوع انسان کو بدی سے بچانے کے لئے اور اللہ کے بندوں میں حقوق العباد کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے نکلے تھے۔

یہ تیسری طاقت ایسی ابھری کہ تیز و تند طوفانوں کی طرح باطل کی قوتوں کو خس و خاشاک کی طرح اڑا اور ہمالے گئی اور ان بادشاہوں پر جو اپنے آپ کو ناقابل تسخیر قوتیں

وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ انقلاب اللہ کا ایک عظیم انعام ہے جو خوش بختوں کو ہی ملا کرتا ہے۔ شاریتا بڑی حسین اور نوجوان شہزادی تھی لیکن اس نے اپنے وجود کو اور اپنے کردار کو اور اپنی سوچوں کو شہنشاہیت سے پاک رکھا تھا۔ شہنشاہیت کا مقصد ہوتا ہے عیش و عشرت، اللہ کے بندوں کو حشرات الارض سمجھنا اور فرعونیت۔ شاریتا نے نہ عشق و محبت کا کھیل کھیلا نہ اپنے حسن و جوانی کو دانہ و دام کی طرح استعمال کیا۔ وہ ان جذبوں اور احساسات میں الجھتی چلی گئی جو اس کی سوچیں بیدار کرتی چلی جا رہی تھیں۔

شاریتا حید کو اپنی خوش بختی کی جو داستان سنا رہی تھی، وہ دراصل اس پورے خطے کی داستان تھی۔ وہ خطہ جسے آج عراق اور شام کہا جاتا ہے، باطل کی بڑی بے رحم گرفت میں آیا ہوا تھا۔ عراق پر آتش پرست ایرانی قابض تھے اور شام اور مصر رومیوں کے قبضے میں تھے۔ پہلے متعدد بار بیان ہو چکا ہے کہ اُس وقت یہ دو ہی جنگی اور شاہی طاقتیں تھیں۔ ایرانی تو آگ کی پوجا کرتے تھے اور رومی جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر لٹکا دیا تھا، اب عیسائیت کے پیروکار تھے اور بیت المقدس کو انہوں نے دنیا بھر کے عیسائیوں کے لئے ایک کعبہ جیسا مقدس مقام بنا دیا تھا۔ مسجد اقصیٰ کو وہ اپنی عبادت گاہ سمجھتے تھے۔

شاریتا نے حید کو ٹھیک سنایا تھا کہ ایرانیوں نے رومیوں سے شام اور مصر چھین لئے تھے۔ تاریخ کے مطابق یہ 614ء کا واقعہ ہے۔ اُس وقت روم کا بادشاہ فوکاس تھا۔ وہ اپنی شاہانہ عیش پرستی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے اس اتنی بڑی شکست کو ہضم کر لیا۔

فوکاس صرف عیش و عشرت میں ہی نہ پڑا رہا بلکہ اُس نے اپنی رعایا پر ظلم و تشدد شروع کر دیا۔ وہ اب لڑنے کی اور ایرانیوں سے مصر و شام فتح کرنے کی بات کرتا ہی نہیں تھا نہ سنتا تھا۔ اُس نے جب دیکھا کہ رعایا بھی احتجاج کر رہی ہے اور رعایا میں سے یہ آوازیں اٹھنے لگی ہیں کہ ایرانیوں پر جو اب حملہ نہ کیا گیا تو وہ ان کے وطن روم پر بھی حملہ کر کے رومیوں کو غلام بنالیں گے، شاہ فوکاس نے لوگوں کے منہ بند کرنے کے لئے اپنی فوج استعمال کی اور فوج نے لوگوں پر بے پناہ ظلم و ستم ڈھائے۔

شاریتا نے ہر قل کی بغاوت کی بات بھی صحیح سنائی تھی۔ اس بغاوت کی تفصیلات تاریخ میں آج بھی موجود ہیں۔ ہر قل نے شاریتا کی ماں کے ہاتھوں فوکاس کو زہر پلا کر بغاوت کی اور کامیاب ہو گیا۔ وہ خود روم کے تخت پر بیٹھا اور 625ء میں اُس نے مصر و

سمجھتے تھے، یہ لشکر آسمانی، بجلیاں، بن کر گرے۔ پھر زمین و آسمان نے دیکھا کہ دنیا کی سب سے بڑی جنگی طاقتوں میں مٹھی بھر مجاہدین کے آگے ٹھہرنے کی تاب نہیں رہی تھی۔ ان ہی مجاہدین کو ایرانیوں اور رومیوں نے عرب کے بدو کہا اور ہنس کر نظر انداز کر دیا تھا۔ عراق اور شام کے نصیب جاگے اور اللہ کا پیغام ان خطوں میں پہنچ گیا۔ اور اب ہر قل بھاگا بھاگا پھر رہا تھا اور اسے کہیں ایسی پناہ نہیں مل رہی تھی جہاں وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا.... یہ 634ء اور 635ء کا دور تھا۔

○

شارینا اور حدید کے گھوڑے اپنی چال سے چلے جا رہے تھے۔ دوپہر کے وقت انہوں نے ایک جگہ بیٹھ کر کچھ آرام کیا اور گھوڑوں کو کھلا چھوڑ دیا کہ وہ کچھ کھا پی لیں۔ شارینا اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان لے آئی تھی۔ دونوں نے کھانا کھا لیا اور پھر چل پڑے تھے۔ شارینا کی داستان ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ حدید کو گزرے دنوں کی باتیں اور وہ حادثات اور واقعات سن رہی تھی جن کی وہ عینی شاہد تھی۔ اتنی سی عمر میں ہی اس نے زمانے کے کئی تغیر اور نشیب و فراز دیکھ لئے تھے۔ ان کے جو اثرات شارینا پر مرتب ہوئے تھے، وہ بھی حدید کو سنائی چلی جا رہی تھی۔

”جانتے ہو حدید، ہر قل کی شکست کا اصل باعث کیا ہے؟“ — شارینا نے کہا۔ ”اُس نے جب شاہ فوکاس کا تختہ الٹا اور خود اس کا جانشین بن گیا تو لوگ بہت خوش ہوئے تھے۔ لوگ شاہ فوکاس کے ظلم و تشدد سے بہت ہی تنگ آ گئے تھے اور کچھ لوگ تو اپنے وطن سے ہمیشہ کے لئے چلے گئے تھے۔ لوگوں کو ایک تو یہ خوشی ہوئی کہ اب ہر قل ایرانیوں کو شکست دے گا اور روم کا وقار بحال ہو جائے گا۔ رومیوں نے کبھی کسی سے شکست نہیں کھائی تھی اس لئے وہ ہر قل کو ہی دل و جان سے چاہتے تھے کہ ان کا یہ طاقتور اور انتہائی قابل جرنیل ان کی قومی آبرو سے شکست کا داغ دھو ڈالے گا اور رومی قوم کے سر پھر اونچے ہو جائیں گے....“

”لوگوں کو دوسری خوشی اس وجہ سے ہوئی کہ شاہ فوکاس نے اپنی عیش و عشرت اور شاہانہ بدستیوں کے اخراجات عوام کا خون چوس کر پورے کرنے شروع کر دیئے تھے۔ لوگ روز بروز غریب ہوتے چلے جا رہے تھے اور شاہ فوکاس محصولات میں اضافہ کرتا چلا جا رہا تھا۔ لوگ روٹی کے ایک ایک نوالے کو ترسنے لگے اور ان کے دلوں میں شاہ فوکاس

66

کی نفرت بیٹھ گئی۔ اگر روم کی فوج بغاوت میں ہر قل کا ساتھ نہ دیتی تو تمام لوگ اس کی مدد کو پہنچ جاتے اور اس بغاوت کو ہر قیامت پر کامیاب کرتے۔ بغاوت کے دوران کہیں کہیں شاہ پرست فوجی دستوں نے لوگوں پر مظالم توڑے تھے لیکن فوج کا میاب نہ ہو سکی کیونکہ لوگ مسلح ہو کر ان فوجی دستوں کے خلاف میدان میں نکل آئے تھے۔ خوزیر لڑائیاں بھی لڑی گئی تھیں جن میں غیر فوجی لوگ خاصی تعداد میں مارے گئے تھے اور شاہ پرست فوج کا بھی جانی نقصان کچھ کم نہ تھا۔ آخر کار یہ دستے لوگوں کے غیض و غضب کے آگے نہ ٹھہر سکے اور بچے بچے سپاہی بھاگ کھڑے ہوئے تھے....

”میں ہر قل کی شکست کی وجہ بتانے لگی تھی۔ لوگوں نے ہر قل کی تخت نشینی پر جشن منائے تھے۔ ہر قل نے بھی لوگوں کو مراعات دے کر انہیں غیبت سے نجات دلائی تھی اور لوگ رضا کارانہ طور پر اس کی فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ تم جانتے ہو کہ فوجی تنخواہ کی خاطر لڑا کرتے ہیں انہیں مال غنیمت کا لالچ ہوتا ہے۔ ان کے اندر کوئی جذبہ نہ ہوتا نہیں، نتیجہ یہ کہ دشمن کا ذرا سا بھی دباؤ برداشت نہیں کرتے اور فوج کی فوج بھاگ اٹھتی ہے لیکن جب ہر قل نے ایرانیوں پر حملہ کیا تو اس کی فوج جانوں کی بازی لگا کر لڑی۔ ان کے دل میں اب تنخواہ اور مال غنیمت کا لالچ نہیں تھا بلکہ قومی جذبہ تھا اور یہ لوگ اپنی قومی ساکھ بحال کرنے کے لئے خون اور جان کے نذرانے دینے پر آمادہ تھے اور انہوں نے یہ نذرانے دیئے۔ اگر یہ جذبہ نہ ہوتا تو ایرانیوں کو شکست دینا بڑا ہی محال تھا....“

”ہر قل نے شام بھی فتح کر لیا اور مصر بھی۔ رومیوں نے فتح کے جشن ایسے انداز سے منائے جیسے خوشی نے انہیں پاگل کر ڈالا ہو....“

”ہر قل نے مصر اور شام کے شہری انتظامات صحیح کر کے رواں کر دیئے اور فوج میں جو کمی واقع ہو گئی تھی، وہ پوری کی اور دونوں ملکوں کے حالات نارمل ہو گئے۔ ہر قل نے جب دیکھا کہ اب اس کی بادشاہی کو کسی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تو اس نے لوگوں پر ٹیکس لگانے شروع کر دیئے۔ ایرانیوں کے خلاف جنگ اسے بہت مہنگی پڑی تھی۔ خزانہ خالی ہو گیا تھا۔ شاہی خاندان نے عیاشیاں بھی کرنی ہوتی ہیں۔ ہر قل نے شاہی اخراجات پورے کرنے کے لئے اور خالی خزانے کو بھرنے کے لئے اسی طرح لوگوں کا خون نچوڑنا شروع کر دیا جس طرح شاہ فوکاس کیا کرتا تھا۔ ان ٹیکسوں کے نفاذ سے پہلے شام اور مصر

کے لوگ بھی ہر قل کو پسند کرنے لگے تھے لیکن ہر قل نے ان سے نظریں پھیر لیں اور ان پر ایسا بوجھ ڈال دیا کہ وہ ایک بار پھر نیم فائدہ کشی کی حالت کو پہنچ گئے....

”ہر قل نے اپنے مذہب عیسائیت کی طرف توجہ دی۔ اُس وقت عیسائیت چند ایک فرقوں میں بٹ گئی تھی۔ اگر ان فرقوں کا وجود ہی ہوتا اور ہر فرقہ اپنے اپنے عقیدے کے مطابق عبادت وغیرہ کر رہا ہوتا تو ہر قل اس فرقہ بندی کی طرف توجہ ہی نہ دیتا لیکن اس نے دیکھا کہ یہ فرقے ایک دوسرے کو دشمن سمجھتے ہیں اور وقتاً فوقتاً ان میں لڑائیاں بھی ہوتی ہیں اور ہر لڑائی میں کچھ آدمی مارے جاتے اور کچھ ایسے زخمی ہوتے کہ ٹانگ یا بازو یا دونوں سے معذور ہی ہو جاتے تھے۔ یہ ایسی صورت حال تھی جو خانہ جنگی کی صورت اختیار کر سکتی تھی۔ ہر قل نے ہر فرقہ کے مذہبی پیشواؤں کے ساتھ بات کی تو اُس نے دیکھا کہ ہر مذہبی پیشوا اپنے اپنے محاذ پر ڈٹا ہوا ہے اور وہ اپنے ہی فرقے کو صحیح العقیدہ سمجھتا ہے....

”ہر قل نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس فرقہ بندی کو ختم کر کے دم لے گا۔ اُس نے ایک سرکاری عیسائی مذہب تشکیل دے ڈالا اور حکم نامہ جاری کیا کہ تمام فرقوں کے عیسائی اس ایک فرقے میں آجائیں اور کوئی دوسرا فرقہ موجود نہ رہے۔ ہر قل نے فرقہ بندی کو جرم قرار دے دیا.... تم جانئے ہو کہ لوگ اپنے مذہبی عقیدوں سے دستبردار نہیں ہوا کرتے۔ لوگوں نے ہر قل کا حکم تو سن لیا لیکن اپنے اپنے فرقے کے وفادار رہے اور ہر قل کا سرکاری مذہب قبول نہ کیا۔ ہر قل نے لوگوں کا یہ ردِ عمل اور رویہ دیکھا تو اُس نے فوج کو پوری اجازت دے دی کہ وہ لوگوں کو سرکاری مذہب کی طرف لائیں اور جو کوئی مزاحمت کرتا ہے اسے قتل کر دیں چاہے قید خانے میں ڈال دیں۔ فوج نے من مانی شروع کر دی۔ فوجی جس گھر میں کوئی خوبصورت عورت دیکھتے وہاں جا چھاپہ مارتے اور گھروالوں کو خوف و ہراس میں مبتلا کر کے ان کی عورتوں کی بے حرمتی کرتے اور ظاہر یہ کرتے کہ یہ گھر یا یہ خاندان فرقہ بندی سے دستبردار نہیں ہو رہا....

”ایک طرف لوگ ٹیکوں کے بوجھ تلے بڑے کراہ رہے تھے اور دوسری طرف ان پر زبردستی ایسا مذہب ٹھونس دیا گیا جسے وہ صحیح اور قابلِ قبول عیسائیت نہیں سمجھتے تھے۔ وہ لوگ بادشاہ کا تو کچھ بگاڑ نہ سکتے تھے لیکن ہوا یہ کہ ان کے دلوں میں ہر قل کی نفرت پیدا ہو گئی اور انہوں نے افسوس کا اظہار کیا کہ ایک غلط قیصر روم کی خاطر قربانیاں

دی تھیں....

”لوگوں کا ردِ عمل اُس وقت سامنے آیا جب تم لوگوں نے شام پر حملہ کیا۔ میں جانتی ہوں کہ ہمارے محل میں مسلمان کا نام آتا تھا تو سب ہنس پڑتے اور مذاق کے لہجے میں کہتے تھے کہ عرب کے بدِ حملہ کرنے آرہے ہیں۔ وہ یہی کہتے تھے کہ یہ لیرے اور قزاق صرف لوٹ مار کرنا ہی جانتے ہیں لیکن میں نے دیکھا کہ ہر قل کی فوج مسلمانوں کی پہلی ضرب ہی نہ سہہ سکی۔ یہ تو میں نے بھی کبھی نہیں مانا تھا کہ مسلمان اتنی بڑی طاقت ہو سکتے ہیں کہ ہماری فوج کو شکست دے دیں گے لیکن اُدھر ایرانیوں کو انہوں نے بھگا دیا اور اُدھر ہر قل کے پاؤں اکھاڑ دیئے....

میں باہر نکل جایا کرتی تھی اور لوگوں سے پوچھتی تھی کہ مسلمان کیسے ہوتے ہیں اور وہ اتنی بڑی طاقت کس طرح بن گئے ہیں۔ آہستہ آہستہ مجھے مسلمانوں کے متعلق معلوم ہوا گیا کہ یہ کیسے لوگ ہیں۔ ہر کوئی کہتا تھا کہ مسلمان صرف خدا کی حکمرانی کو ماننے ہیں اور وہ نئی نوع انسان کے خیر خواہ ہیں۔ میں اپنے دو تین فوجی افسروں سے بھی ملی تھی جو محاذوں سے بھاگ کر پیچھے آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ مسلمان جب کسی شہر یا کسی بستی کو فتح کر لیتے ہیں تو وہ لوگوں کے گھروں میں لوٹ مار نہیں کرتے اور کسی عورت کو خواہ وہ کیسی ہی حسین کیوں نہ ہو ہاتھ لگانا تو دور کی بات ہے، اُس کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے۔ پھر ان میں خوبی یہ دیکھی کہ وہ مفتوحہ لوگوں پر واجبی ساجزیہ عائد کر دیتے ہیں اور تمام لوگوں کی عزت اور جان و مال کے ضامن بن جاتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کے دلوں میں ہر قل کی نفرت بیٹھی ہوئی تھی، انہوں نے مسلمانوں کا سلوک اور رویہ دیکھا تو لوگوں نے بازو پھیلا کر ان کا خیر مقدم کیا۔

”لیکن شارٹا!“ — حدید نے کہا — ”تمہاری فوج کی شکست کی وجہ صرف یہ نہیں کہ یہاں کے لوگ ہر قل سے نفرت کرتے تھے اور ان کے دلوں میں مسلمانوں کی محبت پیدا ہو گئی تھی۔ تم نے شاید سنا نہیں کہ مسلمان کس بہادری، بے خونی اور بے جگرگی سے لڑتے ہیں۔ ہر محاذ پر اور ہر لڑائی میں ہماری تعداد دشمن کی فوج سے چار پانچ گنا کم ہوتی ہے۔“

”سنا ہے“ — شارٹا نے کہا — ”مسلمان مجھے اپنے کردار اور اخلاق کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ لڑنے کے جذبے کی بدولت اچھے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں تمہارے

ساتھ آگئی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس شخص ہر قل سے اتنی نفرت ہو گئی ہے کہ میں اب وہاں دل پر جبر کر کے وقت گزار رہی تھی۔ مجھے پوری امید ہے کہ تم مجھے دھوکہ نہیں دو گے۔“

”دھوکہ دینا ہمارے ہاں گناہ ہے“ — حدید نے کہا — ”ایک عورت کو دھوکہ دینا تو ہمارے ہاں گناہ کبیرا سمجھا جاتا ہے۔ میں تمہیں اتنی سی بات بتا دیتا ہوں کہ میں تم سے محبت کر سکتا ہوں لیکن اپنے فرائض اس محبت پر قربان نہیں کروں گا۔“

”میں تمہیں پہلے بتا چکی ہوں کہ مجھے صرف شزاوی نہ سمجھ لیتا“ — شاریتا نے کہا — ”میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ تمہیں دیکھ کر اچانک میرے دل میں تمہاری محبت کس طرح پیدا ہو گئی لیکن میں تمہارے ساتھ محبت کا جذباتی کھیل کھیلنے نہیں آئی۔ یہ تمہیں بتا دیتی ہوں کہ تم میرے دل میں اتر گئے ہو لیکن تمہاری جس خوبی نے مجھے تمہارا گردیدہ بنایا ہے وہ یہ تھی کہ تم نے ہر قل کے سامنے پوری جرأت کے ساتھ بات کی اور بالکل صحیح بات کی۔ یہ جانتے ہوئے کہ تم ہر قل کے قیدی ہو اور ہر قل تمہیں قتل کر دے سکتا تھا، تم نے وہی بات کی جو تمہیں کرنی چاہئے تھی۔ کوئی شخص ہر قل کے منہ پر ایسی بات نہیں کر سکتا۔ میں نے مسلمانوں کے کردار کے متعلق جو کچھ سنا تھا وہ تم نے سچ ثابت کر دکھایا۔“

○

شاریتا کا حدید پر فریفتہ ہو جانا عجیب بات نہیں تھی۔ حدید خوبرو اور قد آور جوان تھا۔ اُس کی تراشی ہوئی داڑھی اس کے چہرے کی رونق کو دوبالا کرتی تھی۔ اُس کے چہرے پر جلال سا تھا۔ ایسا جلال انہی لوگوں کے چہروں پر ہوا کرتا ہے جو اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

اب وہ ایسے علاقے میں چلے جا رہے تھے جہاں ایک اور خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ خطرہ یہ تھا کہ روم کی فوج کے شکست خوردہ سپاہی ایسی بڑی طرح پسپا ہوئے تھے کہ کئی ایک جنگلوں میں جا چھپے تھے۔ یہ سب فردا فردا یا دو دو چار چار کی ٹولیوں میں بکھرے ہوئے کسی ایسے شہر کی طرف جا رہے تھے جو ابھی تک رومی فوج کے قبضے میں تھا۔ حدید اور شاریتا نے دور سے ایسے تین فوجی دیکھے تھے لیکن وہ فوجی انہیں نہیں دیکھ سکے تھے۔ فاصلہ خاصا زیادہ تھا۔

سورج اُفت پر پہنچ گیا تھا اور اب ان دونوں کو کہیں رک کر رات بسر کرنی تھی۔ کچھ اور آگے گئے تو حدید نے گھوڑا روک لیا اور شاریتا کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ شاریتا نے بھی گھوڑا روک لیا۔ حدید نے کان کھڑے کر لئے تھے۔ اس نے شاریتا سے کہا کہ اسے گھوڑے کے ہنسنے کی آواز سنائی دی ہے اور شاید کوئی آدمی باتیں بھی کر رہے ہیں۔ جس طرف سے یہ آوازیں آئی تھیں، حدید اور شاریتا نے اُس طرف دیکھا۔ اس طرف چھوٹی چھوٹی ٹیکریاں تھیں جو اتنی اونچی نہیں تھیں کہ کسی آدمی کو پوری طرح اپنے پیچھے چھپا سکیں۔ ہری گھاس اونچی تھی اور جنگلی پودے وغیرہ بھی تھے۔ تقریباً تین سو قدم دور حدید اور شاریتا کو تین آدمیوں کے کندھے اور سر نظر آئے۔ وہ گھوڑوں پر سوار تھے اور گھوڑوں کے کان نظر آ رہے تھے۔

سورج ابھی غروب ہو رہا تھا، ابھی اتنی روشنی موجود تھی کہ اتنی دور سے آدمی دیکھے اور پہچانے جاسکتے تھے۔ حدید اور شاریتا نے بڑی تیزی سے اپنے گھوڑے ایک طرف کو موڑ لئے اور قریبی ٹیکری کے پیچھے چلے گئے تاکہ وہ تین آدمی انہیں نہ دیکھ سکیں۔ انہیں توقع یہی تھی کہ ان سواروں نے انہیں نہیں دیکھا۔ وہ ایک بلند ٹیکری کی اوٹ میں ہو گئے تھے اور گھوڑوں کی رفتار ذرا تیز کر لی تھی۔ ان تینوں سواروں کا رخ مغرب کی طرف تھا اور حدید اور شاریتا مشرق کی طرف جا رہے تھے، یعنی ان کی سمیتیں ایک دوسرے سے الٹ تھیں۔ ابھی وہ ایک میل بھی دور نہیں گئے ہوں گے کہ انہیں ایک بڑی ہی خوبصورت جگہ نظر آئی۔ وہاں شفاف پانی کا چشمہ تھا اور یہ پانی چند گز لمبے چوڑے تالاب کی صورت میں اکٹھا ہو گیا تھا اور ایک طرف سے بہ رہا تھا۔ ارد گرد ذرا اونچی ٹیکریاں تھیں جن پر خوشنما درخت اور ہری بھری جھاڑیاں تھیں۔ ٹیکریوں اور پانی کے درمیان کشادہ جگہ تھی جہاں سرسبز گھاس تھی اور یہ جگہ رات گزارنے کے لئے نہایت موزوں تھی۔

وہ گھوڑوں سے اترے، حدید نے دونوں گھوڑوں سے زینیں اتاریں اور انہیں پانی پینے اور گھاس کھانے کے لئے چھوڑ دیا اور خود ایک طرف بیٹھ گئے اور شاریتا نے کھانے کا سامان نکالا۔

○

سورج کبھی کا غروب ہو چکا تھا لیکن چاند نے رات کو تاریک نہ ہونے دیا۔ ہرے

بھرے جنگل کی چاندنی اتنی شفاف تھی کہ سورج کے غروب ہونے کا احساس خاصا کم رہ گیا تھا۔ حدید اور شاریتا سونے کی تیاری کرنے لگے۔

”اب بے فکر ہو جاؤ حدید!“ — شاریتا نے کہا — ”اب ہلکے پیچھے کوئی نہیں آئے گا آرام اور اطمینان سے سو جاؤ۔“

”میرے پاس تلوار ہے، میں بے فکر ہوں“ — حدید نے کہا — ”کوئی ابھی گیا تو پورا مقابلہ کروں گا۔“

”وہ تین سوار جو ہم نے دیکھے تھے ہماری فوج کے تھے“ — شاریتا نے کہا — ”اچھا ہوا انہوں نے ہمیں نہیں دیکھا تھا۔ اتنی دُور سے میں پہچان تو نہیں سکی، شک ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کو میں جانتی پہچانتی ہوں۔ وہ اگلے گھوڑے پر سوار تھا اور اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔“

”جو کوئی بھی تھے، دُور نکل گئے ہوں گے“ — حدید نے کہا — ”صاف پتہ چلتا تھا کہ کسی میدان جنگ سے بھاگ آئے ہیں اور کسی شہر کو جارہے ہیں۔“

لینے ہی لگے تھے کہ انہیں دوڑتے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ دونوں نے چونک کر اُس طرف دیکھا۔ وہاں ایک رومی سپاہی کھڑا تھا۔

”کیا تم دوڑتے آئے تھے؟“ — شاریتا نے اس سے پوچھا — ”کہاں سے آئے ہو؟ کہاں جارہے ہو؟“

”بھوکا ہوں“ — رومی سپاہی نے بھکاریوں کی طرح کہا — ”مسلمانوں نے ہماری فوج کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ باقی جو لوگ بچ گئے وہ ایسے پسا ہوئے کہ بکھر کر ادھر ادھر بھاگ نکلے۔ مسلمان بڑی ظالم قوم ہے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ یہ عرب کے بدو ہیں جو صرف لوٹ مار کرتا جانتے ہیں، ان سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں لیکن وہ تھوڑے سے مسلمان جب ہمارے مقابلے میں آئے تو ہمیں شک ہونے لگا کہ یہ انسان نہیں جنتات ہیں۔ ہماری اتنی بڑی فوج کو انہوں نے خون میں نہلا دیا۔ میں آگے جا رہا تھا، آپ کو دیکھا تو آپ کے پاس چلا آیا۔ کچھ کھانے کو دے دیں ورنہ بھوک سے مر جاؤں گا۔“

”میدان جنگ سے بھاگنے والے بزدلوں کو بھوکا ہی مرنا چاہئے“ — شاریتا نے کہا — ”وہیں بیٹھ جاؤ، میں کھانے کو تمہیں کچھ دیتی ہوں۔“

حدید نے کھانے کی ایک دو چیزیں نکالیں اور اُنھ کو اس رومی سپاہی کو دے دیں۔

وہیں بیٹھ گیا تھا۔ وہ بے تابی اور بے صبری سے کھانے لگا۔

”میں مت بیٹھے رہو“ — شاریتا نے کہا — ”یہاں سے چلے جاؤ اور کہیں جا کر کھانا۔“

شاریتا کا انداز اور لہجہ شنرا دیوں والا تھا۔ حدید نے شاریتا سے کہا کہ وہ اس طرح رعوت سے بات نہ کرے اور بے چارے کو اطمینان سے کھانا کھانے دے۔ رومی سپاہی وہیں بیٹھا کھانا کھاتا رہا جیسے اُس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

رات کی خاموشی میں ایک گھوڑے کے ٹاپ سنائی دینے لگے جو قریب ہی قریب آتے جا رہے تھے۔ حدید کا ہاتھ فوراً تلوار کے دستے پر چلا گیا۔ جوں جوں رات گزرتی جا رہی تھی چاندنی اور زیادہ شفاف ہوتی چلی جا رہی تھی۔ جس طرف سے گھوڑے کے ٹاپ آگے بڑھ رہے تھے، اُس طرف دو چھوٹی ٹیکریوں کے سرے آپس میں ملتے تھے لیکن ان کے درمیان راستہ تھا۔ ایک رومی سپاہی اس راستے پر نمودار ہوا۔ اُس نے ایک گھوڑے کی باگ پکڑی ہوئی تھی اور گھوڑے پر ایک آدمی سوار تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ رومی سپاہی جو شاریتا کا دیا ہوا کھانا کھا رہا تھا، اُٹھ کھڑا ہوا اور گھوڑا سوار کی طرف چل پڑا۔ وہ تو جھکا جھکا، مرل سا آدمی تھا اور لگتا تھا جیسے وہ واقعی بھوک سے مرا جا رہا ہے لیکن وہ جب اُٹھ کر سوار کی طرف گیا تو اس کی چال میں تیزی بھی تھی اور مستعدی بھی۔

حدید تلوار ہاتھ میں لئے اُٹھ کھڑا ہوا لیکن اس نے آگے کو ایک قدم بھی نہ اٹھایا۔ شاریتا بھی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ دونوں رومی سپاہیوں نے مل کر گھوڑا سوار کو گھوڑے سے اٹھایا اور اُسے اُٹھائے اُٹھائے وہاں تک لے آئے جہاں حدید اور شاریتا نے سونے کے لئے کمل بچھائے تھے۔ سپاہیوں نے سوار کو ایک کمل پر بٹھادیا۔

”میں یقیناً خواب نہیں دیکھ رہا شاریتا!“ — سوار نے کہا — ”میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں یہ حقیقت ہے۔ حیران اس لئے ہو رہا ہوں کہ ہماری ملاقات کہاں آن کر ہوئی ہے۔ تم نے مجھے نہیں دیکھا تھا، میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔“

”ہاں کیلاش!“ — شاریتا نے کہا — ”تمہیں اس سے زیادہ حیران ہونا چاہئے جتنا ہو رہے ہو۔ میں نے ایسی توقع یا خواہش دل میں رکھی ہی نہیں تھی کہ تم مجھے راستے میں مل جاؤ گے.... کیا تم زخمی ہو؟“

”ہاں شاریتا!“ — اُس نے جواب دیا — ”دونوں ٹانگیں بُری طرح زخمی ہیں۔“

شاید ایک ٹانگ کی ہڈی بھی مجروح ہو گئی ہے.... تم یہاں کیسے آن پہنچی ہو؟ اور یہ کون ہے؟

”تم یقین نہیں کرو گے!“ — شاریٹا نے کہا — ”میں کون کہ میں تمہاری تلاش میں نکلی ہوں اور تمہارے پیچھے ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہوں تو تم نہیں مانو گے۔“

”میں نہیں مانوں گا“ — اُس زخمی نے کہا — ”اگر تمہارے ساتھ تین چار یا ایک دو ہی سہی رومی سپاہی ہوتے تو میں مان لیتا لیکن تمہارا یہ ساتھی رومی نہیں، یہ عربی معلوم ہوتا ہے اور یہ تمہارا محافظ لگتا ہی نہیں.... میں تمہارے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ مجھ سے تو پاؤں پر کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔ تم بچ بولو گی تو میں تمہارا راستہ نہیں روکوں گا نہ مجھ میں ہمت ہے۔ بہتر ہے بچ بول دو۔“

یہ زخمی خوبرو اور جوان سال آدمی تھا۔ رومی فوج میں افسری عہدے پر تھا اور شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا نام کیلاش تھا۔ وہ ایک چھاپے مار گروہ کا کمانڈر تھا۔ بہت ہی دلیر اور اپنی جان پر کھیل جانے کے لئے ہر وقت تیار۔ اس کے شب خون ہر قل کی فوج میں بہت ہی مشہور تھے۔ وہ چیتے کی طرح اپنے شکار پر جھپٹتا تھا اور پمپٹراس کے کہ اس کا شکار ذرا سنبھلے، وہ اپنا کام کر کے غائب ہو چکا ہوتا تھا۔

شاریٹا کو یہ خوبرو چھاپے مار لڑکین سے ہی اچھا لگتا تھا اور اُس نے کیلاش کو اپنا آئیڈیل بنالیا تھا۔ چونکہ وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس لئے شاریٹا سے ملنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔

شاریٹا نوجوانی میں داخل ہوئی تو لڑکپن کی پسندیدگی والہانہ محبت میں بدل گئی۔ کیلاش اسے ویسی ہی محبت سمجھتا تھا جیسی اکثر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں ہو جایا کرتی ہے لیکن شاریٹا کا یہ جذباتی معاملہ اس کی فطرت کا پابند تھا۔ اس نے حدید کو اپنے متعلق بنایا تھا کہ اس کی فطرت میں عسکری جذبہ غالب حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے اپنی فطرت کا جو نقشہ حدید کو دکھایا تھا، وہ کیلاش کو بھی دکھایا لیکن کیلاش اس محبت کو صرف جذباتی رنگ دیتا تھا اور اس کی تان اس پر ٹوٹتی تھی کہ وہ شاریٹا کے ساتھ شادی کرے گا۔ شاریٹا نے اسے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ جس روز وہ مسلمانوں کے کسی لشکر کو شکست دے کر آئے گا اُس روز وہ اُس کے ساتھ شادی کرے گی۔

کیلاش کی بہادری اور بے جگری کو تو وہ بڑی اچھی طرح جانتی تھی اور یہی وہ وصف

تھا جس نے اسے کیلاش کی محبت میں گرفتار کر لیا تھا لیکن اس محبت کا کیلاش پر یہ اثر ہوا کہ اُس نے جنگ پر جانے سے گریز شروع کر دیا اور کسی نہ کسی بہانے پیچھے ہی رہنے کی کوشش کی۔ شاریٹا کو اس کی یہ عادت اچھی نہ لگی۔ وہ تو اُسے کہا کرتی تھی کہ مجھے بھی ساتھ لے چلو اور میں بھی مردوں کی طرح لڑوں گی۔ کیلاش کو شاریٹا کی یہ باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ وہ ایک خوشبودار پھول ہے جسے وہ پھول کی صورت میں دیکھنا اور سونگھنا چاہتا ہے اور اس کی خواہش یہ ہے کہ جب وہ میدان جنگ سے واپس آئے تو شاریٹا اسے اپنے بازوؤں میں لے کر اپنے ساتھ لگالیا کرے۔

شاریٹا پر اس کا اثر یہ ہوا کہ اس نے کیلاش کی جو تصویر اپنے ذہن میں بنائی تھی، اسے کیلاش نے بد نما اور داغدار کر دیا۔ شاریٹا نے اسے یہ تو نہ کہا کہ وہ جس کیلاش سے محبت کرتی تھی وہ کیلاش محض ایک تصور تھا اور شاریٹا تصور پرست لڑکی نہیں بننا چاہتی۔ پھر یوں ہوا کہ خالد بن ولید، ابو عبیدہ، شرجیل بن حسنہ اور دوسرے نامور سالاروں کی قیادت میں مجاہدین اسلام کا لشکر قیصر روم کے خلاف طوفان کی طرح بڑھا تو کیلاش کو حکم ملا کہ وہ اپنا چھاپے مار گروہ لے کر آگے چلا جائے اور مسلمانوں کی خیمہ گاہوں پر شب خون مارے۔

یہ جنگ طول پکڑتی جا رہی تھی اور ہر محاذ پر فتح مسلمانوں کی ہوتی تھی اور قیصر روم کی فوجیں پیچھے ہی پیچھے ہٹی آرہی تھیں۔ شاریٹا کے خیالوں میں وہ انقلاب آنے لگا تھا جو وہ بڑی تفصیل سے حدید کو سنا چکی تھی۔ کیلاش اس کے دل سے اُتر گیا۔ اُس رات کیلاش بستیوں اور چھوٹی بڑی آبادیوں سے دور اس جنگل میں شاریٹا کے راستے میں آگیا اور ایسی حالت میں آیا کہ اس کی دونوں ٹانگیں بہت ہی بُری طرح زخمی تھیں اور ان زخموں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ چلنے پھرنے سے معذور تھا۔ اسے توقع تھی کہ شاریٹا کے دل میں اس کی محبت اگر پہلے سے بڑھی نہیں تو کم بھی نہیں ہوگی لیکن وہ شاریٹا کو اس جنگل میں ایک مسلمان کے ساتھ دیکھ کر پریشان ہو گیا اور اُس کا چہرہ دل سے اٹھنے والے قہر اور عتاب سے سرخ ہو گیا تھا۔

”مجھے زیادہ حیرت اور پریشانی میں نہ رکھو شاریٹا!“ — کیلاش نے کہا — ”اب بتا دو کہ یہ کون ہے اور تم اس کے ساتھ کہاں جا رہی ہو؟ اگر یہ تمہیں زبردستی اپنے ساتھ لے جا رہا ہو تو تم ہم تینوں کو دیکھ کر خوش ہو تیں اور دوڑ کر ہماری پناہ میں آ جاتیں۔“

تمہیں عذر ملے گا۔۔۔

”تم خوش قسمت ہو کہ میں زخمی ہوں“ — کیلاش نے کہا — ”میں زخمی نہ ہوتا تو تمہیں اس سے زیادہ بولنے کی مہلت نہ دیتا جتنا تم بول چکے ہو۔“

حدید کی مسکراہٹ کچھ اور زیادہ کھل اُٹھی اور اس نے کچھ بھی نہ کہا۔ کیلاش کے ساتھ جو دو سپاہی تھے وہ اُس کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ شاید کیلاش کے حکم کے منتظر تھے۔ وہ اس گفتگو میں دخل نہیں دے رہے تھے۔ کیلاش ایک تو افسر تھا اور دوسرے شاہی خاندان کا آدمی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے دونوں سپاہیوں کو بولنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔۔۔۔ کیلاش یہاں تک اس طرح پہنچا تھا کہ جب وہ اور اس کے دونوں سپاہی حدید اور شاریتا کو دور گھوڑوں پر سوار نظر آئے تھے تو ان دونوں نے ان تینوں کو دیکھ لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ کیلاش اور اس کے سپاہیوں نے انہیں نہیں دیکھا لیکن انہوں نے دیکھ لیا تھا۔ کیلاش کو کچھ شک ہوا تھا کہ یہ شاریتا ہے یا جو کوئی بھی ہے اس کی شکل و صورت شاریتا سے ملتی جلتی ہے۔ اگر یہ شاریتا نہیں تھی تو آخر ایک خوبصورت لڑکی تو تھی اور اس کے ساتھ صرف ایک آدمی تھا جبکہ کیلاش کے ساتھ دو سپاہی تھے۔ اس نے لڑکی کو پکڑنے کے لئے اپنے گھوڑے کا رخ اوھر کر لیا تھا۔

حدید اور شاریتا ایک بڑی لمبی ٹیکری کی اوٹ میں اپنے سفر کو جارہے تھے۔ کیلاش کے گھوڑے سوار سپاہی انہیں ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ کیلاش نے انہیں روک کر کہا کہ گھوڑوں سے اتریں، گھوڑے پیچھے رہنے دیں اور پیادہ دے پاؤں انہیں تلاش کریں۔ کیلاش کہیں پیچھے رک گیا تھا۔ حدید اور شاریتا نے چشمہ دیکھا اور وہ جگہ انہیں اچھی لگی اور وہیں رک گئے۔

رات تاریک ہو چکی تھی اور پورا چاند ابھر آیا تھا۔ آخر وہ دونوں سپاہیوں کو نظر آ گئے۔ دونوں اکٹھے آگے آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ وہ کیلاش کو اطلاع دینے چاہا ہے۔ وہ وہاں سے دوڑ پڑا اور یہ تھی قدموں کی وہ آہستہ آہستہ جو حدید اور شاریتا نے سنی تھی اور اوھر دیکھا تو ایک سپاہی کھڑا تھا۔ شاریتا نے اُس سے پوچھا تھا کہ وہ دوڑتا آیا ہے؟ اس سپاہی نے یہ فریب کاری کی کہ وہ بھوکا بھکاری بن گیا اور روٹی کی بھیک مانگنے لگا۔ شاریتا نے اس پر کچھ غصہ جھڑا تھا لیکن اسے واقعی بھوکا اور مجبور دیکھ کر کھانے کو کچھ دے دیا تھا۔ اتنے میں اس کا ساتھی کیلاش تک پہنچ گیا اور وہ کیلاش کو اور اپنے اور

”یہ مجھے نہیں لے جا رہا کیلاش!“ — شاریتا نے بڑی پختہ آواز میں کہا — ”میں اسے لے جا رہی ہوں اور تمہاری دنیا سے ہمیشہ کے لئے غائب ہو رہی ہوں۔ مجھے بھول جاؤ کیلاش! ہمارے راستے جدا ہو گئے ہیں۔“

”تمہیں لڑکیاں پاگل کہا کرتی ہیں“ — کیلاش نے کہا — ”وہ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ تمہیں یہاں دیکھ کر بھی مجھے یقین نہیں آتا کہ تم ایک مسلمان کے ساتھ بھاگی جا رہی ہو۔ تم نے شاہی خاندان کی عزت خاک میں ملا دی ہے۔“

”کیا تمہارے شاہی خاندان کی کوئی عزت رہ گئی ہے؟“ — حدید نے مسکراتے ہوئے پوچھا اور اسے بولنے کی مہلت دیئے بغیر کہا — ”دوسروں کی عزت کے ساتھ کھیلنے والوں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے جس انجام کو تمہارا شاہی خاندان پہنچ گیا ہے۔“

”ان بادشاہوں کی بیویاں گن لو“ — شاریتا بول پڑی — ”ان کی داشتائیں گن لو۔ نہیں گن سکو گے۔ شاہی خاندان کے آدمی جہاں کہیں کوئی خوبصورت لڑکی دیکھتے ہیں، حکم دے دیتے ہیں کہ اسے محل میں پہنچا دو۔ فوراً“ ان کے حکم کی تعمیل ہوتی ہے۔ ماں باپ اور بھائی بہنوں سے کس لڑکیاں چھین جھپٹ کر اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ جو علاقہ فتح کرتے ہیں وہاں ان کی فوج لڑکیوں پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ میری ماں کو قافلے سے اغوا کیا گیا اور روم کے بادشاہ نوکاس کے پاس پہنچا دیا گیا تھا۔ بادشاہ کا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ اُن والدین کی فریاد سنیں جن کی بیٹیاں اغوا ہو جاتی ہیں اور ان بیٹیوں کو ڈھونڈ نکالنے کا حکم دے لیکن یہاں بادشاہ قزاقوں سے بدتر ہے۔۔۔۔ یہی وہ وجوہات ہیں جنہوں نے میرے دل میں اس شاہی خاندان کی نفرت پیدا کی ہے۔“

”کیلاش بھائی!“ — حدید نے کہا — ”آج تمہاری ایک لڑکی جا رہی ہے اور تم کہتے ہو کہ شاہی خاندان کی بے عزتی ہو گئی ہے۔ میں اس لڑکی کو زبردستی نہیں لے جا رہا۔ یہ میری یا کسی اور کی داشتہ نہیں بنے گی نہ اسے تفریح طبع کا ذریعہ بنایا جائے گا۔ اگر میں اس کے ساتھ شادی کرنا چاہوں گا تو سپہ سالار کی اجازت کے بغیر نہیں کر سکوں گا۔ ایسا بھی نہیں ہو گا کہ یہ سپہ سالار کو اچھی لگی تو وہ اس پر قبضہ کر لے گا۔ اسے ہمارے ہاں اتنی ہی عزت ملے گی اور اتنی ہی وقار ملے گا جتنا ہمارے خلیفہ کے گھر کی مستورات کو اور سپہ سالاروں کی بیویوں کو ملتا ہے۔ عزت اور وقار دیکھنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ چلو۔ وہاں تمہارا علاج ہو گا اور تم نے اگر اسلام قبول کر لیا تو تمہاری عسکری قابلیت کے مطابق

ساتھی کے گھوڑوں کو ساتھ لے آیا۔ کیلاش نے جب شارینا کو قریب سے دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ تو تھی ہی شارینا اور اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ شاہی خاندان کی ایک لڑکی جنگل میں ایک اجنبی کے ساتھ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔

کیلاش نے شارینا کے ساتھ اور بھی بہت سی باتیں کیں لیکن شارینا پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اُس نے مسلمانوں پر لعن طعن کی اور اسلام کی بھی توہین کر ڈالی۔ شارینا کو یہ تاثر دینے کی بھرپور کوشش کی کہ یہ مسلمان ڈاکو اور لٹیرے ہیں اور ان کا نہ کوئی خدا ہے نہ مذہب!

”میں خوش قسمت نہیں کہ تم زخمی ہو“ — حدید نے کہا — ”تم خوش قسمت ہو کہ معذور ہو اور پاؤں پر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ ہم زخمی پر عورت پر بچے اور بوڑھے پر ہاتھ نہیں اٹھایا کرتے۔ تم نے میری بے عزتی کی ہے، میرے مذہب کی توہین کی ہے لیکن میں تم پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ اس اسلام کا حکم ہے جسے تم اچھا نہیں سمجھ رہے بلکہ کہتے ہو کہ یہ تو کوئی مذہب ہی نہیں۔“

”شارینا!“ — کیلاش نے کہا — ”اگر تم برا نہ جانو تو میں اپنے ان سپاہیوں کے ساتھ رات یہیں گزار لوں۔“

”میں بُرا کیوں جانو گی؟“ — شارینا نے کہا — ”جہاں جی چاہتا ہے وہاں لیٹ جاؤ۔“

”اور ہمارے پاس کھانے کا سامان ہے“ — حدید نے کیلاش سے کہا — ”لے لو اور کھا لو۔ کوئی اور ضرورت یا تکلیف ہو تو مجھے بتانا۔“

”مجھے کچھ نہیں چاہئے“ — کیلاش نے کہا اور شارینا سے مخاطب ہوا — ”شارینا! تم مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہی ہو۔ میری صرف یہ بات مان لو کہ تھوڑی سی دیر کے لئے الگ میرے پاس بیٹھنا۔“

”بیٹھ جاؤں گی“ — شارینا نے کہا — ”لیکن ایک بات میری بھی مان لو، مجھ سے دُور جا کر لیٹنا۔“

کیلاش نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ وہ یہاں سے تھوڑی دُور ٹیکری کے قریب اُس کا بستر بچھا دیں۔ سپاہی دوڑے گئے، گھوڑوں سے سفری بستر کھول لائے اور کچھ دُور زمین پر بچھا دیا۔ دونوں نے کیلاش کو اٹھایا اور بستر پر لٹا دیا۔ کیلاش کے کہنے پر سپاہیوں نے

اپنے سونے کا انتظام اس سے کچھ دُور کیا۔

شارینا کیلاش کے بستر پر جا بیٹھی اور اُس سے پوچھا کہ وہ اور کیا بات کہنا چاہتا ہے۔ کیلاش اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ واپس چلی چلے۔ شارینا اُسے اپنا فیصلہ سنا چکی تھی کہ وہ واپس جانے کے لئے نہیں جا رہی۔ کیلاش منت سماجت پر اُتر آیا اور پھر اسے مسلمانوں سے ڈرایا لیکن شارینا پر کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر شارینا اسے مایوس چھوڑ کر واپس حدید کے پاس جا پہنچی اور اس کے ساتھ بچھے ہوئے کبل پر لیٹ گئی۔ وہ دن بھر کے تھکے ہوئے تھے، بڑی جلدی سو گئے۔

آخر دونوں سپاہی اٹھے اور شاریتا اور حدید کی طرف آنے کی بجائے دوسری طرف چلے گئے۔ شاریتا کچھ حیران ہونے لگی کہ یہ دونوں اُس طرف کیوں جا رہے ہیں۔ اُس نے یہ دیکھ لیا کہ دونوں کی تلواریں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ دونوں ساتھ والی چھوٹی سے ٹیکری کی اوٹ میں ہو گئے۔ کیلاش لیٹ گیا۔ شاریتا کچھ اور چوکس ہو گئی۔ اسے کچھ اطمینان ہونے لگا کہ دونوں سپاہی کسی اور مقصد کے لئے اُس طرف چلے گئے ہیں لیکن یہ خیال بھی آیا کہ وہ اپنے گھوڑوں پر زینیں ڈالنے کے لئے گئے ہوں گے۔ آدھی رات کے وقت اس جنگل میں ان کا اور کام ہی کیا ہو سکتا تھا۔

اُس وقت تک شاریتا ایک پہلو پر لیٹی اُدھر دیکھتی رہی تھی۔ اب اُس نے کروٹ بدلنے کی ضرورت محسوس کی اور پیٹھ کے بل ہو گئی۔ اس وقت چاند آگے نکل گیا تھا۔ درختوں کے سائے لمبے ہو گئے تھے۔

شاریتا نے محسوس کیا کہ اُس پر کوئی سلیہ پڑ رہا ہے جو پہلے نہیں تھا۔ یہ دو سائے تھے جن میں سے ایک اُس کے جسم پر اور دوسرا حدید کے جسم پر آہستہ آہستہ ریگ رہا تھا۔ شاریتا نے اپنا دماغ حاضر رکھا اور فوراً پیچھے نہ دیکھا۔ وہ جان گئی کہ دونوں سپاہی ان کے سروں کی طرف سے دے پاؤں ان کی طرف آہستہ آہستہ آرہے ہیں۔

وہ دونوں عقل کے کورے معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے چاند کو نظر انداز کر دیا تھا جو اُن کی پیٹھ کی طرف تھا۔ انہوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ ابھی دور ہی تھے کہ ان کے سائے شاریتا اور حدید پر پڑنے لگے تھے۔

شاریتا پیٹھ کے بل پڑی رہی اور اُس نے کروٹ نہ بدلی۔ آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ڈری تو یقیناً ہوگی لیکن زیادہ ڈر یہ تھا کہ وہ حدید پر وار نہ کر جائیں۔ اسے اپنا نہیں حدید کا زیادہ خیال تھا۔ شاریتا کا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا۔

حدید اور شاریتا کے درمیان دو تین قدموں کا فاصلہ تھا۔ ایک سپاہی ان دونوں کے درمیان آن کھڑا ہوا، شاریتا کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا اور اپنا چہرہ شاریتا کے چہرے کے قریب لے گیا۔ شاریتا نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور اب وہ اس طرح آواز پیدا کر کے سانس لینے لگی جیسے گہری نیند سوئی ہوئی ہو۔

یہ سپاہی اٹھا۔ شاریتا نے سنکھیں دیکھا۔ دوسرا سپاہی حدید کے دوسرے پہلو کی طرف کھڑا تھا۔ شاریتا نے دیکھا کہ دونوں نے تلواریں ہاتھوں میں لے رکھی تھیں۔

رات گزر گئی تھی جب قریب کے ایک درخت پر بیٹھا ہوا ایک پرندہ ہلکی زور آدھی سے پھر پھرایا۔ شاریتا کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے قریب سوئے حدید کے ہلکے ہلکے خراٹے بتا رہے تھے کہ وہ بہت گہری نیند سویا ہوا ہے۔ شاریتا نے ویسے ہی لیٹے لیٹے دیکھا جہاں کیلاش نے بستر بچھ لیا تھا۔ اُن تینوں کو سویا ہوا ہونا چاہئے تھا لیکن کیلاش بیٹھا ہوا تھا اور ایک سپاہی اس کے دائیں اور دوسرا اس کے بائیں بیٹھا تھا اور کیلاش سرگوشیوں میں ان کے ساتھ کوئی بات کر رہا تھا۔

شاریتا کو ایک خیال تو یہ آیا کہ وہ کیلاش کو چاکر دیکھے اور اُس سے پوچھے کہ وہ ابھی تک کیوں جاگ رہا ہے۔ کیا زخم اسے سونے نہیں دے رہے یا وہ درد محسوس کر رہا ہے؟ اُس نے کچھ دیر سوچا اور ذرا سی دیر اس کے دل میں رحم کی لہر اٹھی۔ زخموں کے معاملے میں وہ کیلاش کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی لیکن اسے خیال آیا کہ کیلاش کے پاس جانیٹھے اور اُس کا دھیان اپنی پاؤں کی طرف کر کے اُس کے ذہن سے زخموں کا خیال نکال دے۔ وہ اٹھنے ہی لگی تھی کہ اُس کے دماغ میں ایک روشنی سی چمکی اور ایک شک ابھرا۔ شک کیلاش کی نیت پر تھا۔ وہ یہ کہ کیلاش سپاہیوں سے کہہ رہا ہو گا کہ ایسے طریقے سے شاریتا کو اٹھا لائیں کہ حدید کو پتہ نہ چل سکے۔ مطلب یہ کہ کیلاش اسے زبردستی اپنے ساتھ لے جانے کی سازش کر رہا ہو گا۔

شاریتا کی نیند اُٹ گئی۔ وہ لیٹی رہی اور انہیں دیکھتی رہی۔ کیلاش سرگوشیوں میں انہیں کچھ کہہ رہا تھا اور دونوں سپاہی بار بار شاریتا اور حدید کی طرف دیکھتے تھے۔ شاریتا کا شک پختہ ہوتا چلا گیا۔

رات اتنی خاموش تھی کہ اپنے سانسوں کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ اسے ایک سپاہی کی سرگوشی سنائی دی۔ ”دیر نہ کر۔“

اب تو کسی ٹمک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ دونوں سپاہی حدید کے پہلوؤں کے ساتھ لگے کھڑے تھے اور ان کے منہ ایک دوسرے کی طرف تھے۔ یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ حدید کو قتل کرنے آئے تھے۔ کوئی وقت نہیں تھا۔

تلوار حدید کے پاس تھی جو اُس کے پہلو کے ساتھ رکھی تھی۔ شاریتا کے پاس خنجر تھا جو اُس نے اپنے کپڑوں کے نیچے اُڑس رکھا تھا۔ سپاہی جو حدید اور شاریتا کے درمیان کھڑا تھا، وہ جھکا۔ شاریتا نے دیکھا کہ وہ حدید کی تلوار اٹھا رہا تھا۔

شاریتا آہستہ آہستہ اپنا دایاں ہاتھ اپنے کپڑوں کے اندر لے گئی۔ دوسرا سپاہی جو حدید کے پہلو کے ساتھ کھڑا تھا، وہ شاریتا کی اس حرکت کو نہ دیکھ سکا کیونکہ اس کے سامنے اس کا ساتھی کھڑا تھا۔ جو نہی یہ سپاہی حدید کی تلوار اٹھانے کے لئے جھکا، شاریتا بڑی ہی تیزی سے اٹھی، خنجر نکالا اور جھکے ہوئے سپاہی کی پیٹھ میں اُس جگہ پوری طاقت سے اتار دیا جہاں دل ہوتا ہے۔ اس سپاہی نے سیدھا ہونے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے کہ وہ پیچھے کو دیکھتا، شاریتا نے ایسا ہی ایک اور بھرپور وار اس کی پیٹھ پر کیا۔

حدید کی آنکھ ابھی تک نہیں کھلی تھی۔ سامنے والے سپاہی نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے ساتھی کی پیٹھ میں دوبار خنجر اتر گیا ہے۔ وہ اتنی جلدی فیصلہ نہ کر سکا کہ شاریتا پر تلوار کا وار کرے یا حدید کو پہلے قتل کر دے۔ شاریتا کا دماغ زیادہ تیز تھا۔ جس سپاہی کو اس نے خنجر مارے تھے، وہ ذرا سیدھا ہوا اور ایک طرف کو گرنے لگا لیکن گرنے سے پہلے ہی شاریتا نے اس کے پیچھے اپنے دونوں ہاتھ رکھے اور پوری طاقت سے اسے آگے کو دھکیلا۔ سپاہی سامنے والے سپاہی کے ساتھ ٹکرایا اور حدید کے اوپر گرا۔

حدید ہڑبڑا کر اٹھا۔ زخمی سپاہی کی تلوار گر پڑی تھی۔ شاریتا نے وہ تلوار اٹھالی اور حدید کے اٹھنے سے پہلے آگے کو جست لگائی اور تلوار کا بھرپور وار سپاہی کی گردن پر کیا اور اس کی آدھی گردن کاٹ ڈالی۔ اتنے میں حدید پوری طرح بیدار ہو کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اسے تو کچھ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ شاریتا نے جس سپاہی کی گردن کاٹ دی تھی، وہ ابھی گرا نہیں تھا۔ شاریتا نے تلوار برچھی کی طرح ماری اور اس سپاہی کے پیٹ میں اتار دی اور پھر زور سے پیچھے کو کھینچی۔ دونوں سپاہی مر گئے۔

حدید نے شاریتا سے پوچھا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ شاریتا نے کیلاش کی طرف چلتے ہوئے کہا۔ ”اس سے پوچھتے ہیں۔“

یہ ساری واردات جیسے آنکھ جھپکتے ہو گئی ہو۔ شاریتا اور حدید کیلاش کی طرف چل پڑے۔ کیلاش لیٹ گیا تھا لیکن اب بیٹھا ہوا تھا۔ اُس سے کھڑا تو ہوا ہی نہیں جاتا تھا۔

”بدطینت انسان!“ — شاریتا نے کیلاش کے پہلو میں تلوار کی نوک چھوتے ہوئے کہا۔ ”کیا تو مجھے اس طرح اپنے ساتھ لے جاسکتا تھا؟“

کیلاش منہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے شاریتا کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ جان گیا تھا کہ شاریتا اب وہ لڑکی نہیں جس کے ساتھ اُس نے محبت کی تھی بلکہ یہ لڑکی اب اُس کے لئے سراپا موت بن گئی تھی۔

”سچ بول، شاید میں تجھے معاف کر دوں!“ — حدید نے کہا۔ ”کیا تو نے مجھے قتل کروانا تھا یا ہم دونوں کو؟.... تیرا ارادہ کیا تھا؟“

”سچی بات بتاؤ!“ — شاریتا نے اب اُس کے سینے میں تلوار کی نوک چھوئی۔ ”مجھے بخش دو شاریتا!“ — کیلاش نے روتی ہوئی آواز سے کہا۔ ”میں نے تم سے محبت کی ہے اور تم کہیں بھی چلی جاؤ گی، میرے دل سے اپنی محبت نہیں نکال سکو گی۔“

”میرے اس ساتھی سے بات کرو جس نے تجھ سے کچھ پوچھا ہے۔“ — شاریتا نے ایک بار پھر تلوار کی نوک اس کے سینے میں چھو کر کہا۔ ”اس کے سوال کا صحیح جواب دے۔ ابھی تیرے جسم سے جان نکل جائے گی تو تیرے مژدہ دل سے میزری محبت بھی غائب ہو جائے گی.... فوراً بول، تیرا ارادہ کیا تھا۔“

”حدید!“ — شاریتا نے کہا۔ ”اے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اس نے تمہیں قتل کروانا چاہا تھا، بُری طرح ناکام رہا۔ تمہارا حق ہے کہ اسے ختم کر دو۔“

”میں تم دونوں سے التجا کرتا ہوں۔“ — کیلاش نے بھکاریوں کے لہجے میں کہا۔ ”مجھے قتل کرنے کا گناہ اپنے سر کیوں لینے ہوا!.... میں تو مر ہی رہا ہوں۔ مجھے اٹھا کر گھوڑے پر بٹھا دو۔ زندگی ہوئی تو منزل پر پہنچ جاؤں گا جو مجھے ممکن نظر نہیں آتا۔ ہو گا یہی کہ بھوکا پیاسا گھوڑے کی پیٹھ پر ہی مر جاؤں گا۔ نہ میں گھوڑے سے اتر سکتا ہوں نہ

چل سکتا ہوں اور اتر جاؤں بھی تو کسی کی مدد یا سہارے کے بغیر گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتا۔

”حدید!“ — شاریٹا نے جھنجھلا کر کہا — ”تم سوچ کیا رہے ہو؟ اسے تو میں ہی قتل کر دوں لیکن یہ تمہیں اپنا دشمن سمجھتا ہے اس لئے تم ہی اسے قتل کرو۔“

”میری ایک بات شاید تمہیں اچھی نہ لگے شاریٹا!“ — حدید نے اپنی مخصوص مسکراہٹ سے کہا — ”جو مجھے قتل کرنے آئے تھے انہیں تم نے قتل کر دیا ہے۔ میرا مذہب اس معذور شخص پر ہاتھ اٹھانے سے منع کرتا ہے جو اپنے آپ کھڑا بھی نہیں ہو سکتا اور صرف معذوری کی وجہ سے رحم کی بھیک مانگ رہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس تمام تر خطے میں میری اور اس کی فوجیں آپس میں لڑ رہی ہیں اس لئے یہ تمام علاقہ میدان جنگ ہے۔ اگر یہ شخص مجھ سے لڑ رہا ہو تا تو میں اس کا مقابلہ کر رہا ہوتا تو میں قتل ہو جاتا یا اسے نہ چھوڑتا لیکن یہاں معاملہ ذاتی ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے تمہاری خاطر قتل کرنا چاہا تھا۔ میں کسی اور مقصد کے لئے ایک عقیدہ دل میں بسائے اس میدان جنگ میں آیا تھا۔ اس مقصد اور اس عقیدے کے سامنے اس جیسے معذور آدمی کا قتل گناہ کبیرا ہے۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ آؤ باقی رات کچھ اور آرام کر لیں، صبح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“

شاریٹا نے کچھ کہا تو نہیں لیکن اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ اُسے حدید کا یہ فیصلہ منظور نہیں۔ اس نے حدید کو گھور کر دیکھا۔

”اسے گھوڑے پر بٹھا دیتے ہیں“ — شاریٹا نے کہا — ”تم جاؤ، اس کے گھوڑے پر زین ڈال کر گھوڑا یہاں لے آؤ۔“

کیلاش نے شاریٹا کا شکریہ ادا کیا اور بھکاریوں کی طرح دعائیں بھی دیں۔ گھوڑے کچھ دور ایک درخت کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ یہ تین گھوڑے کیلاش اور اس کے دونوں سپاہیوں کے تھے۔ حدید جا کر ایک گھوڑے پر زین ڈالنے لگا اور پھر اُس نے زین اچھی طرح کس کر باندھ دی اور گھوڑے کو کیلاش کے پاس لے آیا۔

اُس نے کیلاش کو دیکھا، وہ اب بیٹھا ہوا نہیں بلکہ ایک پہلو پر لیٹا ہوا تھا۔ شفاف چاندنی میں حدید کو کیلاش کا خون بہتا نظر آیا۔ تب اس نے دیکھا کہ کیلاش کا سر جسم سے کچھ الگ پڑا تھا لیکن گردن پوری طرح کٹی نہیں تھی۔ حدید نے شاریٹا کی طرف دیکھا۔

”کیا اس لئے مجھے یہاں سے چلنا کیا تھا؟“ — ”حدید نے شاریٹا سے پوچھا۔

”اصول اور عقیدے وہاں چلا کرتے ہیں جہاں سامنا غیرت والے اور کردار والے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے“ — شاریٹا نے کہا — ”تم اپنے مذہب کے پابند ہو، مجھ پر کوئی پابندی نہیں۔ میں نے اس کی گردن کاٹ دی ہے۔ میں نے اس کے ساتھ نیکی ہے کہ اسے قتل کر دیا ہے۔ اگر ہم اس کی بات مان لیتے اور اسے گھوڑے پر بٹھا دیتے تو یہ بھوک اور پیاس سے بڑی ہی آہستہ اور اذیت ناک موت مرتا۔ اس کی سزا یہی ہونی چاہئے تھی۔“

”پھر اسے مار کیوں؟“ — حدید نے پوچھا۔

”تم اتنی سی بات نہیں سمجھ سکے حدید!“ — شاریٹا نے کہا — ”اگر ہم اسے یہیں زندہ چھوڑ جاتے یا اسے گھوڑے پر بٹھا کر رخصت کر دیتے تو یہ شخص ہمارے لئے بہت بڑا خطرہ بن جاتا۔ اسے لڑائی سے بھاگے ہوئے اپنے جیسے رومی فوجی مل سکتے تھے۔ یہ پہلا کام یہ کرنا کہ انہیں ہمارے پیچھے ڈال دیتا۔ اسے قتل کر دینا ہی ٹھیک تھا۔“

دونوں اُس جگہ گئے جہاں رومی سپاہیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ انہوں نے وہ کبل اٹھا لے جن پر وہ سوئے تھے۔ کچھ پرے جا کر کبل بچھا کر لیتے اور سو گئے۔

صبح ابھی دھندلی تھی جب دونوں جاگ اٹھے اور کچھ کھاپی کر انہوں نے کیلاش اور اس کے سپاہیوں کے گھوڑے بھی اپنے گھوڑوں کے پیچھے باندھ لئے اور چل پڑے۔



ادھر رہاء میں ہر قل کے شاہی خاندان کے اتنے زیادہ افراد میں صرف ایک عورت تھی جو شاریٹا کے لئے پریشان تھی۔ وہ تھی اُس کی ماں۔ وہ روتی اور آہیں بھرتی تھی۔ اسے اتنا یقین ضرور تھا کہ شاریٹا اغوا نہیں ہوئی اور قتل بھی نہیں ہوئی۔ وہ اپنی بیٹی کے خیالات اور جذبات کو سمجھتی تھی۔ وہ یہ بھی سمجھ گئی کہ شاریٹا کو یہ مسلمان قیدی اچھا لگا ہو گا اور اسے رہا کروا کے اس کے ساتھ چلی گئی ہے لیکن شاریٹا زندہ بھی تھی تو ماں کو تو نہیں مل سکتی تھی۔

ہر قل شاریٹا کا اگر باپ نہیں تھا تو اس کی ماں کا خاوند تو تھا لیکن اس نے ایسی بے رخی کا مظاہرہ کیا تھا جیسے شاریٹا کے ساتھ اس کا کسی بھی قسم کا تعلق نہ تھا۔ ویسے بھی شاریٹا کی ماں ہر قل کے کام کی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنی نوجوانی اور جوانی ہر قل پر قربان کر

چکی تھی۔

اُس وقت شارینا ہر قل کے دل یا ذہن میں داخل ہو نہیں سکتی تھی کیونکہ ہر قل کے اعصاب پر اور سوچوں پر شکست غالب آگئی تھی اور وہ سوچ سوچ کر تھک گیا تھا کہ شکست کو اسی مرحلے پر کس طرح روک لے اور پھر شکست کو فتح میں کس طرح تبدیل کرے۔ کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

شارینا کی ماں جب اس کی گمشدگی کی اطلاع ہر قل کو دینے گئی تھی تو ہر قل نے اسے ٹالنے کے لئے بے رخی کی تھی۔ اس نے کچھ اس طرح کے الفاظ کہے تھے کہ جانے والوں کا مجھے غم نہیں، میں آنے والوں کا انتظار کر رہا ہوں۔ شارینا کی ماں یہ الفاظ سن کر ہر قل کے کمرے سے نکل گئی تھی۔

وہ کون تھے جن کے متعلق ہر قل نے کہا تھا کہ وہ آنے والوں کا انتظار کر رہا ہے؟

اس سوال کا جواب تاریخ میں موجود اور محفوظ ہے۔ مؤرخوں نے ہر قل کی اُس وقت کی بے تمایاں اور خیالوں کی قلابازیاں قلمبند کر لی تھیں اور کچھ سینہ بہ سینہ آج کے دور تک پہنچیں.... یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ہر قل کی اتنی کثیر فوج ہر میدان میں قلیل تعداد مجاہدین اسلام سے شکست کھاتی پسپائی ہوتی چلی جا رہی تھی حتیٰ کہ پورا ملک شام خالی کر گئی اور بحیرہ روم کے کناروں تک جا پہنچی۔ کچھ بڑے قلعہ بند شہر ابھی رومیوں کے پاس تھے۔ ان میں قابل ذکر انطاکیہ، حلب، مرعش، بیروت ہیں۔ چند اور مقامات بھی تھے جو ابھی رومیوں کے ہاتھ میں تھے۔

ہر قل نے اپنی فوج ان مقامات پر تقسیم کر دی اور حکم یہ دیا کہ اب فوج اکٹھی نہیں بلکہ بکھرے ہوئے ٹکڑوں کی صورت میں لڑے گی۔ اس کی چال جیسا کہ پہلے سنایا گیا ہے، یہ تھی کہ اس کے مطابق مسلمانوں کا لشکر بھی بٹ جائے گا اور جو پہلے ہی قلیل تعداد میں ہے، اور زیادہ قلیل ہو جائے گا۔

اب وہ خود رہاء میں جا پہنچا تھا اور اُس کا منصوبہ یہ تھا کہ اس ساری فوج کو ایک مقام پر اکٹھا کر لے اور پھر مسلمانوں کے لشکر کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں پر حملہ کرے۔ چال تو بڑی اچھی تھی لیکن اپنی فوج کو اکٹھا کرنا اُس کے لئے دشوار ہو رہا تھا۔ اُس نے ان تمام مقامات پر پیغام بھیج دیا تھا کہ فوج رہاء میں آکر اکٹھی ہو جائے۔

ابھی تک کوئی قاصد واپس نہیں آیا تھا۔ یہ تھے وہ لوگ جن کے متعلق اُس نے کہا

تھا کہ وہ آنے والوں کے انتظار میں ہے۔

اُس نے چال تو بڑی اچھی سوچی تھی لیکن وہ بھول گیا تھا کہ مجاہدین اسلام کے سپہ سالار اور دیگر سالار بھی کچھ عقل رکھتے ہیں۔ اسے ابھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ عرب کے سپہ سالاروں نے اس کی یہ چال پہلے ہی بیکار کر دی ہے۔ وہ اس طرح کہ ہر قل نے اپنی فوج کو جن مقامات پر بکھیر دیا تھا، مجاہدین اسلام کے سپہ سالار نے اپنے لشکر کو اسی کے مطابق تقسیم کر کے ان مقامات کی طرف بھیج دیا تھا۔

ہر قل کی یہ چال یہاں تک تو کامیاب تھی کہ مسلمانوں کا لشکر اس کی سوچ کے مطابق بکھر گیا تھا لیکن اسے ابھی یہ بتانے والا کوئی نہ تھا کہ مسلمانوں کے بکھرے ہوئے لشکر نے رومی فوج کو ان مقامات پر روک لیا ہے جہاں ہر قل نے اُس کے ٹکڑے کر کے بھیجا تھا۔ ہر مقام پر مسلمانوں نے رومی فوج کے راستے مسدود کر دیئے۔

ان مقامات میں سب سے بڑا مقام انطاکیہ تھا۔ ہر قل کو اپنے اس قلعہ بند شہر پر بڑا ہی ناز تھا۔ ہونا بھی چاہئے تھا۔ اس کا محل وقوع ہی ایسا تھا کہ اس کے مزید دفاع کی ضرورت ہی نہیں رہتی تھی۔ پھر بھی اس شہر کے چاروں طرف چوڑی اور انتہائی مضبوط اور بلند دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ ان دیواروں کی بلندی دیکھنے والوں کو حیران کر دیتی تھی۔ وہ پہاڑی علاقہ تھا اور شہر ایسی جگہ آباد کیا گیا تھا کہ چاروں طرف پہاڑ تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس شہر کو پہاڑیوں نے آغوش میں لے رکھا ہے۔ شہر تک پہنچنے کے لئے اس پہاڑی علاقے کی بھول حلیوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ مختصر یہ کہ انطاکیہ شام کا انتہا درجے کا مستحکم اور ناقابلِ تسخیر شہر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر قل کے جو فوجی دستے مجاہدین اسلام کے نعروں اور تلواروں سے بچ نکلتے تھے وہ انطاکیہ کا رخ کر لیتے تھے۔ انطاکیہ کو ہی وہ ایسی پناہ گاہ سمجھتے تھے جس کے متعلق انہیں پورا یقین تھا کہ اسے مسلمان کسی طور فتح نہیں کر سکیں گے۔

اس طرح انطاکیہ میں اُس تعداد سے کہیں زیادہ فوج اکٹھی ہو گئی تھی جو عام حالات میں وہاں رکھی جاتی۔ اسلامی لشکر کے سپہ سالار ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ ان کے دست راست خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے.... ہم داستان تو کچھ اور سن رہے ہیں لیکن تاریخ اسلام کے عظیم سپہ سالار خالد بن ولید کا نام آیا ہے تو بے محل نہ ہو گا کہ ان کا تھوڑا سا ذکر ہو جائے۔ ہم نے اس واقعہ کا تفصیلی ذکر اپنی کتاب — ”شمشیر بے

نیام“ — میں کیا ہے۔ یہاں اتنا ہی بتائیں گے کہ قیصر روم کی فوجوں کے قدم ملک شام سے خالد بن ولید نے اکھاڑے تھے اور یہ تاریخ اسلام کا ایک درخشندہ باب ہے۔ ابو عبیدہ خالد بن ولید کے ماتحت تھے لیکن رومی فوجوں کے قدم اکھر گئے اور ان کی فوج شہر پہ شہر خالی کرتی پیچھے ہی پیچھے ہٹنے لگی تو امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابو عبیدہ کو سپہ سالار بنا کر خالد بن ولید کو ان کے ماتحت کر دیا۔

آج ہم ”احساب“ احساب“ کے نعرے سنتے ہیں تو دھیان خلفائے راشدین کے دور کی طرف چلا جاتا ہے جب احساب کے اعلان نہیں کئے جاتے تھے نہ احساب کے بیان دیئے جاتے تھے۔ اُس وقت کسی بڑے حاکم کا احساب ہو چکنا اور اسے سزا سنادی جاتی تو قوم کو پتہ چلتا تھا اور سب اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی میں مزید چوکس ہو جاتے تھے۔ نظم و نسق اور سزا و جزا کی بڑی ہی واضح مثال خالد بن ولید کی ہے۔ مختصراً یہ واقعہ اس طرح ہوا کہ خالد بن ولید نے ایک شاعر کو دس ہزار درہم انعام دے دیا تھا۔ اس کی اطلاع امیر المومنین حضرت عمرؓ کو مل گئی۔ انہوں نے اُسی وقت قاصد بھیجا کہ خالد بن ولید کو باقاعدہ گرفتار کر کے مدینہ لایا جائے۔

وہ خالد بن ولید ہی تھے جن کی عسکری فہم و فراست اور بے مثال شجاعت کی بدولت آدھا ملک شام مجاہدین کے قبضے میں آگیا تھا اور رومی فوجیں کسی نہ کسی مقام پر جم کر لڑنے کے لئے یکجا اور منظم ہو رہی تھیں۔ جنگ ایسے عروج پر جا پہنچی تھی جہاں ذرا سی بھی کوتاہی یا کم فہمی سے پانسہ پلٹ سکتا تھا۔ جنگی امور کے غیر مسلم مبصر لکھتے ہیں کہ ایسی صورت حال میں خالد بن ولید جیسے قابل جرنیل کو ذرا سی غلطی پر پیچھے بلا لینا بہت بڑی جنگی لغزش تھی لیکن حضرت عمرؓ قوم میں ڈسپلن قائم رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے یہ خطرہ مول لے لیا کہ خالد بن ولید کو سپہ سالاری سے معزول کر کے مدینہ بلا لیا اور ان کی جگہ ابو عبیدہ کو سپہ سالار بنا دیا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ آج ایک سپہ سالار نے خلافِ دین حرکت کی ہے تو کل یہ بدعت نیچے کے درجوں تک آجائے گی اور اس کا نتیجہ یہی ہو گا کہ اسلام کی پھیلی ہوئی سلطنت سُکنے لگے گی۔

امیر المومنین نے خالد بن ولید سے کہا کہ تم وہ وقت بھول گئے ہو جب ہم لوگ بڑی مشکل سے دو وقت کی روٹی کھاتے تھے اور آج تم نے ایک شاعر کو دس ہزار درہم انعام دے دیا ہے اور انعام اس وجہ سے دیا ہے کہ اُس نے تمہاری مدح میں شعر کے

ہیں۔

خالد بن ولید نے اپنی صفائی میں کہا کہ انہوں نے یہ رقم اپنی ذاتی جیب سے دی ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ تم نے اُس اپنی جیب سے یہ رقم دی ہے تو یہ اصراف یعنی بے جا فضول خرچی ہے اور اگر تم نے یہ رقم مالِ غنیمت میں سے دی ہے تو یہ بددیانتی ہے۔ خالد بن ولید کے کردار کی عظمت دیکھئے کہ وہ اس قدر طاقات حاصل کر چکے تھے کہ واپس شام جا کر اپنے مفتوحہ علاقوں میں خود مختاری کا اعلان کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا سوچا ہی نہیں اور امیر المومنین نے انہیں معزولی کی جو سزا سنائی تھی وہ سر تسلیم خم کر کے قبول کر لی۔ امیر المومنین کے حکم سے خالد بن ولید اپنے محاذ پر واپس چلے گئے مگر اب وہ اپنے لشکر کے سپہ سالار نہیں تھے بلکہ ابو عبیدہ کی صوابدید پر چھوڑ دیئے گئے تھے کہ وہ انہیں جس طرح چاہیں استعفا کی کریں۔

غیر ملکی تاریخ نویسوں اور مبصروں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات کا اصل باعث یہی تھا کہ ان میں ڈسپلن تھا اور دیانتداری تھی۔ وہ خدا کے نام پر لڑتے تھے اور خدا کے دکھائے ہوئے راستے پر ہی چلتے تھے۔ سزا و جزا اور عدل و انصاف کے معاملے میں کسی کا درجہ نہیں دیکھا جاتا تھا۔

○

انطاکیہ میں رومی فوج کی تعداد بے انداز ہو گئی تھی اور شہر کا دفاع بھی غیر معمولی طور پر مستحکم تھا۔ اور مجاہدین اسلام کی تعداد بہت ہی تھوڑی تھی اور جو تھی وہ بھی مسلسل پیش قدمی اور لڑائیوں کی وجہ سے تھکی ماندی تھی۔ ان احوال و کوائف میں ابو عبیدہ نے خالد بن ولید اور دوسرے سالاروں سے مشورہ کر کے فیصلہ کر لیا کہ انطاکیہ کو محاصرے میں لیں گے اور رومیوں کی اس فوج سے ہتھیار ڈولوائیں گے۔ بظاہر یہ ممکن نہیں تھا لیکن ابو عبیدہ نے اپنے لشکر کو اکٹھا کر کے کہا کہ اس زہریلے ناگ کو اگر ہم نے سستانے کی ذرا سی بھی مہلت دے دی تو یہ تازہ دم ہو کر ایسا جوابی حملہ کرے گا کہ اپنی پسپائی کو پیش قدمی میں بدل ڈالے گا۔

”اسلام کے پاسناؤ!“ — سپہ سالار ابو عبیدہ نے اپنے لشکر سے کہا — ”یہ نیبوں اور پیغمبروں کی سرزمین ہے۔ اس سرزمین پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوئی ہیں اور ہوتی رہیں گی لیکن شرط یہ ہے کہ ہم اللہ کے اس پاک خطے سے ناپاک لوگوں کو بے دخل کر

دیں۔ اُدھر تمہارے بھائیوں نے آتش پرستوں کا صفایا کر دیا ہے۔ اُدھر ہم نے ابھی اپنا فرض پورا نہیں کیا۔ اپنے آپ سے پوچھو، کیا اللہ کی بادشاہی اچھی ہے یا گنہگار انسانوں کے خاندان کی بادشاہی؟.... ہمارا یہ ایمان ہے کہ ہم اللہ کی بادشاہی چاہتے ہیں۔ یہی ایک ذریعہ ہے جو انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلا سکتا ہے.... یہ مت سوچو کہ یہ رومی عیسائی ہیں اس لئے یہ اہل کتاب ہیں۔ ان لوگوں کی حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار ہیں لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کے بالکل اُلٹ چلتے ہیں۔ روم کا ایک شاہی خاندان ہے جو اللہ کے اس پاک خطے کو اپنی بادشاہی میں شامل کئے ہوئے ہے۔ یہ اللہ کے دین کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ تم انہیں یہاں تک شکست پہ شکست دیتے چلے آ رہے ہو مگر اب وہ ایسی پناہ میں پہنچ گئے ہیں جو بظاہر ناقابلِ تسخیر ہے۔ میں تمہیں اتنی خطرناک جنگی مہم میں جانے کا حکم نہیں دے سکتا کیونکہ یہ مہم خون اور جانوں کے نذرانے مانگتی ہے۔ آج تم یوں سمجھ لو کہ اللہ تمہیں براہِ راست حکم دے رہا ہے کہ ان پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دو جنہوں نے دینِ الہی کے دشمنوں کو اپنی پناہ میں لے رکھا ہے۔“

ابو عبیدہؓ نے اپنے اس تاریخی خطاب میں اور بھی بہت کچھ کہنا تھا۔ مجاہدینِ اسلام کو ایسے جذباتی خطاب کی ضرورت کم ہی محسوس ہوا کرتی تھی۔ وہ ایمان کے پکے اور صریح رسالت کے صحیح معنوں میں پروانے تھے۔ ان کے دلوں میں کوئی شک نہیں تھا۔ وہ آج کے مسلمانوں کی طرح یوں نہیں کیا کرتے تھے کہ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آیا وہاں اپنی ہی انگلیاں چوم کر آنکھوں سے لگا لیں۔ مجاہدینِ اللہ کے رسولؐ کے اشارے کے منتظر رہتے تھے اور جانیں قربان کر دیا کرتے تھے۔ اب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ نہیں تھے۔ آپؐ دنیا سے اُٹھ گئے تھے لیکن مردانِ حرؒ پر آپؐ کی غیر حاضری کا یہ اثر ہوا کہ وہ پہلے سے زیادہ دیندار ہو گئے اور اسلامی تعلیمات کی پابندی پہلے سے زیادہ تذبذب سے کرنے لگے تھے۔

الطاحیہ پر حملے سے پہلے ابو عبیدہؓ اور خالد بن ولیدؓ نے ضروری سمجھا کہ مجاہدین کو بتا دیا جائے کہ اب ہم جو قلعہ سر کرنے جا رہے ہیں وہ اُن قلعوں جیسا نہیں جو اب تک ہم سر کرتے آئے ہیں۔ اب ہم پہاڑوں سے ٹکرانے جا رہے ہیں۔ یہ وجہ تھی کہ مجاہدینِ اسلام کو یاد دلانا پڑا کہ اللہ کے حکم سے اللہ کی خوشنودی کے لئے لڑ رہے ہیں اور اب اللہ

ان سے اور زیادہ قربانی مانگ رہا ہے۔

مجاہدینِ زندگی اور موت کا معرکہ لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔

اُسی روز یا اس سے اگلے روز ابو عبیدہؓ اپنے خیمے میں بیٹھے سالاروں کے ساتھ صلاح مشورے کر رہے تھے اور الطاحیہ کو محاصرے میں لینے کی سکیم تیار ہو رہی تھی کہ انہیں اطلاع دی گئی کہ اپنا ایک عہدیدار حدید بن مومن خزر ج رومی فوج کی قید سے فرار ہو کر آیا ہے اور اس کے ساتھ ایک رومی لڑکی ہے۔ دربان نے یہ بھی بتایا کہ یہ دونوں رُہاء سے آئے ہیں۔ ابو عبیدہؓ نے دونوں کو فوراً اندر بلا لیا۔

حدید شاربنا کے ساتھ خیمے میں داخل ہوا اور تمام سالاروں سے مصافحہ کیا۔

”میری داستان سفر خاصی لمبی ہے“ — حدید نے کہا۔ — ”آپ کے پاس جب اتنی فرصت ہوگی مجھے بلا لیں، ابھی کچھ ضروری باتیں آپ کو بتانی ہیں، یہ سن لیں۔“

سپہ سالار ابو عبیدہؓ نے جیٹے، تمام سالار جو وہاں موجود تھے، حدید کو بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ حدید چھاپے اور شب خون مارنے میں خصوصی مہارت رکھتا تھا۔ اس کام کے لئے دلیری اور جسمانی پھرتی کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے لیکن عقل اور حاضر دماغی کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ سب خوبیاں حدید میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ دشمن کے ٹھکانوں پر کسی نہ کسی طرح پہنچ کر وہاں سے جنگی نوعیت کی خبریں لے آنا حدید کا دوسرا کمال تھا۔ ان اوصاف کی بدولت حدید تمام سالاروں میں مقبول تھا۔ وہ قید ہونے والا مجاہد نہیں تھا لیکن شب خون ایسی غیر معمولی دلیری سے مارتا تھا کہ دشمن کے پیٹ میں اُتر جاتا تھا۔ ایسی ہی ایک مہم میں وہ پکڑا گیا تھا۔ رومی افسروں نے جب اس کے ساتھ باتیں کیں تو انہوں نے محسوس کیا کہ یہ تو بڑا قیمتی آدمی ہے۔ اسے ہر قتل تک پہنچایا گیا اور ہر قتل اسے رُہاء اپنے ساتھ لے گیا تھا کہ اس سے کلام کی باتیں معلوم کر لے گا۔ ہر قتل تو بڑا ہی ظالم قصائی تھا لیکن حدید اور اس جیسے تین اور مسلمان قیدیوں پر اس نے ذرا سا بھی تشدد نہ کیا۔ رکھا تو انہیں قید خانے میں ہی لیکن مہمانوں کی طرح۔ انہیں ہر طرح کی سہولت دی اور کھانا و سیاہی دیا جاتا رہا جیسا مہمانوں کو دیا جاتا تھا۔

”یہ لڑکی کون ہے؟“ — ابو عبیدہؓ نے پوچھا۔ — ”اور یہ تمہارے ساتھ کیوں آئی ہے؟“

حدید نے تفصیلاً ”ستایا کہ ہر قتل نے اُسے کس طرح اپنے دربار میں بلایا، کیا پوچھا اور

تھا۔

ابو عبیدہؓ خالد بن ولید اور دوسرے سالاروں کے لئے یہ خبر حوصلہ افزا تھی کہ ہر قل انطاکیہ میں نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انطاکیہ میں جو رومی جرنیل تھے وہ اوسط درجہ عسکری قابلیت کے مالک تھے۔ ابو عبیدہؓ اور خالد بن ولید بڑے ہی دُور اندیش سالار تھے اور ان کی نگاہیں بہت دور تک اور بڑی گہرائی تک دیکھ سکتی تھیں۔ ابو عبیدہؓ نے حدید سے پوچھا کہ ہر قل کی ذہنی اور جذباتی حالت کیسی ہے۔

”یہ مجھ سے پوچھیں“ — شارینا نے کہا — ”جس شخص نے اپنے ساتھ ایک شاہی نجومی اور ایک شاہی جوتی رکھا ہوا ہے اور اپنے فیصلے ان کے زائچوں کے مطابق کرتا ہے، اس کی ذہنی اور جذباتی حالت کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں“ — شارینا نے تفصیل سے سنایا کہ ہر قل نے کس طرح اپنے نجومی کو اپنے ہاتھوں قتل کر دیا ہے اور جوتی نے اسے کھری باتیں کہیں تو سب حیران رہ گئے کہ ہر قل نے اس کی جان نہ لی۔ پھر اس نے حدید کو بلا کر پوچھا کہ اسے اس کی خامیاں اور مسلمانوں کی خوبیاں بتائے۔ شارینا نے یہ ساری باتیں سنا کر کہا — ”ذہنی لحاظ سے ہر قل کے پاؤں اکھڑ چکے ہیں اور وہ شکست کو قبول کر چکا ہے اور اب بے بسی کی حالت میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ شاید وہ کسی معجزے کی توقع رکھتا ہے۔“

سپہ سالار ابو عبیدہؓ کے لئے ہر قل کی اس ذہنی حالت کی اطلاع بڑی قیمتی اور کار آمد تھی۔ حدید اور شارینا کا اُس وقت وہاں پہنچ جانا جب سپہ سالار انطاکیہ پر حملے کا پلان بنا رہا تھا، بظاہر اتفاقیہ بات تھی لیکن درحقیقت یہ اللہ کی مدد تھی کہ اس نے ان دونوں کو نہایت موزوں وقت پر ابو عبیدہؓ کے پاس بھیج دیا تھا۔

ابو عبیدہؓ نے شارینا کو یہ پتہ نہ چلے دیا کہ انہیں اس پر کچھ شک ہے۔ اس کے ساتھ ابو عبیدہؓ بڑی شفقت سے پیش آئے اور اسے بتایا کہ سالاروں کی اور کچھ مجاہدین کی بیویاں اور ہمیشہ وغیرہ لشکر کے ساتھ ہیں۔ اسے ان عورتوں کے ساتھ رہنا پڑے گا۔ اسے یہ بھی بتایا کہ اس کی عزت کا اور ہر ضرورت کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔

شارینا کو مستورات کے خیموں میں بھیج دیا گیا اور حدید کو ابو عبیدہؓ نے اپنے ساتھ ہی رکھا۔ ان نئی اطلاعات کے مطابق سپہ سالار ابو عبیدہؓ نے انطاکیہ پر حملے کے منصوبے پر نظر ثانی شروع کر دی۔ اس وقت وہ انطاکیہ کے قریب ہی کہیں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔

اس نے یعنی حدید نے کیا کہا تھا اور پھر اس لڑکی نے اسے کس طرح رہا کروایا تھا۔ شارینا کو بجا طور پر شک کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ وہ ایک توشاہی خاندان کی لڑکی تھی اور دوسرے بہت ہی خوبصورت تھی اور اس کا دوسرا وصف یہ سامنے آیا کہ وہ بے حد دلیر اور عقلمند لڑکی تھی۔ عین ممکن تھا کہ یہ تخریب کاری کے لئے آئی ہو۔

شارینا نے اپنے اُن ہی خیالات، جذبات اور احساسات کا اظہار کیا جو وہ راستے میں حدید سے کر چکی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ شاہی خاندان کی لڑکی ہے ہی نہیں۔ اسے ایک قافلے سے اغوا کیا گیا تھا۔

”ٹھہرو ذرا!“ — سپہ سالار ابو عبیدہؓ نے کہا — ”تم دونوں کیا کہہ رہے ہو؟....“

ابو عبیدہؓ ان دونوں کی باتیں ایسے انہماک سے سن رہے تھے کہ انہوں نے پہلے توجہ ہی نہ دی کہ ہر قل رُہاء میں ہے۔ انہیں اچانک خیال آیا تو شارینا کو نوک کر چپ کر دیا اور ہر قل کے متعلق پوچھا۔ حدید نے انہیں واضح الفاظ میں بتایا کہ ہر قل وہیں ہے۔ ابو عبیدہؓ اور دوسرے سالار بھی یہ سن کر حیران ہوئے کہ ہر قل کو انطاکیہ میں ہونا چاہئے تھا لیکن وہ دُور رُہاء میں بیٹھا ہے۔ یہ سن کر سالاروں کو خوشی ہوئی کہ ہر قل انطاکیہ میں نہیں۔

تقریباً تمام مؤرخوں نے لکھا ہے کہ ہر قل کو اپنی فوج کے ساتھ رہنا چاہئے تھے اور اُس وقت اس کی فوج کا بیشتر حصہ انطاکیہ میں جمع ہو گیا تھا۔ انطاکیہ ہی ایک مستحکم مقام تھا جہاں وہ مسلمانوں کا مقابلہ ایسے کارگر طریقے سے کر سکتا تھا کہ مسلمان انطاکیہ کی دیواروں سے ٹکرا کر ختم نہ ہوتے تو اتنے کمزور ضرور ہو جاتے کہ باپوس ہو کر پسپائی کا راستہ اختیار کرتے، پھر ہر قل ان کے تعاقب میں جا کر انہیں ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتا۔ مؤرخوں اور جنگی مبصرین نے لکھا ہے کہ ہر قل طاقت ور بادشاہ اور بڑا ہی منجھا ہوا اور بڑا ہی تجربہ کار جرنیل تھا۔ وہ جدھر کا رخ کر لیتا اور فتح اس کے قدم چومتی تھی، اور وہ ہر لڑائی میں فتح کی ہی توقع رکھتا تھا لیکن اہل اسلام نے اُسے پے در پے اتنی شکستیں دیں کہ وہ ذہنی طور پر مایوس ہو گیا۔ انتہائی دشوار حالات میں مناسب اور موزوں فیصلہ کر لینا اس کا خصوصی کمال تھا لیکن اب اسے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا کرتے سوائے اس کے کہ وہ اپنی بکھری ہوئی فوج کو رُہاء میں اکٹھا کرنے کی کوشش کر رہا

سپہ سالار نے سالاروں کو بتایا کہ کل صبح انطاکیہ کی طرف پیش قدمی ہوگی۔

○

شب و روز گزرتے چلے جا رہے تھے اور ہر قل کی بے چینی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اسے جن کا انتظار تھا کہ آئیں گے ان میں سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ وہ غصے سے باؤلا ہوا جا رہا تھا۔

سات آٹھ دن اور گزر گئے ہوں گے کہ اسے اطلاع دی گئی کہ انطاکیہ سے اس کا ایک جرنیل راستین آیا ہے۔ ہر قل اچھل کر اٹھا۔ یہ کہنے کی بجائے کہ اسے فوراً اندر بھیجو، وہ خود دوڑتا ہر نکل گیا۔ اس کے سامنے اس کا ایک جرنیل جس کا نام راستین تھا، کھڑا تھا لیکن اُس کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے وہ کھڑا ہونے کے قابل نہیں۔ ہر قل کو دیکھ کر اس نے روی انداز سے سلام کیا لیکن بڑی مشکل سے اس نے اپنا بازو اٹھایا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد تھا جیسے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہ بچا ہو۔

”کیا تم زخمی ہو راستین!“ — ہر قل نے اس تک پہنچ کر دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھے اور پوچھا۔

”ہیں قیصرِ روم!“ — راستین نے تھکی ماندی آواز میں جواب دیا — ”جسم پر کوئی زخم نہیں دل بُری طرح زخمی ہے۔“

ہر قل نے دربان کو حکم دیا کہ راستین کو سہارا دیں اور اندر لے جا کر بٹھادیں۔ وہاں محافظ دستے کے کچھ آدمی بھی موجود تھے، سب دوڑے آئے اور راستین کو سہارا دینے لگے لیکن اس نے اُن کے ہاتھ جھٹک ڈالے اور ہر قل کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ وہ یوں چل رہا تھا جیسے اس کے نخنوں کے ساتھ وزن بندا ہوا ہو۔ وہ سر جھکائے، قدم کھینتا کمرے میں گیا اور گر پڑنے کے انداز سے بیٹھ گیا۔ ہر قل نے سب سے پہلے اسے شراب پیش کی اور پھر دربان کو بلا کر کہا کہ کھانے کے لئے کچھ لے آئے۔ ہر قل اسے چپ چاپ دیکھ رہا تھا جیسے اس سے کچھ پوچھنے سے ڈر رہا ہو۔ یہ تو اس نے محسوس کر لیا تھا کہ راستین کوئی اچھی خبر نہیں لایا۔

”قیصرِ روم!“ — راستین نے شراب کے چند گھونٹ پی کر کہا — ”انطاکیہ ہاتھ سے نکل گیا ہے۔“

ہر قل کا ردِ عمل یہ تھا کہ وہ منہ کھولے کچھ دیر راستین کے منہ کو دیکھتا رہا۔

”پیشتر اس کے کہ آپ اس شکست کی ذمہ داری مجھ پر یا میرے ساتھی جرنیلوں پر عائد کریں، میری پوری بات سن لیں“ — راستین نے کہا — ”میں ان مسلمانوں کی بہادری کا قائل ہو گیا ہوں۔ ان کی تعداد ہماری نسبت بہت ہی تھوڑی تھی اور ہماری فوج اتنی زیادہ تھی کہ میں صحیح گنتی نہیں بتا سکتا کیونکہ ہر طرف سے ہمارے فوجی بھاگ بھاگ کر انطاکیہ آرہے تھے۔ میں مان نہیں سکتا کہ مسلمانوں کو معلوم نہ تھا کہ انطاکیہ میں اتنی زیادہ فوج ہے اور انطاکیہ دفاعی لحاظ سے اس قدر مضبوط شہر ہے کہ اسے کوئی بیرونی حملہ آور سر نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں کو تمام احوال و کوائف معلوم تھے پھر بھی وہ حملے کے لئے آرہے تھے۔“

”کیا تم لوگوں نے میرے حکم پر عمل نہیں کیا تھا؟“ — ہر قل نے غصیلی آواز میں کہا — ”میں نے تم لوگوں سے کہا تھا کہ مسلمان انطاکیہ کی طرف پیش قدمی کریں تو انہیں انطاکیہ تک پہنچنے ہی نہ دیا جائے اور فوج کو باہر نکال کر ان پر حملہ کر دیا جائے اور پھر پہاڑیوں اور چٹانوں سے پورا فائدہ اٹھایا جائے۔“

”ہاں قیصرِ روم!“ — راستین نے کہا — ”ہم نے آپ کے حکم پر ہی عمل کیا تھا۔ جو ہی ہمیں اطلاع ملی کہ مسلمانوں کا لشکر انطاکیہ کی طرف آرہا ہے تو ہم نے فوراً اپنی فوج کو تیار کیا اور اسے باہر لے آئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ پہاڑیوں کے درمیان ایک کشادہ میدان ہے۔ ہم نے اپنی فوج کو جنگی ترتیب میں کر کے اس میدان میں کھڑا کر دیا۔ انطاکیہ کی طرف جانے کے لئے اسی میدان سے گزر کر جاتے ہیں۔ اس کے ارد گرد اونچی نیچی پہاڑیاں ہیں....“

”مسلمان جب ہمارے سامنے اس میدان میں آئے تو ہم بہت خوش ہوئے کہ ان کی تعداد اُس سے بہت ہی تھوڑی تھی جو ہم سمجھ رہے تھے۔ میرے ساتھی جرنیلوں نے کہا کہ عربی مسلمان جاہل لوگ ہیں، انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ انطاکیہ میں ہم نے کتنی فوج اکٹھی کر رکھی ہے۔ میں ذاتی طور پر انہیں جاہل نہیں سمجھتا تھا لیکن یہ خوشی مجھے بھی ہوئی کہ وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر ہمارے سامنے آگئے ہیں۔ انہیں اسی میدان میں کچل دینا مشکل کام نہیں تھا....“

”ہم نے یہ چال چلی کہ درمیان والے دو دستوں کو حملے کا حکم دیا اور ساتھ ہی اپنے دونوں پہلوؤں کے دستوں کو پیغام بھیجا کہ وہ دائیں اور بائیں سے مسلمانوں کے پیچھے

ہمارے پاس رہ گیا تھا.... یہ تمہاری نالائقی کا نتیجہ ہے۔ تم سب بزدل ہو گئے ہو۔“

”میرے دو ساتھی جرنیل مارے گئے ہیں اور تیسرا شدید زخمی ہو گیا ہے۔“

راستین نے کہا — ”میں جانتا تھا آپ شکست کا الزام ہمارے ہی منہ پر تھوپیں گے۔ میں نے پہلے ہی عرض کی ہے کہ میری پوری بات سن لیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کا قبر اور عتاب مجھ پر کس طرح گرے گا لیکن میں شکست کی وجوہات ضرور بتاؤں گا....

آپ کے حکم سے ہم نے شہر سے باہر آکر مسلمانوں کو روکا۔ آپ کہتے تھے کہ مسلمان انطاکیہ کا محاصرہ نہ کر سکیں کیونکہ محاصرہ ہو گیا تو انطاکیہ کی ساری فوج اندر ہی بند ہو جائے گی اور نہ جانے محاصرے میں کتنا عرصہ گزر جائے۔ آپ نے کہا تھا کہ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں۔ اتنے مضبوط قلعے سے باہر آکر لڑنا ہماری حماقت تھی اور اس کی ہمیں بڑی سخت سزا ملی ہے....

”قیصر روم! ایک اور پہلو بھی ہے جسے ہم ہمیشہ نظر انداز کرتے رہے۔ اس کا تعلق شہری لوگوں کے ساتھ ہے۔ آپ نے ان پر اس قدر زیادہ ٹیکس اور دیگر محصولات عائد کر دیئے تھے جو لوگوں کی برداشت سے باہر ہو گئے تھے۔ پھر آپ نے مذہب میں بھی دخل اندازی کی۔ اتنا بڑا ملک ہماری سلطنت میں سے نکل گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو اس کا کتنا زیادہ صدمہ ہو گا۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کو ان وجوہات سے آگاہ اور خبردار کر دوں جنہوں نے آج یہ روز بد دکھایا ہے۔ ایک تو یہ ٹیکس وغیرہ تھے جن سے لوگوں میں یہ بات پھیلی کہ بادشاہ اور اس کے جرنیل اور سارے کا سارا شاہی خاندان لوگوں کو بھوکا رکھ کر اپنی عیاشیوں کے اخراجات پورے کر رہا ہے۔ یہاں کے مقامی لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک کی دولت روم جارہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے خود دیکھا ہے کہ روم کے جو شہری یہاں بسلسلہ کاروبار یا سرکاری عمل بن کر آئے ہیں وہ اپنے آپ کو یہاں کے لوگوں کے بادشاہ سمجھتے ہیں۔“

”میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں“ — ہرقل نے جھنجھلا کر کہا — ”تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تمہیں شہریوں سے کوئی تعاون نہیں ملانے کوئی مدد ملی ہے۔ بات جلدی کرو، لمبی لمبی باتوں کا وقت نہیں۔ ہمیں سوچنا ہے اب کیا ہو گا اور ہم کیا کریں۔“

”صرف یہ بات نہیں کہ شہریوں سے ہمیں مدد نہ ملی“ — راستین نے کہا — ”شہری ہمارے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اگر ہم محاصرے میں لڑتے تو یہ شہری باہی

چلے جائیں اور انہیں گھیرے میں لے لیں لیکن مسلمان ہمارے دستوں کا حملہ برداشت نہ کر سکے اور وہ لڑتے لڑتے پیچھے ہی پیچھے ہٹتے گئے۔ ہم نے ان پر دباؤ اور زیادہ کر دیا اور ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ پہاڑوں کے اندر چلے گئے اور ہمارے دستے ان کے سر پر سوار رہے۔ مسلمان دراصل بھاگنے کی کوشش میں تھے....

”جب ہمارے زیادہ سے زیادہ دستے پہاڑیوں کے اندر چلے گئے تو ہم سمجھے کہ مسلمانوں نے ہمیں ایک جال میں پھانس لیا ہے جس سے ہم آسانی سے نکل نہیں سکیں گے۔ انہوں نے چال یہ چلی تھی کہ تھوڑی تھوڑی نفری کے تین چار دستے ہمارے سامنے کئے اور پسپائی کا تاثر دیتے ہوئے وہ پیچھے ہٹے اور ہم نے زیادہ سے زیادہ فوج ان کے پیچھے پہاڑیوں میں بھیج دی اور نعرے یہ لگوائے کہ ایک بھی مسلمان یہاں سے زندہ واپس نہ جائے۔ مسلمانوں نے پہاڑیوں کی ڈھلوانوں پر اور گھنے درختوں پر تیر انداز اور برچھیاں پھینکنے والے آدی چڑھار کھے تھے۔ ہمارے آگے پسپا ہونے والے دستے تو ادھر ادھر ہو گئے لیکن ہم پر تیروں اور برچھیوں کا جو مینہ برس پڑا اس نے ہماری فوج میں سے کسی خوش قسمت کو ہی باہر نکلنے دیا ہو گا....

”ہمارے کسی جرنیل نے گھبرا کر یہ احمقانہ کام کیا کہ باقی ماندہ فوج کو بھی مسلمانوں کے پیچھے پہاڑیوں کے اندر بھیج دیا۔ ہم بڑی مشکل سے ان پہاڑیوں میں سے نکلے۔ ہماری تنظیم اور ترتیب تباہ ہو چکی تھی اور سپاہی اپنے اپنے طور پر وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے....

”ہم یہ لڑائی ہار چکے تھے لیکن ہم انطاکیہ ان مسلمانوں کو کسی قیمت پر ہی نہیں دینا چاہتے تھے۔ ہم جتنے سپاہی اکٹھے کر سکے وہ کئے۔ تعداد تو بہت ہی تھوڑی رہ گئی تھی۔ جلدی نقصان بے پناہ ہوا اور شدید زخموں کی تعداد اور ہی زیادہ تھی۔ بہر حال ہم جتنے صحیح اور سلامت سپاہی اکٹھے کر سکے انہیں لے کر انطاکیہ کی طرف چل پڑے۔ جب ہم قلعے کے دروازوں پر پہنچے تو تمام دروازے اندر سے بند تھے۔ بہت شور شرابہ کیا کہ دروازے کھول دیں لیکن دیواروں کے اوپر سے ہم پر تیروں کی بوچھاڑیں آنے لگیں۔ تب پتہ چلا کہ مسلمان شہر میں داخل ہو چکے ہیں اور دروازے انہوں نے بند کئے ہیں۔“

”تو کیا انطاکیہ بھی ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے؟“ — ہرقل نے حیرت زدہ سے لہجے میں پوچھا اور راستین کے جواب کا انتظار کئے بغیر بولا — ”یہی تو ایک مضبوط قلعہ

ہو کر شر کے دروازے کھول دیتے۔ میں تو شر کے باہر ہی تھا اندر جانے کا موقع نہ ملا تو ادھر کا رخ کر لیا۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ انطاکیہ کے لوگوں نے مسلمانوں کا استقبال پورے تپاک سے کیا ہو گا حالانکہ ان میں مسلمان شاید کوئی بھی نہیں۔ سب ہمارے ہم مذہب ہیں۔“

”مجھے صرف ایک اور موقع مل جانے دو۔“ ہرقل نے کہا۔ ”یہ لوگ ٹیکوس کی اور شاہی خاندان کی عیاشیوں کی باتیں کرتے ہیں، میں ان کی رگوں سے خون بھی نچوڑ لوں گا۔“

”شہنشاہ روم“ — راستین نے کہا — ”اگر آپ آج میری رگوں میں سے بھی خون نچوڑ لیں اور مجھے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کر باہر پھینک دیں تو بھی میں وہ بات کہنے سے گریز نہیں کروں گا جو کوئی آدمی اپنے بادشاہ کے منہ پر کہنے کی جرأت نہیں کیا کرتا۔ بادشاہوں کے حضور ان کی تعریفیں کی جاتی ہیں تاکہ وہ خوش رہیں اور انعام و اکرام سے نوازتے رہیں۔ مجھ سے آپ خوش نہ ہوں، ناراض ہو جائیں لیکن میں آپ کا ایک جرنیل ہوں۔ آپ نے مجھے بڑی اونچی حیثیت بھی دی ہے اور اجرت بھی دل کھول کر دی ہے۔ میرا فرض ہے سلطنت روم کی حفاظت اور اس کا پھیلاؤ لیکن میں شکست کھا کر آگیا ہوں۔ میں اس میں اپنی ذاتی بے عزتی سمجھتا ہوں۔ مجھے آپ کی عظمت بھی عزیز ہے۔ میں نمک حرامی کروں گا اگر میں حقیقت پر پردہ ڈال کر آپ کو خوبصورت تصورات میں الجھا دوں۔“

”کیا تم اصل بات فوراً نہیں کر سکتے؟“ — ہرقل نے قہر بھری آواز میں کہا۔

”اصل بات سن لیں“ — راستین نے کہا — ”دشمن کو اس لئے بُرا نہ کہو کہ وہ دشمن ہے۔ دشمن نے ہم پر فتح حاصل کی ہے اور اس کی پیش قدمی اور ہماری پسپائی جاری ہے۔ دیکھو اور غور کرو کہ دشمن میں کون سی طاقت ہے اور ہم اس طاقت سے محروم کیوں ہو گئے ہیں.... ہم لوگوں کی رگوں سے خون نچوڑ لینے کے ارادے باندھتے ہیں مگر ہمارا دشمن اپنے ساتھ ایک نظریہ اور ایک عقیدہ لایا ہے جو لوگوں کی رگوں میں خون ڈالتا ہے نچوڑتا نہیں۔ ہمارے دشمن کا عقیدہ انسان کو انسانیت کا مقام دینا ہے۔“

”تو کیا ہم بھی اسلام قبول کر لیں؟“ — ہرقل نے طنز بھرے لہجے میں کہا — ”کیا تم اسلام کو عیسائیت سے افضل سمجھتے ہو؟“

”سلطنت روم کے بادشاہ!“ — راستین نے کہا — ”یہاں سوال یہ نہیں کہ افضل اسلام ہے یا عیسائیت، اصل سوال یہ ہے کہ وہ کون ہے جو انسانیت کو پوری تکریم اور تعظیم دیتا ہے۔ اس وقت صرف مسلمان ہیں جو انسان کو وہ انسان سمجھتے ہیں جو خدا نے پیدا کیا تھا۔ عملاً یوں ہوا ہے کہ شام کے ایک شرے لوگ اگلے شہر پہنچتے ہیں تو وہاں کے لوگوں کو بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کی اطاعت فوراً قبول کر لینا کیونکہ وہ انسان کو انسانیت کے پورے حقوق دیتے ہیں اور وہ رومیوں جیسے بادشاہ نہیں۔ لوگ یہ بھی مشہور کرتے ہیں، اور یہ ہے بھی صحیح کہ مسلمان فوج جس بستی اور شہر کو فتح کرتی ہے، وہاں لوٹ مار نہیں کرتی نہ وہ کسی عورت پر ہاتھ اٹھاتی ہے.... قیصر روم! مسلمانوں نے ہر اس بستی میں لوگوں کے ساتھ ایسا ہی باعزت سلوک کیا اور لوگوں نے انہیں دل و جان سے قبول کیا۔ ہم جہاں جاتے ہیں، سب سے پہلے وہاں کے لوگوں کے گھروں سے دولت اور خوبصورت لڑکیاں سمیٹنے اور کچھ شہابی محل میں پہنچاتے اور کچھ اپنی ملکیت میں رکھ لیتے ہیں۔ انطاکیہ میں میرے مخبر مجھے بتاتے رہتے تھے کہ یہاں کے لوگ مسلمانوں کو نہ صرف یہ کہ پسند کرتے ہیں بلکہ ان کے انتظار میں ہیں۔ ہماری شکست کی اصل وجہ یہ ہے۔“

○

ہرقل نے اپنے ایک ہارے ہوئے، محاذ سے بھاگے ہوئے جرنیل کی پوری بات سن تولی لیکن اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ اس پر خاموشی سی طاری ہو گئی تھی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات اور اٹھنا، کمرے میں ٹھلنا پھر بیٹھ جانا اور پھر اٹھ کر ٹھلنے لگنا ایسی علامات تھیں جو اس بے چینی اور بے قراری کا پتہ دیتی تھیں جو اس کے اندر پیا تھی۔ اس سے توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی کہ وہ اسلامی اصولوں کی عظمت اور افادیت پر غور کرے گا اور اپنا رویہ بدلنے کی کوشش کرے گا۔

چونکہ یہ داستان فتح مصر کی طرف بڑھ رہی ہے اس لئے ہم انطاکیہ کی فتح کا مزید ذکر نہیں کریں گے۔ البتہ اتنی سی بات ضروری معلوم ہوتی ہے کہ انطاکیہ کی فتح اسلام کے نظریے اور دین کے اصولوں کی فتح تھی۔ سپہ سالار ابو عبیدہؓ نے شہریوں پر جزیہ عائد کر دیا اور باقی تمام ٹیکس اور محصولات ختم کر دیئے۔ شہر میں بعض لوگ کفر عیسائی تھے۔ انہوں نے روم کی بادشاہی کو تو قبول کیا ہی نہیں تھا، انہوں نے درپردہ لوگوں کو اکسانا شروع کر

دیا کہ وہ مسلمان فاتحین کو جزیہ نہ دیں اور خود مختار ہو جائیں۔ کچھ لوگ ان کی باتوں میں آگے اور جزیہ دینے سے انکار کر دیا۔ ابو عبیدہؓ کے حکم سے ایسے لوگوں کو شہر بدر کر دیا گیا۔

مسلمان فاتحین کے سامنے صرف یہ کام نہیں تھا کہ وہ مفتوحہ شہروں کا نظم و نسق درست کرنے بیٹھ جاتے۔ سالاروں کے سامنے اصل کام یہ تھا کہ پسپا ہوتی ہوئی رومی فوج کو کہیں بھی اکٹھا نہ ہونے دیا جائے۔ جاسوسوں نے اطلاع دی کہ انطاکیہ سے بھاگی ہوئی رومی فوج حلب کے مقام پر اکٹھی ہو رہی ہے۔ ابو عبیدہؓ نے کچھ لشکر اپنے ساتھ لیا اور حلب کو روانہ ہو گئے۔ خالد بن ولیدؓ کو انہوں نے ایک اور سمت بھیج دیا جہاں رومی فوج تازہ دم ہونے کے لئے رک گئی تھی۔

مٹورخوں نے لکھا ہے کہ ابو عبیدہؓ حلب پہنچے تو انطاکیہ سے ایک قاصد یہ پیغام لے کر ان تک پہنچا کہ انطاکیہ کے لوگوں نے نافرمانی شروع کر دی ہے اور صورت بغاوت والی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ ابو عبیدہؓ نے ایک نائب سالار عیاض بن غنم کو اس کام کے لئے بھیجا کہ وہ بغاوت پر قابو پائیں لیکن یہ احتیاط کریں کہ کسی پر بلاوجہ اور غیر ضروری تشدد اور زیادتی نہ ہو۔

اس کے ساتھ ہی ابو عبیدہؓ نے ایک پیغام مدینہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کو بھیجا جس میں انہوں نے ایک تو انطاکیہ کی فتح کی خوشخبری سنائی اور ساتھ یہ اطلاع دی کہ انطاکیہ کے لوگوں نے جزیہ کے معاملے میں بغاوت کر دی ہے۔

امیر المومنین نے یہ پیغام ملتے ہی جواب بھیجا جس میں انہوں نے لکھا کہ لوگوں کو ہر وہ سہولت دو جو ان کا حق ہے۔ اگر کچھ لوگوں کے وظیفے مقرر کئے ہیں تو وہ انہیں بروقت ادا کئے جائیں۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ شہر میں مجاہدین کے دو تین دستے موجود رہیں اور وہ نظم و نسق برقرار رکھیں تاکہ لوگوں کو یہ تاثر نہ ملے کہ مسلمانوں کے پاس اتنی فوج ہے ہی نہیں کہ وہ مفتوحہ آبادیوں کو اپنے قابو میں رکھ سکیں۔

تدبر اور ہوش مندی سے اس بغاوت پر قابو پایا گیا۔ بغاوتیں تو کچھ اور علاقوں میں بھی ہوئی تھیں۔ ان سب پر قابو پایا گیا تھا۔ ہم یہاں تفصیلات میں نہیں جا رہے، یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر قل کس انجام کو پہنچا اور اسے اس انجام تک کس طرح پہنچایا گیا۔ پھر ہم یہ بیان کر رہے ہیں کہ مسلمانوں نے ہر قل کی اس چال کو اس

طرح بے کار کیا کہ اس نے اپنی فوج کو مختلف مقامات پر تقسیم کر دیا تھا۔ اسے توقع تھی کہ مسلمان بھی اس کے مطابق تقسیم ہو جائیں گے لیکن اللہ کی راہ میں لڑنے والوں کو اللہ کی مدد اور راہنمائی حاصل تھی ورنہ اتنی قلیل تعداد کو اتنے زیادہ حصوں میں بانٹ دینا، مسلمانوں کے لئے بڑا ہی تباہ کن اقدام ہوتا۔

○

ہر قل کا جرنیل راستین اسے انطاکیہ کی صحیح صورت حال بتا کر اور شکست کی وجوہات واضح کر کے پھر محاذ پر چلا گیا تھا۔ ہر قل اب دوسرے مقامات سے آنے والے قاصدوں کا انتظار کرنے لگا لیکن کہیں سے کوئی قاصد نہیں آ رہا تھا۔ اُس کی زندگی اب سرِ پا انتظار بن کر رہ گئی تھی۔ یہ تمام مقامات سرحدی تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ روم کی فوج تمام تر شام سے نکل گئی ہے اور اب سرحد پر قدم جمانے کی کوشش کر رہی ہے۔ معروف تاریخ دان الفرید بلر لکھتا ہے کہ ہر قل مایوسیوں میں ڈوب گیا تھا اور اپنے مشیروں اور مصاحبوں کے ساتھ جو باتیں کرتا تھا ان سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس نے اس حقیقت کو قبول کر لیا تھا کہ اس کی شہنشاہی کا ستارہ جو شام پر چمکتا ہی رہتا تھا، ٹوٹ کر شام کے افق میں ہی کہیں گم ہو گیا ہے۔

آخر ایک روز حلب سے اُس کی فوج کا ایک افسر آیا جو کچھ زخمی بھی تھا۔ اُس نے ہر قل کو ویسی ہی کہانی سنائی جیسی راستین انطاکیہ کی سنا چکا تھا۔ اس نے سنایا کہ اب بچی کچی فوج ادھر ادھر سے حلب آ رہی تھی کہ مسلمانوں کا مختصر سا لشکر آن پہنچا۔ رومیوں پر مسلمانوں کی ایسی دہشت طاری تھی کہ وہ جم کر لڑ ہی نہ سکے۔

”وہاں کے لوگوں کا رویہ کیا تھا؟“ — ہر قل نے پوچھا۔

”ہمارے حق میں اچھا نہیں تھا“ — اس افسر نے جواب دیا — ”مجھے شک ہے کہ بعض لوگوں نے مسلمانوں کی کسی نہ کسی طرح مدد بھی کی تھی۔ ہمارے خلاف وہ مخبری تو ضرور ہی کرتے رہے۔“

”کیا اس کی کوئی وجہ بتا سکتے ہو؟“ — ہر قل نے پوچھا۔

راستین جرنیل تھا اس لئے اُس نے ہر قل کو بڑے صاف الفاظ میں جرات کے ساتھ وجہ بتادی تھی لیکن یہ رومی معمولی سا افسر تھا اس لئے اس نے سچ بولنے کی جرات نہیں کی۔ ہر قل نے شاہانہ غصے سے پھر اپنا سوال دہرایا تو افسر بے چین سا ہو گیا اور ہر قل

کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ تب ہر قل نے اسے کہا کہ وہ ڈرے جھکے بغیر وجہ بتا دے تاکہ آئندہ ایسی وجہ پیدا نہ ہونے دی جائے۔

”شیشاہ معظم!“ — افسر آخر بولا — ”ہماری شکست کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میدان جنگ میں لڑنے، زخمی ہونے اور اپنی جان قربان کرنے والا افسر اتنی جرأت نہیں رکھتا کہ اپنے شمشاہ کے آگے بچ بول سکے۔ آپ نے مجھے بچ بولنے کا حکم دیا ہے۔ میں چند الفاظ میں وجہ بیان کر دیتا ہوں۔۔۔۔۔ لوگ کہتے ہیں ہمیں بادشاہ کی نہیں بندے کی حکمرانی چاہئے۔ ہم نے سنا ہے مسلمان ایسے مذہب کے پیروکار ہیں جس میں کسی کی بادشاہی کی گنجائش ہی نہیں رکھی گئی بلکہ وہ خود کسی بندے کو حکمران بنالیتے ہیں اور رعایا کا پیٹ کاٹتے نہیں بلکہ پیٹ بھرتے ہیں۔“

ہر قل نے سر جھکا لیا جیسے وہ بات کی تہہ تک پہنچ گیا ہو۔ ہر قل سر جھکا لینے والا بادشاہ نہیں تھا۔ اب جو اس کا سر جھکا تھا، اس سے صاف پتہ چلا تھا کہ اس نے شکست تسلیم کر لی ہے۔

ایک دو دن ہی اور گزرے تھے کہ ایک اور مقام مرعش سے ایک رومی قاصد آ گیا۔ ہر قل نے اپنی فوج کا کچھ حصہ اس قلعہ بند اور بڑے مضبوط مقام پر بھیج دیا تھا۔ قاصد نے بتایا کہ مسلمانوں کا ایک لشکر آیا اور مرعش کو محاصرے میں لینے لگا لیکن وہاں کے جرنیل نے فوج کو حکم دیا کہ یہ بہت ہی کم تعداد لشکر ہے، اسے محاصرہ نہ کرنے دیا جائے بلکہ باہر نکل کر اسے گھیرے میں لے کر ختم کیا جائے۔ اس حکم کے تحت فوج باہر نکلی تو مسلمانوں نے ایسی چال چلی کہ وہ لڑتے لڑتے پیچھے بھی ہٹنے لگے اور دائیں بائیں پھیلنے بھی لگے۔ پھر یوں ہوا کہ اس لشکر کو گھیرے میں لینے کی بجائے، لشکر نے اپنے دونوں پہلو پھیلا کر رومی فوج کو گھیرے میں لے لیا اور جو مسلمان رومی فوج کے عقب میں چلے گئے تھے وہ قلعے میں داخل ہو گئے۔

قاصد نے بتایا کہ رومی فوج پیچھے ہٹنے لگی تو قلعے کی دیواروں سے اس پر تیر اور برہمیاں برسے لگیں۔ نفسا نفسی کا ایسا عالم طاری ہوا کہ رومی نہ باہر لڑنے کے قابل رہے نہ قلعے میں داخل ہو سکے۔ جانی نقصان بے انداز ہوا اور زخمیوں کی تعداد بھی خاصی زیادہ تھی اور وہی زندہ رہے جو اس معرکے سے نکل گئے تھے۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ خالد بن ولید نے مرعش پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا اور رومی

فوج کی جو نفری وہاں موجود تھی، اسے تباہ و برباد کر دیا۔

اس کے بعد رہاء میں ہر قل کو یہ اطلاع ملی کہ بیروت پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا ہے اور اس تمام سرحدی علاقے سے مسلمانوں نے رومی فوج کو بے دخل کر دیا ہے۔۔۔۔۔ اس سرحدی علاقے میں شام کے دفاع کے لئے کئی ایک قلعے بنائے گئے تھے۔ ان سب پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

یہ تھے یزید بن ابی سفیان جو اُس وقت دمشق میں تھے۔ سپہ سالار ابو عبیدہ کا حکم پہنچا تو وہ دمشق سے نکلے اور بیروت جا پہنچے۔ مورخ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے یہ کارنامے معجزوں سے کم نہ تھے۔ بیروت اور اس کے ملحقہ علاقوں پر قبضہ ہو جانے کا مطلب یہ تھا کہ سمندر کی طرف سے رومیوں کو کوئی مدد اور کوئی کمک نہیں مل سکتی تھی۔ اُس وقت مصر پر رومیوں کی ہی حکومت تھی۔ ہر قل مصر سے کمک منگوا سکتا تھا لیکن مسلمانوں نے راستے مسدود کر دیئے تھے۔

○

ہر قل تو بڑا کایاں اور مجھا ہوا جرنیل تھا لیکن اُس نے مسلمانوں کے لشکر کو بکھیرنے کے لئے جو چال چلی تھی، اس سے مسلمان سالاروں نے فائدہ اٹھا لیا اور اس کی فوج کو خون میں نہلا کر بچ جانے والے رومیوں کو تڑپڑ کر دیا۔ ہر قل اللہ کے اس قانون سے واقف نہیں تھا کہ اللہ جسے چاہتا ہے اُسے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اُسے ذلت میں پھینک دیتا ہے لیکن اللہ کسی کو بلا وجہ عزت اور کسی کو ویسے ہی ذلت نہیں دے دیا کرتا۔ اس کی کچھ شرائط بھی اللہ نے مقرر کی ہیں۔ اللہ انہیں ہی چاہتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چاہتے ہیں اور اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔

ہر قل نے اپنے مشیروں اور مصاحبوں کو بلایا اور انہیں صورت حال بتا کر کہا کہ وہ مشورہ دیں کہ اپنی بکھری ہوئی فوج کو کہاں کبجا کیا جائے اور کیا فوج کبجا ہو جائے تو یہ لڑنے کے قابل ہوگی؟

ایک مشیر فوراً بول اٹھا۔ اس نے سب سے پہلے ہر قل کی مداح سرائی کی، پھر مسلمانوں کو جبرا بھلا کہا اور پھر اس قسم کے الفاظ کہے کہ روم کی فوج کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔

”اٹھو!“ — ہرقل نے اُس مشیر سے کہا — ”باہر نکل جاؤ پھر مجھے کہیں نظر نہ آتا“ — ہرقل دوسرے مشیروں سے مخاطب ہوا — ”مجھے صحیح مشورہ چاہئے۔ صورت حال تم سب کے سامنے ہے۔“

مشیروں اور مصاحبوں پر خاموشی طاری ہو گئی جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ تھے یا مر ہی گئے تھے۔ ہرقل انہیں دیکھتا رہا۔ سب کو غالباً ”توقع تھی کہ ہرقل گرج کر بولے گا اور حکم دے گا کہ اُسے صحیح مشورہ دیا جائے۔ ان میں سے کوئی بھی سچ بات کہنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ غالباً“ ہرقل نے محسوس کر لیا کہ یہ لوگ کس ذہنی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ اُسے شاید یہ احساس بھی ہو گیا تھا کہ ان لوگوں کو مدح سرائی اور خوشامد کا عادی اُس نے خود بنایا ہے۔ اس کے سامنے بڑی ہی تلخ اور اذیت ناک حقیقت آگئی تھی جو اسے مجبور کر رہی تھی کہ وہ سچ کا سامنا کرے۔

”ہم اب کہیں بھی نہیں لڑ سکتے“ — ہرقل نے خود ہی فیصلہ بنا کر مشیروں کو ذہنی اذیت سے نکالا — ”ایک ہی صورت رہ گئی ہے۔ وہ یہ کہ ہم شام سے نکل جائیں اور مصر جا کر فوج کو منظم اور تیار کریں اور پھر شام پر حملہ آور ہوں۔“

”ہم پہلے اس تجربے سے گزر چکے ہیں“ — ایک بوڑھے مشیر نے کہا — ”ایرانیوں نے ہم سے صرف شام ہی نہیں مصر بھی چھین لیا تھا۔ آپ اُس وقت بادشاہ نہیں تھے، خود مختار نہیں تھے لیکن آپ نے بادشاہ کو بے اختیار کر کے سلطنت کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لئے، فوج کو تیار کیا اور جب مصر اور شام پر حملہ کیا تو ایرانیوں کو فیصلہ کن شکست دے کر دونوں ملکوں سے نکال دیا تھا۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ملک شام پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ مصر تو ہمارے پاس ہے۔ فیصلہ بہتر یہی ہے کہ ہم یہاں سے نکل چلیں۔“

اس کے بعد تمام مشیر باری باری بولنے لگے اور سب نے اسی فیصلے کی تائید کی کہ شام سے نکل جانا چاہئے۔ اگر ہم اس توقع پر فوج کو لڑاتے رہے کہ مسلمانوں کو ایک زوردار حملے سے پسپا کر دیں گے تو حاصل کچھ بھی نہ ہو گا سوائے اس کے کہ جو فوج بچ گئی ہے وہ بھی کٹ جائے گی۔

ہرقل نے حکم جاری کر دیا کہ وہ قسطنطنیہ جانا چاہتا ہے اور جتنی جلدی ہو سکے روانگی کی تیاری شروع کر دی جائے۔ اُس وقت قسطنطنیہ بھی رومیوں کی سلطنت کا ایک بڑا شہر

تھا اور جنگ سے محفوظ۔ ہرقل کو اب وہی پناہ گاہ نظر آئی تھی۔ اُس کے کوچ کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ ہرقل تو اُس دور کی سب سے بڑی اور بیست ناک جنگی طاقت کا سب سے بڑا جرنیل اور بادشاہ تھا۔ اس کے غرور اور تکبر نے اور انسانوں پر اس کے ظلم و تشدد نے اسے یہ روزِ عبرت دکھا دیا جب اس کی بیست ناک جنگی طاقت ڈرے سے ہوئے سپاہیوں کی صورت میں بکھر گئی تھی۔ اس کے نامور جرنیل مارے گئے تھے۔ ہر طرف اور ہر جگہ اس کے فوجیوں کی گلٹی سڑتی ہوئی لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور زخمی فوجی اپنے آپ کو گھسیٹتے پھرتے تھے۔ اس فوج کا سب سے بڑا جرنیل اور بادشاہ، مجسم حسرت و یاس بنائیں منزل کو روانہ ہو رہا تھا جسے وہ سب سے زیادہ محفوظ پناہ سمجھتا تھا لیکن یقین نہیں تھا کہ اس منزل تک خیریت سے پہنچ بھی سکے گا یا نہیں۔

تاریخ میں صرف وہ واقعات ملتے ہیں جو یعنی شاہدوں کے حوالوں سے کبھی قلبند کئے گئے تھے۔ ان واقعات میں انسان چلتے پھرتے، بھاگتے دوڑتے، ایک دوسرے کا خون بہاتے اور روئے زمین پر اچھی بُری حرکتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ کسی مورخ نے یہ نہیں لکھا کہ فلاں صورت حال میں فلاں کے دل میں کیا تھا اور اس کے اندر کیسے طوفان پیا ہو رہے تھے۔ کسی نے لکھا بھی تو یہ قیاس آرائی تھی یا قیافہ شناسی۔ ہرقل کے متعلق متعدد مورخوں نے لکھا ہے کہ وہ مایوسی اور نامرادی میں ڈوب گیا تھا اور اس قدر بے چین اور بے قرار رہنے لگا تھا کہ اس کے لئے کوئی معمولی سا فیصلہ کرنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ وہ فتوحات کا عادی ہو گیا تھا اور اس وہم میں مبتلا کہ کوئی اسے شکست دے ہی نہیں سکتا۔ اس خوش فہمی نے اسے رعایا کے لئے فرعون بنادیا تھا۔

ہم تصور کی آنکھ سے دیکھتے ہیں کہ اس وقت اُس کے دل پر کیا گزر رہی تھی۔ اُسے اپنا ایک بڑا ہی نامور جرنیل تذارق یاد آیا ہو گا۔ یہ ابو بکر صدیق کے دورِ خلافت کا واقعہ ہے۔ مجاہدین اسلام دو عظیم سالاروں شعی بن حارثہ اور سعد بن ابی وقاص کی قیادت میں زرتشت کے پجاری ایرانیوں کے خلاف عراق میں برسہا برس بیکار تھے۔ آتش پرست ایرانی پسپا ہوتے چلے جا رہے تھے۔

شام سلطنت روم میں شامل تھا اور حکومت ہرقل کی تھی۔ اُس وقت تک ہرقل مسلمانوں کو عرب کے بدو اور صحرائی لیرے کہا کرتا تھا۔ اس نے مسلمانوں کو یہ تاثر دینے کے لئے کہ وہ شام کی سرحدوں سے باہر ہیں ورنہ نیست

صحابیؓ کے منہ پر وے مارا تھا اور بڑی بے ہودگی سے انہیں رخصت کیا تھا۔۔۔ عین ممکن ہے اب ہر قل دل ہی دل میں پچھتا رہا ہو کہ وہ حلقہ گوش اسلام ہو جاتا تو آج وہ بھی فاتحین میں شامل ہوتا اور اس ذلت و رسوائی تک نہ پہنچتا۔

تاریخ میں ہر قل کی اُس وقت کی کیفیت اتنی سی ہی لکھی ملتی ہے کہ اُس کا چہرہ مرجھایا ہوا، سر جھکا ہوا اور کندے مسکڑے ہوئے تھے۔ اُس کے دل کو اس خیال نے بھلایا ہو گا کہ ابھی پورے کا پورا مصر اُس کے قبضے میں ہے اور وہ وہاں جا کر فوج کو تیار کرے گا اور پھر شام پر حملہ کر کے مسلمانوں سے انتقام لے گا۔

○

ہر قل کا قافلہ کوئی چند ایک افراد کا قافلہ نہیں تھا جو قسطنطنیہ جا رہا تھا۔ مصر اور شام کی بے انداز حسین ترین لڑکیوں کا حرم بھی ساتھ تھا۔ محافظ دستہ بھی تھا اور رہاء میں جو تھوری سی فوج موجود تھی، وہ بھی ساتھ جا رہی تھی۔

یہ قافلہ پہاڑیوں کے اندر اندر، عام راستے سے ہٹ کر جا رہا تھا۔ یہ ایک احتیاط تھی جو اس لئے کی گئی تھی کہ راستے میں مسلمانوں کا کوئی دستہ دیکھ نہ سکے۔ ہر قل لڑائی سے کترا رہا تھا۔ اُس نے ایک حفاظتی تدبیر اور بھی اختیار کی تھی۔ وہ یہ کہ عام قسم کے مسافروں اور غریب سے لوگوں کے بھیس میں چند آدمی بہت آگے بھیج دیئے تھے۔ ان کے ذمے کام یہ تھا کہ جہاں کہیں دور یا قریب مسلمانوں کا کوئی دستہ نظر آئے تو فوراً پیچھے آکر اطلاع دیں تاکہ راستہ بدل لیا جائے۔

راستے میں ایسا ایک خطرہ آ ہی گیا۔ مسلمانوں کے تین چار سوار دستے مرعش سے ایک اور مقام دلوک کی طرف جاتے نظر آئے۔ اُس وقت ہر قل ایک مشہور مقام شمشاط کے قریب پہنچ چکا تھا اور اُس کا ارادہ وہیں رات گزارنے کا تھا۔ اُس کے جاسوس جو بہت آگے آگے جا رہے تھے، ان میں سے ایک سرپٹ گھوڑا دوڑاتا آیا اور ہر قل کو اطلاع دی کہ مسلمانوں کے سوار دستے شمشاط کی طرف آ رہے ہیں۔ ہر قل نے فوراً ”کوچ کا حکم دے دیا اور اپنے قافلے کو قریبی پہاڑیوں کے اندر لے گیا اور سفر نہ صرف جاری رکھا بلکہ رفتار تیز کر دی۔

وہ خوش قسمت تھا کہ اُس وقت وہاں سے کھسک گیا اور پہاڑیوں میں رُو پوش ہو گیا۔ وہ جو سوار دستے دیکھے گئے تھے ان کے سالار خالد بن ولید تھے۔ وہ ان دستوں کے

ناہود کر دیئے جائیں گے، اپنا ایک بڑا زبردست کثیر تعداد لشکر یرموک کے مقام پر بھیج دیا اور مسلمانوں کو لٹکارا۔ اس لشکر کا جرنیل تاریخ کا ایک مشہور جنگجو تذارق تھا۔ ہر قل کو توقع تھی کہ وہ ایک ہی معرکے میں مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گا لیکن اس معرکے کا انجام یوں ہوا کہ تذارق مارا گیا۔ اُس کا تقریباً ”آدھا لشکر کٹ مرا اور جو تعداد بچ گئی وہ بندہ بندہ ہو کر بکھری اور وہشت زدگی کے عالم میں واپس پہنچی۔

مؤرخ لکھتے ہیں کہ تذارق کے بعد ہر قل کو خود آگے بڑھنا چاہئے تھا تاکہ مسلمانوں پر اس کا دبہ قائم ہو جاتا لیکن وہ اس لئے باہر ہی نہ نکلا کہ اسے بھی شکست ہوگی اور اس کا وقار یرموک کی زمین میں ہی دفن ہو جائے گا۔۔۔ اب جبکہ وہ شکست خوردگی کی حالت میں قسطنطنیہ جا رہا تھا، اُسے یرموک کا معرکہ یاد آیا ہو گا اور وہ پچھتا رہا بھی ہو گا کہ اُس نے عبرت حاصل نہ کی اور مسلمانوں کو کمزور ہی سمجھتا رہا۔

پھر اُسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خط یاد آیا ہو گا جس میں آنحضورؐ نے اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ اس واقعہ کا مختصر سا پس منظر یوں ہے کہ، جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے، ایرانیوں نے رومیوں سے شام و مصر چھین لئے تھے۔ اُس وقت روم کا بادشاہ فوکاس تھا۔ ایرانیوں نے بیت المقدس بھی فتح کیا تھا اور حضرت عیسیٰؑ کی (فرضی) قبر سے صلیب اعظم اٹھا کر لے گئے تھے۔ ہر قل نے شاہ فوکاس کا تختہ الٹا، خود شاہ روم یا قیصر روم بنا اور ایرانیوں کو شکست دے کر ان سے صلیب اعظم واپس لے لی تھی۔

وہ صلیب اعظم واپس حضرت عیسیٰؑ کی مفروضہ قبر پر رکھنے بیت المقدس جا رہا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے نام ایک خط بھیجا جس میں اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ خط ایک صحابی وحیہ بن خلیفہ کلبی لے جا رہے تھے۔ ہر قل انہیں بیت المقدس کے راستے میں ملا۔ انہوں نے وہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خط ہر قل کو دے دیا اور جواب کا انتظار کرنے لگے۔

آج جب شکست خوردہ ہر قل مسلمانوں کے قہر و عتاب سے بھاگا ہوا شام کی سرحد سے نکل رہا تھا، اسے یقیناً ”مسلمانوں کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا خط یاد آیا ہو گا اور یہ بھی کہ اُس نے کس طرح آنحضورؐ کا مذاق اڑایا تھا، وحیہ بن خلیفہ کلبی پر پھبتیاں کسی تھیں اور پھر اس نے آنحضورؐ کی شان میں گستاخانہ کلمے کہے تھے اور خط آپؐ کے ان

عنه، شرجیل بن حسنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قیادت میں ملک شام پر لشکر کشی کی تھی۔ مجاہدین اسلام نے دمشق فتح کر لیا تھا۔ ہرقل اُس وقت انطاکیہ میں تھا۔ یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس نے اور اس کے جرنیلوں وغیرہ نے مسلمانوں کو عرب کے بدو اور صحرائی قزاق کہا تھا۔ ہرقل نے دمشق کو مسلمانوں سے بچانے کے لئے فوج بھیج دی تھی لیکن اس فوجی مدد کے پہنچنے سے پہلے ہی مسلمانوں نے دمشق فتح کر لیا تھا۔

اب جبکہ ہرقل شکست خوردگی کے عالم میں بزنطیہ جا پہنچا تھا اور اس کی امیدوں کے چراغ ٹھنڈا رہے تھے، اس سے کچھ عرصہ پہلے کا یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے شام میں پہلی فتح یہ حاصل کی تھی کہ دمشق پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہرقل نے خود انطاکیہ سے نکلنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ اسے یقین تھا کہ عرب کے یہ بدو اس کی اتنی بڑی جنگی قوت کا پال بھی بیکار نہیں کر سکیں گے۔

ہرقل کی بھیجی ہوئی ملک پہنچ گئی تو رومی لشکر کی تعداد کم و بیش پچاس ہزار ہو گئی جس میں گھوڑ سوار دستے زیادہ تھے۔ یہ فوج دمشق سے کچھ دُور بیسان کے مقام پر جمع ہو گئی جہاں وہ مسلمانوں کا مقابلہ کرنا چاہتی تھی۔

ہم یہاں ان لڑائیوں کی تفصیل پیش نہیں کریں گے، رومیوں کے غرور اور تکبر کا ایک واقعہ سناتے ہیں۔ دمشق جیسا بڑا شہر دے کر بھی رومی جرنیل مسلمانوں کو صحرائی قزاق اور لئیرے سمجھ رہے تھے۔ اس رومی فوج کا کمانڈر سکارنام کا ایک تجربہ کار جرنیل تھا جس کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔

وہ علاقہ بڑا ہی زرخیز تھا اور پانی کی اتنی افراط کہ کئی ایک چھوٹی بڑی ندیاں بہتی تھیں۔ جرنیل سکار کے حکم سے ندیوں کے کنارے توڑ دیئے گئے جس سے تمام علاقوں میں پانی پھیل گیا۔ اس نے یہ اقدام مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑی رکاوٹ اور دشواری پیدا کرنے کے لئے کیا تھا۔

مجاہدین اسلام نے ہر طرف پھیلتا ہوا پانی دیکھا تو انہوں نے بڑی بلند آواز سے قہقہے لگائے اور رومیوں کو کچھ طنزیہ کلمے بھی کہے۔ مجاہدین نے ذرا سی بھی گھبراہٹ یا پریشانی کا اظہار نہ کیا اور لڑائی کی تیاریاں کرتے رہے۔ مسلمانوں کے حوصلے اور عزم کی یہ چٹنگی اور ان کی یہ بے نیازی دیکھ کر رومی فوج متاثر بھی ہوئی اور مرعوب بھی۔

ساتھ دلوک جا رہے تھے کیونکہ اس مقام سے اطلاع گئی تھی کہ رومی فوج کی کچھ نفری اور وہاں کے لوگ باغی ہوتے جا رہے ہیں۔ تاریخ کے مطابق خالد بن ولید نے فوراً وہاں پہنچ کر بغاوت کو اٹھنے سے پہلے کچل ڈالا۔ تاریخ اسلام کے اس عظیم سپہ سالار کو معلوم نہ ہو سکا کہ ایک بڑا ہی موٹا شکار ان کی نظروں سے ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔

مشہور مصری تاریخ نویس محمد حسنین بیگل نے کئی ایک متورخوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ ہرقل جب اس پہاڑی خطے سے آگے نکلا تو ایک بلند مقام پر پہنچ کر اس نے پیچھے دیکھا۔ اسے چھوٹی بڑی بستیاں نظر آئیں اور اُن تک پھیلا ہوا ملک شام بھی نظر آیا۔ اُس نے آہ لی اور کہا — ”آخری سلام اے سرزمین شام.... اب کوئی رومی بے دھڑک تیری زمین پر قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکے گا.... اوداع اے سرزمین شام!“ ہرقل کے لئے قسطنطنیہ کا راستہ محفوظ نہیں رہا تھا۔ اس نے شام کی سرحد سے کچھ دور غیر معروف سے ایک مقام بزنطیہ کا رخ کر لیا۔

المقریزی نے ہرقل کی اُس وقت کی کیفیت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ ہرقل بزنطیہ میں اس طرح داخل ہوا جیسے اپنے جنازے کے ساتھ اپنی آخری رسوم ادا کرنے آیا ہو۔

○
 شمع بجھنے کو آتی ہے تو کچھ دیر ٹھنڈائی ہے اور پھر آخری بار اس کی لو بجھ جاتی ہے۔

ہرقل کی شمع ٹھنڈا رہی تھی اور کوئی دم کو بجھنے کو تھی۔ اس شمع میں اُس کا خون جل رہا تھا، اُس کی رعونت جل رہی تھی اور اُس کا وہ غرور اور تکبر جل رہا تھا جو اُسے اپنی جنگی اور ذاتی طاقت پر ہوا کرتا تھا۔ ملک شام اس کی شہنشاہیت سے نکل گیا تھا لیکن کچھ سرحدی علاقوں پر ابھی مسلمانوں کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ ہرقل کی امیدیں دم توڑ رہی تھیں۔

کیا ہرقل نے عبرت حاصل کی تھی؟.... تاریخ میں اس سوال کا جواب نہیں ملتا۔ انسان کی فطرت کا خاصہ ہے کہ ایک بار طاقت کا زعم، رعونت، غرور اور تکبر دماغ پر قبضہ کر لیں تو پھر انسان ذرا مشکل سے ہی عبرت حاصل کرتا ہے۔ تاریخ ہمیں وہ وقت یاد دلاتی ہے جب مسلمانوں نے ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ

”ہم آپ کی عزت کرنا چاہتے تھے“ — سکار نے کہا — ”اگر آپ کو اپنی عزت کا خود ہی خیال نہیں تو یہ ایک مجبوری ہے۔“

علامہ شبلی نعمانی مورخوں کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غصہ آگیا اور وہ گھنٹوں کے بل کھڑے ہو گئے یعنی پوری طرح نہ اٹھے۔

”اپنے اس جرنیل کے دماغ میں میری یہ بات ڈال دو“ — معاذؓ نے ترجمان سے کہا — ”اے کمو کہ تم قالین پر بیٹھنے کو عزت سمجھتے ہو تو مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ ہمارے ہاں عزت کا تصور کچھ اور ہے۔ اگر زمین پر بیٹھنا غلاموں کا شیوہ ہے تو میں ہوں ہی غلام لیکن اپنے اللہ کا!“

معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پھر بیٹھ گئے لیکن رومی جرنیل اور اس کے ان افسروں کو جو وہاں موجود تھے حیرت زدہ کر دیا۔

”آپ کے اس لشکر میں آپ سے بڑھ کر بھی کوئی ہے؟“ — جرنیل سکار نے پوچھا۔

”معاذ اللہ“ یہی کافی ہے کہ میں کسی سے بدتر نہیں ہوں۔“

سب حاضرین محفل خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔ معاذؓ نے یہ بات ایسے دانشمندانہ اور پُر اعتماد انداز سے کہی تھی کہ سب متاثر ہوئے لیکن وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے کہ انہوں نے کوئی اثر قبول کیا ہے۔ معاذؓ کی نگاہیں ان سب پر گھوم گئیں اور کسی نے کوئی اور بات نہ کی۔

”ان سے کمو کوئی بات کریں“ — معاذؓ نے ترجمان سے کہا — ”اگر انہیں کچھ نہیں کہنا تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔“

ترجمان نے جب رومی زبان میں اپنے جرنیل کو بتایا کہ انہوں نے کیا کہا ہے تو وہ بولا۔

”ہم آپ سے صرف ایک بات پوچھنا چاہتے ہیں“ — جرنیل سکار نے کہا — ”ملک حبشہ آپ کے قریب ہے۔ دوسرے ملک بھی ہیں، پھر آپ نے ادھر کارخ کیوں کیا ہے؟.... کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہمارا بادشاہ سب سے بڑا بادشاہ ہے؟ ہماری فوج کی تعداد آسمان کے ستاروں اور زمین کے ذروں کے برابر ہے۔ کیا آپ یہ سوچ کر ادھر آئے ہیں کہ ہمیں شکست دے سکیں گے؟.... ناممکن!“

رومی جرنیل سکار نے اس کے باوجود مسلمانوں کو کمزور اور کمتر سمجھا اور ایک ایچی بھیجا کہ وہ اپنا کوئی نمائندہ بھیجیں جس کے ذریعے صلح اور امن کی بات کی جاسکے۔ سپہ سالار ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا ایچی بنا کر رومیوں کے پاس بھیجا۔

علامہ شبلی نعمانی طبری اور بلاذری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ معاذؓ بن جبل گھوڑے پر سوار ہو کر رومیوں کے کیمپ میں گئے تو انہیں سکار کے خیمے تک لے جایا گیا۔ وہ گھوڑے سے اترے اور سکار کے ایک محافظ نے ان کا گھوڑا پکڑ لیا اور کہا کہ آپ اندر چلے جائیں۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ معاذؓ بزرگ صحابی تھے، ان کی عمر اور رتبے کو دیکھتے ہوئے رومی عیسائی ان کا احترام کر رہے تھے۔

معاذؓ خیمے میں داخل ہونے لگے تو وہیں رک گئے۔ یہ تھا تو خیمہ لیکن اندر سے یوں لگتا تھا جیسے کسی بادشاہ کا خاص کمرہ ہو۔ ایسی ایسی قیمتی سجاوٹ کہ یہ میدان جنگ کا خیمہ لگتا ہی نہیں تھا۔ جس چیز نے معاذؓ کو حیران اور پریشان کیا وہ خیمے کے اندر بچھا ہوا قالین تھا۔ اس قدر قیمتی اور ایسا عمدہ اور نفیس کہ معاذؓ اس پر پاؤں رکھنے سے گریز کر رہے تھے۔

رومی جرنیل سکار نے انہیں آگے آکر بیٹھنے کو کہا۔ وہاں سبھی لوگ اور سکار بھی فرش پر یعنی فرش پر بیچھے ہوئے قالین پر بیٹھے تھے۔ معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس قالین پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ ان کے درمیان جو باتیں ہو رہی تھیں وہ ایک ترجمان کے ذریعے ہو رہی تھیں۔ سکار چونکہ رومی تھا اس لئے وہ اس خطے کی زبان نہیں بولتا تھا نہ سمجھتا تھا۔

”آپ اس قالین پر بیٹھ سکتے ہیں“ — سکار نے کہا — ”اس پر صرف غلاموں کو پاؤں رکھنے کی اجازت نہیں۔“

”میں مسلمان ہو کر اس قالین پر نہیں بیٹھوں گا“ — معاذؓ نے کہا — ”اس قالین سے مجھے غریب رعایا کے خون کی بو آ رہی ہے۔ یہ قالین غریب مزدوروں اور کسانوں کا حق چھین کر تیار کیا گیا ہے۔“

قالین خیمے جتنا لمبا پوڑا نہیں تھا۔ زمین تنگی بھی تھی۔ معاذؓ زمین پر یعنی خیمے کے فرش پر بیٹھ گئے۔

”ہم یہ درخواست لے کر آئے ہیں جو دراصل اللہ کا پیغام ہے۔“ — معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا — ”اسلام قبول کر لیں۔ ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے ہم جیسی عبادت کریں۔ شراب اور خنزیر کا گوشت چھوڑ دیں کہ یہ دونوں چیزیں حرام ہیں اور ہر طرح کی حرام کاری اور شاہانہ عیش و عشرت چھوڑ دیں۔“

”اگر ہم آپ کی یہ درخواست قبول نہ کریں تو؟“ — سکار نے رعونت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”تو پھر جزیہ دیں۔“ — معاذ نے جواب دیا۔ ”اگر یہ بھی منظور نہیں تو پھر فیصلہ تلوار کرے گی.... اگر آپ کی تعداد ستاروں کے برابر ہے تو ہمیں اللہ کے اس فرمان پر بھروسہ ہے کہ ایسا اکثر ہوا ہے کہ ایک چھوٹی جماعت اللہ کے حکم سے ایک بڑی اور طاقتور جماعت پر فتح یاب ہوئی ہے۔ آپ کو اپنے بادشاہ پر بڑا ناز اور فخر ہے لیکن آپ یہ نہیں دیکھ رہے کہ وہ بادشاہ اپنے آپ کو ہر قانون سے بالاتر سمجھتا ہے اور آپ سب کی جان مال اور آبرو اس کے اختیار میں ہے لیکن ہم نے جس کو اپنا بادشاہ بنا رکھا ہے وہ اپنے آپ کو ہم سب سے بڑا اور برتر نہیں سمجھتا۔ ہم اسے خلیفہ کہتے ہیں۔ وہ بھی کوئی جرم کرے گا تو ایک عام آدمی جیسی سزا پائے گا۔“

یہ رومی جرنیل دراصل یہ چاہتا تھا کہ مسلمان کسی بھی قسم کی کوئی خیرات وصول کر لیں اور یہاں سے واپس چلے جائیں۔ اس نے ملک شام کا ایک ضلع اور کچھ اتنا ہی حصہ اردن کا پیش کیا اور کہا کہ مسلمان یہ زمین لے لیں اور واپس چلے جائیں۔ معاذ ”اٹھ کھڑے ہوئے اور مزید بات چیت سے انکار کر دیا اور واپس چلے آئے۔“

یہ رومی جرنیل ابھی تک یہ توقع رکھتا تھا کہ یہ غریب سے مسلمان جن کا ایک اتنے بڑے رستے والا آدمی قائلین پر بیٹھنے سے سمجھتا ہے، کچھ لے کر واپس جانے پر رضامند ہو جائیں گے۔ اُس نے اپنا ایک ایلیٹی مجاہدین اسلام کے سپہ سالار ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف بھیجا جسے یہ پیغام دیا کہ سپہ سالار رومی ایلیٹی کو اپنے پاس آنے کی اجازت دے دیں۔

ابو عبیدہ نے اجازت دے دی اور اُسی روز سکار کا بھیجا ہوا ایک ایلیٹی ابو عبیدہ کے پاس آگیا۔

طبری اور بلاذری کے حوالوں سے یہ واقعہ تاریخ کے دامن میں یوں محفوظ ہے کہ

رومی ایلیٹی کو غالباً ”یہ توقع تھی کہ اسلامی لشکر کا سپہ سالار توجاہ و جلال والا آدمی ہو گا اور اس کی کچھ توشان و شوکت دوسروں سے الگ ہوگی۔ ایلیٹی ابو عبیدہ کے پاس آیا تو اُس وقت سپہ سالار زمین پر بیٹھے ایک تیر کو ہاتھ میں لئے دیکھ رہے تھے۔ رومی ایلیٹی نے کسی سے پوچھا کہ تمہارا سردار کون ہے۔ ان آدمیوں نے ابو عبیدہ کی طرف اشارہ کیا تو وہ حیران ہو کر ان کی طرف دیکھتا ہی رہا پھر ان کے قریب آیا۔

”کیا تم ہی اس لشکر کے سپہ سالار اور سردار ہو؟“ — ایلیٹی نے کچھ رعونت کا سا مظاہرہ کیا۔

”ہاں، میں ہی ہوں۔“ — ابو عبیدہ نے بڑے آرام سے جواب دیا۔

”پھر میری ایک بات سن لو۔“ — رومی ایلیٹی نے افسرانہ جلال سے کہا — ”ہم تمہاری تمام فوج کو سونے کی دودو اشرفیاں فی آدمی دیں گے اور تم یہاں سے واپس چلے جاؤ۔“

معلوم نہیں اُس وقت اشرفیاں تھیں یا نہیں، اس رومی کا مطلب دراصل یہ تھا کہ سونے کے دودو ٹکڑے ہر مجاہد کو دیئے جائیں گے اور وہ واپس چلے جائیں۔

”کوئی اور بات کرنی ہے تم نے؟“ — ابو عبیدہ نے پوچھا۔

”نہیں!“

”پھر تم چلے جاؤ۔“ — ابو عبیدہ نے کہا۔

ایلیٹی بڑا ہی برہم ہو کر چلا گیا۔ ابو عبیدہ نے اُسی وقت ایک پیغام امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا جس میں یہ سارا واقعہ لکھا۔

فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ تیز رفتار قاصدوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ چار پانچ دنوں بعد قاصد امیر المومنین کا پیغام لے کر آگیا۔ امیر المومنین نے لکھا تھا کہ اللہ کی راہ میں ثابت قدم رہو، اللہ تمہارا یاد و مددگار ہے۔

○

وہ ہر قتل جسے رعایا اور اس کے جرنیل بادشاہوں میں سب سے بڑا بادشاہ سمجھتے تھے، اور وہ ہر قتل جس کی فوج کی تعداد آسمان کے ستاروں اور زمین کے ذروں کے برابر تھی، بزنطیہ میں اس حال میں پہنچا تھا کہ آسمان کے ستاروں اور زمین کے ذروں کے برابر فوج سپاہی سپاہی ہو کر بکھر گئی تھی اور آدمی سے زیادہ فوج ہلاک ہو کر ہڈیوں کے ڈھانچوں

میں تبدیل ہو چکی تھی اور ملک شام پر مجاہدین اسلام کا قبضہ ہو گیا تھا.... آسمان کے ستارے ٹوٹ پھوٹ کر زمین کے ذروں میں مل کر خاک ہو گئے تھے۔

اُدھر جنگ قادسیہ کے بعد کسریٰ امیر ان بڑی بُری شکست کھا کر بھاگا اور اپنا دار الحکومت مدائن بے باخترانوں سمیت مسلمانوں کے لئے چھوڑ کر کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ امیران و عراق مجاہدین اسلام کی جھولی میں آ پڑے اور اُدھر شام مسلمانوں کے قدموں میں آگرا۔ یہ صورت حال ایسی تھی جو ہر قل کا دل توڑ رہی تھی لیکن اُدی بہر حال حوصلہ والا تھا، اُس نے اطمینان سے اس صورت حال کا اور اپنی جنگی طاقت کا جائزہ لیا تو اس کا ٹوٹا پھوٹا حوصلہ پھر سے قائم ہونے لگا۔ اس کے مشیروں نے بھی اس سے کہا کہ اپنی اُدھی فوج مارے جانے نے اور شام ہاتھ سے نکل جانے سے روم کی شہنشاہی کے لئے اتنا نقصان نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔ ابھی مصران کے پاس تھا اور مصر میں بے شمار فوج تھی۔ مشیروں نے ہر قل سے کہا کہ وہ مصر سے فوج منگوائے اور تیاری کر کے مسلمانوں پر جوابی حملہ کیا جائے۔

ہر قل کی اُس وقت کی ذہنی کیفیت کے متعلق مورخوں نے لکھا ہے۔ بزنطیہ میں پہنچ کر جب اسے یہ محفوظ پناہ مل گئی اور کچھ آرام اور سکون بھی مل گیا تو اسے مشیروں کے مشورے بڑے ہی اچھے لگے۔ اُس نے اسی وقت قاصد مصر اس پیغام کے ساتھ بھیج دیئے کہ کم و بیش چالیس ہزار نفری کی فوج فوراً روانہ کر دی جائے۔ اُدھر اس کے پاس ایک مدد اور آگئی جو اس کے لئے بالکل ہی خلاف توقع تھی۔ اس مدد نے اس کا حوصلہ پہلے کی طرح مضبوط کر دیا۔

یہ مدد اس طرح آئی کہ ایک روز اسے اطلاع دی گئی کہ عراق اور شام کے مختلف قبائل کے بیس پچیس سردار اسے ملنے آئے ہیں۔ یہ سب جنگجو قبائل تھے۔ ان سرداروں کے ساتھ بیس پچیس نہایت حسین و جمیل، معصوم صورت نوجوان لڑکیاں تھیں جو ان سرداروں کے اپنے ہی خاندانوں میں سے تھیں۔ ہر قل نے ان سب کو اندر بلا لیا۔ ان سرداروں کے ساتھ ایک معمر، سفید ریش بزرگ تھا جو شکل و صورت اور لباس سے دانشمند اور مذہبی پیشوا لگتا تھا۔

ان قبائل کے متعلق تھوڑی سی معلومات بے محل نہیں ہوں گی۔ عراقی اور شام کے سرحدی علاقوں میں اور کچھ دوسرے علاقوں میں بھی جو جنگ کی لپیٹ میں آئے

تھے، بہت سے قبائل آباد تھے، ان میں بڑے قبائل بنی تمر، بنو غسان، بنی تغلب، بنی ایاد، بنی مذام اور بنی عدوان تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے قبائل تھے۔ یوں کہہ لیں کہ ان علاقوں کی آبادی قبائل کی صورت میں بٹی ہوئی تھی۔ یہ جو قبائلی سردار ہر قل کے پاس گئے تھے، یہ سب غیر مسلم تھے۔ کچھ فارس کے یعنی عراق اور امیران کے آتش پرست تھے اور باقی عیسائی تھے۔

”کیا تم یہ لڑکیاں میرے لئے تحفہ لائے ہو؟“ — ہر قل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”کیا تم مجھے فاتح سمجھ کر آئے ہو؟ اس وقت میری ضرورت کچھ اور ہے۔ مجھے یہ حسین و جمیل لڑکیاں نہیں چاہئیں۔ اس وقت مجھے ایسے جوان مردوں کی ضرورت ہے جو میرے بازو مضبوط کریں اور میں عرب کے ان بددوؤں کو یہاں سے دھکیل کر وہیں پہنچا دوں جہاں سے یہ آئے ہیں۔“

”ہم آپ کے بازو ہی مضبوط کرنے آئے ہیں“ — بوڑھے سردار نے کہا۔ ”یہ لڑکیاں ہم تحفے کے طور نہیں لائے۔ یہ ہماری اپنی بیٹیاں ہیں۔ انہیں ہم آپ کے پاس صرف یہ دکھانے کے لئے لائے ہیں کہ یہ ہے ہماری عزت اور آبرو جو جنگوں میں محفوظ نہیں رہی۔ ہم ان معصوم بچیوں اور ان جیسی ہزار ہا بچیوں کی آبرو کی حفاظت کرنے کے لئے آپ کے ساتھ بات کرنے آئے ہیں۔ آپ ہماری مدد کریں اور ہم آپ کی مدد کریں گے۔ آپ کو جن جوان مردوں کی ضرورت ہے، وہ ہم آپ کو ہزار ہا کی تعداد میں دیں گے۔“

”میری مدد کا تمہیں اب خیال کیوں آیا ہے؟“ — ہر قل نے پوچھا۔ ”یہ خیال اُس وقت کیوں نہ آیا جب فارس کی فوج مسلمانوں کے آگے بھاگی جا رہی تھی اور اُدھر میری فوج بکھر کر پیچھے ہٹ رہی تھی؟“

یہ واقعہ بیان کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ بیان کیا جاسکے کہ ہر قل کے اقتدار کی شمع آخری بار کس طرح بجھ کر اور جب بجھ گئی تو وہ شام سے مصر تک کیوں اور کس طرح پہنچا۔ ہم ان طویل تفصیلات کو یوں مختصر کرتے ہیں کہ اس معرقبائلی سردار نے ہر قل کو بتایا کہ مسلمانوں نے امیرانیوں کے خلاف لشکر کشی کی اور اُدھر شام پر بھی انہوں نے حملہ کیا تو ان دونوں جنگوں میں ان قبائلیوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ ان کی کھڑی فصلیں تباہ ہو گئیں جو فوجوں کے گھوڑے، اونٹ اور بیل وغیرہ کھا گئے۔ اس

بوڑھے سردار نے یہ بھی بتایا کہ خود اپنے فوجیوں نے ان کی لڑکیاں اٹھالیں یا انہیں خراب کر کے چلے گئے۔

”کیا مسلمانوں نے تمہاری لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک نہیں کیا تھا؟“ — ہرقل نے پوچھا۔

”نہیں!“ — قبائلی سردار نے جواب دیا — ”مسلمان جب کسی بستی میں یا کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو وہ گھروں کو نہیں لوٹتے نہ وہ عورت پر ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ وہ بعض لڑکیوں کو لونڈیاں بنا کر لے جاتے ہیں لیکن ہم ان عربوں کو جانتے ہیں، وہ بغیر شادی کے کسی عورت کے ساتھ ناروا سلوک نہیں کرتے لیکن شہنشاہ روم! اگر ایک بھی مسلمان ہماری ایک بھی لڑکی کو ساتھ لے جائے اور اسے اپنی باقاعدہ بیوی بنالے تو بھی ہم اسے اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں۔ اسی لئے ہم یہ لڑکیاں آپ کے سامنے لائے ہیں کہ یہ پھول مسلمانوں کے ہاتھوں میں نہ جائیں اور اپنا بھی کوئی فوجی انہیں اپنا مال نہ سمجھے۔“

اس بزرگ سردار نے ہرقل کو بتایا کہ وہ آتش پرست ہے اور ان عیسائی قبائلی سرداروں کے ساتھ آیا ہے۔ مذہب کوئی بھی ہو، عزت ہر کسی کی ایک جیسی ہوتی ہے۔ بات دراصل یہ تھی جو اس سردار نے ہرقل کو بتائی کہ مجاہدین اسلام نے ان کی کچھ بڑی بڑی بستیاں اور قصبے تباہ و برباد کر دیئے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں نے مجاہدین کے خلاف اپنی فوجوں کو بھرپور مدد دی اور مجاہدین کو دھوکے دیئے تھے۔ یہ سب قبائلی سردار ہرقل کو یہ کہنے آئے تھے کہ اب مسلمانوں نے ملک شام بھی فتح کر لیا ہے اور وہ کچھ اور بستیاں اجاڑ دیں گے اس لئے وہ ہرقل کو قبائلیوں کی پوری فوج دینا چاہتے ہیں۔

”اے روم کے شہنشاہ!“ — اس معمر سردار نے کہا — ”میری عمر دیکھیں زمانے کے کتنے ہی نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ میں آپ کے چہرے پر مایوسی اور تذبذب دیکھ رہا ہوں۔ اپنے آپ کو شکست خوردہ نہ سمجھیں۔ آج شکست ہوئی ہے تو کل فتح بھی ہو سکتی ہے۔ مصر سے مزید فوج منگوائیں اور ہم آپ کو اپنی فوج دیں گے۔ ایک بات شاید آپ کو معلوم نہ ہو۔ وہ یہ ہے کہ یہ عربی مسلمان سمندر کی طرف سے آنے والی ہر چیز سے بہت ڈرتے ہیں۔ ہم ان میں یہ مشورہ کر دیں گے کہ سمندر سے فوج آ رہی ہے۔“

یہ بوڑھا قبائلی سردار ٹھیک کہہ رہا تھا۔ دو تین اور مستند مآثر خوں نے بھی لکھا ہے

کہ اُس وقت تک مسلمان سمندر میں نہیں اُترے تھے۔ ان کا کوئی بحری بیڑہ نہیں تھا نہ انہیں بحری جنگ کی سوجھ بوجھ تھی۔ وہ صحرائی لوگ تھے اور نہ جانے کیوں سمندر سے کچھ ڈرتے تھے۔ اس کے بعد تو مسلمانوں نے سمندری جنگوں میں ایسا نام پیدا کر لیا تھا کہ مسلمانوں کی بحری طاقت ایک ضرب المثل بن گئی تھی۔

ہرقل نے جب ان قبائلیوں کی یہ پیکش سنی تو اس نے انہیں پہلی بات یہ بتائی کہ مصر سے اس کی فوج آ رہی ہے اور قبائلی فوراً اس کے پاس مسلح ہو کر پہنچ جائیں۔ یہ سردار جب جانے لگے تو ہرقل نے یا اس کے شاہی خاندان کے کسی اور فرد نے یا کسی مشیر نے یہ مشورہ دیا کہ اتنی خوبصورت اور نوجوان لڑکیوں کو سفر واپس نہ بھیجا جائے بلکہ ہرقل کے محل میں ہی رہنے دیا جائے جہاں یہ بالکل محفوظ رہیں گی۔



مجاہدین اسلام کے تمام سالار مفتوحہ شہروں اور علاقوں کے انتظامات میں مصروف تھے۔ فتح کے بعد ایسے مسائل اور ایسی افزائش پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کی طرف فوری توجہ بہت ضروری ہو جاتی ہے۔ ابھی یہ خطرہ بھی باقی تھا کہ کہیں بغاوت بھی ہو سکتی ہے۔ رومی فوجی کہیں کہیں چھپے ہوئے بھی تھے۔ سالار ادھر مصروف تھے اسے لئے انہیں پتہ ہی نہ چل سکا کہ ہرقل پھر فوج اکٹھی کر رہا ہے اور مصر کی بندرگاہ اسکندریہ سے مزید فوج آ رہی ہے اور غیر مسلم قبائل ایک فوج کی صورت میں منظم ہو کر ہرقل تک بڑھ چکے ہیں۔

ہرقل ایک بار پھر ذہنی اور جسمانی طور پر بیدار ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد مصر سے چلی ہوئی فوج بحری جہازوں کے ذریعے ساحل سے آگئی۔ ہرقل نے اپنے آدمی وہاں بھیج رکھے تھے۔ وہ فوج کو ایک ایسے مقام تک لے گئے جو ہرقل نے انہیں بتایا تھا۔ یہ مقام اُس وقت کے ایک مشہور شہر ممص کے قریب تھا۔ قبائلیوں کے جو لشکر آ رہے تھے، انہیں بھی ہرقل اسی مقام کی طرف بھیج رہا تھا۔ اس ساری فوج کا کمانڈر ہرقل کا اپنا بیٹا حنین تھا۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ یہ بیٹا ایسے جوش اور بھڑکے ہوئے جذبے سے آیا تھا کہ اپنے باپ کی شکست کا انتقام لے گا اور اس شکست کو فتح میں بدلے گا۔

مصر سے آئی ہوئی ہرقل کی فوج اور قبائلی لشکر ایسے انداز سے اور ایسی ترتیب میں

حمص کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے کہ حمص جیسا بڑا اور اہم شہر محاصرے میں آگیا لیکن یہ محاصرہ قریب نہیں تھا بلکہ اتنی دور تھا کہ مسلمانوں کو اس کا پتہ ہی نہ چل سکا۔ علاقہ پہاڑی تھا اور کچھ جنگلات بھی تھے جن سے رومیوں نے یہ فائدہ اٹھایا کہ اپنے آپ کو چھپائے رکھا۔ ابھی قبائلیوں کے اور لشکر نے آنا تھا اس لئے یہ لوگ محاصرہ تنگ نہیں کر رہے تھے۔

مجاہدین اسلام کے سپہ سالار ابو عبیدہ حمص میں ہی تھے اور یہی مجاہدین کا ہیڈ کوارٹر بھی تھا۔ دوسرے سالار دوسرے شہروں میں مصروف تھے۔ ابو عبیدہ نے اپنے جاسوس باہر بھیجنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی کیونکہ رومیوں کی طرف سے حملے کا خطرہ ختم ہو گیا تھا۔ ہر قتل کے متعلق معلوم ہو گیا تھا کہ وہ بزنطیہ میں ہے اور وہاں سے بھی نکل جائے گا۔

ایک روز ابو عبیدہ کو کسی طرح معلوم ہوا کہ رومی ایک بار پھر منظم ہو کر حمص کے قریب آ رہے ہیں یا آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ کوئی مصدقہ اطلاع نہیں تھی بلکہ اُڑتی اُڑتی سنی گئی تھی۔ ابو عبیدہ نے حدید کو بلایا۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حدید جاسوسی اور شب خون مارنے میں خصوصی مہارت اور جرأت رکھتا تھا۔

حدید جس کا پورا نام حدید بن مومن خزرج تھا، حکم ملتے ہی اپنے سپہ سالار کے پاس پہنچا۔ سپہ سالار ابو عبیدہ نے اسے کہا کہ وہ حمص سے دُور دُور جا کر دیکھے کہ رومی فوج کہیں موجود ہے؟ سپہ سالار نے اسے وہ ساری خبر سنائی جو انہوں نے سنی تھی۔ حدید یہ حکم لے کر چلا گیا اور ایک عام قبائلی کسان کا بھیس بدل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنے مشن پر نکل پڑا۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جب حدید اور شارینا سپہ سالار ابو عبیدہ کے پاس پہنچے تھے تو ان کی ساری بات سن کر سپہ سالار نے شارینا کو عورتوں کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ عورتیں سالاروں کی بیویاں، مجاہدین کی بھی بیویاں اور ہمیشہ وغیرہ تھیں جو ان کے ساتھ میدان جنگ میں آئی تھیں۔ شارینا حدید کی محبت میں گرفتار تھی لیکن جب سے حدید اسے یہاں لایا تھا، وہ حدید کو دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔ یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ حدید اور شارینا کی شادی کر دی جائے گی لیکن جنگ کی صورت حال ابھی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ شارینا حدید کو دیکھنے کو بھی ترس رہی تھی۔

حدید جب گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہا تھا تو شارینا نے اُسے دور سے دیکھ لیا۔ وہ عرب کی مسلمان لڑکی ہوتی تو یوں نہ کرتی لیکن وہ آزاد خیال اور شاہی خاندان کی لڑکی تھی اور اس کے علاوہ وہ حدید کی محبت میں تڑپتی رہتی تھی۔ وہ حدید کی طرف اُٹھ دوڑی اور اسے پکارنے لگی۔ حدید نے گھوم کر دیکھا تو گھوڑا روک دیا۔ شارینا دوڑتی اُس تک پہنچی اور پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ وہاں ایسی بات نہیں تھی کہ انہیں یوں الگ اکٹھے کھڑے دیکھ کر کوئی اعتراض کرتا۔ وہ اخلاق اور کردار کا زمانہ تھا۔ عورتیں اور نوجوان لڑکیاں بھی میدان جنگ میں زخمی مجاہدین کو اٹھاتیں، سہارا دے کر پیچھے لاتیں اور انہیں پانی پلاتی تھیں۔ بعض لڑکیاں رات رات بھر ایک ایک زخمی کے پاس بیٹھی ان کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ حدید اور شارینا کے متعلق تو سب کو معلوم تھا کہ یہ دونوں کہاں سے اور کیسے آئے ہیں۔

حدید نے شارینا سے کہا کہ وہ اپنے کام سے جا رہا ہے اور وہ واپس چلی جائے لیکن شارینا نے ہلکے شکوے شروع کر دیئے کہ وہ اسے ملتا نہیں اور کبھی اس نے آکر اسے دیکھا بھی نہیں۔ حدید نے اسے بتایا کہ وہ صبح شام مصروف رہتا ہے لیکن اتنی سی بات سے شارینا کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ تسلی نہ ہونے کی ایک وجہ تو صاف تھی۔ اس نے شاہی محل میں جنم لیا، پلٹی بڑھی اور شاہی ماحول میں جوان ہوئی تھی اور وہ اس کے بالکل اُلٹ ماحول میں آگئی تھی۔ دوسری وجہ یہ کہ حدید بن مومن اسے اتنا اچھا لگا تھا کہ ویوانہ دار اسے چاہنے لگی تھی اور کئی دن اسے حدید نظر نہیں آتا تھا۔

اب اسے حدید نظر آگیا تو اس کے پیچھے پڑ گئی کہ وہ اسے بتائے کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ حدید ایک خفیہ مشن پر جا رہا تھا جو وہ شارینا کو نہیں بتانا چاہتا تھا لیکن شارینا نے گھوڑے کے آگے ہو کر لگام پکڑ لی اور بچوں جیسی ضد کرنے لگی کہ وہ اسے بتائے وہ کہاں جا رہا ہے۔

حدید کو بھی آخر اُس سے محبت تھی۔ وہ اس کی اتنی پیاری ضد سے متاثر ہو گیا اور اسے بتایا کہ وہ اپنے سپہ سالار کے ایک ٹک کے مطابق کچھ دور دیکھنے جا رہا ہے کہ واقعی رومی فوج کہیں قریب آگئی ہے یا یہ ایک افواہ تھی جو سپہ سالار کے کانوں تک پہنچ گئی۔

شارینا نے اب یہ ضد شروع کر دی کہ وہ بھی اس کے ساتھ جائے گی۔ حدید کو یہ منظور نہ تھا نہ ہی مناسب تھا کہ وہ اسے ساتھ لے جاتا۔ شارینا فہم و فراست رکھنے والی

لڑکی تھی۔ اس نے کہا کہ رومی کہیں نظر آ بھی گئے تو اسے کوئی نہیں پہچان سکے گا کیونکہ وہ اب ایسے لباس میں ہے کہ اسے کسی معمولی سے گھرانے کی لڑکی سمجھا جائے گا اور کسی نے پوچھ بھی لیا کہ تم دونوں کون ہو تو وہ کہے گی کہ میں اس کی بیوی ہوں۔

حدید نے اسے بہت سمجھایا لیکن وہ نہیں مان رہی تھی۔ حدید گھوڑے سے اتر اور شارینا کو اپنے بازوؤں میں لے کر بڑے پیار سے سمجھایا کہ وہ واپس چلی جائے اور اس کے فرائض میں مخل نہ ہو۔ بڑی تک و دو کے بعد حدید نے شارینا کو راضی کر لیا کہ وہ واپس چلی جائے۔

شارینا وہاں سے آستہ آہستہ نہ چلی بلکہ دوڑ پڑی۔ حدید نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ چلی گئی ہے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور آگے کو چل پڑا۔ شارینا اُس پر بھی پیار اور محبت کے جذبات طاری کر گئی تھی لیکن وہ اسلام کا مجاہد تھا جذبات کے غلبے سے نکل آیا اور آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ وہ گھوڑا دوڑا نہیں رہا تھا گھوڑا معمول کی چال چل رہا تھا۔

وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اُسے کسی گھوڑے کے ٹاپ سنائی دیے۔ اُس وقت وہ ایک چٹان کی اوٹ میں تھا۔ کوئی سوار گھوڑا سرپٹ دوڑاتا آ رہا تھا۔ حدید کو خیال آیا کہ سپہ سالار نے ہی کسی سوار کو کوئی اور پیغام دے کر اس کے پیچھے بھیجا ہو گا۔ وہاں کسی دشمن کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

حدید نے گھوڑے کا رخ موڑا اور چٹان کی اوٹ سے نکل کر سامنے آگیا کہ دیکھو کہ یہ کون آ رہا ہے۔ گھوڑا قریب آگیا تھا۔ سوار نے سر اور چہرے پر کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ سوار نے قریب آکر گھوڑا روکا تو حدید نے دیکھا کہ یہ تو شارینا ہے۔ وہ پریشان ہو گیا اور شارینا سے کہا کہ وہ واپس چلی جائے۔ شارینا نے کہا کہ وہ واپس جانے کے لئے نہیں آئی اور اسے پوری امید ہے کہ وہ حدید کے لئے مددگار ثابت ہوگی.... حدید یہ تو دیکھ ہی چکا تھا کہ یہ لڑکی کس قدر دلیر ہے اور کیا کچھ کر سکتی ہے۔ وہ کوئی عام سی قسم کی لڑکی ہوتی جو صرف محبت کی ہی طلبگار ہوتی تو حدید اسے اپنے ساتھ نہ لے جاتا۔ اس نے سوچ سوچ کر یہی بہتر سمجھا کہ شارینا کو ساتھ لے جائے۔

اب دونوں پہلو پہلو چلے جا رہے تھے۔ حدید نے یہ دیکھ لیا تھا کہ شارینا نے ایسا لباس پہن رکھا ہے جس نے سر اور چہرے کو اس طرح چھپا رکھا ہے کہ قریب آکر ہی کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ عورت ہے۔

○

”یہ علاقہ میرے لئے نیا اور اُن دیکھا نہیں“ — شارینا نے کہا — ”میں یہاں اپنے آپ کو اجنبی نہیں سمجھتی۔ ہم نے اس ملک پر حکومت کی ہے اور میں چند مرتبہ یہاں سیر پانے کے لئے آئی ہوں۔ آگے ایک ندی آئے گی۔ یہ جگہ بہت ہی خوبصورت ہے۔ گھوڑوں کو اس ندی سے پانی پلائیں گے اور کچھ دیر سنا بھی لے لیں گے۔“

وہ تو ایک روح پرور سبزہ زار تھا۔ زمین نشیب و فراز والی تھی۔ خوش نما جھاڑیاں اور سبز گھاس سے لدی پھندی ٹیکریاں بھی تھیں۔ دونوں چلتے گئے اور جب ایک ٹیکری سے گھومے تو آگے چھوٹی سی ندی آگئی۔ شارینا کے کہنے پر حدید نے گھوڑا روک لیا اور دونوں گھوڑوں سے اترے اور گھوڑوں کو کھلا چھوڑ دیا۔ گھوڑے فوراً ندی کے کنارے چلے گئے اور پانی پینے لگے۔

شارینا نے اپنے سر سے کپڑا کھول دیا اور چہرہ بھی نکا کر دیا۔ وہاں انہیں دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ یہ خطرہ تو تھا ہی نہیں کہ کوئی رومی ادھر آ نکلے گا۔ ان کے خیال کے مطابق دور دور تک کسی رومی کا نام و نشان اور سرِ مرغ نہ تھا۔

جہاں وہ اترے تھے اس سے چند ہی قدم دور سے ندی مُرتقی تھی اور وہاں ایک ٹیکری بھی تھی اور اس طرف ندی ٹیکری کے پیچھے ہو جاتی تھی۔

وہ دونوں بیٹھ گئے لیکن اُس وقت ان پر رومانی کیفیت طاری نہیں تھی بلکہ وہ اپنے دشمن کی باتیں کر رہے تھے اور شارینا حدید کو یقین دلارہی تھی کہ وہ اس کا ساتھ مردوں کی طرح دے گی اور کہیں بھی اس پر ایسا بوجھ یا اس کے کندھوں پر ایسی ذمہ داری نہیں ڈالے گی جیسی عام عورتیں اپنے مردوں کے لئے بن جایا کرتی ہیں۔

وہ اپنی باتوں میں مگن تھے کہ انہیں کسی اور کی باتوں کی آواز سنائی دینے لگی جو ٹیکری کی اوٹ سے ان کی طرف بڑھتی آرہی تھی۔ آواز اور قریب آئی تو دونوں چپ ہو گئے اور شارینا نے حدید کے کان میں سرگوشی کی کہ یہ تو رومی زبان میں باتیں کرتے آ رہے ہیں.... شارینا نشی نہیں تھی۔ وہ تلوار اور ایک خنجر سے مسلح ہو کر آئی تھی اور حدید تو تھا ہی مسلح۔ اس کے پاس بھی تلوار تھی اور ایک خنجر۔

آوازیں جب سر پر آ پہنچیں تو دونوں اُنھ کو کھڑے ہوئے اور ابھی سنبھل بھی نہ

ایک مسلمان کو عیسائی کر کے ساتھ لے جا رہی ہے۔ روتاس کے ساتھ جو دو آدمی تھے وہ رومی فوج کے سپاہی تھے۔

شاریتا نے انہیں وہیں بٹھالیا اور روتاس سے پوچھا کہ ہرقل کہاں اور اپنی فوج کہاں ہے۔ روتاس شاریتا سے اس لئے بھی متاثر تھا بلکہ مرعوب تھا کہ وہ شہزادی تھی۔ اس نے شاریتا کو بتانا شروع کر دیا کہ ہرقل کہاں ہے اور اب اپنی فوج اور قبائلی لشکر یہاں ان پہاڑیوں کے پیچھے اکٹھے ہو گئے ہیں اور محص کو محاصرے میں لے کر یہ شہر فتح کر لیا جائے گا۔

شاریتا نے یہ ساری بات حدید کو اس کی زبان میں بتائی اور کچھ اشارہ بھی دے دیا۔ باتیں کرتے کرتے روتاس نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ اس بھیس میں محص جا رہا ہے کہ وہ یہ اندازہ کر سکیں کہ محص کے اندر مسلمانوں کی فوج کتنی کچھ ہے اور یہ قلعہ بند شہر کس طرح لیا جاسکتا ہے اور کیا محص والوں کو کیس سے ملک پہنچ سکتی ہے یا نہیں۔

شاریتا اس طرح اٹھی جیسے بیٹھ بیٹھ کر تھک گئی ہو اور ٹانگیں سیدھی کرنا چاہتی ہو۔ باتیں کرتے کرتے وہ ان رومیوں کے پیچھے ہو گئی۔ جو نبی روتاس نے نظرس ہٹائیں شاریتا نے بڑی تیزی سے تلوار نکالی اور ایک سپاہی کی گردن پر ایسا بھرپور وار کیا کہ اس کی گردن اُدھی سے زیادہ کٹ گئی۔ روتاس نے یہ دیکھا تو کچھ سمجھ نہ سکا۔ اتنی دیر میں شاریتا نے تلوار دوسرے سپاہی کے پہلو میں اس طرح اتار دی جس طرح برچھی ماری جاتی ہے۔

تب روتاس بڑی تیزی سے اٹھا اور اس کا ایک ہاتھ اس کی تلوار کے دتے پر گیا لیکن حدید کی تلوار کی نوک اس کے سینے کے ساتھ لگ چکی تھی اور شاریتا نے اسے کہا تھا کہ اسے زندہ رہنے دیا جائے گا اور وہ مقابلہ کرنے کی حماقت نہ کرے۔ شاریتا کی تلوار کی نوک بھی روتاس کے ایک پہلو کے ساتھ لگ گئی تھی۔ روتاس نے اپنا ہاتھ اپنی تلوار کے دتے سے ہٹالیا۔ حدید نے شاریتا سے وہ کپڑے لے لیا جو اس نے اپنے سر اور پیرے پر لپیٹا تھا۔ اس کپڑے سے حدید نے روتاس کے ہاتھ اس کی پیٹھ پیچھے باندھ دیئے اور پھر حدید اور شاریتا نے اسے اٹھا کر حدید کے گھوڑے پر بٹھادیا۔ حدید اس کے پیچھے بیٹھا اور شاریتا اپنے گھوڑے پر سوار ہوئی اور دونوں وہیں سے واپس چل پڑے۔

یہ کوئی عجیب اتفاق نہ تھا کہ شاریتا کے ساتھ بالکل ایسا ہی ایک واقعہ پہلے پیش آچکا

پائے تھے کہ ٹکری کی اوٹ سے تین آدمی اچانک سامنے آ گئے۔ حدید کو یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دیر نہ لگی کہ یہ تینوں رومی فوجی ہیں حالانکہ وہ فوجی وردی میں نہیں تھے بلکہ حدید کی طرح ہی انہوں نے عام سی قسم کے لباس پہن رکھے تھے جیسا لباس اس خطے کے عام لوگ پہنا کرتے تھے۔ ان میں ایک گورے چٹے رنگ کا جوان سا آدمی تھا جس کی آنکھیں کچھ نیلی اور کچھ سبزی تھیں۔ اس نے جب شاریتا کو دیکھا تو چونک کر ذرا پیچھے ہٹ گیا۔

”میں تمہارا نام نہیں جانتی“ — شاریتا نے اس گورے چٹے آدمی سے کہا —

”اتنا یاد ہے کہ تم شاہ ہرقل کے محافظ دستے کے کماندار رہ چکے ہو۔“

”ہاں شہزادی شاریتا!“ — اُس آدمی نے کہا — ”میرا نام روتاس ہے اور میں

شاہی محل کے محافظ دستے کا کماندار رہ چکا ہوں.... پہلے یہ بتائیں کہ آپ یہاں کیسے؟“

— اُس نے حدید کی طرف دیکھ کر پوچھا — ”اور یہ کون ہے؟“

”یہ مسلمان ہے“ — شاریتا نے کہا — ”اور میں اسے اپنے ساتھ لے جا رہی

ہوں۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں رہا ہے باہر نکلی تو دو مسلمانوں نے مجھے اغوا کر لیا

تھا اور اپنے ہاں لے گئے تھے۔ وہاں میرے ساتھ کوئی ناروا سلوک نہیں ہوا۔ یہ اس لئے

نہیں ہوا کہ مجھے کسی سالار کی بیوی بننا تھا اور مسلمان دشمن کی عورتوں کے ساتھ وہ

سلوک نہیں کرتے جو ہماری فوج کیا کرتی ہے۔ بہر حال میں تھی تو ان کی قیدی لیکن اس

آدمی نے مجھ پر رحم کیا اور قید سے آزاد کرادیا۔ میں تمہیں پوری کمائی نہیں سنارہی، تم

بھی جوان ہو اور جوانی کے جذبات سے واقف ہو۔ یہ میری محبت میں ایسا جھٹکا ہوا کہ اپنا

مذہب بھی چھوڑنے پر تیار ہو گیا۔ اب موقع ملا ہے اور ہم دونوں وہاں سے فرار ہو آئے

ہیں۔ معلوم نہیں تھا کہ میں اسے کہاں لے جاؤں۔ اچھا ہوا تم مل گئے۔ اب تم ہٹا سکو

گے کہ اپنی فوج کہاں ہے۔ میں اسے وہاں لے جا کر عیسائی بنواؤں گی اور یہ خواہش اس

نے خود ظاہر کی ہے۔“

حدید چپ رہا۔ اُسے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ شاریتا اس رومی افسر سے کیا کہہ رہی

ہے۔ شاریتا ملک شام کی زبان بول اور سمجھ سکتی تھی۔ اس نے اس زبان میں یعنی عربی

زبان میں حدید کو بتایا کہ اس نے اس جوان سال رومی کے ساتھ کیا جھوٹا بولا ہے۔

روتاس نے شاریتا سے کہا اسے معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ وہ اغوا ہو گئی تھی۔ بہر حال اس

نے خوشی کا اظہار کیا کہ شاریتا نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی قید سے فرار ہو کر آ گئی ہے بلکہ

سے بڑی دشواری یہ تھی کہ باقی سب سالار، خالد بن ولید، شرجیل بن حسہ، عمرو بن العاص جیسے تاریخ ساز سالار اُن سے بہت دور تھے۔ ہر ایک کی ذمہ داری میں وسیع علاقہ تھا جسے وہ نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔

ابو عبیدہ نے اپنے ماتحت سالاروں کو بلایا جو ان کے ساتھ محص میں تھے۔ انہیں اس صورت حال سے اور آنے والی آفت سے آگاہ کیا اور پھر تیز رفتار قاصد کو پیغام لکھ کر مدینہ امیر المومنین کی طرف بھیج دیا۔ اس میں انہوں نے لکھا کہ وہ محص میں کس خطرے میں گھر گئے ہیں۔ ایک تو انہیں ہدایات اور احکام دینے جائیں اور جس قدر ملک مل سکتی ہے بلاتاخیر بھیج دی جائے۔

تمام مورخوں نے لکھا ہے کہ صاف نظر آ رہا تھا کہ ہر قتل محص پر قبضہ کر لے گا اور مسلمانوں کے لئے قدم جمانا ناممکن نہیں تو بڑا ہی دشوار ضرور ہو جائے گا۔ اس سوال کا جواب اُس وقت کوئی بھی نہیں دے سکتا تھا کہ محص کو اتنی تیزی سے مدد مل بھی سکے گی یا نہیں جس تیزی سے رومی اور قبائلی لشکر محص کی طرف بڑھ رہے تھے۔

تھا کہ اس کی فوج کے ایک افسر نے اسے راستے میں دیکھ لیا تھا اور اس افسر نے حدید کو اُس وقت اپنے دو سپاہیوں سے قتل کروانے کی کوشش کی تھی جب حدید اور شاریتا ایک چشے کے کنارے سوئے ہوئے تھے۔ اب پھر رومی فوج کا ایک افسر دو سپاہیوں کے ساتھ اسے مل گیا۔ یہ اتفاق اس وجہ سے عجیب نہ تھا کہ اس ماحول میں اور اس صورت حال میں جب رومی فوج وہاں موجود تھی، ایسا ہی واقعہ پیش آ سکتا تھا کہ کوئی رومی شاریتا کو پہچان لیتا اس کے سوا وہاں اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔

روتاس کو حدید اور شاریتا محص لے آئے اور ابو عبیدہ کے پاس لے گئے۔ اُس وقت تک ابو عبیدہ کو ایک اور ذریعے سے انتہا پتہ چل چکا تھا کہ کچھ قبائل لشکروں کی صورت میں منظم ہو کر کہیں جا رہے ہیں لیکن یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں اور کیوں جا رہے ہیں۔ سپہ سالار نے اس طرف بھی جاسوس بھیج دیئے تھے اور اپنے ان سالاروں کو جو ملک شام میں بکھرے ہوئے تھے، پیغام بھیج دیئے تھے کہ یہ دیکھیں کہ عیسائی اور آتش پرست قبائل کہاں جا رہے ہیں اور ان کی ظاہری اور درپردہ سرگرمیاں کیا ہیں۔

یہ ایک قدرتی مدد تھی کہ شاریتا حدید کے ساتھ چل پڑی تھی۔ حدید بھی کوئی ایسا اناڑی نہ تھا، وہ شاریتا کے بغیر ہی کچھ دیکھ آتا اور کوئی خبر لے آتا لیکن روتاس کو ساتھ لے آنے سے ہی صورت حال کا علم ہو گیا۔

روتاس سے کہا گیا کہ وہ ہر قتل کے صحیح عزائم اور اس کا منصوبہ پوری طرح بیان کر دے تو اس کی جان بخشی ہو جائے گی اور اسے جنگ کے بعد غلام بنانے کی بجائے آزاد کر دیا جائے گا۔ جان کے عزیز نہیں ہوتی۔ روتاس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس کا بادشاہ ہر قتل شکست کھا کر بھاگ گیا ہے اور اس کی فوج میں کوئی دم خم نہیں رہا۔ روتاس نے سپہ سالار ابو عبیدہ کو ہر قتل اور تمام قبائل کا سارے کا سارا پلان سنا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ رومی فوج اور قبائلی لشکر محص کو محاصرے میں لے چکے ہیں اور کچھ قبائلی لشکر پہنچ جائیں گے تو محص پر بڑا ہی زبردست حملہ ہو گا۔

طبری، بلاذری اور جوزی نے خاص طور پر یہ واقعہ تاریخ کے دامن میں اس طرح ڈالا ہے کہ رومی فوج اور قبائلی لشکروں کی نفری پچاس ہزار سے زیادہ تھی اور محص میں جو مجاہدین موجود تھے ان کی تعداد تین اور چار ہزار کے درمیان تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ ابو عبیدہ جیسے سپہ سالار کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا۔ ان کے لئے سب

عزت اور احترام سے آؤ اور رخصت کریں گے۔“

ابو عبیدہؓ نے محافظوں کو اشارہ کیا۔ محافظ روتاس کو اپنے ساتھ لے کر باہر نکل آئے۔ حدید بھی ان کے ساتھ آگیا اور شارینا کے پاس دک گیا۔

”اے کہاں لے جا رہے ہیں؟“ شارینا نے روتاس کے متعلق پوچھا۔

”قید خانے میں!“

”قید خانے میں کیوں؟“ شارینا نے پوچھا اور جواب کا انتظار کئے بغیر بولی۔

”اُنہیں روک لو حدید!“

”سپہ سالار کے حکم میں دخل اندازی نہ کرو شارینا!“ حدید نے کہا۔ ”تمہاری عقل اُن تک نہیں پہنچ سکتی۔“

”میں سپہ سالار سے ملنا چاہتی ہوں۔“ شارینا نے کہا۔ ”تم بھی ساتھ آؤ۔ مجھ میں سپہ سالار جیسی عقل تو نہیں ہوگی لیکن میری عقل میں ایک بات آگئی ہے۔“

حدید کی کوئی اور بات سننے بغیر شارینا اندر چلی گئی۔ حدید بھی اُس کے پیچھے چلا گیا کہ نہ جانے کیسی باتیں کہہ گزرے جو سپہ سالار کو اچھی نہ لگیں۔

”سالار محترم!“ شارینا نے اندر جاتے ہی کہا۔ ”میں آپ کے فیصلوں اور احکام میں دخل اندازی نہیں کر رہی، صرف یہ پوچھنے کی معافی چاہتی ہوں کہ اس رومی افسر کو آپ قید خانے میں کیوں قید کر رہے ہیں؟ اسے تو آپ نے آزادی کا وعدہ دیا تھا۔“

”میری عزیز بچی!“ سپہ سالار ابو عبیدہؓ نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ ”اگر یہ کارنامہ تمہارا نہ ہوتا تو میں تمہیں اس سوال کا جواب نہ دیتا۔ میں تمہارے جذبے کی دل طور پر تعریف کرتا ہوں لیکن تم ابھی کم عمر ہو اس لئے نہیں سمجھ سکتیں کہ جذبے کی لگام عقل کے ہاتھ میں نہ ہو تو جذبہ نقصان بھی دے جایا کرتا ہے۔ تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ مجھ سے پوچھو کہ میں اسے قید خانے میں کیوں بند کر رہا ہوں۔ اگر اسے ابھی آزاد کر دیا تو یہ سیدھا ہرقل کے پاس پہنچے گا اور اسے بتائے گا کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھ چڑھ گیا تھا اور اُس نے یہ راز اگل دیا ہے۔ اس کی اس اطلاع پر ہرقل فوراً اپنا حملہ اور محاصرے کا منصوبہ تبدیل کر دے گا۔ ہو سکتا ہے وہ محص کو نظر انداز کر دے اور کسی اور شہر کو جاکر محاصرے میں لے لے جو ہمارے قبضے میں آچکا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

محص ہی نہیں وہاں تو پورے کا پورا ملک شام ہاتھ سے جاتا نظر آنے لگا تھا۔ رومی فوج کے پکڑے ہوئے افسر روتاس نے بتایا تھا کہ اس وقت تک رومی فوج اور غیر مسلم قبائل کے لشکر کی تعداد پچاس ہزار سے تجاوز کر چکی ہے اور ان قبائل کے آدمی ابھی تک اس لشکر میں شامل ہونے کے لئے آرہے ہیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سپہ سالار ابو عبیدہؓ جیسی مضبوط اعصاب والی شخصیت کے چہرے پر تشویش کا تاثر آگیا تھا۔ تشویش تو ہوئی ہی تھی۔ اُن کے پاس تھا ہی کیا.... مجاہدین کی کل تعداد تین اور چار ہزار کے درمیان تھی۔

جس وقت سپہ سالار ابو عبیدہؓ روتاس سے سن رہے تھے کہ ہرقل کا پلان کیا ہے اُس وقت انہوں نے شارینا کو باہر بھیج دیا تھا۔ شارینا نے اپنا کام کر دیا تھا اور یہ اُس کا بہت بڑا کارنامہ تھا لیکن جنگی امور اور مسائل میں جن کا تعلق صرف مردوں یعنی سالاروں کی سطح کے مردوں کے ساتھ تھا، ایک عورت کی موجودگی ضروری بھی نہیں تھی اور مناسب بھی نہیں۔

ابو عبیدہؓ نے روتاس کی ساری بات سن کر اپنے دو تین محافظوں کو بلایا اور کہا کہ روتاس کو قید خانے میں بند کر دیا جائے۔ روتاس نے احتجاج کے لہجے میں کہا کہ اس نے ہر راز بتا دیا ہے اور میرے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ مجھے آزاد کر دیا جائے گا تو پھر قید خانے میں کیوں ڈالا جا رہا ہے؟

”ہم دل سے تمہاری قدر کرتے ہیں۔“ ابو عبیدہؓ نے کہا۔ ”ہم تمہیں جنگی قیدی سمجھ کر قید خانے میں نہیں ڈال رہے۔ جو نبی جنگ ختم ہوگی ہم تمہیں پوری

جائے گا کہ وہ قیدی نہیں ہمارا مہمان ہے۔“

”اور اس خوش اخلاقی کا میں اس پر ایسا تاثر پیدا کر دوں گی کہ یہ اسلام قبول کر لے گا۔“ شاریٹا نے کہا۔ ”لیکن میرا اولین مقصد یہ ہو گا کہ اس سے کچھ اور راز حاصل کر لوں۔ حدید میرے ساتھ ہو گا لیکن میں روتاس سے اکیلے ملا کروں گی۔“

ابو عبیدہؓ نے اُنہی وقت دربان کو بلا کر حکم دیا کہ اس رومی کو قید خانے میں نہ لے جایا جائے، اسے مہمان کے طور پر کہیں اور رکھا جائے گا۔ سپہ سالار نے اس کے مطابق حکم دے دیا کہ انتظام مکمل کیا جائے اور اس کے کمرے کے سامنے ہر وقت، دن رات پہرہ کھڑا رہے۔

ابو عبیدہؓ خالد بن ولیدؓ سعد بن ابی وقاصؓ اور عمرو بن العاصؓ کے پائے کے سپہ سالار تھے۔ خالد بن ولیدؓ کی معزولی کے بعد امیر المومنین حضرت عمرؓ نے لشکر کی کمان ابو عبیدہؓ کو ہی دی تھی۔ انہوں نے ٹھیک کہا تھا کہ جو مشورہ شاریٹا نے دیا تھا یہ خود ہی ان کے ذہن میں آ جانا چاہئے تھا لیکن نہ آیا۔ وجہ یہ تھی کہ انہیں محض ہاتھ سے جاتا نظر آ رہا تھا۔ اس پریشانی نے ان کے ہوش و حواس کو بھی مجروح کر دیا تھا کہ مکہ پہلے پہنچتی ہے یا ہرقل کا لشکر۔ یہ ان کے بس میں تھا ہی نہیں کہ مکہ رومی لشکر سے پہلے پہنچ جائے۔ وہ کچھ اور سوچنے کے قابل رہے ہی نہیں تھے۔ انہوں نے ایک کی بجائے اکٹھے دو قاصد امیر المومنین حضرت عمرؓ کی طرف دوڑا دیئے تھے۔

انہوں نے قاصدوں کو بڑی سختی سے ہدایات دی تھیں کہ وہ سوئیں گے تو گھوڑوں کی پیٹھ پر سوئیں گے اور کھائیں گے بھی تو چلتے گھوڑوں پر کھائیں گے۔ ایک ہدایت یہ بھی دی کہ دو قاصد اس لئے بھیج رہے ہیں کہ راستے میں ایک کو کچھ ہو جائے اور وہ اتنا بیمار ہو جائے کہ موت نظر آنے لگے تو دوسرا قاصد اس کے لئے رکے نہیں، اکیلا ہی چلا جائے۔ ابو عبیدہؓ کے الفاظ یہ تھے کہ اُڑ کر مدینہ پہنچو۔

اُس دُور کے قاصد ایسے نہیں تھے کہ پیغام لے کر چلتے تو اپنی مرضی کی رفتار سے جاتے اور خوش ہوتے کہ چلو میدانِ جنگ سے تو کچھ دنوں کی چٹھیاں ملیں۔ وہ قاصد بھی مجاہد تھے۔ ان کا بھی جذبہ تھا اور اپنے اس فرض پر جان قربان کر دینا ان کا ایمان تھا۔ پیغامِ رسانی کا انتظام بڑا اچھا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چوکیاں قائم کر دی گئی تھیں جہاں تازہ دم اور نہایت تندرست گھوڑے موجود رہتے تھے۔ قاصد ہر چوکی پر

اس نے ہمیں غلط خبر دی ہو۔ یہ اطلاعاتیں مجھے پہلے ہی ملی ہیں کہ محض سے دُور پہاڑی علاقے میں ہرقل کی فوج اور قبائل کا لشکر اس طرح اکٹھا ہو گیا ہے کہ محض محاصرے میں ہے۔ بے شک فاصلہ زیادہ ہے لیکن اس فوج اور لشکر نے اسی حالت میں پیش قدمی کی تو محض بالکل ہی محاصرے میں آجائے گا اور ہمیں قلعہ بند ہو کر لڑنا پڑے گا اور ہمارا سب سے بڑا نقصان یہ ہو گا کہ مکہ ہم تک نہیں پہنچ سکے گی۔ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ یہ محاصرہ توڑ دینے اور رومی فوج کو پسپا کرنے کے فوراً بعد روتاس کو آزاد کر دیا جائے گا۔“

”میں آپ کو خراج تحسین پیش کرتی ہوں محترم سپہ سالار!“ شاریٹا نے کہا۔ ”آپ کے سامنے میری حیثیت کچھ بھی نہیں۔ پھر بھی آپ نے میری بات تحمل سے سنی ہے اور جواب دیا ہے۔ رومیوں کے ہاں کوئی چھوٹا آدمی اپنے سالار کے سامنے اونچا سانس بھی نہیں لے سکتا۔ میں ہرقل سے ایسی بات کرنے کی جرأت ہی نہ کرتی حالانکہ وہ میرا باپ ہے۔ باپ سے پہلے وہ اپنے آپ کو بادشاہ اور پھر افواج کا سالار سمجھتا ہے۔“

”شاریٹا بیٹی!“ ابو عبیدہؓ نے کہا۔ ”میں اس وقت مضروف بھی ہوں اور کچھ پریشان بھی۔ اگر تمہیں کوئی خاص بات کہنی ہے تو وہ کہو۔ اپنی تعریفیں سننے کا ہمارے ہاں رواج بھی نہیں اور میرے پاس وقت بھی نہیں۔ تم مجھے خراج تحسین پیش نہ کرو، خراج تحسین کی حق دار تم خود ہو جس نے بہت بڑا کارنامہ کیا ہے۔“

”میں خاص بات ہی کہنا چاہتی ہوں۔“ شاریٹا نے کہا۔ ”اس رومی افسر روتاس کو قید خانے میں رکھنے کی بجائے کسی بڑے اچھے کمرے میں رکھیں، باہر پہرہ کھڑا کروا دیں تاکہ اسے یہ احساس نہ ہو کہ یہ قیدی ہے۔ پھر مجھے اجازت دیں کہ میں اس سے ملتی رہوں۔ مجھے امید ہے میں اس کے سینے سے کچھ اور کام کی باتیں نکلوا سکوں گی۔“

سپہ سالار ابو عبیدہؓ نے حدید کی طرف دیکھا پھر اُن دو تین سالاروں کی طرف دیکھا جو وہاں موجود تھے۔ ابو عبیدہؓ کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا۔

”خدا کی قسم اس لڑکی نے عقل و دانش کی بات کی ہے۔“ سپہ سالار ابو عبیدہؓ نے کہا۔ ”اور کیا تم سب نے محسوس نہیں کیا کہ میں کتنا پریشان ہوں اور میرا ذہن کہاں الجھ گیا ہے؟.... میرا دماغ حاضر ہو تا تو یہ بات میں خود سوچ لیتا.... شاریٹا! روتاس کو قید خانے کی بجائے نہایت اچھے رہائشی کمرے میں رکھا جائے گا اور اسے یہ احساس دلایا

تھکا ہوا گھوڑا چھوڑتے اور تازہ دم گھوڑا لے کر آگے چلے جاتے تھے۔ جب صحرا شروع ہو جاتا تھا تو صحرائی چوکیوں میں اونٹ بھی رکھے ہوتے تھے کیونکہ ریگستان میں اونٹ گھوڑے سے زیادہ تیز دوڑتا ہے اور پانی کی حاجت محسوس نہیں کرتا۔ یہ قاصدوں کی صوابدید پر ہوتا تھا کہ انہیں گھوڑے کی بجائے اونٹ پر آگے جانا چاہئے۔ یہ بھی پیش نظر رکھیں کہ محض سے مدینہ کم و بیش بارہ سو کلومیٹر دور اور راستہ زیادہ تر صحرائی تھا۔

○

سپہ سالار ابو عبیدہؓ نے محض میں اپنا ہیڈ کوارٹر جس مکان میں بنایا تھا اور ساتھ ہی رہائش رکھی تھی وہ کوئی معمولی اور عام سامکان نہیں تھا۔ یہ علاقہ بلکہ پورا شام کبھی ایرانیوں اور کبھی رومیوں کے قبضے میں رہا ہے۔ دو بادشاہ تھے اس لئے انہوں نے ہر جگہ اپنے لئے محل تعمیر کرا رکھے تھے۔ رومی فوج کے اس افسر کو جس کا نام روتاس تھا اس محل کے ہی ایک کونے والے کمرے میں رکھا گیا۔ اس کمرے کی اندرونی زیب و زینت، پلنگ اور دیگر فرنیچر وغیرہ شاہانہ تھا۔ کمرے کے باہر ایک سپرہ دار کھڑا کر دیا گیا تھا۔ روتاس کو کھانا بھی اچھا دیا جانے لگا۔ اگر وہ قید خانے میں قید کیا جاتا تو اسے بڑی گندی کوٹھڑی میں رکھا جاتا اور نہایت گھٹیا کھانا دیا جاتا۔

اگلے روز شاریتا اس کے کمرے میں گئی۔ اس نے کمرے کی ہر ایک چیز دیکھی پھر پلنگ اور بستر کو اچھی طرح دیکھا جیسے کمرے کا معائنہ کر رہی ہو۔

”اپنے آپ کو قیدی نہ سمجھنا“۔ شاریتا نے کہا۔ ”تم یہاں مہمان ہو.... کوئی تکلیف تو نہیں؟ میرا خیال ہے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں.... کیا تم خدا کا شکر ادا نہیں کرو گے کہ تمہیں قید خانے میں نہیں بھیجا گیا؟“

”تمہارے سپہ سالار نے مجھے آزاد کر دینے کا وعدہ کیا تھا“۔ روتاس نے کہا۔

”سپرہ کھڑا کر دینے کا مطلب ہے کہ میں قیدی ہوں۔“

”تم فوج کے افسر ہو“۔ شاریتا نے کہا۔ ”اگر تمہارے پاس تمہارے دشمن کا کوئی آدمی تمہاری ہی طرح تمہارے پاس لایا جائے اور وہ ویسے ہی راز نگاہل دے جیسے تم نے اگلے ہیں تو کیا تم اسے فوراً آزاد کر دو گے کہ وہ اپنی فوج میں جا کر بتائے کہ وہ راز نگاہل آیا ہے اور اپنے جنگی منصوبے تبدیل کر دو؟“

روتاس نے سر جھکا لیا جیسے اسے شاریتا کا جواب ٹھیک لگا ہو۔

”میں تمہارے پاس آتی رہوں گی“۔ شاریتا نے کہا۔ ”ہم دونوں رومی ہیں۔ یہ ایسا رشتہ ہے جسے میں نظر انداز نہیں کر سکتی۔“

”لیکن اب تو تم مسلمان ہو“۔ روتاس نے کہا۔ ”تم نے عملاً ثابت کر دیا ہے کہ مجھے اپنا دشمن سمجھتی ہو۔ کیا یہ بتانا پسند کرو گی کہ تم یہاں پہنچی کیسے تھیں؟ اور پھر تم ایک مسلمان کے ساتھ جا کہاں رہی تھیں کہ میں تمہارے سامنے آ گیا؟“

”تمہاری حیرت کو میں سمجھتی ہوں“۔ شاریتا نے کہا۔ ”تم سوچتے ہو گے کہ میں شہنشاہ ہرقل کی بیٹی ایک معمولی سے عربی مسلمان کے ساتھ کیوں چلی آئی۔ یہ شخص جو میرے ساتھ تھا اس کا نام حدید بن مومن خزرج ہے۔ اپنی فوج میں اس کا عمدہ معمولی سا ہے۔ ہمارا جنگی قیدی تھا۔ مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں نے اسے رہا کیا اور اس کے ساتھ آ گئی۔“

شاریتا نے روتاس کو حدید اور اپنے فرار کا واقعہ سنایا لیکن ایسے لہجے اور انداز سے سنایا جیسے اسے اپنا یہ اقدام پوری طرح اچھا نہ لگا ہو۔ روتاس نے اس سے پوچھا کہ وہ یہاں خوش ہے یا کوئی کمی محسوس کر رہی ہے۔

”میں یہاں اسلام قبول کرنے نہیں آئی تھی“۔ شاریتا نے جھوٹ بولا۔ ”مجھے اپنے باپ کے خلاف بھی کوئی شکایت نہیں تھی۔ شاید میں پیار کی تشنگی محسوس کرتی تھی اور میری عمر ایسی ہے کہ عقل پر جذبات غالب آ جاتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ شخص حدید مجھے کیوں اتنا اچھا لگتا ہے جیسے اس کے ہاتھ میں کوئی طلسم ہے جو مجھ پر بڑے ہی خوبصورت آسیب کی طرح طاری ہو جاتا ہے۔ مجھے اسلام سے نہیں حدید سے محبت ہے۔ میں تمہارے دو سپاہیوں کو مار کر تمہیں زندہ یہاں لے نہ آتی تو تم حدید کو مار ڈالتے۔ تمہیں یہاں حدید کو خوش کرنے کے لئے لائی تھی۔ حدید کے سالار اس پر بہت خوش ہیں۔ سچ پوچھتے ہو تو یہ لوگ مجھے اچھے نہیں لگے۔ میں تو شہزادی تھی اور کہاں اس جنگل میں خیمے میں پڑی رہتی ہوں اور زمین پر سوتی ہوں۔ یہ لوگ بہت ہی سادہ بلکہ پسماندہ ہیں۔ آج تمہیں یہاں دیکھ کر اور تمہارے پاس بیٹھ کر مجھے دلی تسکین محسوس ہو رہی ہے۔ یہ خیال رکھنا کہ مجھے اپنا دشمن نہ سمجھنا۔ میں تمہارے لئے جو کچھ بھی کر سکتی تھی کر دیا ہے۔ تمہیں قید خانے میں نہیں جانے دیا اور یہ کمرہ تمہیں دلویا

ہے۔“
”اگر مسلمانوں کو شکست ہو گئی اور یہ یہاں سے بھاگ نکلے تو پھر تم کیا کرو گی؟“
روتاس نے پوچھا۔

”میں تم سے امید رکھوں گی کہ میرے راز کو دل میں دفن کر دو گے۔“ شارینا نے کہا۔
”میں اس کوشش میں ہوں کہ حدید کو اپنے ساتھ لے جاؤں اور اسے اسلام سے نکال کر اپنے مذہب میں لے لوں۔ اگر مسلمان یہاں سے پسپا ہوئے تو پھر میں حدید کو ساتھ لے کر واپس آ جاؤں گی۔“

○

اگلے روز شارینا پھر روتاس کے کمرے میں گئی۔ وہ تو جیسے شارینا ہی کے انتظار میں تھا۔ پہلے روز شارینا اس پر ایسا تاثر چھوڑ آئی تھی کہ وہ اگلی ملاقات کا انتظار بڑی ہی بے تابی سے کرنے لگا۔ وہ کوئی بوڑھا یا ادھیڑ عمر آدمی نہیں تھا۔ ابھی وہ اچھی بھلی جوانی کی عمر میں تھا۔ شارینا کی باتوں سے زیادہ تو وہ اس لڑکی کے حسن و جوانی سے متاثر ہوا تھا۔ شارینا کا وہ مفکورہ بھی تھا کہ اس نے اسے قید خانے کی کال کو ٹھہری سے بچا کر اس امیرانہ کمرے میں رکھا تھا۔ اب شارینا اس کے کمرے میں گئی تو پہلے سے زیادہ دلچسپی سے اس سے پوچھا کہ اسے کوئی تکلیف یا بے آرامی تو نہیں ہوئی؟
”نہیں ا!“ روتاس نے کہا۔ ”تم نے اگر میرے پاس آنا چھوڑ دیا تو مجھے بہت تکلیف ہو گی۔“

”میں رومی فوج کے حملے کا انتظار کر رہی ہوں۔“ شارینا نے کہا۔ ”معلوم نہیں ہر قل کس انتظار میں ہے۔ یہ تو بڑا ہی موزوں وقت ہے کہ محص کو محاصرے میں لے لیا جائے۔ شہر کے اندر فوج بہت ہی تھوڑی ہے۔ یہ لوگ زیادہ دن مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔“

”ہو جائے گا۔“ روتاس نے بے پروائی سے کہا۔ ”یہ بادشاہوں کے اور جرنیلوں کے معاملات ہیں، تم جو تھوڑا سا وقت میرے ساتھ گزارنے آئی ہو اسے میں خاک و خون کی باتیں کر کے بے مزہ نہیں کرنا چاہتا۔ ہر قل جب مناسب سمجھے گا فوج کو پیش قدمی کا حکم دے دے گا۔ کوئی اور بات کرو۔“

شارینا نے محسوس کر لیا کہ روتاس اسے کوئی اور جنگی معاملے کی بات بتانے سے

گریز کر رہا ہے۔ اس کا انداز ایک تو ٹالنے والا تھا اور دوسرے یہ کہ وہ شارینا جیسی حسین و جمیل لڑکی کے ساتھ شگفتہ اور رومانی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ شارینا نے اس کے ساتھ ایسی ہی ہلکی پھلکی پُر لطف باتیں شروع کر دیں۔

”میری ایک ضرورت پوری نہیں ہو رہی۔“ روتاس نے کہا۔ ”میں شراب کے نشے سے ٹوٹا ہوا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ ہم لوگ پانی کی طرح شراب پیتے ہیں لیکن یہاں ایک قطرہ دیکھنے کو بھی نہیں ملتا۔“

”تم شاید نہیں جانتے۔“ شارینا نے کہا۔ ”مسلمان شراب نہیں پیتے۔ یہی نہیں کہ یہ شراب نہیں پیتے بلکہ اسے گناہ سمجھتے ہیں اور شراب پینے والے کو سزا دیتے ہیں۔“

شارینا بڑی ذہین اور فہم و فراست والی لڑکی تھی۔ روتاس نے شراب کا نام لیا تو شارینا کو یاد آیا کہ اس کی قوم تو اتنی شرابی ہے کہ پانی نہ ملے تو نہ سسی شراب ضرور مل جائے۔ شارینا نے سوچا کہ یہ روتاس کی ایسی کمزوری ہے جسے ہاتھ میں لے لیا جائے تو اس کے اندر سے سارے راز نکالے جاسکتے ہیں۔ یہی سوچ کر شارینا نے شراب ہی کی بات چلنے دی اور ایسی باتیں شروع کر دیں کہ روتاس شراب کی طلب پہلے سے زیادہ محسوس کرنے لگا۔ اب تو صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ بُری طرح نشے سے ٹوٹا ہوا ہے۔

”کچھ کرو شارینا!“ روتاس نے کہا۔ ”اس شہر میں عیسائی بھی رہتے ہوں گے اور وہ شراب تو ضرور ہی پیتے ہوں گے۔ کسی طرح کسی عیسائی یا کسی بھی غیر مسلم کے گھر سے شراب لا دو۔“

”لا دوں۔“ شارینا نے کہا۔ ”لیکن میں پکڑی گئی تو مجھے یہ لوگ سزا دیں گے۔ میں اپنے آپ کو اس خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی۔“

اب تو روتاس نے شارینا کی منت سماجت شروع کر دی۔ آخر شارینا نے کہا کہ وہ پوری کوشش کرے گی اور اسے شراب لا دے گی لیکن ہر روز نہیں لاسکے گی۔ اگر لا سکی بھی تو اسے نہیں دے گی کیونکہ پہرہ دار ہر وقت دروازے کے باہر موجود رہتا ہے۔ اُس نے شراب کی بُو سونگھ لی تو سیدھا اندر آئے گا اور دونوں کو شراب خوری کے جرم میں سپہ سالار کے آگے کھڑا کر دے گا۔ پھر سپہ سالار کوڑوں کی سزا دے گا جو شاید ہی کوئی برداشت کر سکتا ہو۔

کچھ وقت روتاس کے ساتھ گزار کر شارینا وہاں سے نکلی اور حدید سے ملی۔ حدید سے کہا کہ وہ کسی طرح شراب کا انتظام کر دے۔ حدید یہ سمجھا کہ شارینا ایک رومی کو خوش کرنا چاہتی ہے۔ حدید نے اُسے بتایا کہ شراب خوری مجرم ہے اور اس کی کیا سزا ہے۔

”یہ میں یہاں کی عورتوں سے سن چکی ہوں“۔ شارینا نے کہا۔ ”روتاس سے میں نے ابھی بہت کچھ پوچھنا ہے لیکن وہ ٹال مٹول کر رہا ہے اور مجھے شک ہے کہ وہ اور کچھ نہیں بتانا چاہتا۔ آج اُس نے شراب مانگی ہے اور وہ بُری طرح نشے سے ٹوٹا ہوا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اسے تھوڑی سی یا جتنی بھی مل جائے پلا کر اس سے کچھ اور باتیں معلوم کروں۔“

روتاس نے ٹھیک کہا تھا کہ محص میں عیسائی بھی آباد ہیں، بُت پرست بھی ہیں اور شاید ایک دو گھر آتش پرستوں کے بھی ہوں۔ ان لوگوں کے ہاں شراب ہوگی۔ ”ایک اور بات یاد آگئی ہے“۔ حدید نے کہا۔ ”اس سے یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ محص میں ہرقل کے جاسوس موجود ہیں یا نہیں۔ اگر موجود ہیں تو بتائے کہ وہ کون کون ہیں.... میں شراب کا بندوبست کر لوں گا۔“

حدید کے لئے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ اس نے دو تین غیر مسلم گھروں سے کچھ شراب اکٹھی کر لی اور چھوٹے مشکیزہ شارینا کے حوالے کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی حدید نے شارینا کو بتایا کہ وہ سپہ سالار سے اجازت لے لے گا کہ روتاس سے مزید راز اگوانے کے لئے اُسے شراب پلانا ضروری ہے۔ اس کی اجازت دے دی جائے۔

حدید نے سپہ سالار سے یہ اجازت بھی لے لی اور طے یہ پایا کہ روتاس کو نہ بتایا جائے کہ شراب نوشی کی اجازت لے لی گئی ہے بلکہ اسے اس تاثر میں رکھا جائے کہ اُسے چوری چھپے شراب پلانی جا رہی ہے۔ پرہ داروں کو بھی کہہ دیا گیا کہ انہیں کمرے سے شراب کی بو آئے تو اسے نظر انداز کر دیں۔

○

اگلے روز شارینا شراب کا یہ چھوٹا سا مشکیزہ ایک چادر میں لپیٹ کر روتاس کے پاس گئی اور اُسے بتایا کہ اُس نے بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے اور اب وہ بچ بچا کر پی لے۔

روتاس نے شارینا سے مشکیزہ اس طرح لیا جیسے اس سے چھینا ہو۔ شارینا نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

روتاس نے شراب گلاس میں ڈال کر پینی شروع کر دی اور شارینا سے کہا وہ بھی پیئے لیکن اس لڑکی نے انکار کر دیا۔

”شراب اپنے سامنے دیکھ کر میں بڑی مشکل سے اپنے آپ پر جبر کر رہی ہوں۔“ شارینا نے کہا۔ ”لیکن میں مجبور ہوں۔ اگر ایک گھونٹ بھی پی کر حدید کے پاس گئی یا کسی کے پاس سے بھی گزری وہ مجھے پکڑ لے گا اور پھر یہ کوئی نہیں دیکھے گا کہ یہ لڑکی کون ہے اور کس کی بیٹی اور یہ کتنی اہم ہے، وہ مجھے سپہ سالار کے ہاں پیش کر دیں گے اور سپہ سالار ایسی سزا دے گا جو میں برداشت نہیں کر سکوں گی۔“

اس دوران روتاس پیتا ہی چلا گیا اور اب اس نے جو باتیں کیں، اُن میں ہلکی پھلکی لڑکھاہٹ تھی۔ وہ نارمل حالت میں رہا ہی نہیں تھا۔

”میں واپس جانا چاہتی ہوں“۔ شارینا نے کہا۔ ”یہاں کی پابندیاں دیکھو کہ شراب بھی نہیں پینے دیتے۔ معلوم نہیں شاہ ہرقل کب حملہ کرے گا۔ محص سے مسلمان بھاگے تو میں یہیں رہوں گی.... تم مجھے بتاتے کیوں نہیں کہ حملے میں اتنی تاخیر کیوں کی جا رہی ہے۔ میں تو سوچتی ہوں کہ مجھے موقع ملے تو میں ہرقل کے پاس پہنچ جاؤں اور اسے کہوں کہ یہی وقت ہے حملے کا۔ اگر ادھر ادھر سے ملک آگئی تو پھر رومیوں کے لئے محص فتح کرنا ممکن نہیں رہے گا۔“

”اس کی کچھ وجوہات ہیں“۔ روتاس نے کہا۔ ”سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ شاہ ہرقل بہت ہی محتاط ہو گیا ہے۔ وہ خود کتنا ہی جرأت اور ہمت والا کیوں نہ ہو، لڑنا تو فوج نے ہے۔ ساری فوج پر مسلمانوں کی دہشت طاری ہو گئی ہے۔“

”وہ تو ہونی ہی تھی“۔ شارینا نے کہا۔ ”مسلمانوں نے ہر میدان میں ہماری فوج کو بہت بُری شکست دی ہے اور پورے کا پورا ملک فتح کر لیا ہے۔ ادھر ایرانیوں کو اسی طرح مسلمان شکست دیتے دیتے ان کے ملک سے ہی باہر لے گئے ہیں۔ وہ خیریں بھی ہماری فوج تک پہنچتی رہی ہیں۔“

”حیرت اور دہشت کی وجہ اور ہے“۔ روتاس نے کہا۔ ”حیرت اس پر کہ مسلمانوں کی تعداد ہمارے مقابلے میں بہت ہی تھوڑی ہے اور دہشت اس وجہ سے کہ

اتنی تھوڑی تعداد میں انہوں نے اتنی بڑی اور طاقتور فوج کو شکست دی ہے۔ ہماری فوج میں مسلمانوں کے متعلق عجیب و غریب اور پراسرار کہانیاں مشہور ہو گئی ہیں۔ ہمارے سپاہی یقین کی حد تک کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے قبضے میں جتنا ہیں۔ ہماری فوج نے تو ایرانیوں جیسی طاقتور فوج کو بھی شکست دی ہے.... شاہ ہرقل زخمی شیر کی طرح آخری حملہ تو ضرور کرے گا اور اس نے فوج اور قبائل کا لشکر آگے بھیج بھی دیا ہے لیکن اب وہ قدم اٹھانے سے پہلے کئی بار سوچتا ہے۔

”جزیرہ کے ان قبائل کا لشکر تو تازہ دم ہے“ — شارینا نے کہا۔ ”کیا یہ مدد شاہ ہرقل کے لئے کافی نہیں؟“

”کافی تو ہے“ — روتاس نے جواب دیا۔ ”لیکن ان قبائل کے متعلق شاہ ہرقل اور زیادہ محتاط ہے۔ یہ تو میں بھی کہتا ہوں کہ ان قبائلیوں پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ شاہ ہرقل نے اپنے جرنیلوں اور ان سے چھوٹے افسروں سے کہہ دیا ہے کہ یہ قبائل اپنے گھروں، اپنے بیوی بچوں اور اپنے جان و مال کی حفاظت کی خاطر اکٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں کوئی قوی جذبہ نہیں نہ ان کی اپنی کوئی بادشاہی ہے جس کی خاطر یہ لڑنا چاہیں گے۔ ان قبائل کے سرداروں نے صاف کہا ہے کہ مسلمان ان کے گھرباہ کر دیں گے اور ان کی لڑکیوں کو اٹھالے جائیں گے۔ یہ لوگ صرف تحفظ چاہتے ہیں جو اگر انہیں مسلمانوں کی طرف سے مل گیا تو رومیوں کے خلاف ہو جائیں گے....

”پھر ان لوگوں میں ایک خامی اور بھی ہے۔ یہ فرداً فرداً لڑا کے اور شہسوار ہو سکتے ہیں اور ہیں بھی لیکن فوج کی تنظیم اور ترتیب میں لڑنا کوئی اور ہی بات ہے۔ پہلے تو انہیں یہ سیکھنا ہے کہ فوج کی ترتیب میں کس طرح لڑا جاتا ہے۔ اگر انہیں اسی طرح میدان میں لے آئے تو یہ فوج کی طرح نہیں بلکہ ایک ہجوم کی طرح لڑیں گے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ قبائلی دیکھیں گے کہ رومی فوج لڑتی ہے یا بھاگتی ہے۔ اگر ہماری فوج جم کر نہ لڑی تو سب سے پہلے یہ قبائلی بھاگیں گے اور کوئی بعید نہیں کہ مسلمانوں سے جا ملیں۔ اگر آج انہیں معلوم ہو جائے کہ رومیوں کی نسبت مسلمان ان کے ہمدرد ہیں تو یہ رومیوں سے منہ موڑ جائیں گے۔“

روتاس کبھی ہرقل کے محافظ دستے کا مکائدہر ہوا کرتا تھا اور اب وہ جاسوسی کے نظام کا مکائدہر تھا اور اپنے دو آدمیوں کے ساتھ محص کی طرف یہ دیکھنے آ رہا تھا کہ مسلمانوں کا

دفاعی انتظام کیسا ہے اور کیا قلعے کے باہر بھی کوئی فوج ہے۔ جاسوسی کے شعبے میں ہونے کی وجہ سے وہ ہرقل کی سطح کی باتیں بھی جانتا تھا لیکن وہ اتنی سی بات نہ سمجھ سکا کہ شارینا اس کے سینے سے راز اگلا رہی ہے۔ اس کامیابی میں شارینا کی ذہانت تو کام کر رہی تھی لیکن اصل کام شراب نے دکھایا تھا۔

روتاس پیتا اور بہکتا چلا گیا اور جب اس کا دماغ بالکل ہی ماؤف ہو گیا تو شارینا وہاں سے آگئی اور حدید کو بتایا کہ اس نے کیا کچھ معلوم کیا ہے۔ حدید شارینا کو سپہ سالار ابو عبیدہ کے پاس لے گیا اور شارینا نے وہی باتیں پھر دہرائیں۔

ابو عبیدہ نے اسی وقت جاسوسی کے نظام کے سربراہ کو بلایا اور اسے بتایا کہ رومیوں کے ہاں کیا ہو رہا ہے اور اس صورت حال سے ہم کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

”وہ میں بتاتا ہوں“ — سپہ سالار ابو عبیدہ نے کہا۔ ”انتہائی عقل مند آدمی بھیجو جو اپنے آپ کو وہاں مختلف عیسائی قبیلوں کے فرد ظاہر کریں اور بتائیں کہ وہ قبائل کے لشکر میں شامل ہونے آئے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف لڑیں گے۔“

فوری طور پر دس بارہ مجاہدین منتخب کر کے تیار کئے گئے۔ انہیں دشمن کے علاقے میں جانے کا اور وہاں کے لوگوں میں کھل مل جانے کا تجربہ خاصا تھا اور انہیں ٹریننگ بھی ایسی ہی دی گئی تھی۔ ان میں سرفرست حدید تھا۔ ان کا کام یہ تھا کہ رومی فوج کے ساتھ جو غیر مسلم قبائل جا ملے ہیں ان میں شامل ہو جائیں اور انہیں رومیوں کے خلاف گمراہ کریں۔

○

ابو عبیدہ نے اپنے ماتحت سالاروں کو بلایا اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک قاصد خالد بن ولید کی طرف دوڑا دیا کہ وہ جس قدر جلدی ہو سکے محص پہنچ جائیں۔

”میرے عزیز رفیقو“ — ابو عبیدہ نے اپنے سالاروں سے کہا۔ ”تم سب نے سن لیا ہے کہ اس رومی فوج کے افسر روتاس نے ہرقل، اس کی فوج اور عیسائی قبائلیوں کے متعلق کیا باتیں بتائی ہیں اور ہرقل کس تذبذب میں پڑا ہوا ہے لیکن اس سے ہمیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہئے کہ ہمارا دشمن اپنے ہاں کی صورت حال اپنے موافق کر کے حملہ کرے گا۔ ہم یہی سمجھیں گے کہ کسی بھی وقت محص محاصرے میں آ جائے گا اور ہمارے پاس نفری اتنی تھوڑی ہے کہ ہم یہ محاصرہ توڑ نہیں سکیں گے۔ میں

نے قبائلیوں میں شامل ہونے کے لئے بڑے ذہین اور اپنے کام میں ماہر مجاہدین کو روانہ کر دیا ہے۔ مدینہ کو بھیجے ہوئے قاصد آدھا راستہ طے کر چکے ہوں گے۔ اپنی دفاعی تیاریاں مکمل رکھو اور خود بھی دعا کرو اور مجاہدین سے کہو وہ بھی اللہ کے حضور دعا کرتے رہیں کہ ملک جلدی پہنچ جائے اور اگر نہ پہنچ سکے تو اللہ ہماری مدد کرے۔“

سپہ سالار ابو عبیدہؓ کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ راتوں کو جیسے سوتے بھی نہ ہوں۔ ایسا تو وہ دن اور رات میں دو تین مرتبہ ضرور کرتے کہ قلعے کی دیوار پر جا کھڑے ہوتے اور مدینہ کی طرف دیکھنے لگتے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ اتنی جلدی ملک نہیں پہنچ سکتی۔ دن گزرتے جا رہے تھے۔ اس وقت خالدؓ بن ولید شام کے مفتوحہ شہر تیسرین میں تھے۔ محص کا قاصد ان تک پہنچا اور انہیں بتایا کہ محص کس خطرے میں آگیا ہے اور سپہ سالار اس وقت کس تکلیف اور آفت میں مبتلا ہے۔ خالدؓ بن ولید اسی وقت کمان اپنے نائب سالار کے حوالے کر کے محص کو روانہ ہو گئے۔

ابو عبیدہؓ نے خالدؓ بن ولید کو اپنے سامنے دیکھا تو انہوں نے دلی سکون محسوس کیا۔ وہ تو اپنے آپ کو تنہا اور کچھ حد تک بے بس سمجھنے لگے تھے۔ خالدؓ بن ولید بہت ہی تیز رفتاری سے آئے تھے۔ وہ خود بھی آرام کرنے کے قائل نہیں تھے نہ ابو عبیدہؓ نے کہا کہ ذرا استراحت تو پھر بات کریں گے۔

ابو عبیدہؓ نے انہیں بتایا کہ محص کی طرف کتنا بڑا خطرہ بڑھا چلا آ رہا ہے اور محص میں اس لشکر کے مقابلے میں بہت تھوڑی نفری ہے۔ ابو عبیدہؓ نے اس دوران جو اقدام کئے تھے وہ تفصیل سے خالدؓ بن ولید کو بتائے۔

”میں نے جو سوچا ہے وہ یوں ہے۔“ ابو عبیدہؓ نے کہا۔ ”انطاکیہ، حماہ، حلب اور قریب کی تمام چھاؤنیوں سے مجاہدین کی آدھی آدھی نفری محص میں اکٹھی کر لی جائے اور محصور ہو کر لڑا جائے۔“

”محمصور ہو کر نہیں۔“ خالدؓ بن ولید نے مشورہ دیا۔ ”ہم قلعے سے باہر دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ یہ کوئی نیا دشمن نہیں۔ اسے ہم بڑی دُور سے دھکیلتے چلے آ رہے ہیں اور شام کی آخری سرحد تک پہنچ چکے ہیں۔ اس کی چالوں کو اور اس کی فوج کو ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ہم اس میدان میں بھی اسے شکست دے دیں گے۔“

تمام مورخوں نے لکھا ہے ابو عبیدہؓ نے خالدؓ بن ولید کا یہ مشورہ قبول نہ کیا۔ وہاں محص کے دو تین سالار بھی موجود تھے۔ انہوں نے اپنے سپہ سالار ابو عبیدہؓ کی اس تجویز سے بھی اختلاف کیا کہ دوسری جگہوں سے مجاہدین کی آدھی آدھی نفری یہاں بلالی جائے اور انہوں نے خالدؓ بن ولید کے مشورے سے بھی اختلاف کیا۔ وجہ یہ بتائی کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ دشمن کو پہلے پتہ چل جائے کہ محص کو مضبوط کرنے کے لئے دوسری جگہوں سے نفری اکٹھی کر لی گئی ہے تو دشمن ان میں سے کسی اور جگہ پر حملہ کر کے قبضہ کر سکتا ہے اور اس طرح دوسری بڑی چھاؤنیوں پر بھی ہتھ بول کر کامیاب ہو سکتا ہے۔ ان سالاروں نے کہا کہ کسی شہر اور قصبے کو کمزور نہ کیا جائے اور صرف مدینہ کی کمک کا ہی انتظار کیا جائے۔ اگر کمک آنے سے پہلے رومی پہنچ گئے تو پھر انہی حالات میں لڑیں۔

وہ دین و ایمان والے تھے۔ اللہ کی راہ میں باطل کے خلاف وطن سے بے وطن ہوئے اور اپنا اور دشمن کا خون بہا رہے تھے۔ ان کے دلوں میں ہوس ملک گیری نہیں تھی اور وہ اپنی بادشاہی قائم کرنے کے ارادے سے گھروں سے نہیں نکلے تھے۔ انہوں نے تلوار کا مقابلہ تلوار سے کیا اور جو جیتتے تھے ان کے دل انہوں نے اخلاق سے موہ لئے تھے۔ جن شہروں کو انہوں نے فتح کیا انہوں نے وہاں کے لوگوں سے جزیہ تو وصول کیا لیکن ہر قل جیسے بادشاہوں نے ان پر جو ظالمانہ محصولات عائد کر رکھے تھے وہ اتنے کم کر دیئے کہ جس کی جتنی حیثیت اور استطاعت تھی اس سے اسی کے مطابق محصولات وصول کئے جاتے تھے۔ وہاں کے غیر مسلم مسلمانوں سے بہت ہی خوش اور مطمئن تھے اور نظریوں آتا تھا کہ مشکل کے وقت مسلمانوں کے شانہ بشانہ لڑیں گے لیکن اسلام کے سالار ان پر اتنا بھروسہ نہیں کرتے تھے۔

اسلام کے یہ اولین مجاہدین اللہ سے مدد مانگتے تھے۔ دعائیں کرتے تھے لیکن صرف دعاؤں پر ہی بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ وہ قرآن کے اس فرمان سے بڑی اچھی طرح آگاہ تھے کہ تم عملاً جتنی کوشش کرو گے اللہ تمہیں اتنا ہی دے گا۔ انہوں نے کبھی معجزے کی توقع نہیں رکھی تھی۔ انہوں نے اپنی جائیں دے کر اسلام کو زندہ رکھا۔ اپنا خون بہا کر شیعہ رسالت کو سمجھنے نہ دیا اور اس طرح اللہ کا پیغام حق دُور دُور تک پھیلتا چلا گیا۔

ابو عبیدہؓ نے خالدؓ بن ولید کو واپس تیسرین بھیج دیا تاکہ وہاں کا دفاع ان کی غیر

آ رہے تھے۔ قاصدوں نے ان کے قریب آ کر اونٹ روکے اور اونٹوں کو بٹھا کر اترنے کی بجائے اونٹوں سے کود آئے۔

”اچھی خبر لائے ہو؟“ — حضرت عمرؓ نے پوچھا اور اس کے ساتھ ہی اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔

”خبر بڑی بھی نہیں“ — ایک قاصد نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”مکہ جلدی پہنچ گئی تو خبر اچھی بھی ہو جائے گی۔“

”ایمیر المومنینؓ!“ — دوسرے قاصد نے کہا۔ ”ہم کہیں سے پسپا نہیں ہوئے۔ چلے، بیٹھ کر پیغام سناتے ہیں۔“

گھر میں داخل ہو کر حضرت عمرؓ نے قاصدوں کو بٹھایا اور ان کے لئے پانی اور کھانا وغیرہ منگوایا اور پھر کہا کہ اب بتاؤ۔ ایک قاصد بولنے لگا۔ اس نے پوری تفصیل سے بتایا کہ محض کس خطرے میں آ گیا ہے اور رومی فوج کے ساتھ الجزیرہ کے غیر مسلم قبائل کا لشکر بھی شامل ہو گیا ہے۔

”خدا کی قسم!“ — امیر المومنین نے ساری تفصیلات سن کر کہا۔ ”مجھے میری ذات سے اشارے مل رہے تھے کہ ایسی صورت پیدا ہو ہی جائے گی۔ میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کیوں نہ کروں جس نے مجھے اتنی فہم و فراست عطا کی ہے کہ اس کا دفاعی انتظام پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔“

امیر المومنین نے جس دفاعی انتظام کی طرف اشارہ کیا تھا، تاریخ میں اس کا ذکر ایک دو مورخ ہی کرتے تو ہم ان کے نام لے کر حوالے دیتے لیکن صرف مسلمان مورخین نے ہی نہیں بلکہ غیر مسلم یورپی مورخوں نے بھی حضرت عمرؓ کی جنگی فہم و فراست اور تدبیر کو خراج تحسین پیش کیا ہے کہ ہر محاذ کے ہر گوشے تک مکہ پہنچانے کے انتظامات انہوں نے تیار رکھے ہوئے تھے۔ سب سے بڑا انتظام یہ تھا کہ انہوں نے بصرہ اور کوفہ کو اس طرح آباد کیا تھا کہ ان دونوں جگہوں کو بہت بڑی چھاؤنیاں بنادیاں اور کسی غیر مسلم کو وہاں آباد نہیں ہونے دیا تھا تاکہ دشمن کو خبر نہ ہونے پائے کہ یہاں کیا کچھ موجود ہے۔

اس کے علاوہ سات اور شہر تھے جن میں سے ہر شہر میں امیر المومنین نے چار چار ہزار سوار مجاہدین ہنگامی حالات کے لئے رکھے ہوئے تھے۔ ان کے لئے حکم تھا کہ اس طرح

حاضری میں کمزور نہ ہو جائے۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ جب خالدؓ بن ولید ابو عبیدہؓ سے رخصت ہوئے تو ان کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے وہ اپنے سپہ سالار کو اس مشکل صورت حال میں اکیلا چھوڑنا نہ چاہتے ہوں۔

”ابن جراحؒ!“ — خالدؓ بن ولید نے ابو عبیدہؓ سے کہا۔ ”میری ضرورت پیش آ گئی تو ایسا قاصد بھیجنا جو اڑتا ہوا مجھ تک پہنچے اور میں اس سے زیادہ تیز رفتاری سے پہنچوں گا۔“

خالدؓ بن ولید ابو عبیدہؓ سے گلے ملے۔ گھوڑے پر سوار ہوئے اور اللہ حافظ کہہ کر روانہ ہو گئے۔

○

دونوں قاصد مدینہ پہنچ گئے۔ اُس وقت وہ اونٹوں پر سوار تھے اور اونٹ دوڑتے آ رہے تھے۔

وہ اکیلے نہیں تھے، مدینہ کے کئی آدمی اور لڑکے ان کے ساتھ ساتھ دوڑتے آ رہے تھے۔ یہ تو مدینہ کا معمول بنا ہوا تھا کہ جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے اور کسی نہ کسی وجہ سے محاذ پر نہیں گئے تھے وہ قاصد کے منتظر رہتے تھے۔ بعض تو شہر سے کچھ آگے چلے جاتے اور جب کوئی قاصد آتا تو اس کے ساتھ ساتھ دوڑ پڑتے اور پوچھتے تھے کیا خبر لائے ہو۔ قاصد لوگوں کے جذبات کو سمجھتے تھے اور کم سے کم الفاظ میں ان کو خبر سنا دیتے تھے۔

اُس وقت مجاہدین اسلام بیک وقت دو محاذوں پر لڑ رہے تھے۔ دونوں دشمن باطل کی بڑی ہی زبردست جنگی قوتیں سمجھے جاتے تھے اور یہ غلط نہیں تھا کہ ان کے مقابلے میں کوئی آنے کی جرات نہیں کرتا تھا۔ ایک آتش پرست ایرانی تھے اور دوسرے رومی۔ ان محاذوں سے کسی بھی وقت کوئی بہت ہی بڑی خبر آ سکتی تھی اور اکثر توقع یہی ہوتی تھی کہ بڑی خبر آئے گی لیکن مجاہدین کے ساتھ ضعیف العربوڑھوں، بوڑھیوں، معصوم بچوں اور اُن معذوروں کی دعائیں تھیں جو محاذوں پر جانے کے قابل نہیں رہے تھے اور دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعاؤں سے ان کی مدد کر رہے تھے۔

مدینہ کی گلیوں میں شور مچا ہو گیا۔ ”قاصد آئے ہیں.... دو قاصد آئے ہیں۔“ یہ شور و غل امیر المومنین حضرت عمرؓ کے کانوں سے ٹکرایا تو وہ بڑی تیزی سے اُٹھے اور قاصدوں کے استقبال کے لئے باہر آ گئے اور اُس طرف دوڑ پڑے جدھر سے قاصد

ہر وقت کیل کانٹے سے لیس ہو کر تیار رہیں کہ جو نبی کہیں سے ملک طلب کی جائے تو قریبی شہر سے چار ہزار سوار یا اس سے کم فوراً روانہ ہو جائیں اور ایک لمحہ بھی ضائع کے بغیر وہاں تک پہنچیں جہاں ان کی ضرورت ہو۔

امیر المومنین نے اسی وقت ایک قاصد سعد بن ابی وقاص کی طرف دوڑا دیا اور پیغام یہ دیا کہ تعقل بن عمرو کو چار ہزار سوار دے کر یہ پیغام ملتے ہی حمص بھیج دو اور وہاں ابو عبیدہ دشمن میں گھر گئے ہیں اور ملک پہنچنے تک نہ جانے وہاں کیسی صورت حال پیدا ہو جائے۔

اس وقت سعد بن ابی وقاص مدائن میں تھے اور زرتشت کے بیماری وہاں سے بھاگ گئے تھے اور اس طرح کسریٰ ایران کو شکست فاش دی گئی تھی اور عراق مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا تھا۔ تعقل بن عمرو اس وقت کوفہ میں تھے۔ سعد بن ابی وقاص نے امیر المومنین کا پیغام ملتے ہی ایک قاصد کوفہ بھیج دیا۔

تعقل پیغام ملتے ہی چار ہزار سوار لے کر یوں کوفہ سے حمص کو نکلے جس طرح اچانک طوفان اور بگولے اٹھا کرتے ہیں۔ ان کے لئے حکم تھا کہ کم سے کم پڑاؤ کر کے تیز سے تیز حمص پہنچنا ہے۔

اس وقت حضرت عمرؓ کے پاس ان کے مشیر بیٹھے ہوئے تھے اور امیر المومنین جو کچھ بھی سوچتے ان سے مشورہ لیتے تھے۔ یہ صورت حال امیر المومنین حضرت عمرؓ کے تدبیر اور دور اندیشی کی بڑی سخت آزمائش تھی۔ وہ پسائی اور شکست کا نام بھی نہیں سنتا چاہتے تھے۔ یہ تو جذباتی کیفیت تھی، حقیقت یہ انہیں نظر آرہی تھی کہ حمص سے پاؤں اکھڑے تو پھر نہ جانے کہاں تک مجاہدین کو پیچھے ہٹنا پڑے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ایران سے فوج نکال کر بھیجی جائے اور کسریٰ ایران پھر اٹھ کھڑا ہو اور عراق کے مفتوحہ علاقوں پر پھر قبضہ کر لے۔

”میرے بھائیو!“ — امیر المومنین نے اپنے مشیروں سے کہا — ”خدا کی قسم! یہ ساری سازش الجزیرہ کے قبائل کی ہے۔ ان میں اکثریت عیسائیوں کی ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ اسلام اس علاقے تک پہنچے۔ انہوں نے ہر قل کو اکسیا ہے اور کم و بیش تمیں ہزار کا لشکر اسے دیا ہے کہ وہ ان کا ساتھ دے اور مسلمانوں کو ملک شام سے بے دخل کر دیا جائے۔“

”یہاں تک میں جانتا ہوں ہر قل میں اتنا دم خم نہیں رہا کہ وہ کہیں بھی ہمارے مجاہدین پر جو ابلی حملہ کرے گا۔ اس کی اس فوج کی تو کمرہی ٹوٹ چکی ہے جو شام میں لڑی تھی۔ اس کی فوج کی بیشتر نفری ماری گئی ہے۔ اس سے زیادہ نہیں تو اتنی ہی زخمی ہے اور اگر کچھ نفری جسمانی لحاظ سے صحیح اور سلامت ہے تو اس میں لڑنے والا جذبہ بچھا چکا ہے۔ اسے مصر سے جو فوج ملی ہے اس نے ہر قل کے نیم حردہ ارادوں میں کچھ جان ڈال دی ہوگی اور اس جڑے وقت میں یہ قبائلی اس کے پاس جا پہنچے اور اتنا بڑا لشکر اسے دے کر اس میں پھر غرور اور تکبر پیدا کر دیا ہو گا۔“

”تم جانتے ہو کہ قبائلیوں کا علاقہ جنگ سے محفوظ رہا ہے۔ ان کی تین بستیوں نے ہمارے مقابلے میں ہمارے دشمن کا ساتھ دیا تھا لیکن دشمن پھر بھی شکست کھا کر پسپا ہوا اور ہم نے ان تینوں بستیوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ ان کی باقی تمام بستیاں محفوظ رہیں۔ کیا تم کوئی طریقہ سوچ سکتے ہو کہ ان قبائلیوں کو رومیوں سے الگ کیا جائے؟“

”ان کی بستیوں پر یلغار کی جائے“ — ایک مشیر نے کہا — ”انہوں نے ابھی جنگ کا ذائقہ نہیں چکھا سوائے ان تین بستیوں کے۔ ان پر آفت نازل ہوگی تو وہ تیس ہزار قبائلی جو بزنطیہ ہر قل کے پاس چلے گئے ہیں، بھاگ بھاگ واپس اپنی بستیوں کو جائیں گے۔“

”خدا کی قسم!“ — امیر المومنین نے کہا — ”ہماری سوچیں ایک نجیبی ہیں اور جب خیالات میں ہم آہنگی ہو تو پھر اس دیوار کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔۔۔ ان قبائلیوں کی بستیوں پر حملے ہوں گے تو وہ تو واپس آئیں گے ہی لیکن ہر قل ان کا ساتھ نہیں دے گا۔ اس صورت میں ابو عبیدہ تھوڑی سی کمک کے ساتھ ہر قل پر چڑھ دوڑے گا اور پھر ہر قل کے لئے یہی راہ نجات رہ جائے گی کہ وہ بحری جہازوں میں فوج کو لاوے اور مصر کو روانہ ہو جائے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ شام اب ہمارا ملک ہے۔ اس ملک کے جو لوگ ہمارے دشمن کے پاس اس نیت سے گئے ہیں کہ وہ ہم پر جو ابلی حملہ کرے اور یہ لوگ اس کی جنگی مدد کریں گے تو یہ بغاوت ہے۔ یہ لوگ باغی ہیں، غدار ہیں اور ان کے دماغوں کو ٹھکانے پر لانا ہمارا حق بھی ہے فرض بھی۔“



امیر المومنین کے پاس پورا ریکارڈ تھا کہ کون سا سالار کہاں ہے اور اس کے پاس

امیر المومنین نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ان کی دانست میں یہی دو قبیلے ہیں جنہوں نے دوسرے قبیلوں کو بھی تیار کر کے ہر قل کا ساتھ دیا ہے اور محض پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں قبیلوں کو گھنٹوں بٹھانا بہت ہی ضروری ہے کیونکہ یہ اپنے آپ کو سب سے زیادہ طاقتور سمجھتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے حکم نامے میں لکھا کہ سالار عیاضؓ بن غنم ان تمام دستوں اور ان کے سالاروں کے سپہ سالار ہوں گے اور ان کا حکم سب سالاروں پر چلے گا۔ یہ پیغام لے کر قاصد رخصت ہو گیا۔



سپہ سالار سعدؓ بن ابی وقاصؓ کو جو نبی امیر المومنین کا یہ حکم پہنچا انہوں نے اسی وقت ان تمام سالاروں کو حکم بھیج دیا کہ وہ اپنی اپنی ذمہ داری کے علاقے میں پہنچ جائیں۔ سعدؓ بن ابی وقاصؓ نے ان سب کو تفصیلاً ”یہ حکم سمجھایا اور اس کا پس منظر بھی بتایا۔

اسنے انتظامات کر کے بھی امیر المومنین حضرت عمرؓ کو تسلی نہ ہوئی۔

”میرے بھائیو!“ — امیر المومنین نے اپنے مشیروں سے کہا — ”میں امین الاُمت کو اس مشکل وقت میں تنہا نہیں رہنے دوں گا۔ میں کچھ اور ملک ساتھ لے کر تمس جارہا ہوں۔“

امین الاُمت ایک خطاب تھا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو عبیدہؓ کو عطا کیا تھا۔

حضرت عمرؓ نے مدینہ سے اور مدینہ کے گرد و نواح سے بڑی عجلت میں لڑنے والے لوگوں کو اکٹھا کیا اور اس نفری کو اپنے ساتھ لے کر ایک روز محض کی طرف روانہ ہو گئے۔ کسی بھی مؤرخ نے یہ نہیں لکھا کہ امیر المومنین کے ساتھ کتنی نفری تھی یا یہ کہ کتنے پیادہ اور کتنے سوار تھے۔ صرف یہ لکھا ہے کہ ایک فوج تیار کر کے امیر المومنین تمس کے سفر کو روانہ ہو گئے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ امیر المومنین دمشق کے رستے سے جارہے تھے۔ چونکہ وہ ایک فوج کو ساتھ لے جا رہے تھے اس لئے رفتار اتنی تیز نہیں تھی جتنی ایک قاصد کی ہو سکتی ہے۔ امیر المومنین نے ابو عبیدہؓ کی حوصلہ افزائی کے لئے ایک قاصد اپنے آگے تمس کو روانہ کر دیا اور اسے پیغام یہ دیا کہ امیر المومنین

کتنے دستے ہیں اور اسے ایک محاذ سے فارغ کر کے کسی دوسرے محاذ کو بھیجا جاسکتا ہے یا نہیں۔ بلاذری نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ اس قسم کی تفصیلات اور اعداد و شمار اپنے ذہن میں محفوظ رکھتے تھے اور کبھی اس قسم کی باتیں کرنے لگتے تھے جیسے انہیں وہ محاذ سامنے نظر آ رہا ہو اور امیر المومنین اس کا آنکھوں دیکھا حال سنارے ہوں۔ یہیں سے کچھ ایسی روایات نے جنم لیا ہے جن میں کچھ حقیقی ہیں اور کچھ بنائی گئی تھیں۔

ان روایات سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ کو دشمن کی شکست اور اپنی فتح کا اس قدر خیال ہوتا تھا کہ ذہنی طور پر ہی نہیں بلکہ روحانی طور پر بھی اپنے آپ کو محاذ پر تصور کرتے تھے۔ ایک اور تاریخ نویس طبری نے لکھا ہے کہ جب امیر المومنین حضرت عمرؓ سپہ سالار ابو عبیدہؓ کے پیغام کے مطابق مختلف احکامات دے رہے تھے اور اقدامات کر رہے تھے، یوں لگتا تھا جیسے وہ مدینہ میں اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے نہیں بلکہ محاذوں کے قریب کسی ایسی بلندی پر بیٹھے ہوئے ہیں جہاں سے انہیں تمام محاذ نظر آ رہے ہوں اور اس کے مطابق احکام دے رہے ہوں۔

حضرت عمرؓ نے عراق و ایران کے محاذ کے سپہ سالار سعدؓ بن ابی وقاصؓ کے نام ایک اور پیغام لکھوایا۔ اس میں انہوں نے یہ حکم دیا کہ سالار سمیلؓ بن عدی اور عبداللہؓ بن غسان کو چار چار ہزار سوار دے کر الجزیرہ میں ان قبائلی علاقوں میں بھیج دیں جنہوں نے ہر قل کو اپنے تئیں ہزار آدمی محض پر حملہ کرنے کے لئے دیئے ہیں۔ ان دونوں سالاروں کے لئے امیر المومنین نے یہ ذمہ داریاں لکھیں کہ سمیلؓ بن عدی کو ذقہ بھیجا جائے اور عبداللہؓ بن غسان کو نفعین کے علاقے میں روانہ کیا جائے۔ دونوں سالار ان قبائل کی بستیوں پر حملے کریں۔ اگر وہ مقابلہ کریں تو لڑیں اگر ہتھیار ڈال دیں تو انہیں جنگی قیدی بنالیں اور اگر وہ زیادہ مقابلہ کریں اور ہتھیار نہ ڈالیں تو ان کی بستیوں کو تباہ کر دیا جائے۔

امیر المومنین نے یہ بھی لکھوایا کہ جب یہ دونوں سالار ان علاقوں سے جو انہیں دیئے گئے ہیں باغیوں کو صاف کر دیں تو سمیلؓ بن عدی حران اور عبداللہؓ بن غسان رہا چلے جائیں۔

حضرت عمرؓ نے مزید حکم یوں لکھوایا کہ سالار ولید بن عتبہؓ الجزیرہ کے ان غیر مسلم عربوں کے علاقے میں جا کر حملے کریں جہاں دو قبیلے بنی ربیعہ اور بنی تنوخ رہتے ہیں۔

خود کچھ لشکر لے کر محص کو آ رہے ہیں۔ قاصد کو خاص طور پر کہا گیا تھا کہ وہ غیر معمولی رفتار سے جائے۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ ملتا ہے کہ امیر المومنین کو جس وقت سپہ سالار ابو عبیدہ کا پیغام ملا تھا اور امیر المومنین پریشانی میں مبتلا ہوئے تھے اُس وقت سے قرآن کی یہ آیت ان کی زبان سے بار بار نکلتی تھی اور وہ ہر کسی کو یہی آیت بتاتے پھرتے تھے۔ "اور جن لوگوں نے ہمارے لئے جہاد کیا، ہم ان کو ضرور اپنے راستے دکمائیں گے اور اللہ اپنے نیکو کار بندوں کے ساتھ ہے" — (29، 79)

امیر المومنین یہ بھی بار بار کہتے تھے کہ نیک اعمال کا دامن نہ چھوڑ، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

○

اب ہم اس داستانِ جہاد کو اُس جگہ لے چلتے ہیں جہاں محص سے کچھ دُور پہاڑی علاقے میں ہرقل فوج اور الجزیرہ کے عیسائی قبائل کا لشکر محص کو محاصرے میں لئے بیٹھا تھا اور ہرقل کے حکم کا انتظار کر رہا تھا۔

کچھ دنوں سے قبائلی لشکر میں یہ بات دہی دہی زبان سے سنی سنائی جانے لگی تھی کہ ان رومیوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ ہرقل اپنی شکست کو فتح میں بدلنا چاہتا ہے اور اگر اسے فتح حاصل ہو گئی تو وہ پھر محصولات کے ذریعے رعایا کا خون چوسنا شروع کر دے گا اور دوسری طرف مسلمان اس شکست کا انتقام الجزیرہ کے ان قبائل کی بستیوں کو اجاڑ کر لیں گے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ان کی تین بستیاں مجاہدین نے تباہ و برباد کر دی تھیں کیونکہ ان بستیوں کے لوگوں نے مسلمانوں کے خلاف ہرقل کی مدد کی تھی۔ ان بستیوں کے نام یہ ہیں — موصل، بیت اور فر قیسا۔

یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ یہ بات کہاں سے اور کیسے اٹھی ہے۔ کچھ قبائلیوں نے اس شک کو صحیح مان لیا تھا اور باقی ابھی متذبذب میں تھے۔ ان میں جو ذرا عقل و ہوش والے تھے، وہ کہتے تھے کہ ابھی وقت ہے، سوچ لو۔ رومی فوج لڑنے کے قابل نہیں رہی اور یہ فوج لڑنے کی بجائے پسپائی کے راستے دیکھے گی۔ اگر ہرقل کی فوج پسپا ہو گئی تو مسلمان الجزیرہ کی بستیوں کو کھڑا نہیں چھوڑیں گے۔ یہ شکوک و شبہات وہ دس گیارہ مجاہدین قبائلیوں کے لشکر میں پھیلا رہے تھے جنہیں ابو عبیدہ نے ایسی ہی تخریب کاری

اور جاسوسی کے لئے وہاں بھیجا تھا۔ وہ سب وہاں تک اکٹھے نہیں پہنچے تھے۔ ایک ایک دو دو کر کے گئے تھے اور ظاہر یہ کیا کہ وہ عیسائی قبیلوں میں سے ہیں۔ ان میں سے جس سے بھی کوئی اصل قبائلی پوچھتا تھا کہ تم کس قبیلے سے ہو تو یہ مجاہد اُس سے پوچھتا کہ تمہارا تعلق کس قبیلے سے ہے۔ وہ اپنا قبیلہ بتاتا تو مجاہد کسی دُور دراز علاقے کے گمنام سے قبیلے کا نام لے لیتا۔ مختصر یہ کہ وہ مجاہدین اپنے مشن میں خاصی کامیابی حاصل کر رہے تھے۔ انہوں نے بدلی پھیلاؤ شروع کر دی تھی اور دیکھا گیا کہ اس کی مخالفت اور تردید بہت کم ہوتی تھی۔ تاریخوں کے مطابق حقیقت یہ ہے کہ ان قبائلیوں میں اکثریت ابھی وہم اور شک میں مبتلا تھی۔

وہ جو اللہ نے قرآن میں مجاہدین کو مژدہ سنایا ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کو اللہ راستے دکھادیا کرتا ہے اور نیک اعمال والوں کے ساتھ رہتا ہے، یہ فرمان محص سے کچھ دُور پہاڑی علاقے میں عملی صورت میں سامنے آ گیا۔ اس کی ابتدا بز نضیہ سے ہوئی تھی۔

پچھلے باب میں سنایا گیا ہے کہ الجزیرہ کے بڑے بڑے قبیلوں کے پیچیس تیس سردار بز نضیہ ہرقل سے ملنے اور اسے جنگی مدد پیش کرنے گئے تھے تو ان کے ساتھ بیس پیچیس نہایت خوبصورت اور نوجوان لڑکیاں تھیں جن کے چہروں سے معصومیت نکلتی تھی۔ ان میں کچھ لڑکیوں کی کم عمری میں تھیں۔ انہوں نے یہ لڑکیاں ہرقل کو دربار میں پیش کی تھیں اور بتایا تھا کہ وہ اس کی مدد کو آئے ہیں۔ ہرقل نے ان معصوم لڑکیوں کو دیکھ کر پوچھا تھا کہ تم یہ لڑکیاں میرے لئے تحفہ لائے ہو؟

ایک بوڑھے عیسائی سردار نے اسے جواب دیا تھا کہ ہم آپ کے بازو مضبوط کرنے آئے ہیں اور یہ لڑکیاں ہم تحفے کے طور پر نہیں لائے، یہ ہماری اپنی بیٹیاں ہیں۔ انہیں ہم آپ کے پاس صرف یہ دکھانے کے لئے لائے ہیں کہ یہ ہماری عزت اور آبرو ہے جو اس جنگ میں محفوظ نہیں رہی۔ اس قبائلی سردار نے یہ بھی کہا تھا کہ ان معصوم بچیوں اور ان جیسی ہزار بچیوں کی آبرو کی حفاظت کرنے کے لئے آپ کے ساتھ بات کرنے آئے ہیں۔ آپ ہماری مدد کریں اور ہم آپ کی مدد کریں گے اور آپ کو ہزار ہا جوان جنگجوؤں کا لشکر دے دیں گے۔

اسی ملاقات میں ان قبائلی سرداروں کے ساتھ ہرقل نے جنگی معاہدہ کر لیا اور انہیں کہا کہ وہ واپس چلے جائیں اور جس قدر لشکر اکٹھا کر سکتے ہیں کر لیں اور بہت ہی جلدی لشکر کو یہاں لے آئیں۔ ہرقل نے انہیں یقین دلایا کہ ان قبائلیوں نے اسے فتح دلا دی تو وہ ان تمام قبائل کو آزاد اور خود مختار کر دے گا اور ان پر اپنا کوئی محصول یا معاوضہ عائد نہیں کرے گا۔

یہ قبائلی سردار جب واپس جانے لگے تو انہوں نے کہا کہ ان کی لڑکیوں کو باہر بھیجا جائے کہ وہ انہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔ کسی مشیر نے یہ مشورہ دیا کہ سفر لمبا ہے اور پُر خطر بھی ہے، مسلمانوں کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں راستے میں آجائیں۔ ایسا ہوا تو وہ ان سب سرداروں کو قتل کر کے لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

سرداروں کو ہرقل پر اتنا اعتماد تھا کہ انہوں نے یہ بات مان لی اور لڑکیوں کو دیں ہرقل کے محل کے کسی حصے میں چھوڑ آئے جہاں انہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔

دو موزخوں نے لکھا ہے کہ ظاہری طور پر یہ مشورہ تو ایک مشیر نے دیا تھا لیکن درپردہ ہرقل کی اپنی خواہش تھی کہ اتنی خوبصورت اور نوزیر لڑکیاں اس کے ہاتھ سے نہ نکلیں۔ اس نے اس مشیر کو یہ مشورہ دینے کے لئے کہا تھا۔ ہرقل بادشاہ تھا اور بز فنیہ میں اس کا محل بھی تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ اتنی حسین اور پُرکشش لڑکیاں قبائلیوں کے خیموں اور جھونپڑوں میں اچھی نہیں لگتیں، یہ تو محل میں رکھنے والی چیزیں ہیں۔

سردار چلے گئے اور جب وہ کچھ دنوں بعد واپس آئے تو ان کے ساتھ کم و بیش تیس ہزار لڑکا جو انوں کا لشکر تھا جس میں آدمی سے زیادہ نفری گھوڑ سوار تھی۔

ہرقل نے باہر آ کر اس لشکر کو دیکھا تو اس کے چہرے پر رونق آگئی اور اس رونق میں رعونت کا رنگ نمایاں تھا۔ اس لشکر کو اس نے لڑانا تھا اور غالباً اسے معلوم تھا کہ محض میں مسلمانوں کی تعداد چار ہزار سے زیادہ نہیں اور یہی وہ شہر ہے جو سب سے زیادہ اہم ہے اور قریب بھی۔ اس نے اس لشکر کو دیکھتے ہی محض کو محاصرے میں لے کر اور پھر یلغار کر کے محض پر قبضہ کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔

کچھ ہی دن گزرے تھے کہ مضر سے چار ہزار گھوڑ سواروں کی کمک پہنچ گئی۔ یہ کمک ہرقل نے منگوائی تھی۔ اس کمک کا کمانڈر ہرقل کا اپنا بیٹا قسطنطین تھا۔

ہرقل نے قبائلی لشکر بھی اس کے حوالے کر دیا اور اس طرح قسطنطین اپنے سوار دستوں کے علاوہ قبائلی لشکر کا بھی کمانڈر بن گیا تھا۔ ہرقل نے بیٹے کو تمام تر ہدایات دے کر اور محض پر ہلکے بولنے کا منصوبہ سمجھا کر اسے اس مقام پر بھیج دیا جس کا ذکر اس داستان میں ہو چکا ہے۔ یاد دہانی کے لئے یہ بتا دیا جاتا ہے کہ پہاڑی علاقے میں دُور دُور سے محض کو محاصرے میں لے لیا گیا تھا اور اب ہرقل کے حکم پر محض کی طرف چاروں طرف سے پیش قدمی کرنی اور محض پر یلغار کرنی تھی لیکن ہرقل کے حکم میں تاخیر ہوتی جا رہی تھی۔

○

قسطنطین جب بز فنیہ میں تھا تو اس نے ان بیس پچیس لڑکیوں کو دیکھا تھا جنہیں الجزیرہ کے قبائلی سردار اپنے ساتھ لائے تھے۔ قسطنطین ابھی جوانی کی عمر میں تھا۔ ہرقل بڑھاپے کی عمر میں بھی عورتوں کا رسیا تھا۔ اس کا بیٹا تو ابھی جوان تھا۔ اس نے ان لڑکیوں کے متعلق پوچھا تھا کہ یہ کون ہیں اور کیسے آئی ہیں۔ اسے بتایا گیا تھا کہ یہ عیسائی قبائل کی لڑکیاں ہیں اور اسے ساری بات سنا دی گئی تھی۔ دو چار دنوں بعد اسے آگے بھیج دیا گیا تھا۔

کچھ دن آگے محاذ پر رہ کر اس نے اپنی فوج اور لشکر کی ترتیب دیکھی اور اپنے ماتحت کمانڈروں کو ہدایات دیتا رہا۔ وہ شاید اس جنگلاتی اور پہاڑی علاقے سے اکٹا گیا تھا اور اس کے لئے وہاں اس کے سوا کوئی کام نہ تھا کہ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے دستوں اور قبائلیوں کے لشکر کو دیکھ آتا تھا۔ یہ تو کئی میلوں میں پھیلا ہوا لشکر تھا۔ ابھی کوئی جنگی سرگرمی نہیں تھی۔ ایک روز وہ بز فنیہ چلا گیا۔ وہ اپنے باپ ہرقل سے حکم لیتا چلتا تھا یا ویسے ہی بغرض تفریح چلا گیا تھا۔

یہاں یہ جانا ضروری ہے کہ ہرقل کا ایک بیٹا اور بھی تھا۔ اس کی کئی بیویاں تھیں اور ہر بیوی سے اولاد تھی لیکن یہ دوسرا بیٹا اس کی تمام تر اولاد میں سے نمایاں اور ایک خصوصیت کا حامل تھا۔ اس کا نام بوکلس تھا اور اس کی عمر ابھی سولہ سترہ سال تھی۔ ہرقل کو اصل پیار قسطنطین سے تھا۔ قسطنطین جنگی فہم و فراست اور مہارت کا حامل ہونے کے علاوہ سلطنت کے امور سے بھی واقف تھا اور پیچیدہ مسئلے بھی سلجھایا کرتا تھا۔ ہرقل نے قسطنطین کو ہی اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔

ہر قل کا بیٹا یوکلِس کسی اور بیوی میں سے تھا۔ اس کی ماں بڑی چال باز اور ہوشیار عورت تھی اور اس کا ذہن مقلاتی سازشوں میں خوب چلتا تھا۔ اسے بہت دکھ تھا کہ ہر قل نے قسطنطین کو جانشین مقرر کر دیا تھا لیکن یوکلِس کی ماں اپنے اس بیٹے کو جانشین مقرر کروانا چاہتی تھی۔ تاریخ میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ یوکلِس خود بھی جانشین بننے کا خواہش مند تھا یا نہیں لیکن اس کی ماں کی سوچ کچھ اور ہی تھی۔

یوکلِس میں ایک جسمانی خامی تھی جو اچھی خاصی معذوری تھی۔ وہ یہ کہ اس کا بایاں بازو پیدا نشی طور پر بے کار تھا اور بالکل سوکھا ہوا۔ یوکلِس کی ماں کو ہر قل نے یہی جواز بتایا تھا کہ وہ آدھے آدمی کو اپنی اتنی بڑی بادشاہی کا جانشین نہیں بنا سکتا۔ یوکلِس کی ماں اس جواز کو تسلیم نہیں کرتی تھی۔

یوکلِس کا کمال یہ تھا کہ دائیں بازو سے ہی تیغ زنی اور برچھی بازی کر لیتا تھا اور اس کا وار خالی نہیں جاتا تھا۔ یوں کہہ لیں کہ وہ اسی طرح ہاں تیغ زن اور برچھی باز تھا جس طرح دونوں بازوؤں والے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی وہ گھوڑو سواری میں بھی شہسوار بن گیا تھا۔ صرف دائیں ہاتھ سے گھوڑے کی لگام قابو میں رکھتا اور اس نے کئی بار کرتب بھی دکھائے تھے۔

صرف تیر اندازی تھی جو اس سے نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اس کے لئے دونوں بازوؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ شکل و صورت اور جسمانی کشش کے لحاظ سے وہ قسطنطین سے زیادہ دل کو اچھا لگتا تھا۔ اس نے کئی بار ہر قل سے کہا تھا کہ اسے میدان جنگ میں جانے دیا جائے لیکن ہر قل یہ خطرہ مول لینے کے لئے کبھی بھی تیار نہیں ہوا تھا۔ رومیوں کی زبان میں وہ جس نام سے مشہور ہو گیا تھا اس نام کے معنی ہیں ایک بازو والا شہزادہ۔

○

قسطنطین محاذ سے بڑا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ شہر کے قریب سے ایک ندی گزرتی تھی جو چٹانوں میں سے گھوم پھر کر آگے جاتی تھی۔ وہاں ندی کے کنارے درختوں کے اتنے جھنڈ تھے کہ دور سے کچھ نظر نہیں آتا تھا اور وہ جگہ بہت خوبصورت تھی۔

قسطنطین کو اُس جگہ کے قریب سے گزرنا تھا۔ وہ کچھ اور قریب ہوا تو اسے ایسے قہقہے اور کچھ ایسا شور سنائی دیا جیسے بچے یا لڑکیاں ندی میں نہا اور کھیل رہی ہوں۔ اس

نے گھوڑے کی رفتار کم کر لی۔ اتنے میں ایک لڑکی دوڑتی ہوئی سامنے آئی۔ اس کے پیچھے ایک اور لڑکی دوڑ رہی تھی۔ وہ کھیل رہی تھیں۔

یہ وہ ہیں پچیس نوخیز لڑکیاں تھیں جنہیں قبائل کے سردار اپنے ساتھ لائے تھے کہ ہر قل کو دکھا کر بتائیں کہ یہ ہے ہماری عزت اور آبرو جسے ہم مسلمانوں سے برباد نہیں کروانا چاہتے ان لڑکیوں کو بڑا فائدہ کے محل میں ہی رکھ لیا گیا تھا کہ وہاں محفوظ رہیں گی۔

وہ سب اُس روز ندی میں نہانے اور کھیلنے آئی تھیں۔ ان میں سے دو لڑکیاں ایک دوسری کے پیچھے دوڑتی ندی سے ذرا ہٹ کر چٹانوں سے ٹکلیں اور قسطنطین کے سامنے آ گئیں۔ ان میں پیچھے دوڑنے والی لڑکی سولہ سترہ سال عمر کی تھی اور جس کے پیچھے دوڑ رہی تھی وہ بارہ تیرہ سال عمر کی تھی۔ قسطنطین کی نظریں بڑی لڑکی پر جم گئیں۔ ایک تو وہ تھی ہی بہت خوبصورت اور نوخیز اور دوسرے یہ کہ وہ نیم برہنہ تھی۔ قسطنطین بادشاہ کا بیٹا تھا بلکہ شہزادہ تھا اور سلطنت روم کا اگلا بادشاہ اُسی کو بننا تھا۔ یہ بادشاہ اپنی رعایا کی لڑکیوں کو اپنی ملکیت سمجھا کرتے تھے۔

قسطنطین نے اپنا گھوڑا اس لڑکی کے آگے کر لیا۔ چھوٹی لڑکی کچھ دُور رک کر قسطنطین کو دیکھنے لگی۔ قسطنطین نے جس لڑکی کو روکا تھا اس کے چہرے پر خوف کا تاثر آ گیا اور وہ اُلٹے قدم آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔ قسطنطین گھوڑے سے کود کر اُتر اور اس لڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔

قسطنطین اسے پیار سے بلارہا تھا لیکن لڑکی پیچھے ہٹتی جا رہی تھی۔ قسطنطین نے لپک کر اس کا ایک ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا پھر اس کا ہاتھ چھوڑ کر دونوں بازو اس کی طرف پھیلائے لیکن لڑکی بڑی پھرتی سے پیچھے ہٹ گئی اور اس کے بازوؤں میں نہ آئی۔

اب قسطنطین غضب ناک ہو کر اس کی طرف بڑھا۔ لڑکی پیچھے کو مڑ کر بھاگنے لگی لیکن ٹھوکر کھا کر گری پڑی۔ وہ اٹھے بغیر پیچھے کو سرک رہی تھی۔ اس کے اور قسطنطین کے درمیان تین قدموں کا فاصلہ تھا۔ اچانک ایک گھوڑا کہیں سے سامنے اور ان دونوں کے درمیان آ کر رک گیا۔

قسطنطین نے سوار کو دیکھا تو وہ اس کا چھوٹا بھائی یوکلِس تھا جس کا ایک بازو سوکھا کر بے کار ہو گیا تھا۔ قسطنطین نے بڑے غصے میں اسے راستے سے ہٹ جانے کو کہا۔

یو کلس گھوڑے سے کود آیا۔ وہ قریب ہی سے گزر رہا تھا تو اس نے یہ منظر دیکھا۔
ہو سکتا تھا کہ وہ ان لڑکیوں کو دیکھنے ہی آیا ہو اور نیت اس کی بھی ایسی ہی ہو جیسی
فلسطين کی تھی لیکن وہ اس لڑکی کا محافظ بن گیا۔ اس پر فلسطين جھپٹ رہا تھا۔
فلسطين نے تلوار نکال لی۔ یو کلس کو دگر گھوڑے سے اترا اور گھوڑے کو ٹھوکر مار
کر آگے کر دیا اور اس نے بھی تلوار نکال لی۔ دونوں تلواریں تان کر ایک دوسرے کی
طرف دیکھنے لگے اور وار کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

”میرے سامنے سے ہٹ جا یو کلس!“ — فلسطين نے چیلنج کے لہجے میں کہا۔
”پہلے ہی تیرا ایک بازو نہیں ہے۔ میں تجھے دوسرے بازو سے بھی محروم کر دوں گا۔“
”پھر پہلا وار تو کر“ — یو کلس نے کہا۔ ”تجھے افسوس نہ رہے کہ وار کرنے کا
موقع نہیں ملا تھا۔ یہ لڑکیاں ہماری مہمان ہیں۔ میں تجھے کسی لڑکی کی طرف بد نیتی کی آنکھ
سے دیکھنے بھی نہیں دوں گا۔“

جس طرح یو کلس کا گھوڑا اچانک فلسطين اور لڑکی کے درمیان آگیا تھا اسی طرح
ایک گھوڑا فلسطين اور یو کلس کے درمیان آن رُکا اور اس کا سوار گھوڑے سے اترا۔
ان دونوں نے دیکھا وہ ہرقل کے محافظ دستے کا ایک عمدے دار تھا۔ فلسطين کے سامنے
اس کی حیثیت اس کے ایک ملازم کی سی تھی۔ فلسطين نے حکم دیا کہ وہ آگے سے ہٹ
جائے۔

”میں شاہی خاندان کے محافظوں میں سے ہوں۔“ — اس محافظ عمدے دار نے کہا
— ”شاہی خاندان کے ہر فرد کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔ میں ایک لڑکی کی خاطر دو
شہزادوں کو ایک دوسرے کا خون بہاتے نہیں دیکھ سکتا۔ پہلے آپ دونوں مجھے قتل کریں
اور اس کے بعد ایک دوسرے کا خون بہالیں۔“

اس شخص نے ایسی باتیں کیں کہ فلسطين نے اپنی تلوار نیام میں ڈال لی۔ یو کلس
نے ادھر ادھر دیکھا، لڑکی وہاں نہیں تھی بلکہ تمام لڑکیاں وہاں سے بھاگ گئی تھیں۔ وہ
محافظ جس نے ان دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے کا خون بہانے سے روکا تھا ان لڑکیوں
کے ساتھ آیا تھا۔ اُس کے ساتھ چند اور محافظ بھی تھے جو لڑکیوں سے دُور دور پہرے پر
کھڑے تھے۔ یہ عمدے دار اتفاق سے ادھر آ نکلا تھا۔

فلسطين بڑے غصے کے عالم میں سوار ہوا اور وہاں سے یو کلس کو گھورتا ہوا چلا گیا۔

○

یو کلس بھی واپس اپنے گھر چلا گیا اور فوراً بعد ہرقل نے اسے بلایا اور بہت ڈانٹا کہ
اُس نے بڑے بھائی کی بے عزتی کی ہے۔ یو کلس کچھ بھی نہ بولا۔ اسے معلوم تھا کہ
فلسطين ہرقل کا چیتا بیٹا ہے اور وہ اسی کو ٹھیک سمجھے گا۔ یو کلس وہاں سے چپ چاپ
واپس آگیا۔

وہ عجیب سے ذہن کا نوجوان تھا۔ ہرقل کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد وہ محل کے اُس حصے
میں گیا جہاں قبائلی لڑکیاں رہتی تھیں۔ اُس نے پوچھا کہ وہ لڑکی کون تھی جس پر شہزادہ
فلسطين جھپٹ رہا تھا۔ وہ لڑکی سامنے آگئی اور اس نے یو کلس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے
اس کی عزت بچالی تھی۔

یو کلس نے اس سے پوچھا کہ اس کا قبیلہ کون سا ہے اور اس کے باپ کا نام کیا ہے۔
اُس نے قبیلہ کا نام بتایا اور باپ کا نام بھی۔ یو کلس وہاں سے چل پڑا۔

اگلے روز وہ علی الصبح بڑے فلیہ سے گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا اور اس نے گھوڑا دوڑا
دیا۔ بڑی لمبی مسافت طے کر کے اُس جگہ پہنچا جہاں قبائلی لشکر اور فوج رُکے ہوئے
تھے۔ یو کلس لڑکی کے قبیلہ کا نام لے کر پوچھتا پھر اس کے قبیلے کے آدمی کہاں ہوں گے۔
اسے بتایا گیا کہ یہ تو ڈھونڈنے والی بات ہے، بتایا نہیں جاسکتا کہ کون کہاں ہے۔

مختصر قصہ یوں ہوا کہ یو کلس نے اس لڑکی کے باپ کو ڈھونڈ نکالا۔ یہ باپ اپنے قبیلے
کا سردار تھا۔ یو کلس نے اسے بتایا کہ اس کی لڑکی کو اس نے کس طرح بچایا ہے اور ان
قبائلیوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ اپنی لڑکیوں کو محل سے نکال لیں ورنہ وہاں کسی کی بھی
عزت محفوظ نہیں رہے گی۔ یو کلس نے یہاں تک کہہ دیا کہ خود ہرقل کی نیت ان
لڑکیوں کے متعلق صاف نہیں۔ اتنی سی بات کہہ کر یو کلس وہاں سے واپس چل پڑا۔

لڑکی کا باپ خود قبیلے کا سردار تھا۔ وہ تو ہرقل کے پاس یہ فریاد لے کر آئے تھے کہ
ان معصوم لڑکیوں کی عزت کی حفاظت چاہتے ہیں لیکن محل ہی میں ان کی عزت پر حملے
ہونے لگے تھے۔ اس شخص نے اپنے قبیلے کو اکٹھا کیا اور یہ بات انہیں سنائی۔ ہر شخص
بھڑک اٹھا اور سبھی ایک ہی بات کہنے لگے کہ شاہ ہرقل کے پاس چلو اور اسے کہیں گے
کہ ہم اپنی لڑکیوں کو یہاں سے لے جا رہے ہیں۔

یہ بات تمام قبائل میں پھیل گئی۔ ان تمام بیٹیوں کے باپ اور بھائی وہاں اس لشکر

میں موجود تھے جو ہر قل کی مدد کو مسلمانوں کے خلاف لڑنے آئے ہوئے تھے۔ ان سب میں غصے اور احتجاج کی لہر دوڑ گئی۔ وہ تو ہر قل کے پاس جانے کو تیار ہو گئے تھے لیکن بعض نے مشورہ دیا کہ فسطین واپس آجائے تو پہلے اس کے ساتھ بات کریں گے۔ قبائلیوں میں بددلی پیدا ہو گئی تھی۔

دو تین روز بعد فسطین آگیا تو تمام قبائل کے سرداروں نے اسے گھیر لیا اور بتایا کہ ان کی لڑکیوں کے ساتھ یہ سلوک شروع ہو گیا ہے تو وہ اپنی لڑکیوں کو بز فنیہ سے لے کر واپس چلے جائیں گے۔ فسطین نے انہیں یہ جھوٹ بول کر کہ یہ واقعہ بالکل غلط ہے، راضی کرنے کی کوشش کی لیکن وہ راضی نہیں ہو رہے تھے۔

ان سب میں ایک معمر سردار بھی تھا جو اس عمر میں لڑنے کے قابل نہیں تھا لیکن اپنے قبیلے کے ساتھ آگیا تھا۔ اُس نے کہا کہ کوئی اور آدمی یہ بات سنا تا تو شاید اس پر جھوٹ کا شک کیا جاتا لیکن یہ بات سننے والا ایک شہزادہ ہے۔ شہزادے کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔

دو تین قبیلوں کے سردار بولے کہ وہ بز فنیہ جا کر لڑکیوں سے پوچھیں گے۔ اگر یہ واقعہ سچ نکلا تو وہ اس لڑائی اور قربانی سے باز آئے۔ تمام قبائلی سرداروں کو یہ بات اچھی لگی۔ فسطین انہیں روکنے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ بز فنیہ کی طرف چل پڑے۔ بز فنیہ پہنچ کر انہوں نے لڑکیوں سے پوچھا تو پتہ چلا کہ یہ واقعہ بالکل صحیح ہے۔ اس لڑکی نے پورا واقعہ بیان کیا جس پر فسطین چھٹ رہا تھا۔

یہ سردار تمام لڑکیوں کو ساتھ لے کر ہر قل کے پاس گئے اور وہاں یہ مسئلہ پیش کر دیا۔ ہر قل نے بھی انہیں ٹھنڈا اور راضی کرنے کی کوشش کی لیکن یہ قبائلی اتنے اکھڑے لوگ تھے کہ راضی نہیں ہو رہے تھے۔

ہر قل نے انہیں دھمکی دی کہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ گئے تو وہ انہیں کبھی معاف نہیں کرے گا اور اُس نے مسلمانوں پر فتح حاصل کر لی تو وہ اُن کی بستیاں اجاڑ دے گا اور ان کی یہ بیٹیاں اپنے محل میں لے آئے گا۔

تاریخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ بعض قبائل ان سرداروں سے اختلاف کر رہے تھے لیکن سردار اپنی لڑکیوں کو محل میں چھوڑنے سے گریز کر رہے تھے۔ وہ لڑکیوں کو ساتھ لے کر چلنے لگے۔ ہر قل نے انہیں روک لیا۔ ہر قل کو احساس تھا کہ یہ تیس ہزار کالنگر

اس کا ساتھ چھوڑ گیا تو اسے شام کے اس آخری قلعے سے بھی بھاگنا پڑے گا۔ اس نے ان قبائلی سرداروں کو یوں راضی کر لیا کہ وہ انہیں خیمے دے دے گا اور وہ لوگ لڑکیوں کو اپنے ساتھ ان خیموں میں رکھیں اور ان پر اپنے محافظ مقرر کر دیں۔ وہ رک تو گئے لیکن ان کے دل پوری طرح صاف نہیں ہوئے تھے۔ وہ لڑکیوں کو محاذ پر لے گئے اور انہیں وہاں خیموں میں رکھا۔

قبائلیوں میں یہ سارا واقعہ پھیل گیا تھا اور انہیں یہ بھی پتہ چل گیا کہ لڑکیوں کو محاذ پر لے آئے ہیں۔ اب ہر قبائلی کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ ان رومیوں پر کبھی اعتبار نہ کرنا۔

اُدھر مجاہدین کی کمک بڑی تیزی سے پہنچ رہی تھی۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ ابھی راستے میں ہی تھے۔ جن سالاروں کو قبائلی علاقوں پر حملے کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا وہ اپنے علاقے میں پہنچ گئے تھے۔

قدرتی امر کے طور پر لازماً ہوتی ہیں۔ محلاتی سازشوں کے اثرات محلات کی چار دیواری تک ہی محدود نہیں رہتے، دیواریں پھاند کر باہر آجاتے ہیں اور میدان جنگ تک جا پہنچتے ہیں اور فتح و شکست تک کو بھی اپنی زد میں لے لیتے ہیں۔ تاریخ نے ان ڈراموں اور سازشوں کو کم ہی اہمیت دی ہے لیکن یہ ڈرامے جہاں دلچسپ ہیں وہاں سبق آموز اور عبرت ناک بھی ہیں۔

صرف اسلام ایک ایسا دین ہے جس نے شہنشاہیت کے خاتمے کو اپنی بنیادی تعلیمات میں شامل کیا۔ اسلام نے چھوٹے بڑے کی تمیز ختم کی اور مکرم انسانیت کا سبق صرف دیا ہی نہیں بلکہ اللہ کے قانون کی شکل میں نافذ کیا اور اس پر سختی سے عمل کرایا۔ دنیائے کفر جو اسلام کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی تھی، اس کے پیچھے مذہبی نظریات کا اتنا عمل دخل نہیں تھا جتنا شہنشاہیت کو تھا۔ وہ سب بادشاہ اور شہنشاہ تھے۔ شہنشاہیت اور فرعونیت کے خاتمے میں انہیں اپنی موت نظر آرہی تھی لیکن فتح اُسی نے پائی جس نے انسانوں کے دلوں کو فتح کیا.... تلوار سے نہیں پیار سے.... یہ فاتحین تھے اللہ کے نام لیا اور شیخ رسالت کے پروانے!

اسلام کو بھی اُس وقت زوال آیا جب خلافت شہنشاہیت کے رنگ ڈھنگ اختیار کرنے لگی تھی۔ ہم جس دور کی بات کر رہے ہیں، اُس وقت مسلمانوں میں مساوات تھی جسے مساوات محمدی کہا گیا تھا اور آج تک کہا جاتا ہے۔ اللہ اور انسان کے درمیان نہ کوئی خلیفہ آسکتا تھا نہ کوئی عالم دین۔ خلیفہ دوم امیر المومنین حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر کہا تھا — ”اللہ نے اپنے بندوں کو آزاد پیدا کیا ہے، تم نے انہیں غلام کیسے بنا لیا ہے!“

یہ ہے داستان ایک شہنشاہ کی جس کا نام ہرقل تھا اور جس نے شاید کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ فرعون کس انجام کو پہنچے تھے۔ روم کا یہ بادشاہ اپنے آپ کو فرعون سمجھ بیٹھا تھا اور ملک شام کی بازی ہار کر سرحد پر بیٹھا ہادی ہوئی بازی جیتنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ آئیے دیکھیں یہ بازی آخر کس نے ہاری، کس نے جیتی اللہ کے بندوں کے یہی خواہوں نے یا بادشاہت کے پجاریوں نے!

○

پچھلے باب میں تفصیل سے ذکر آیا ہے کہ ہرقل کے بیٹے یوکل نے اپنے بڑے

تاریخ کے کچھ گوشے، کچھ کونے کھد رے ایسے ہیں جو وقت کی دھندلاہٹ میں چھپ گئے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھو تو نظر آجاتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن پر گزرتے زمانوں نے سیاہ پردے ڈال دیے ہیں۔ بعض تاریخی واقعات کی کڑیاں اس تاریکی میں آ کر گم ہو جاتی ہیں۔ پھر بھی ایسے محقق ہو گزرے ہیں جو اس دھند سے اور بعض تاریکی میں ڈوبے ہوئے گوشوں سے گم گشتہ کڑیاں نکال لائے اور تاریخ کے دامن میں ڈال دیں۔

تاریخ میں میدان جنگ کی، فتح و شکست کی، پیش قدمیوں اور پسپائیوں کی ہی کہانیاں ملتی ہیں۔ یہ کہانیاں شکست کھانے والی قوم کی اگلی نسلوں کے لئے عبرت ناک اور فاتحین کی نسلوں کے لئے ولولہ انگیز اور حوصلہ افزا ہوتی ہیں۔ تاریخ میں اہمیت ان ہی کہانیوں کو دی گئی ہے اور دی جاتی رہے گی۔ یہ کہانیاں قوموں کی روایت کی صورت میں ڈھل کر ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔

تاریخ کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ اس پہلو کا بظاہر جنگ و جدل کے ساتھ تعلق نظر نہیں آتا۔ یہ پس پردہ کھیلے جانے والے بڑے ہی سنسنی خیز، پراسرار، حیرت انگیز ڈرامے ہوتے ہیں۔ اسے بنی نوع انسان کی تاریخ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایسے ڈرامے وہیں کھیلے جاتے ہیں جہاں انسانیت شہنشاہیت کے چنگل میں بے بس و مجبور ہو کر ترپتی ہے مگر کچھ بھی نہیں سکتی۔ انسان انسان کے ہاتھوں میں کھلونا اور کٹہ پتی بنا ہوا ہے۔ انسان ہی انسان کا لہن و اتا اور خدا بن جاتا ہے۔

جہاں شہنشاہیت ہے وہاں محلات بھی ہیں اور محلات ہیں تو محلاتی سازشیں بھی ایک

یوکلے کی کمزوری یہ تھی کہ وہ بائیں بازو سے معذور تھا۔ پیدائشی طور پر اس کا بائیں بازو بالکل ہی سٹوکھا ہوا تھا۔ وہ دائیں ہاتھ سے ہی تیغ زنی، برچھی بازی اور گھوڑ سواری اسی طرح کر لیتا تھا جس طرح دونوں بازوؤں والے کیا کرتے تھے لیکن یہ معذوری اس کے لئے ایک بد قسمتی اور طعنہ بن گئی تھی۔

”تم کیوں تسلیم نہیں کرتے کہ تم معذور ہو!“ — قسطنطین نے کہا — ”تم اداورے انسان ہو۔ فوج کے لئے اور میدان جنگ کے لئے تم محض بے کار ہو۔ یہاں باتیں کرنے کے لئے آئے ہو، یہ جان لو کہ میدان جنگ میں زبان نہیں تلوار چلا کرتی ہے۔“

یوکلے نے اس کے جواب میں کچھ بھی نہ کہا۔ اس نے قسطنطین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر طنزیہ سا تبسم آگیا۔ پھر اس نے لگام کو ہلکا سا جھٹکا دیا، کچھ ایڑ لگائی گھوڑا دوڑا اور وہاں سے چلا گیا۔ قسطنطین دیکھتا ہی رہ گیا۔ دونوں بھائیوں میں عداوت تو پہلے ہی موجود تھی لیکن قبائلی لڑکی کے واقعہ کے بعد یہ عداوت اور زیادہ زہرناک ہو گئی تھی۔ دونوں بھائیوں کی رگوں میں ایک ہی باپ کا خون تھا لیکن دونوں کی مائیں الگ الگ تھیں۔

○

قسطنطین ہر قل کے پاس جا پہنچا اور اسے بتایا کہ یوکلے کچھ زیادہ ہی خود سر ہو تا جا رہا ہے۔ قسطنطین نے ہر قل کو وہ ساری بات بتائی جو یوکلے کے ساتھ ہوئی تھی۔

”مجھے اس پر شک ہے“ — قسطنطین نے کہا — ”وہ کہتا تو ہے کہ ان قبائل کا اعتماد بحال کر رہا ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ وہ قبائل میں ہمارے خلاف بد اعتمادی پیدا کر رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اُس لڑکی کے معاملے میں یہ کہاں تک پہنچا تھا۔ لڑکی کے باپ تک پہنچا اور اسے جانتا تھا کہ تمہاری لڑکیاں یہاں محفوظ نہیں۔“

”میں جانتا ہوں“ — ہر قل نے کہا — ”یہ میں سب جانتا ہوں۔ یہ لڑکا اپنے دماغ سے کام نہیں لے رہا، اسے اس کی ماں ہمارے خلاف اکسار ہی ہے۔ تم اپنے کام پر توجہ رکھو۔“

”میں ایک مشورہ دیتا چاہتا ہوں“ — قسطنطین نے کہا — ”یوکلے کو بڑی آسانی سے غائب کیا جاسکتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی یہ حل سوچا ہے؟“

بھائی سے ایک لڑکی کو بچانے کے لئے تلوار نکال لی تھی اور بڑے بھائی قسطنطین نے بھی تلوار نکال لی تھی۔ کوئی ایک بھائی دوسرے بھائی کے ہاتھوں یا دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو جاتے لیکن محافظ دستے کا ایک کمانڈر درمیان میں آگیا اور خون خرابہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ہر قل نے یوکلے کو بلا کر ڈانٹ دیا تھا کہ اس نے اپنے بڑے بھائی کی توہین کی ہے۔ اس واقعہ کے پیش نظر یوکلے کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ قبائلی عیسائیوں کی یہ لڑکیاں میدان جنگ میں خیموں میں رہنے کے لئے بھیج دی گئی تھیں۔ یہ ذکر بھی تفصیل سے ہو چکا ہے کہ ہر قل کا سارا پیارا اپنے بیٹے قسطنطین کے ساتھ تھا جو اب اس ساری فوج کا سپہ سالار یعنی کمانڈر انچیف تھا جس فوج نے محض پر یلغار کرنی تھی اور پھر قسطنطین کو ہر قل نے اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔

یوکلے ایک بار پھر میدان جنگ میں چلا گیا۔ ابھی جنگ شروع نہیں ہوئی تھی۔ وہ سارا دن وہاں دور دور تک پھیلی ہوئی فوج میں گھومتا پھرتا رہا اور عیسائی قبائل کے سرداروں اور دیگر افراد سے پوچھتا پھرا کہ اپنی لڑکیوں کے متعلق مطمئن ہیں یا نہیں۔

قسطنطین اسی فوج کا کمانڈر تھا۔ اس وقت وہ اپنے خیمے میں تھا۔ اسے اطلاع ملی کہ یوکلے اس ساری فوج میں گھوم پھر رہا ہے اور وہ زیادہ تر قبائلیوں کے ساتھ باتیں کرتا ہے۔ قسطنطین خیمے سے نکلا، گھوڑے پر سوار ہوا اور اس طرف گھوڑا دوڑا دیا جس طرف یوکلے گیا تھا۔ اسے یوکلے نظر آگیا اور وہ اُس تک جا پہنچا۔

”یہاں کیوں آئے ہو یوکلے؟“ — قسطنطین نے پوچھا اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا — ”تمہیں سب سے پہلے میرے پاس آنا چاہئے تھا۔ تمہیں کسی نے یہ حق نہیں دیا کہ فوج میں گھومو پھرو اور جو چاہو سپاہیوں سے کہتے رہو۔“

”میں نے یہ حق اپنے آپ کو خود ہی دیا ہے“ — یوکلے نے کہا — ”میں بھی اسی ہر قل کا بیٹا ہوں جس کے تم ہو۔ میں تمہارے ماتحت نہیں کہ جو تم چاہو گے میں کروں گا۔ میں تمہارے اس سوال کا جواب دیتا ہی نہیں چاہتا تھا لیکن ہماری بادشاہی ایسا صورت حال میں الجھ کے رہ گئی ہے کہ میں تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔ الجیزیرہ کے یہ قبائل ہماری مدد کو آئے ہیں اور تم نے ان میں بد اعتمادی اور بے دلی پیدا کر دی ہے صرف ایک لڑکی کی خاطر۔ میں یہ دیکھتا پھر رہا ہوں کہ ان لوگوں کی خفگی اور رنجش وہ ہوئی ہے یا نہیں۔ میں ان پر اعتماد بحال کرنا چاہتا ہوں۔“

بادشاہوں کے محلات میں اپنے مفاد کی خاطر بھائیوں کا اپنے بھائیوں کو قتل کروانا کوئی عجیب فعل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

”ہاں“ میں یہ بھی سوچ چکا ہوں۔“ ہرقل نے کہا۔ ”لیکن یہ وقت ان چھوٹی چھوٹی فضول باتوں پر غور کرنے کا نہیں۔ پورا ایک ملک ہمارے ہاتھ سے جا رہا ہے.... میں یوکلکس کو مروانا نہیں چاہتا۔ اگر ایسا کیا تو تم اس کی ماں کو اچھی طرح نہیں جانتے، وہ کوئی ایسی زمین دوز چال چلے گی کہ ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل جائے گی۔ یہ مجھ تک ہی رہنے دو کہ میں کیا سوچتا ہوں۔ تم تمہیں پر نظر رکھو اور پوری کوشش کرو کہ الجزیرہ کے یہ قبائل ناراض نہ ہوں۔ ان کی ہمیں ابھی ضرورت ہے۔ ہمارا مقصد پورا ہو گیا تو پھر میں ان لوگوں کو اُسی سطح پر گرا دوں گا جو ان کی اصل سطح ہے۔“

”جو کچھ آپ کرنا چاہتے ہیں جلدی کریں“ فسطین نے کہا۔ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ناں بیٹا اپنی کوئی زمین دوز کارروائی کر گزریں اور ہم دیکھتے رہ جائیں۔ مجھ سے زیادہ اور کسے احساس ہو گا کہ ہم پر کتنا نازک اور پرخطر وقت آ رہا ہے.... اگر آپ نے مجھے اتنا اختیار دے رکھا ہو تا تو میں اس یوکلکس کو غداری کے الزام میں اپنی فوج کے سامنے سزائے موت دیتا اور اس کا سر ہر چھٹی کی آبی میں اُڑس کر ہر طرف اس کی نمائش کرتا۔ یہ شخص بلا شک و شبہ غدار ہے۔“

”اصل مسئلہ اسے مروانے کا ہے۔“ ہرقل نے کہا۔ ”اگر اسے غداری کے جرم میں جلاؤ کے حوالے کیا گیا اسے ہم نے کسی خفیہ طریقے سے قتل کروا دیا تو اس کی ماں الجزیرہ کے قبائلیوں سے کہے گی کہ اس کے بیٹے کو صرف اس لئے قتل کیا گیا ہے کہ اس نے ایک قبائلی لڑکی کی عزت بچائی تھی۔ پھر تم سوچ سکتے ہو فسطین! ان قبائلیوں کا رد عمل کیا ہو گا.... ہمارے لئے بہت ہی خطرناک ہو گا۔“

ہرقل جلاؤ قسم کا بادشاہ تھا۔ اُس کے ہاں رحم نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی لیکن وہ ایک شہزادے کے معاملے میں ہوشمندی سے کوئی اقدام کرنا چاہتا تھا۔ یہ تو اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یوکلکس کو زندہ نہیں رہنے دے گا لیکن فسطین ابھی جوانی کی عمر میں تھا، اس کی سوچیں اور اس کا تجربہ باپ جتنا نہیں تھا اور اس کے دل میں یوکلکس کی دشمنی آگ کی طرح اسے جلا رہی تھی اس لئے وہ چاہتا تھا کہ یوکلکس کو فوراً اور اس کے سامنے قتل کر دیا جائے۔ ہرقل نے فسطین کی یہ بے تابی دیکھی تو بہتر جانا کہ اسے بتا دے کہ وہ یوکلکس

کو اس دنیا سے اٹھانے کا کیا طریقہ سوچ چکا ہے۔

”میرے عزیز بیٹے!“ ہرقل نے کہا۔ ”میں یوکلکس کو ایک رتبہ دے کر ایک جرنیل کے ساتھ میدان جنگ میں بھیجوں گا۔ اسے اور اس کی ماں کو ایک بڑی خوبصورت خواب دکھاؤں گا۔ تم جانتے ہو یوکلکس ایک بازو سے کیا لڑے گا۔ پہلے تصادم میں ہی مارا جائے گا۔ اس سے یہ ہو گا کہ وہ مارا بھی جائے گا اور اس کی ماں فخر سے اس کا ذکر بھی کرے گی کہ اس کا بیٹا میدان جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا ہے۔“

”کیا آپ اس جرنیل کو پہلے کچھ بتائیں گے؟“ فسطین نے پوچھا۔ ”کیا اسے پہلے بتا دیں گے کہ اس لڑکے کو ایسی جگہ دھکیلے جہاں یہ مارا جائے؟“

”میرے عزیز بیٹے!“ ہرقل نے ایسے پیار سے کہا جس میں ذرا سا غصہ بھی تھا۔ ”معلوم ہوتا ہے تم اپنے اصل فرض کو نظر انداز کر کے صرف اس مسئلے پر دماغ کو مرکوز کئے ہوئے ہو کہ یوکلکس کو کس طرح فوراً مار دیا جائے۔ میں نے تمہیں اتنی بڑی فوج کا کمانڈر بنایا ہے۔ اگر تم نے اسی طرح جذبات سے مغلوب ہو کر اپنی فوج کو لڑایا تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہو گا کہ شکست کھاؤ گے اور دشمن کے ہاتھوں مرو گے یا جنگی قیدی بن جاؤ گے.... جاؤ، اپنی فوج میں چلے جاؤ اور اس مسئلے کو ذہن سے نکال دو۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا ہے وہ میں سوچ چکا ہوں۔“

فسطین اٹھا اور باہر نکل آیا۔ باپ کے حکم کے مطابق اُسی وقت گھوڑے پر سوار ہوا اور محاذ کی طرف چلا گیا۔



جس وقت باپ بیٹا یہ گفتگو کر رہے تھے، اُس وقت ان کی حاضری میں ایک بڑی ہی خوبصورت اور نازک اندام کنیز موجود تھی۔ اس کا لباس ایسا ہی تھا کہ رہنہ لگتی تھی۔ وہ ہرقل کی عادات سے واقف تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ اس کے پیالے میں شراب ڈالتی اور الگ جاکھڑی ہوتی تھی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے ان باتوں سے اس کا کوئی تعلق واسطہ ہی نہ ہو جو ہرقل اور فسطین کے درمیان ہو رہی تھیں۔ کبھی ہرقل کے اشارے پر وہ کمرے سے باہر چلی جاتی اور کچھ ہی دیر بعد ہرقل دوبار تابی بجانا اور کنیز اندر آ جاتی تھی۔ یہ ان بادشاہوں کے انداز تھے جن سے غالباً وہ اپنے آپ کو یقین دلاتے تھے کہ وہ ان لوگوں کے بادشاہ اور دیوتا ہیں اور لوگوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بادشاہ کو

اپنا خدا سمجھیں۔ یہ نوخیز کزنہ ایک بڑی ہی خوبصورت گڑیا تھی جس کے ساتھ بچہ جس طرح چاہتا کھیل سکتا تھا۔ مسطین چلا گیا تو ہرقل کے اشارے پر کینز اس کے قدموں میں بیٹھ گئی اور اس کی ٹانگیں سلانے لگی۔

ہرقل نے دربار کو بلا کر کہا کہ وہ یوگس کی ماں کو ساتھ لے آئے۔۔۔۔ ہرقل کی یہ بیوی کہیں دور نہیں تھی، اسی محل کے ایک کمرے میں تھی۔ اطلاع ملتے ہی ہرقل کے پاس پہنچ گئی۔ وہ تقریباً پینتالیس سال عمر کی بڑی ہی خوبصورت اور پُرکشش جسم والی عورت تھی۔ شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی، ہر عیش و آرام میں تھا اس لئے اصل عمر سے خاصی چھوٹی لگتی تھی۔ اس کا نام لیزا تھا۔ ہرقل نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لیزا کے چہرے پر سوالیہ تاثر تھا۔ ہرقل نے ایک عرصے بعد اسے اس طرح تنہائی میں بلایا تھا۔

لیزا کی ایک تاریخ تھی۔ وہ اپنے ماضی پر اور اپنے خاندانی پس منظر پر بجا طور پر فخر کر سکتی تھی۔ وہ رومی نہیں تھی بلکہ ایرانی تھی اور کسریٰ کے خاندان کی شہزادی تھی۔ مذہبی لحاظ سے وہ آتش پرست تھی۔

جب ایران اور روم برسرِ بیکار تھے اور کبھی ایک کو فتح حاصل ہوتی اور کبھی دوسرے کو اور کبھی مصر اور شام ایرانیوں کے زیرِ تسلط آجاتے اور کبھی رومیوں کے، اُس وقت لیزا کی ملاقات ہرقل کے ساتھ ہوئی تھی لیکن یہ کوئی دوستانہ ملاقات نہیں تھی۔ لیزا ہرقل کے لئے بڑا ہی حسین پیغام اجل بن کر آئی تھی۔ اُس نے اپنا تعارف یوں نہیں کرایا تھا کہ وہ کسریٰ ایران کی شہزادی ہے بلکہ اس نے اپنے اغوا کا ایک ٹانگ کھیلایا تھا اور ایک مظلوم مغویہ بن کر ہرقل کے پاس پہنچی یا پہنچائی گئی تھی۔ ہرقل کو بتایا گیا تھا کہ یہ لڑکی ایک تاجر کی بیٹی ہے اور قافلے سے اغوا کر کے لائے ہیں۔ ہرقل اُس وقت جوان تھا اور ایسے ہی ہیروں اور موتیوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ اُس نے یہ تحفہ دل و جان سے قبول کر لیا۔

شام پر ایرانی قابض ہو گئے تھے اور ہرقل نے ایرانیوں پر جوابی حملہ کرنے کے لئے روم کے بادشاہ فوس کو اس کا تختہ الٹ کر بالکل معزول کر دیا تھا اور پھر شام پر حملہ آور ہوا تھا۔ وہ آدھا شام فتح کر چکا تھا جب یہ لڑکی اس کے پاس آئی تھی یا اسے پیش کی گئی تھی۔

لڑکی کسی تاجر کی بیٹی نہیں تھی نہ اغوا ہوئی تھی۔ کسریٰ کی ایک سازش کے تحت لڑکی کو بڑی ہی کامیابی سے ہرقل تک پہنچا دیا گیا تھا۔ کسریٰ نے کہا تھا کہ وہ ہرقل کو قتل کرنا چاہتا ہے اور ہرقل قتل ہو گیا تو پھر رومی فوج اس کے مقابلے میں نہیں ٹھہرے گی لیکن اسے قتل کس طرح کیا جائے؟

اس موقع پر اس شہزادی نے کہا کہ وہ یہ کام کر سکتی ہے۔ کسریٰ رضامند نہ ہوا لیکن لڑکی نے جب اپنا منصوبہ بیان کیا تو کسریٰ نے ایک سازش تیار کر لی اور مطلوبہ افراد کو بلا کر سب کچھ سمجھا دیا۔ لڑکی کا کام یہ تھا کہ شراب میں ہرقل کو زہر پلا دے گی اور وہاں سے فرار ہو آئے گی۔

اس شہزادی کو اندازہ نہیں تھا کہ جسے وہ زہر پلانے آئی ہے وہ بڑا ہی شاطر اور غیر معمولی عقل و دانش رکھنے والا بادشاہ ہے۔ ہرقل نے بڑی کامیابی سے منصوبہ بنا کر بادشاہ کا تختہ الٹ دیا تھا اور روم کے عوام اور روم کی فوج اس کے ساتھ ہو گئی تھی۔ ہرقل اس شہزادی کے حسن سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اس سے کہا کہ تم ایرانی حسن کا بے مثل نمونہ ہو۔ شہزادی کے منہ سے نکل گیا کہ میں ہی ایرانی۔ ہرقل اسی سے چوکتا ہو گیا۔ ایرانیوں اور رومیوں کی دشمنی تو ضرب النمل بن گئی تھی۔

ہرقل نے کسی شک شبہ کا اظہار کئے بغیر شہزادی کے ساتھ ایسا پیار اور پُراثر سلوک کیا جس کی اس شہزادی کو توقع نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے ہرقل کو اس لڑکی پر شبہ ہو گیا ہو اور ہرقل نے اس کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا ہو کہ اسے داشتہ بنانے کی بجائے محبوبہ بنالیا اور اس کے آگے بچھنے لگا۔

ایک روز شہزادی کو موقع مل گیا اور اس نے شراب میں زہر ملا بھی دیا لیکن جب شراب کا یہ پیالہ ہرقل کے آگے رکھا تو اس کا اپنا دل اس کے خلاف ہو گیا۔ ہرقل نے پیالہ اٹھالیا اور جب پیالہ اس کے ہونٹوں سے ایک دو لچ ہی دُور رہ گیا تھا، شہزادی نے بھپٹ کر پیالہ اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ ہرقل حیرت زدگی کے عالم میں اسے دیکھنے لگا۔

”میں تمہیں زہر نہیں دے سکتی“ — شہزادی نے کہا اور ہرقل کو بتا دیا کہ وہ اغوا نہیں ہوئی تھی اور ایک منصوبے کے تحت آئی تھی۔

ہرقل نے اُسی وقت ایک خاص ایچی کو بلایا اور کسریٰ ایران کے نام پیغام لکھوا کر

اسے دیا اور کہا کہ وہ فوراً روانہ ہو جائے اور یہ پیغام کسریٰ کے ہاتھ میں جا کر دے۔

پیغام میں ہر قل نے لکھا تھا کہ جس شنزادی کو تم نے مجھے زہر پلانے کے لئے بھیجا تھا وہ اب میری بیوی بن چکی ہے اور یہ بھی سن لو کہ اس پر کوئی جبر نہیں کیا بلکہ یہ اس کی اپنی خواہش تھی جو میں نے دلی مسرت سے قبول کر لی ہے۔ اگر مجھے زہر دینا ہی مقصود ہے تو ایک اور شنزادی کو بھیج دو لیکن یہ بھی ذہن میں رکھو کہ وہ بادشاہ جو مرد میدان ہوتے ہیں، میدان میں آکر لڑا کرتے ہیں اور اپنی بیٹیوں کو اپنے دشمن کے پاس نہیں بھیجا کرتے۔

یہ واقعہ تاریخ کے حوالے کرنے والے مؤرخ نے لکھا ہے کہ ہر قل کا ایلچی پیغام لے کر چلا گیا اور پھر کبھی واپس نہ آیا۔ کسریٰ نے اسے قتل کروا دیا تھا۔ ہر قل نے اس شنزادی کو عیسائی بنالیا اور اس کا نام لیزا رکھا۔ کچھ ہی دن ہر قل کی جذباتی کیفیت یہ رہی جیسے لیزا کے حسن و جمال اور طلسمانی فوجانی میں کھو گیا ہو۔ لیزا نے پہلے بچے کو جنم دیا تو ہر قل کی توجہ لیزا سے ہٹ گئی۔ یہ پہلا بچہ یوکلکس تھا جس کا بالیاں بازو پیدا انہی طور پر بے کار تھا۔

لیزا خود ہر قل جیسے شاہی خاندان کی شنزادی تھی۔ اسے معلوم ہونا چاہئے تھا کہ یہ تو بادشاہ اپنا حق سمجھتے ہیں کہ ایک چیز ذرا سی بھی پرانی ہو جائے تو اسے پھینک دیتے ہیں اور اسی جیسی ایک اور نئی چیز لے آتے ہیں۔ لیزا نے یوکلکس کے بعد ایک بچی کو جنم دیا تو ہر قل اسے یوں نظر آنے لگا جیسے کسی سفر میں ملا تھا، کچھ دور تک ہم سفر رہا اور ایک دور رہے پر اس کا راستہ لیزا کے راستے سے جدا ہو گیا تھا۔

لیزا کی جگہ ایک اور کنیز آگئی تھی اور ہر قل اسے بھی رخصت کرنے والا تھا۔ لیزا نے اپنے آپ کو کوڑے کباڑ کی کوئی چیز نہ سمجھا، وہ آخر شاہی خاندان کی فرد تھی۔ محلاتی سازشوں سے خوب واقف تھی۔ اس کی ماں ایسی ہی ایک سازش کا شکار ہوئی تھی اور اس نے ایسا ہی شکار کھلیا بھی تھا۔ لیزا ایک سے بڑھ کر ایک کار آمد اور تباہ کن سازش سوچ سکتی تھی اور اس پر عمل کروانا بھی جانتی تھی۔ وہ ہر قل کے دماغ پر سوار رہی اور ہر قل اسے نظر انداز نہ کر سکا بلکہ ہر قل کے دل میں اس کا کچھ ڈر بھی پیدا ہو گیا۔

یہ تھی یوکلکس کی ماں جو اسے ہر قل کا جانشین بنانا چاہتی تھی لیکن ہر قل نے اپنے دوسرے بیٹے قسطنطین کو جانشین بنادیا تھا۔

○

اب ہر قل نے لیزا کو بلایا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئی تو ہر قل پہلے اس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا پھر سر جھکا لیا۔

”کیوں بلایا ہے مجھے؟“ — لیزا نے یوں پوچھا جیسے ہر قل کوئی چھوٹا سا آدمی ہو۔

”تمہارے بیٹے کے متعلق بات کرنی ہے“ — ہر قل نے کہا۔

”میرا ہی نہیں“ — لیزا نے کہا — ”وہ تمہارا بیٹا بھی ہے.... کو، کیا بات کرنی ہے؟“

”تمہاری ایک خواہش پوری کرنا چاہتا ہوں“ — ہر قل نے کہا — ”تم اپنی زندگی میں اس کے سر پر روم کی بادشاہی کا تاج دیکھنا چاہتی ہو۔ میں قسطنطین کو اپنا جانشین مقرر کر چکا ہوں اور کسی وجہ اور جواز کے بغیر اس فیصلے کو منسوخ نہیں کر سکتا لیکن ایک راستہ نکال لیا ہے۔ میں اپنی زندگی میں ہی سلطنت کے دو حصے کروں گا۔ ایک حصہ قسطنطین کا اور دوسرا یوکلکس کا ہو گا۔ پہلے اس ملک شام کا فیصلہ ہو جائے دو۔“

”یہ فیصلہ تو ہو چکا ہے“ — لیزا نے کہا — ”جس دشمن نے تمہیں اتنی تھوڑی تعداد میں ہوتے ہوئے بھی شام کی سرحد تک پہنچا دیا ہے وہ یہاں سے بھی تمہیں اٹھا دے گا۔“

”لیزا!“ — ہر قل نے کہا — ”ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہو؟ میں ان مسلمانوں سے یہ ملک واپس لے لوں گا اور یوکلکس کو اسی ملک کا بادشاہ بنا دوں گا۔“

”میری دعا بھی یہی ہے“ — لیزا نے کہا — ”لیکن یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ میں آسمان سے تارے توڑ کر لاؤں گا اور آدھے تمہیں دے دوں گا.... میں کتنی ہوں میرے بیٹے کو وہ دس جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔“

”میں آدھی فوج کی کمان تو اسے فوراً دے رہا ہوں“ — ہر قل نے کہا — ”میں یوکلکس کو محاذ پر بھیج رہا ہوں۔ اسے ایک جرنیل کے ساتھ لگا دوں گا تاکہ جنگی قیادت کا تجربہ حاصل کرے۔ مجھے پوری امید ہے کہ وہ ایک ہاتھ سے ہی دشمن پر اپنی تلوار کی اور اپنی فوج پر قیادت کی دھاک بٹھالے گا۔ پھر میں اسے جرنیل بنا دوں گا۔“

”آج یہ خیال تمہیں کیوں آگیا؟“ — لیزا نے پوچھا — ”آج تک تم اسے بیگانہ کیوں سمجھتے رہے ہو؟“

”مجھے اس کی ایک صلاحیت کا اب پتہ چلا ہے“ — ہرقل نے کہا — ”قسطنطین نے ان قبائلیوں کی لڑکیوں پر دست اندازی کی تھی جو ہماری مدد کو آئے ہیں۔ یوکلےس نے ان لڑکیوں کو قسطنطین سے بچالیا اور تلوار نکال لی تھی۔ اس سے مجھے خوشی ہوئی کہ میرے اس بیٹے میں جرات بھی ہے اور آزادانہ فیصلہ کرنے کی صلاحیت بھی۔“

لیزا خاصی عیار عورت تھی۔ اس کا سب سے زیادہ کارگر حربہ اس کی خوبصورتی تھی اور پھر اس نے اپنی زبان میں ایسا جادو پیدا کر رکھا تھا جس سے کوئی بچ نہیں سکتا تھا لیکن ہرقل نے اسے ایسے سبزیغ دکھائے کہ وہ اس کی نیت کو سمجھے بغیر اس کی باتوں میں آگئی اور جب وہ وہاں سے نکلی تو ایک مسرور اور کامیاب عورت تھی۔

کچھ دیر بعد ہرقل نے یوکلےس کو بلایا۔ اسے ماں بتا چکی تھی کہ اس کے باپ نے اس کے لئے کیا فیصلہ کیا ہے۔ وہ تو بہت خوش تھا۔

”میرے عزیز بیٹے!“ — ہرقل نے یوکلےس سے کہا — ”اُس روز میں نے تمہیں برا بھلا کہا تھا کہ تم نے اپنے بڑے بھائی کی بے عزتی کی ہے لیکن تنہائی میں سوچا تو بے اختیار میرے دل میں تمہارے لئے تعریف نکلی کہ تم عقل اور جرات والے ہو۔ تمہاری وجہ سے قبائل کے لوگ موجود ہیں۔ تم قسطنطین کا ہاتھ نہ روکتے تو ہم اس تیس ہزار جنگجوؤں کی مدد سے محروم ہو چکے ہوتے میں تمہیں اب اپنے ایک جرنیل انتھونیس کے ساتھ محاذ پر بھیج رہا ہوں۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ اس سے جنگی قیادت کے داؤ پیچ سیکھ لو پھر میں تمہیں جرنیل بنا کر چند ایک دستے تمہارے حوالے کر دوں گا۔“

ہرقل نے اسے کہا کہ اگلی صبح اسے محاذ کو روانہ ہو جانا چاہئے اور انتھونیس کو بلا کر اس کے متعلق ہدایات دے دی جائیں گی۔

ہرقل کا اپنا ایک جاسوسی اور مخبری کا نظام تھا جس سے اس کے ذاتی حلقے کے افراد بھی ناواقف تھے۔ یہ نظام اتنا خفیہ تھا کہ اس کا اپنا بیٹا قسطنطین بھی اس کے وجود سے آگاہ نہیں تھا۔ دوسرے تیسرے روز ایک مخبر جو فوج کا ہی کوئی عمدے دار ہوتا تھا، ہرقل کے پاس جا کر پوری رپورٹ دیتا تھا۔

ایسا ہی ایک جاسوس ہرقل کے ہاں گیا۔ ہرقل کتنا ہی مصروف کیوں نہ ہوتا اور خواہ

وہ سویا ہوا ہی ہوتا، اس کا حکم تھا کہ ایسا کوئی آدمی یہ کہے کہ وہ ایک ضروری بات بتانے آیا ہے تو اسے فوراً اطلاع دی جائے۔ اگر وہ سویا ہوا ہے تو اسے جگا لیا جائے۔ یہ جاسوس گیا تو ہرقل نے اسے فوراً بلالیا اور اپنے خاص کمرے میں بٹھا کر دروازہ بند کر لیا۔

”تم جانتے ہو میں کیا معلوم کرنا چاہتا ہوں“ — ہرقل نے کہا — ”بتاؤ کیا خبر لائے ہو۔“

”ان قبائلیوں پر ابھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا“ — جاسوس نے کہا — ”ان میں بددی سی پائی جاتی ہے۔ ان کی لڑکی کا واقعہ اپنی سے اونٹی قبائلی تک پہنچ گیا ہے۔ ان لوگوں کا ایک رد عمل یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ قسطنطین کو وہ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے اور اس کا نام آتا ہے تو ان لوگوں کے چہروں پر خشکی اور ناپسندیدگی کے تاثر آ جاتے ہیں۔“

”تمہاری اپنی رائے کیا ہے“ — ہرقل نے پوچھا — ”اگر میں حکم دے دوں کہ تمہیں کی طرف پیش قدمی کر کے تمہیں کو محاصرے میں لے لیا جائے اور کوشش یہ کی جائے کہ محاصرہ طویل نہ پکڑے تو کیا یہ قبائلی دل و جان سے لڑیں گے؟“

”انہوں نے ایک شرط اپنے سامنے رکھ لی ہے“ — جاسوس نے جواب دیا — ”وہ کہتے ہیں کہ رومی فوج لڑے گی تو وہ اس کا ساتھ دیں گے اور اگر فوج جوش اور جذبے سے نہ لڑی تو تمام قبائل کے لوگ یہاں سے چلے جائیں گے شہنشاہ معظم! اصل بات یہ ہے کہ آپ اس ملک کی خاطر لڑے ہیں لیکن یہ قبائلی صرف اپنا اپنے بیوی بچوں اور اپنے مال و اموال کا تحفظ چاہتے ہیں۔ ان کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کا پلہ ہماری ہوا تو ان کے ساتھ یہ لوگ جا ملیں یا نہ ملیں، یہاں سے چلے جائیں گے اور آپ ان کی مدد سے محروم رہ جائیں گے۔“

”اور اپنی فوج کا جذبہ کیا ہے؟“ — ہرقل نے پوچھا — ”کیا اپنی فوج میں جوش و خروش اور تازگی نظر آتی ہے؟“

”نہیں شہنشاہ معظم!“ — جاسوس نے کہا — ”آپ کے دل کو دکھ پہنچا کر مجھے دلی رنج ہو رہا ہے لیکن میرا فرض ہے کہ حقیقت بیان کروں۔ ہماری فوج میں کوئی تازگی نظر آتی ہے نہ ہی جوش و خروش نظر آتا ہے۔ میں نے خود خیموں میں بیٹھ کر باتیں کیں

اور ان کی سنی ہیں۔ ان بد بختوں پر مسلمانوں کا خوف اس طرح طاری ہے جیسے وہ کم آہنی اثر میں ہوں۔ انہیں بتایا گیا کہ محص میں مسلمانوں کی فوج بمشکل چار ہزار ہے اور یہ چار ہزار سپاہی ہماری اتنی بڑی فوج کے سامنے ٹھہر نہیں سکیں گے جس میں صرف قبائلیوں کی نفری تیس ہزار ہے لیکن ہمارے سپاہیوں میں ذرا سا بھی جوش و خروش پیدا نہیں ہو رہا۔ کچھ ایسی آوازیں بھی اٹھنے لگی ہیں کہ مسلمانوں کا مذہب ہی سچا ہے۔ ایسے باتیں کرنے والے یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ خدا مسلمانوں کے ساتھ ہے۔“

مختصر یہ کہ ہر قل کو اپنی فوج کے متعلق مایوس کن رپورٹیں مل رہی تھیں۔ اسے کسی کی رائے لینے کی ضرورت ہی نہیں تھی، وہ خود مرد میدان اور تاریخ کا ایک قابل جرنیل تھا۔ جنگی امور کو اور فنِ ضرب و حرب کو خوب سمجھتا تھا۔ لڑنا بھی جانتا تھا اور لڑا، بھی جانتا تھا۔ وہ اپنی فوج کا اور قبائلی لشکر کا تجربہ خود کر سکتا تھا۔ اس کے پاس اب یہی ایک راستہ تھا کہ وہ فوراً ”محص پر حملہ کر دیتا۔ محص اس کے قبضے میں آ جاتا تو اس کی فوج میں کچھ جذبہ پیدا ہو سکتا تھا لیکن اپنی فوج کی ذہنی و جسمانی حالت کو اور عیسائی قبائلیوں کے تذبذب کو دیکھتا تھا تو وہ اس فیصلے پر پہنچتا تھا کہ ابھی حملہ نہ کیا جائے۔ وہ اس خوش فہمی میں بھی مبتلا تھا کہ محص کو کمک نہیں مل سکے گی اور مسلمانوں کی نفری تھوڑی ہی رہے گی۔

ہر قل ایسا بوکھلایا ہوا تھا کہ وہ جان ہی نہ سکا کہ مسلمان کتنی تیزی سے حرکت میں آ رہے ہیں اور کچھ دنوں بعد کیا ہونے والا ہے۔

اس کا اپنا جاسوسی کا نظام تھا تو بہت ہی تیز اور وہ لوگوں کے دلوں کی باتیں بھی معلوم کر لیا کرتا تھا لیکن اسے ذرا سا بھی شک نہ ہوا کہ عرب کے دس بارہ مسلمان اس کے محاذ پر قبائلی عیسائیوں کے بہروپ میں پہنچے ہوئے ہیں اور وہ بڑی دانشمندی سے قبائلیوں میں بددی اور رومیوں کے خلاف غلط فہمیاں پیدا کر رہے ہیں۔ ذہنی تخریب کاری کی کارروائیاں کرنے والے ان دس بارہ مسلمانوں کا کمائنڈر جدید تھا۔ وہ تو اس تخریب کاری کا ماہر تھا۔ وہ بعض قبائل کے سرداروں تک پہنچ گیا تھا اور ان کے ذہنوں میں بھی اس نے ہر قل اور رومیوں کے خلاف غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اپنے ایمان، عزم اور عہد کے پکے اور سچے تھے۔ وہ اللہ کی راہ میں باطل کے خلاف لڑتے ہوئے جانیں قربان کرنے وطن سے اتنی دور آئے

تھے۔ اللہ ان کے ساتھ نہ ہوتا تو اور کس کے ساتھ ہوتا!

مسلمانوں کے ہاں کوئی محلاتی سازش نہیں تھی نہ ان میں لڑکیوں پر دست درازی کر کے دل خوش کرنے والے سالار تھے نہ ان کے دلوں میں کوئی شک اور شبہ تھا۔ وہ سب اللہ کے ایک عظیم پیغام کے پیامبر تھے اور اپنے فرائض کو پوری طرح جانتے تھے۔ ان میں سالار بھی تھے، نائب اور ماتحت بھی تھے لیکن سب جانتے تھے کہ اللہ کی نگاہ میں برتر وہ ہے جو ایمان اور کردار میں برتر ہے۔



پچھلے باب میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے ابو عبیدہؓ کو اس اتنی نازک اور خطرناک صورت حال سے نکلنے کے لئے کیا کیا اقدامات کئے تھے اور عراق کے محاذ کے کون کون سے سالار کو شام کے محاذ پر پہنچ کر کون کون سے علاقے میں جانے کا حکم دیا تھا۔ حضرت عمرؓ خود بھی مجاہدین کا ایک لشکر بڑی عجلت میں اکٹھا کر کے محص کو روانہ ہو گئے تھے۔

امیر المومنین نے ایک قاصد کو اس ہدایت کے ساتھ محص کو بھیج دیا تھا کہ کمک بھی آ رہی ہے اور میں بھی آ رہا ہوں اور وہ اتنی تیز جائے جیسے اڑ کر محص پہنچا ہو۔ جنگوں میں جرنیل اور سپہ سالار جب کسی محاذ کی طرف کوچ یا پیش قدمی کرتے تھے تو ان کی کوشش ہوتی تھی کہ دشمن کو اس کا علم نہ ہو سکے اور وہ اچانک دشمن پر جا بھڑ بولیں لیکن حضرت عمرؓ نے اس جنگی اصول کے بالکل الٹ ایک کارروائی کی۔ وہ یہ کہ چند ایک شتر سوار اور گھوڑ سوار الگ کئے اور انہیں کہا کہ وہ آگے نکل جائیں اور محاذ کے قریب بتیوں میں یہ خبر پھیلاتے جائیں کہ مدینہ سے بہت بڑی کمک محص کو جا رہی ہے۔ امیر المومنین نے یہ بھی کہا کہ الجوزیرہ میں وہ خاص طور پر یہ خبر پھیلائیں اور یہ بھی کہ عراق سے کچھ سالار دستے لے کر محص اور بزنطیہ کی طرف جا رہے ہیں۔

حضرت عمرؓ اپنے کوچ کی یہ تشہیر اور نمائش اس خیال کے پیش نظر کر رہے تھے کہ انہیں ہتہ چل گیا تھا کہ ہر قل میں اتنا دم غم نہیں رہا کہ وہ اب کیسے بھی مجاہدین کے ساتھ ٹکر لے سکے یا کیں جوابی حملہ کر سکے۔

مدینہ سے روانگی سے کچھ پہلے امیر المومنین نے اپنے مصاحبوں سے کہا تھا کہ ہر قل کی فوج کی کمرٹ پچی ہے اور وہ اتنا زیادہ جانی نقصان اٹھا چکی ہے کہ اب اس کا لڑنے کا

جذبہ مرہی گیا ہو گا۔

امیر المومنین اپنی اور ملک کی آمد کی زیادہ تشہیر الجزیرہ کے ان عیسائی قبائل میں کرنا چاہتے تھے جنہوں نے ہر قل کو تیس ہزار نفری کالشکریا تھا۔ اس تشہیر کا مقصد یہ تھا کہ یہ قبائل ڈر جائیں کہ مسلمان ان کی بستیوں کو تباہ کر دیں گے اور یہ سوچ کر وہ ہر قل کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔

یہ صحیح طور پر بتانا ممکن نہیں کہ امیر المومنین کا قصد کتنے دنوں بعد محض پہنچنا تھا۔ بہر حال وہ بہت ہی تیزی سے سفر کرتا محض پہنچ گیا اور ابو عبیدہ کو یہ خبر سنائی کہ ملک پہنچ رہی ہے اور امیر المومنین ایک لشکر ساتھ لے کر خود بھی آرہے ہیں۔ قصد نے انہیں یہ بھی بتایا کہ محض کو اور ملک کہاں کہاں سے مل رہی ہے اور یہ بھی کہ قبائلی علاقوں میں بھی سالار اپنے اپنے دستے لے کر پہنچ گئے ہیں۔

تصور میں لایا جاسکتا ہے کہ ابو عبیدہ نے کس طرح سکھ اور چین کا سانس لیا ہو گا۔ وہ تو سپہ سالار تھے، وہاں کوئی چھوٹے سے چھوٹا مجاہد بھی جیتی ہوئی بازی ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ ابو عبیدہ نے مجاہدین کو صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا کہ اب پسپائی سے بچنے کا ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ جائیں قریان کر دو۔ ہر مجاہد نے عہد کر لیا تھا — ”فتح یا موت“ — ان حالات میں امیر المومنین کا قصد ابو عبیدہ کو یوں نظر آنے لگا جیسے اللہ نے آسمان سے رحمت کا فرشتہ اتارا ہو۔

خالد بن ولید بھی چار ہزار گھوڑ سواروں کے ساتھ محض پہنچ چکے تھے۔ خالد بن ولید خطرے مول لینے والے سالار تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ باہر نکل کر لڑیں گے لیکن ابو عبیدہ اور دوسرے سالاروں نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا تھا۔ اب اطلاع ملی کہ اللہ کی مدد امیر المومنین کی صورت میں آرہی ہے تو خالد بن ولید بہت ہی خوش ہوئے کہ اب باہر نکل کر لڑنے کا موقع ملے گا۔

امیر المومنین کا یہ قصد واپس چلا گیا اور ایک ہی دن کے وقفے سے دوسرا قصد آ گیا۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے اس دوسرے قصد کو اس پیغام کے ساتھ بھیجا تھا کہ ابو عبیدہ اپنے ذرائع سے رومیوں کے محاذ پر یہ خبر پھیلا دیں کہ عراق سے ملک آگئی ہے اور بہت سے دستے الجزیرہ کے قبائلی علاقوں میں پھیل گئے ہیں۔ امیر المومنین نے خاص طور پر یہ ہدایت بھیجی کہ ان قبائل کا جو لشکر ہر قل کے پاس پہنچ گیا ہے، اس لشکر پر

خطرہ سوار کر دیا جائے کہ مسلمانوں کے جو دستے الجزیرہ میں گئے ہیں وہ وہاں کی بستیاں اُجاڑ دیں گے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سارا علاقہ اب مسلمانوں کے تسلط میں ہے اور اس علاقے کے جو لوگ رومیوں کی مدد کے لئے چلے گئے ہیں وہ غدار ہیں اور انہیں اس غداروں اور بغاوت کی سزا دی جائے گی جو یہ ہوگی کہ ان کی بستیاں اُجاڑ دی جائیں گی اور مویشیوں پر مسلمان قبضہ کر لیں گے۔

یہ ایک نفسیاتی یلغار تھی جو امیر المومنین رومیوں اور ان کے قبائلی اتحادیوں پر کر رہے تھے۔ ابو عبیدہ نے تو پہلے ہی دس بارہ مجاہدین قبائلی لشکر میں بددلی پیدا کرنے کے لئے بھیج رکھے تھے۔ اب انہیں امیر المومنین کی یہ ہدایت ملی تو انہوں نے ایک اور مجاہد کو یہ ساری ہدایت سمجھا کر رومیوں کے محاذ پر بھیج دیا۔

○

یہ قصد قبائلی عیسائیوں کے بھیس میں روانہ ہو گیا۔ اسے حدید کے پاس پہنچنا تھا اور باقی کام حدید اور اس کے ساتھیوں کو کرنا تھا۔

رومی فوج اور عیسائی قبائلی پہاڑوں کے اندرونی علاقے میں اس طرح خیمہ زن تھے کہ محض ان کے محاصرے میں تھا لیکن وہ محض سے ابھی کئی میل دُور تھے۔ اس سارے لشکر کو ہر قل کے حکم پر محض کی طرف پیش قدمی کرنی تھی اور محض کو محاصرے میں لے لیتا تھا۔

ابو عبیدہ کا بھیجا ہوا یہ قصد وہاں پہنچا تو قبائلی اُسے اپنا ہی آدمی سمجھ کر دوڑے آئے اور اسے گھیر لیا۔ وہ اس سے پوچھنے لگے کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور اپنے علاقے کے حالات کیسے ہیں۔ ان کی باتوں سے قصد کو اندازہ ہوا کہ انہیں پہلے ہی خبر مل چکی ہے کہ مسلمانوں نے الجزیرہ کی بستیوں پر حملہ کر دیا ہے اور وہاں کے حالات ٹھیک نہیں۔

قصد نے انہیں بتایا کہ حالات بہت بُرے ہیں اور مسلمان تعزیری کارروائی کے طور پر بستیاں اُجاڑ رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ قصد نے اچھی خاصی وحشت پھیلا دی اور پھر وہ ڈھونڈتا ہوا حدید تک بھی پہنچ گیا۔ حدید بھی قبائلی عیسائی بنا ہوا تھا۔ قصد نے اسے ابو عبیدہ کا پیغام دیا۔ حدید نے اسے بتایا کہ وہ واپس چلا جائے اور سپہ سالار ابو عبیدہ کو تسلی دے کہ جو طریقہ کار انہوں نے بتایا ہے اس پر پہلے ہی عمل ہو رہا ہے اور اس میں جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی کیونکہ الجزیرہ سے خود عیسائی خبریں لے کر پہنچ گئے ہیں

اور اس تمام تر تیس ہزار لشکر کو پتہ چل چکا ہے کہ پیچھے خیریت نہیں۔

قاصد واپس آگیا اور حدید اور اس کی مختصر سی اس جماعت نے جلتی پر خوب تیل ڈالا اور قابلیوں کے لشکر پر دہشت طاری کر دی۔ محاذ پر یہ قبائلی کسی ایک جگہ اکٹھے نہیں تھے، وہ تو میلوں لمبائی میں رومی فوج کے ساتھ پھیلے ہوئے تھے۔ ایک افواہ اشقی تھی جو تیز ہوا کی طرح دُور دُور تک پھیلے ہوئے قابلیوں تک پہنچ جاتی تھی۔ کوئی بھی اس کی تصدیق کرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا۔ ہر ایک کی زبان پر یہی ایک افواہ ہوتی تھی اس لئے ہر کوئی اسے سچ مانتا تھا۔

قبائلی پہلے ہی رومیوں سے بددل ہو چکے تھے۔ ان کے دلوں میں رومیوں کے متعلق جو شکوک و شبہات پیدا ہو گئے تھے، انہیں حدید اور اس کی جماعت نے مزید پکا کر دیا تھا اور یہ شکوک یقین کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ اصل میں بات یہ پیدا کر دی گئی تھی کہ وہ جو لڑائی لڑنے آئے ہیں وہ رومیوں کے مفادات کی لڑائی ہے اور اس میں ان کے لئے نقصان ہی نقصان ہے۔ یہ قبائلی تو اپنا تحفظ چاہتے تھے۔ اب انہیں یہ خبریں ملیں کہ مسلمانوں کا لشکر ان کے علاقوں پر حملہ آور ہو گیا ہے تو قبائلی سرداروں کا ایک وفد ہرقل کے پاس گیا۔ یہ خبریں ہرقل تک بھی پہنچ چکی تھیں۔ قبائلی سرداروں نے اسے بتایا کہ وہ اس کی لڑائی لڑنے آگئے ہیں لیکن ان کے اپنے علاقوں پر مسلمانوں نے یلغار کر دی ہے۔

ہرقل بڑا ہی ہوشیار اور چالاک آدمی تھا۔ عیار ایسا کہ کسی کو شک تک نہیں ہوتا تھا کہ یہ شخص عیاری کر رہا ہے۔ اس نے قبائلی سرداروں کے وفد کی پوری بات بڑی دلچسپی اور ہمدردی سے سنی۔

”میرے عزیز بھائیو!“ — ہرقل نے کہا — ”مجھے سب سے پہلے تمہارے گھروں کا اور بیوی بچوں کے تحفظ کا خیال ہے۔ اگر مسلمان تمہارے علاقوں میں آگئے ہیں تو کوئی قیامت نہیں آگئی۔ میں اب تم پر حملے کو مزید ملتوی نہیں کروں گا۔ ہم نے تمہیں مسلمانوں سے لے لیا تو پھر ہم ان کی کمر توڑ دیں گے اور پھر تم دیکھنا کہ تمہارے علاقوں میں مسلمانوں کی جو فوج پھیل گئی ہے، وہ سب بھاگی بھاگی اس طرف آجائے گی۔ میرا ساتھ دو اور پھر دیکھنا کہ ہم ان مسلمانوں کو کس انجام تک پہنچائیں گے۔“

”ہم اور انتظار نہیں کر سکتے“ — وفد کے ایک سردار نے کہا — ”تمہیں فتح

ہونے تک مسلمان ہماری بستیوں کا صفایا کر چکے ہوں گے۔ اگر آپ ہمارا تعاون اور اتحاد چاہتے ہیں تو پہلے اپنی فوج کو ہمارے ساتھ ہمارے علاقوں میں بھیجیں۔ ہم مسلمانوں کو وہاں سے بھگا دیں گے اور پھر تمہیں پر حملہ کریں گے یا جہاں آپ چاہیں گے ہم آپ کے ساتھ ہوں گے۔“

ہرقل اتنا کچا آدمی نہیں تھا کہ وہ ان قابلیوں کی باتوں میں آجائے۔ وہ تو انہیں اپنے مفادات کے لئے استعمال کر رہا تھا۔ قابلیوں کی پریشانی بلاوجہ نہیں تھی۔ پہلے ایک موقع پر مسلمانوں نے ان کی تین بستیاں اس جرم کی سزا کے طور پر تباہ کر دی تھیں کہ انہوں نے اُس وقت بھی مسلمانوں کے خلاف رومیوں کا ساتھ دیا تھا۔ ان قابلیوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ ہرقل تو تمہیں پر حملے کو ملتوی کرتا چلا آ رہا ہے لیکن مسلمان عزم کے اتنے کئے ہوئے ہیں کہ وہ اللہ کا نام لے کر تکبیر کے نعرے لگاتے حملہ کر دیتے ہیں اور اپنی کوئی کارروائی انہیں نہیں ڈالتے۔

ہرقل چاہتا تھا کہ قبائلی اس کے ساتھ رہیں اور وہ تمہیں پر حملہ کرے لیکن قبائلی چاہتے تھے کہ ہرقل انہیں اپنی فوج دے دے اور وہ مسلمانوں کو اپنے علاقوں سے نکالیں۔

ہرقل نے زبان سے یہ واؤ آزمایا، بڑے پیار اور بظاہر دلی ہمدردی سے بھی انہیں قائل کرنے کی کوشش کی لیکن قبائلی سردار جو پہلے ہی رومیوں سے بددل ہو گئے تھے، اس کی باتوں میں نہ آئے اور یہ مذاکرات کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئے۔

”میری ایک بات سن لو“ — ہرقل نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا — ”جسے تم اپنا علاقہ کہہ رہے ہو وہ تمہارا اپنا نہیں ہے۔ وہ علاقہ اُس کا ہے جس نے یہ ملک فتح کیا ہے۔ پہلے تم میرے زیر تسلط تھے، اب اس علاقے پر مسلمان قابض ہو گئے ہیں لہذا تم آزاد نہیں ہو۔ اگر تم لوگوں میں ہمت اور غیرت ہے تو مسلمانوں کے خلاف بغاوت کر دو۔ وہ نئے نئے آئے ہیں اور ابھی یہاں کا نظام انہوں نے نہیں سنبھالا، اس بد نظمی سے فائدہ اٹھاؤ اور باغی ہو جاؤ۔“

سردار وہاں سے آگئے۔ وہ ہرقل سے ملنے بڑبڑائے گئے تھے جو محاذ سے خاصا دور تھا۔ واپس محاذ تک پہنچتے پورا دن اور آدھی رات گزر گئی تھی۔ وہ محاذ پر پہنچے تو انہیں اطلاع ملی کہ قابلیوں کی بیشتر نفری یہاں سے رخصت ہو چکی ہے اور سب اپنے اپنے علاقے کی

طرف چلے گئے ہیں۔ ان سرداروں نے بھی بوریا بستر سمیٹا اور روانہ ہو گئے۔ انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ وہ اپنی لڑکیوں کو ساتھ لے گئے ہیں۔

○

مؤرخوں نے لکھا ہے کہ ایک صبح ابو عبیدہؓ اذان کی آواز پر جاگے اور اٹھے۔ وہ نماز کے لئے اٹھے تھے کہ دربان نے انہیں اطلاع دی کہ حدید بن مومن خنزرج اپنے ساتھیوں کے ساتھ آیا ہے۔ ابو عبیدہؓ کو جیسے اپنے کانوں پر شک ہوا ہو۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ حدید اپنی جماعت کے ساتھ اچانک واپس آجائے گا۔ انہیں کچھ پریشانی سی ہوئی کہ رومیوں کو ان کی اصلیت معلوم ہوگئی ہوگی اور دو چار آدمی پکڑے گئے ہوں گے اور باقی بھاگ آئے ہیں۔ ابو عبیدہؓ انہیں بلانے کی بجائے دوڑے باہر نکلے۔ دیکھا حدید کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور اس کی جماعت کے تمام مجاہد موجود تھے اور سب کے چہروں پر بشارت تھی۔

”تم سب کیوں آئے ہو؟“ — ابو عبیدہؓ نے پوچھا۔

”اس لئے کہ تمیں ہزار قبائیکوں کا لشکر چلا گیا ہے“ — حدید نے مسکراتے ہوئے

جواب دیا۔

”کہاں؟“

”جہاں سے وہ آئے تھے“ — حدید نے جواب دیا — ”کچھ ہماری کامیابی نے ان لوگوں میں بددلی پھیلا دی تھی اور باقی کلام ان اطلاعوں اور خبروں نے کر دیا جو ان لوگوں کو اپنے علاقوں سے پہنچی تھیں کہ مسلمان آگئے ہیں۔ ہم نے انہیں پھیلا میں، جلتی پر تیل ڈالا اور آخر قبائلی رومیوں کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔“

حدید اور اس کے ساتھیوں نے تفصیلات سنائیں کہ قبائلی کس طرح ہر قتل سے بدظن ہوئے تھے اور آخر وہ کس طرح ہر قتل کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ ابو عبیدہؓ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا اور بلند آواز سے کہا کہ یہ سب اس اللہ تبارک و تعالیٰ کی رحمت و برکت ہے جس کے نام پر ہم یہاں آئے تھے اور جس کے نام پر ہم نے اپنی جانیں قربانی کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔

ابو عبیدہؓ اور یہ سب لوگ نماز پڑھنے کے لئے چلے گئے۔ اُس زمانے میں سپہ سالار امامت کے فرائض سرانجام دیا کرتا تھا۔ ابو عبیدہؓ نے نماز کی امامت کی اور نماز سے فارغ

ہوئے تو ابو عبیدہؓ اٹھے اور سب سے کہا کہ کوئی آدمی ابھی جائے نہیں۔

”آج کی صبح ہمارے لئے ایک بہت بڑی خوشخبری لے کر ظلوع ہوئی ہے۔“ — ابو عبیدہؓ نے بڑی بلند آواز میں کہا اور ہزار ہا مجاہدین جو وہاں موجود تھے سناٹے میں آگئے۔ ابو عبیدہؓ نے اعلان کیا — ”تمیں ہزار عیسائی قبائل کا لشکر رومیوں کا ساتھ چھوڑ کر اپنے علاقوں میں چلا گیا ہے۔ یہ اللہ کی غیبی مدد ہے۔ اللہ نے قرآن کی سورہ الزمر میں فرمایا ہے کہ جنہوں نے شیطان سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف رجوع کیا ان کے لئے خوشخبری ہے۔ اللہ نے اپنے رسولؐ سے اس آیت میں فرمایا ہے کہ میرے ان بندوں کو خوشخبری سناؤ جو میری بات سننے میں اور نیک راستے پر چلتے ہیں اور اللہ انہی کو صحیح راستہ دکھاتا ہے اور یہی ہیں جو عقل و ہوش والے ہیں.... اللہ کے یہ بندے تم ہو جنہیں اللہ نے آج خوشخبری بھیجی ہے کہ الجزیرہ کے قبائلیوں کا وہ تمیں ہزار کا لشکر جو ہمارے لئے ایک بہت بڑا خطرہ بن گیا تھا، رومیوں کا ساتھ چھوڑ کر ان سے بدظن ہو کر چلا گیا ہے اور پیچھے روم کی تھوڑی سے فوج رہ گئی ہے۔ یہ فوج تم سے پہلے ہی خوف زدہ ہے اور اس فوج میں اتنا سامان خم بھی نہیں کہ تمہارے سامنے ایک دن بھی ٹھہر سکے۔“

”نعرۂ تکبیر“ — کسی نے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر یہ نعرہ بلند کیا اور حمص کے زمین و آسمان — ”اللہ اکبر“ — کے گونج دار اور گرج دار دھماکے سے لرز اٹھے۔ یہ نعرہ بلند کرنے والے خالد بن ولید تھے جو ابو عبیدہؓ کی مدد کے لئے تشریف سے آ کر حمص میں مقیم تھے۔ انہوں نے شہر سے باہر نکل کر لڑنے کا مشورہ دیا تھا جو سپہ سالار ابو عبیدہؓ نے نہیں مانا تھا۔ اب انہیں شہر سے باہر جا کر کھلے میدان میں رومیوں سے آمنے سامنے کے معرکے کا موقع مل گیا تھا۔

”مجاہدین اسلام!“ — ابو عبیدہؓ بڑی پُر جوش آواز میں کہہ رہے تھے — ”انشاء اللہ یہ معرکہ شام کا آخری معرکہ ہو گا۔ جس طرح عراق کی سرزمین زرتشت کے بجا ریوں سے پاک ہو گئی ہے اسی طرح شام سے رومی بیٹھ کے لئے چلے جائیں گے اور یہ زمین بھی پاک ہو جائے گی۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن ایک بار پھر یاد دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہم نے یہ ملک اس لئے فتح نہیں کیا کہ یہاں حکمرانی کریں گے یا یہاں کے بادشاہ بن بیٹھیں گے بلکہ ہمارا مقصد اور ایمان یہ ہے کہ یہاں اللہ کی حکمرانی قائم کریں گے۔ یہ بھی سن لو کہ ملک فتح کرنے پر ہی ہمارا کام ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اصل

کام اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ یہ کام ہے لوگوں کے دلوں پر فتح حاصل کرنا اور ان کے دلوں سے غلامی کا احساس مٹا کر انہیں وہ حکم و تعظیم دینا جو اللہ نے اپنے بندوں کو عطا کی ہے لیکن ابھی اپنے آپ کو فاتح نہ سمجھ لینا کیونکہ دشمن ابھی یہاں موجود ہے۔ جب تک دشمن اپنے خون میں ڈوب نہ جائے اور اپنے گھوڑوں کی اڑائی ہوئی گرد میں گم نہ ہو جائے اپنے آپ کو فاتح نہ سمجھتا۔ اللہ نے معجزہ دکھا کر ہمارے دشمن کو تیس ہزار کے لشکر سے محروم کر دیا ہے، ہمیں یقین ملا ہے کہ اس کی ذات باری ہمارے ساتھ ہے۔ امیر المومنین بھی کمک لے کر آرہے ہیں اور قحطاع بن عمرو ہماری مدد کے لئے چار ہزار گھوڑ سوار لے کر پہنچنے ہی والے ہیں۔ اب فوراً حملے کی تیاری کرو۔ ضروری ہدایات اور دیگر باتیں تمہیں سالار بتا دیں گے۔“

مجاہدین کے اس لشکر کی جذباتی اور جسمانی کیفیت ایسی ہو گئی جیسے ان میں نئی روح پھونک دی گئی ہو۔ وہ ہمت اور حوصلہ ہارنے والے نہیں تھے، انہوں نے ہر میدان قلیل تعداد سے فتح کیا تھا اور کئی گنا زیادہ طاقتور دشمن کو تہ تیغ کیا تھا لیکن یہاں ایسی صورت حال پیدا ہو گئی تھی کہ پریشانی کے آثار سپہ سالار کے چہرے پر بھی نظر آنے لگے تھے۔ وہ محاصرے میں آکر لڑنے کے لئے تیار تھے لیکن اب اپنے سپہ سالار سے یہ خوشخبری سنی تو وہ بند کلیوں کی طرح کھل اٹھے۔

ابو عبیدہ اور خالد بن ولید نے حملے کا پلان تیار کر لیا اور اپنے لشکر کو فوری تیاری کا حکم دے دیا۔

○

بزنطیہ میں ہرقل کے ہاں تو ماتم والی فضا بن گئی تھی۔ وہ عیسائی قبائلیوں کو روکنے میں بڑی طرح ناکام ہوا تھا۔ اس کا اپنا جو جاسوسی نظام تھا، اس سے اسے اپنی فوج کے متعلق بڑی مایوس کن رپورٹیں مل رہی تھیں۔ قبائلیوں کے چلے جانے سے ہرقل اتنا مایوس نہیں ہوا تھا جتنی مایوسی اس کی فوج پر طاری ہو گئی تھی۔ مایوسی تو طاری ہوئی ہی تھی۔ فوج کی یہ نفری جو اس وقت بزنطیہ میں تھی، یہ ہرقل کی بچی کچی فوج تھی۔ ان فوجیوں نے اپنے ہزار ہا ساتھیوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں کلتے دیکھا تھا۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ ان کے اپنے گھوڑ سوار اپنے پیادہ سپاہیوں کو گھوڑوں تلے کچل کر پسا ہوئے تھے۔

تین مہینوں کے مطابق اُس وقت تک شام کی جنگ میں ہرقل کے تقریباً نوے ہزار فوجی مارے جا چکے تھے اور زخمیوں کا کوئی شمار ہی نہ تھا۔ صحیح سلامت گھوڑے جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے تھے، ان کی تعداد ہزاروں تھی۔

ہرقل اپنے بیٹے قسطنطین کے ساتھ وہاں گیا جہاں اس کی فوج خیمہ زن تھی اور جس نے محص کو محاصرے میں لینا تھا۔ یہ فوج دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسے ایک جگہ اکٹھا کیا گیا اور ہرقل نے اپنے فوجیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے بڑی جوشیلی تقریر کی لیکن اس نے دیکھا کہ اس کے فوجی یوں چُپ چاپ اور بے حس و حرکت بن رہے ہیں جیسے ان کے جسم بے جان ہو چکے ہوں۔ یہ فوج تو ہرقل کو اپنے قریب دیکھ کر نعرے لگایا کرتی تھی لیکن اب اس فوج کا یہ عالم تھا کہ ہرقل جس قدر جوش و خروش سے بات کرتا تھا، اس کی فوج اتنی ہی مُردہ ہوتی چلی جا رہی تھی۔ کسی نے رسمی طور پر بھی نعرہ نہ لگایا۔ ہرقل بغیر لڑے پسا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی اس فوج میں جان ڈالنے کے لئے ایک اور حربہ آزمایا۔

”تم ارض روم کے شیر ہو“ — ہرقل نے بازو ہوا میں لہرا کر کہا — ”تم روم کی عزت اور ان کے محافظ ہو۔ تم نے اس ملک پر حکومت کی ہے۔ مرد میدان اپنی ملکیت اور اپنی بادشاہی آسانی سے دشمن کے حوالے نہیں کیا کرتے۔ اگر تم اس میدان میں جم گئے تو یہ ملک شام پھر تمہارا ہو گا۔ میرے جاسوسوں نے اطلاع دی ہے کہ مسلمان محص سے باہر آکر ہم سے لڑیں گے۔ میں یہی چاہتا تھا کہ وہ قلعہ بند شہر کی دیواروں سے باہر آ جائیں اور پھر مجھے پورا یقین ہے کہ تم انہیں بھاگنے نہیں دو گے کٹ کر پھینک دو گے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم میں سے ہر سپاہی کو خالص سونے کا ایک ایک ٹکڑا دوں گا۔ تم میں سے جو زیادہ بہادری سے لڑیں گے انہیں الگ انعام دیا جائے گا جو اسے مالا مال کر دے گا۔ یہ بھی سن لو کہ جو بزدلی دکھائے گا اور بھاگے گا اسے زندہ جلادیا جائے گا۔ میں انعام دینے میں ایسی فیاضی کروں گا کہ تم حیران رہ جاؤ گے۔“

اب عقل کی اس اندھی فوج میں کچھ حرکت نظر آنے لگی اور سپاہیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے ہرقل کو خراج تحسین پیش کر رہے ہوں۔ یہ فوج تنخواہ دار تھی۔ ہر سپاہی کے پیش نظر دو چیزیں رہتی تھیں۔ ایک تنخواہ اور دوسرے مال غنیمت۔ اس فوج کو مال غنیمت کہاں سے ملتا؟ یہ تو ہر میدان سے بھاگی ہوئی فوج تھی۔ جانیں پنا

ہی ان کے لئے بہت بڑی غنیمت تھی۔

ہرقل کی تقریر میں جوش بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ سپاہیوں میں کچھ ہلچل پیدا ہو گئی ہے تو اس نے کہا کہ تمہیں سونے اور چاندی کے خزانوں کا شہر ہے۔ اس شہر کو فتح کر لو اور یہ خزانے تمہارے ہوں گے۔ مال غنیمت اتنا زیادہ اور اتنا قیمتی ہے کہ دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے۔ اس شہر میں انتہائی حسین لڑکیاں اتنی زیادہ تعداد میں ہیں کہ ہر سپاہی کے حصے میں ایک لڑکی آجائے گی اور جو سپاہی کسی بھی لڑکی کو ساتھ لے آئے گا، وہ اسی کی ملکیت رہے گی۔

اب تو صاف نظر آنے لگا کہ اس رومی فوج میں زندگی لوٹ آئی تھی۔ ہرقل نے فوج کو بتایا کہ تمہیں میں مسلمانوں کی فوج بہت ہی کم ہے جو ایک دن بھی مقابلہ نہیں کر سکے گی۔

دو تین جرنیل فوج کے پیچھے گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان جرنیلوں میں ایک انتھونیس تھا جس کے پہلو میں ایک اور گھوڑا سوار تھا۔ وہ یوکلکس تھا۔ ہرقل نے یوکلکس کی ماں سے کہا تھا کہ وہ یوکلکس کو جرنیل بنا رہا ہے لیکن اسے عملی تجربے کی ضرورت ہے۔ یوکلکس کی ماں تو خوش ہو گئی تھی اور یوکلکس بھی خوش تھا لیکن ماں بیٹا جان نہ سکے کہ ہرقل اور اس کے بیٹے مسٹنٹین نے یہ انتظام یوکلکس کو مروانے کے لئے کیا تھا۔ اس نے یوکلکس کو بہت دن پہلے جرنیل انتھونیس کے حوالے کر کے کہا تھا کہ اسے میدان جنگ میں قیادت کے عملی سبق دینے ہیں۔

یوکلکس کو اس طرح مروانے کی سازش سے جرنیل انتھونیس کو بے خبر رکھا گیا تھا۔ اسے ہرقل نے کہا تھا کہ یوکلکس کو لڑائی کے دوران اپنے ساتھ ہی نہ رکھے بلکہ اسے کچھ دیر کے لئے الگ کر کے لڑائی میں سپاہیوں کی طرح شامل ہونے دے۔ یوکلکس کو قتل کرنے کا کام دو عہدے داروں کو سونپا گیا تھا۔ انہیں ہرقل نے بتا دیا کہ وہ یوکلکس پر نظر رکھیں اور وہ جب گھمسان کی لڑائی میں ذرا الگ ہو جائے تو اسے قتل کر دیں اور پھر مشہور کیا جائے گا کہ یوکلکس لڑتے ہو مارا گیا ہے۔ ان عہدے داروں سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ یہ قتل انتھونیس کے سامنے نہ ہو۔

یوکلکس کو پہلی بار میدان جنگ میں آنے کا موقع ملا تھا۔ وہ ماہر تیغ زن اور برجھی باز تھا۔ بازو تو اس کا ایک ہی تھا لیکن اسی ہاتھ سے وہ تیغ زنی اور برجھی بازی کے اہل

کمالات دکھاتا تھا کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے تھے۔ وہ بہت ہی خوش تھا کہ اسے لڑنے کا موقع دیا گیا ہے۔

ہرقل کا لیکچر ختم ہو گیا تھا اور فوج ابھی وہیں کھڑی تھی۔ ہرقل گھوڑے پر سوار اپنی فوج کا معائنہ کرنے کو چلا۔ اس کے ساتھ مسٹنٹین گھوڑے پر سوار تھا۔

”اب تو اس یوکلکس کو زندہ رہنے کا حق ملنا ہی نہیں چاہیے“ — مسٹنٹین نے ہرقل سے کہا — ”کیا آپ نے اس کے جرم کی سنگین کا ابھی تک اندازہ نہیں کیا؟ ان قبائلیوں کو یہاں سے بھگانے میں یوکلکس کا بھی اچھا خاصا ہاتھ ہے۔ انہیں میرے خلاف اتنا زیادہ بھڑکادیا تھا کہ مجھے یہ خطرہ نظر آنے لگا تھا کہ لڑائی کے دوران یہ قبائلی میرا حکم مانیں گے ہی نہیں۔“

”میں نے اب فیصلہ بدل تو نہیں دیا“ — ہرقل نے کہا — ”میں اسے زندہ رہنے کے حق سے محروم کر چکا ہوں۔ تم اب یہ سوچو کہ مسلمانوں نے حملہ کر دیا تو تم اس فوج کو کس طرح لڑاؤ گے۔“

مسٹنٹین نے باپ کو یقین دلایا کہ وہ اس فوج کو بڑے کارگر طریقے سے لڑائے گا اور اپنی جان بھی لڑا دے گا۔۔۔۔۔ یہ دونوں باتیں کرتے کرتے یوکلکس اور انتھونیس تک جا پہنچے اور گھوڑے روک لئے۔ ہرقل نے یوکلکس کی پیٹھ تھپکی اور بڑے پیار سے اس کی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ اس لڑائی کے بعد تم جرنیل ہو گے۔

○

امیر المومنین حضرت عمرؓ نے سعد بن ابی وقاصؓ کو عراق پیغام بھیجا تھا کہ تعقل بن عمرو کو چار ہزار سوار دے کر فوراً ”حمص روانہ کر دیا جائے اور وہ کم سے کم پڑاؤ کر کے وہاں پہنچیں۔ تعقل بن عمروؓ کیسری ایران کی فوجوں کے خلاف لڑے تھے اور انہیں شکست دینے میں بہت شہرت حاصل کی تھی۔ ان کی تیز رفتاری تو خاص طور پر مشہور تھی۔ اب بھی وہ حمص کو اسی تیز رفتاری سے جا رہے تھے لیکن فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ ابھی منزل تک نہیں پہنچے تھے۔

حمص میں ابو عبیدہؓ کو پیغام مل گیا تھا کہ تعقل بن عمروؓ کے پاس چار ہزار گھوڑا سواروں کے ساتھ پہنچ رہے ہیں لیکن ابو عبیدہؓ نے ان کا انتظار نہ کیا کیونکہ انہوں نے خالد بن ولیدؓ سے مشورہ کر کے فیصلہ کیا تھا کہ رومیوں کی اس فوج پر فوراً ”حملہ کر دیا جائے۔ ان

دونوں سالاروں نے یہ سوچا تھا کہ یہ فوج اور ہر قل خود بھی صدمے کی حالت میں ہوں گے کہ وہ تیس ہزار قبائلی لشکر سے محروم ہو گئے ہیں۔ دوسری سوچ یہ آئی تھی کہ اس فوج کو اتنی مہلت نہ دی جائے کہ بز فنیہ جاکر قلعہ بند ہو جائے۔ محاصرے کی جنگ لمبی ہو سکتی تھی۔

سالار اس علاقے سے واقف نہیں تھے جس میں ہر قل کی فوج موجود تھی۔ سپہ سالار ابو عبیدہؓ نے حدید کو بلایا۔ حدید تو اس علاقے میں رہ کر آیا تھا اس لئے وہاں کے خدوخال سے ہی نہیں بلکہ چپے چپے سے واقف تھا۔ اس نے سپہ سالار کو وہاں کی زمین نہایت اچھی طرح سمجھادی۔

وہ علاقہ میدانی نہیں، پہاڑی اور جنگلاتی تھا۔ حملے اور لڑائی کا پلان اس کے مطابق بنایا گیا۔ اسی روز پیش قدمی کا حکم دے دیا گیا۔ حدید اپنے دو تین ساتھیوں کے ساتھ ہراول دستے کے ساتھ گائیڈ کے طور پر گیا۔ اوہر ہر قل اور فلسطین ابھی فیصلہ نہیں کر سکے تھے کہ فوج کو یہیں رہنے دیں یا بز فنیہ بلا کر قلعہ بند ہو جائیں۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ انہیں ایسی توقع تھی یا نہیں کہ مسلمان پیش قدمی کریں گے یا تمس میں ہی اس انتظار میں رہیں گے کہ رومی فوج حملہ کرے۔ تاریخ سے اتنا پتہ چتا ہے کہ ہر قل بُری طرح بُوکھلایا ہوا تھا اور تذبذب کے عالم میں تھا۔ اپنی فوج کو بہر حال اس نے ہر وقت تیار رہنے کا حکم دے دیا تھا۔

ابو عبیدہؓ چاہتے تو یہ تھے کہ اچانک رومیوں پر جا پڑیں لیکن ایسی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی کہ وہ رومیوں کو بے خبری میں جالیں گے کیونکہ ہر قل کے مخبر اور جاسوس محض میں بھی موجود تھے اور ان کا بارہر کے علاقے میں بھی موجود ہونا یقینی تھا۔

ابو عبیدہؓ نے اپنے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک حصے کو سیدھا جانا تھا اور دو حصوں کو دائیں اور بائیں دور دور نکل جانا تھا اور دشمن کو یہ تاثر دینا تھا کہ حملہ آور فوج ہی ہے جو سامنے سے آرہی ہے۔

ابو عبیدہؓ اس درمیان والے حصے کے ساتھ تھے۔ اس حصے کی پیش قدمی کی رفتار کم رکھی گئی تاکہ دائیں اور بائیں والے حصے اپنے مقام تک پہنچ جائیں اور پھر سامنے سے حملہ کیا جائے۔ ان پہلوؤں والے دستوں کو دور کا ہیکر کاٹ کر جانا تھا۔

فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ پیش قدمی میں دن ہی گزر جاتا۔ فجر کی نماز کے بعد چلا ہوا

لشکر اُس وقت لڑائی کے مقام پر پہنچ گیا جب سورج سر پر آ رہا تھا۔ جونہی ابو عبیدہؓ کے دستے پہاڑیوں سے نکل کر اس کشادہ میدان میں پہنچے جہاں رومی فوج تھی تو انہوں نے دشمن کو لڑائی کی ترتیب میں تیار پایا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہر قل کو پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی۔ ہر قل خود میدان جنگ میں نہیں تھا۔ کمان اس کے بیٹے فلسطین کے ہاتھ میں تھی۔ مسلمانوں کے لشکر کو دیکھ کر اُس نے بڑے ہی پرجوش لہجے میں اپنی فوج کو لکارا اور کہا کہ وہ دیکھو تمہارا دشمن کتنی تھوڑی تعداد میں ہے اور تم اسے آسانی سے کاٹ دو گے۔ اس کے ساتھ ہی فلسطین نے اپنی فوج کو دائیں بائیں اور زیادہ پھیلا دیا۔

○

اُس زمانے کا ایک دستور یہ بھی تھا کہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے دونوں طرفوں سے ایک دوسرے کو لکارا جاتا تھا کہ ہمارے ایک ہمارے کے مقابلے میں اپنا کوئی بہادر باہر نکالو۔ اس طرح دونوں طرفوں سے ایک ایک آدمی دونوں فوجوں کے درمیان جاکر مقابلہ کرتے تھے جو ایک کے بارے جانے تک جاری رہتا تھا۔ عموماً "خالد بن ولید ایسے کئی مقابلے لڑ چکے تھے اور ان انفرادی مقابلوں میں انہوں نے رومیوں کے کئی جرنیل ہلاک کئے تھے لیکن اس لڑائی میں ایسا کوئی مقابلہ نہ ہوا۔ ابو عبیدہؓ نے آٹھ سائے کے حملے کا حکم دے دیا اور مجاہدین نعرۂ تکبیر کی گرج کے ساتھ پورے خوش خروش سے دشمن کی طرف بڑھے۔ چند منٹوں میں ہی دونوں فوجیں سمٹ کر گھٹا ہو گئیں۔

رومیوں کا جرنیل انتھونیس یوکلکس کے ساتھ ایک پہلو پر تھا۔ وہ اس طرح یوکلکس کو ہربا بتا رہا تھا جس طرح استاد اپنے شاگرد کو سبق دیا کرتا ہے۔ چونکہ وہ جرنیل تھا اس لئے سپاہیوں کی طرح لڑ نہیں رہا تھا بلکہ لڑا رہا تھا۔ اس کے اور یوکلکس کے ہاتھ میں تلواریں تھیں اور گھسان کی لڑائی ان تک پہنچ رہی تھی۔ یوکلکس آگے بڑھ کر لڑنا چاہتا تھا لیکن انتھونیس اسے آگے نہیں جانے دے رہا تھا۔ وہ یوکلکس کو پینترے اور لڑائی کے داؤ پیچ بتا رہا تھا۔

رومی فوج جم کر لڑ رہی تھی۔ وہ تو بدول اور کم حوصلہ فوج تھی کیونکہ اس پر مسلمانوں کی دہشت پہلے ہی طاری تھی۔ توقع نہیں تھی کہ رومی سپاہی اس طرح لڑیں گے لیکن وہ شاید اس خیال سے جم گئے تھے کہ مسلمانوں کی تعداد خاصی تھوڑی تھی۔ فلسطین اپنی اس فوج کو بڑی اچھی طرح کنٹرول کر رہا تھا اور فوج کو دائیں بائیں اس

طرح پھیلانے کی کوشش میں بھی تھا کہ پہلوؤں سے مسلمانوں پر حملہ کیا جائے۔

اس کے مطابق ابو عبیدہؓ مجاہدین کو بھی پھیلاتے چلے جا رہے تھے۔ اس طرح گھمسان کی یہ لڑائی وہاں تک جا پہنچی یہاں انھو نیس اور یوکلس تھے۔ انھو نیس لڑائی میں الجھ گیا اور اس کی توجہ یوکلس سے ہٹ گئی۔ وہ دیکھ نہ سکا کہ یوکلس جوانی کے جوش میں بھول گیا تھا کہ وہ جرنیل تو نہیں لیکن جرنیلی حیثیت کا آدمی ہے۔ وہ تیغ زنی کے جوہر آزمانا چاہتا تھا۔ وہ ایک ہی ہاتھ سے لڑ رہا تھا اور گھوڑے کی لگام اپنے منہ میں لے رکھی تھی۔ یہی اس کا کمال تھا کہ وہ گھوڑے کو بھی اپنے قابو میں رکھے ہوئے تھا اور لڑ بھی رہا تھا۔

انھو نیس نے دائیں بائیں دیکھا اسے یوکلس اپنے ساتھ نظر نہ آیا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ پریشان بھی اتنا کہ وہ لڑائی کو بھول گیا اور یوکلس کو ڈھونڈنے لگا۔ یوکلس جلد ہی اُسے نظر آگیا اور انھو نیس نے گھوڑا اس کی طرف دوڑا دیا۔

انھو نیس نے دیکھا کہ دو مسلمان گھوڑا دو تین رومی گھوڑا سواروں کے تعاقب میں گھوڑے دوڑاتے یوکلس کے قریب سے گزر گئے تھے۔ یوکلس نے اپنا گھوڑا ان کے پیچھے ڈال دیا۔ انھو نیس فوراً اس تک پہنچ کر اسے روکنا اور اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ دو رومی گھوڑا سوار یوکلس کے پیچھے جا رہے تھے۔

انھو نیس نے یہ عجیب منظر بھی دیکھا کہ قسطنطین اس طرف آگیا تھا اور اس نے ایک جگہ گھوڑا روک لیا تھا۔ وہ اس فوج کا کمانڈر تھا اور اسے اس وقت فوج کے پیچھے یا درمیان میں ہونا چاہئے تھے۔ اس کے ساتھ ایک سوار علمبردار تھا اور صرف دو محافظ تھے۔ وہ یوکلس کو مسلمان سواروں کے پیچھے جانا دیکھ رہا تھا۔

ایک رومی سوار یوکلس کے قریب ہو گیا اور تلوار اس طرح بلند کی جیسے یوکلس کو مارنا چاہتا ہو۔ انھو نیس ان کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ اپنا ہی ایک سوار یوکلس کو تلوار مارنے لگا ہے تو انھو نیس نے گھوڑا اور تیز کر کے تلوار اس طرح اس رومی سوار کی پیٹھ میں اتار دی جس طرح بر جھی ماری جاتی ہے۔

ایک اور رومی سوار یوکلس کے گھوڑے کے دوسرے پہلو پر تھا لیکن ذرا آگے تھا۔ انھو نیس نے دیکھا کہ وہ اپنا گھوڑا یوکلس کے گھوڑے کے ساتھ کر کے اسے روکنے کی کوشش میں تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ یوکلس کو مارنا چاہتا ہے۔

انھو نیس نے اپنا گھوڑا اس کی طرف کر لیا اور رومی سوار اسے دیکھ نہ سکا کیونکہ اس کی توجہ یوکلس پر تھی۔ انھو نیس نے اس کے دائیں کندھے پر تلوار کا ایسا زور دار کیا کہ اس کا بازو جسم سے الگ کر دیا۔ اُس کی تلوار اُسی ہاتھ میں تھی۔ انھو نیس نے یوکلس کو اپنے ساتھ لیا اور ایک طرف لے گیا۔

انھو نیس نے پرواہ ہی نہیں کی کہ قسطنطین نے اس کی یہ کارروائی دیکھی ہے یا نہیں۔ یہ کوئی معمولی جرم نہیں تھا کہ اس نے لڑائی کے دوران اپنے ہی دو سپاہیوں کو مار دیا تھا۔ قسطنطین نے انھو نیس کی یہ ساری کارروائی دیکھی اور منہ پھیر کر وہاں سے چلا گیا۔

”آپ نے اپنے ہی آدمیوں کو کیوں کاٹ پھینکا ہے؟“ — یوکلس نے انھو نیس سے پوچھا۔

”اگر میں انہیں دیکھ نہ لیتا تو یہ تمہیں کاٹ پھینکتے“ — انھو نیس نے کہا۔

”اب مجھ سے الگ نہ ہوتا۔“

”کیا آپ مجھے بتائیں گے نہیں یہ معاملہ کیا ہے؟“ — یوکلس نے پوچھا۔ ”میں تو لڑنے آیا تھا۔ اپنے باپ اور بھائی کو میں دکھانا چاہتا تھا کہ میں دیکھنے میں ادھورا ہوں‘ اپنے فرائض کی ادائیگی میں ادھورا نہیں ہوں۔ شاید یہی دیکھنے کے لئے شاہ ہرقل نے مجھے آپ کے ساتھ بھیجا تھا۔“

”نہیں میرے بیٹے!“ — انھو نیس نے کہا — ”تمہارے باپ اور بھائی نے تمہیں یہاں قتل کروانے کے لئے بھیجا تھا اور قتل ان دو آدمیوں نے کرنا تھا جو تم تک پہنچ گئے تھے اور ایک کی تلوار اور تمہاری گردن کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا تھا اور دوسرا سوار اپنا گھوڑا تمہارے گھوڑے کی گردن سے لگا کر تمہیں روک رہا تھا۔ میں نہ دیکھ لیتا تو تمہاری ماں کو یہ خبر سنائی جاتی کہ تمہارا بیٹا بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ اُس وقت قسطنطین اس طرف آگیا تھا۔ اتنی زیادہ خونریزی لڑائی میں قسطنطین کو کہیں اور ہونا چاہئے تھا۔ وہ ادھر آیا تو تم پر حملہ ہوا۔ تمہارے یہ دونوں قاتل کوئی معمولی سپاہی نہیں بلکہ دو چار سو سپاہیوں کی کمان کرنے والے عہدیدار تھے۔“

یوکلس یقیناً حیران نہیں ہوا ہو گا کہ باپ اور بھائی نے اسے قتل کرانے کی سازش

کی تھی۔ شاہی خاندانوں میں خون کے رشتے کوئی معنی نہیں رکھتے اور جہاں تخت و تاج کی جانشینی کا مسئلہ پیدا ہو جائے وہاں بھائی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔

”مجھے بتائیں میں کیا کروں؟“ — یوکلےس نے پوچھا — ”یہاں سے نکل جاؤں یا یہیں رہوں؟“

”میرے ساتھ رہو“ — انتھونیس نے کہا — ”اب تو مجھے بھی یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔ میں نے کمان کرنے والے دو عمدیداروں کو قتل کر دیا ہے۔ یہ کوئی نیس نے گاکہ قتل کی وجہ کیا تھی۔ میرے لئے اب سزائے موت ہے۔“

”پھر آئیں یہاں سے نکل چلیں“ — یوکلےس نے کہا۔

”تم یوں کرو“ — انتھونیس نے کہا — ”یہ جو ٹیکری ہے اس کے پیچھے چلے جاؤ اور اس طرح بزنیہ پہنچو کہ یہاں سے نکلے تمہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ سیدھے اپنی ماں کے پاس پہنچو اور اسے بتا دیا یہاں کیا ہوا ہے اور میں نے تمہیں کیا بتایا ہے۔“

”اور آپ؟“

”ابھی کچھ فیصلہ نہیں کیا“ — انتھونیس نے کہا — ”تم جاؤ۔“

یوکلےس ساتھ ہی ایک ٹیکری کے پیچھے چلا گیا اور وہاں سے اس نے بزنیہ کا رخ کر کے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

○

وہاں ایک گھوڑ سوار کے نکل بھاگنے کا کسی کو پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ فلاں بھاگ نکلا ہے۔ وہاں تو سینکڑوں گھوڑے بھاگتے دوڑتے میدان جنگ سے نکل گئے تھے۔ بعض بغیر سواروں کے تھے۔ ان کے سوار زخمی ہو کر گھوڑوں سے گر پڑے تھے۔ کچھ سوار زخمی ہو کر گرے تو ان کے ایک ایک پاؤں رکابوں میں پھنس گئے تھے اور گھوڑے ان کی لومہاں لاشیں گھسیٹتے پھر رہے تھے۔ بعض گھوڑے زخمی تھے اور وہ اندھا دھند دوڑتے پھر رہے تھے اور بعض گھوڑے اپنے سواروں کو پیٹھوں پر اٹھائے دوڑے جا رہے تھے۔ ان کا رخ انطاکیہ کی طرف تھا جہاں سے آگے ہجیرہ روم کی بندرگاہ تھی۔ اس بندرگاہ پر وہ بحری جہاز کھڑے تھے جو مصر سے ہر قتل کے لئے ملک لائے تھے۔

مورخوں کے مطابق دو تین گھنٹوں تک رومی جم کر لڑتے رہے۔ ہر قتل نے انہیں

سونے کے ٹکڑوں، انعام اور محض کے مال غنیمت کے لالچ جو دیئے تھے، ان میں اتنی طاقت تھی کہ رومیوں کے قدم جم گئے تھے۔

ابو عبیدہؓ نے دیکھا کہ رومی کچھ زیادہ ہی جوش اور جذبے میں ہیں تو انہوں نے خالدؓ بن ولید کو اشارہ کیا۔ مجاہدین کے لشکر کے کچھ دستے دائیں کو اور کچھ بائیں کو چلے گئے تھے۔ یہ خالدؓ بن ولید کے زیر کمان تھے۔ انہوں نے ان دستوں کو ایسی خوبی سے پہاڑیوں کے پیچھے چھپا دیا تھا کہ رومی ان سے خبر نہ رہے۔ پیش قدمی کے دوران انہیں دُور سے ہی پہاڑیوں کے اندر بھیج دیا گیا تھا۔ یہ خالدؓ بن ولید کی ایک خصوصی چال ہوتی تھی جس سے انہوں نے اپنے سے کئی گنا طاقتور دشمن کو کئی میدانوں میں بہت بڑی شکست دی تھی۔ یہاں بھی انہوں نے رومیوں کو یہی دھوکہ دیا۔

ابو عبیدہؓ نے اشارہ کیا تو خالدؓ بن ولید نے دائیں بائیں قاصدوں کو یہ پیغام دے کر دوڑا دیا کہ ٹوٹ پڑو۔

پہلوؤں کے ان دستوں کے کماندار بے تابی سے اس حکم کے منتظر تھے۔ وہ تہج و تاب کھا رہے تھے کہ ان کے بھائی لڑ رہے ہیں، اپنا اور دشمن کا خون بہا رہے ہیں اور وہ پہاڑیوں کے اندر آرام سے چھپے بیٹھے ہیں۔ آخر انہیں حملے کا حکم ملا۔ دشمن کے دونوں پہلوؤں سے پہاڑیوں کے اندر سے گھوڑے سرپٹ دوڑتے اس طرح نکلے جس طرح سیلاب بند توڑ کر غزوات، ٹھاٹھیں مارتا باہر آتا اور جو کچھ بھی سامنے آتا ہے خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا ہے۔

کچھ گھوڑ سوار رومیوں کے عقب میں چلے گئے۔ قسطنطین کے لئے دو ہی راستے رہ گئے تھے۔ اپنی فوج کو کنوا لیتا یا بھاگ نکلتا۔ اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اپنی فوج کو مجاہدین کی تلواروں اور برہمیدوں سے کٹ مرنے اور ان کے گھوڑوں تلے روندے جانے کے لئے چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ رومی سپاہ کٹ کٹ کر گرنے لگی۔ میدان جنگ کے ارد گرد پہاڑیاں، ٹیکریاں اور چٹانیں تھیں۔ رومی جو لڑائی سے نکل سکے وہ پہاڑیوں کے اندر چلے گئے اور بچ نکلے۔

تمام مورخ متفقہ طور پر لکھتے ہیں کہ بھاگنے والے رومیوں کا رخ انطاکیہ کی طرف تھا۔ وہ یہی فوج تھی جو قسطنطین کے ساتھ مصر سے ہر قتل کی مدد کے لئے آئی تھی۔ یہ رومی فوجی اس موقع پر انطاکیہ کی طرف بھاگ رہے تھے کہ جن بحری جہازوں پر وہ آئے

تھے وہ ابھی وہیں ہوں گے اور انہیں واپس مصر لے جائیں گے۔ حیرت ناک بات یہ ہوئی کہ قسطنطین بھی بز فنیہ جانے کی بجائے اٹاکیہ کی طرف بھاگا۔ ظاہر ہے اس کا ارادہ بھی مصر چلے جانے کا تھا۔
ہرقل کی شکست مکمل ہو چکی تھی۔ ملک شام پر اس کا ایک انچ زمین پر بھی تسلط نہیں رہا تھا۔

بز فنیہ میں ہرقل کو اطلاع مل گئی تھی کہ اس کی یہ فوج جو مصر سے آئی تھی اور وہ کچی کچی فوج جو بز فنیہ میں اس کے پاس تھی، سب کٹ مری ہے یا تترہتر ہو کر بھاگ نکلی ہے۔ ہرقل نے اس اطلاع پر پہلا اقدام یہ کیا کہ بز فنیہ سے نکل جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس نے حکم دے دیا کہ بز فنیہ خالی کر دیا جائے۔

خالی کر دینے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ایک دو دنوں میں وہ محل بھی خالی کر جاتا اور وہاں سے نکلنے والے لوگ نکل بھی جاتے، اس انخلا میں بہت سے دنوں کی مہلت درکار تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ ہرقل نے شکست تسلیم کر لی تھی اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مصر چلا جائے گا۔ اپنے مصاحبوں سے اس نے کہا تھا کہ وہ مصر جا کر فوج کو تیار کرے گا اور پھر شام پر فوج کشی کر کے مسلمانوں کو یہاں سے نکال باہر کرے گا۔۔۔۔۔ یہ ایک قدرتی ردِ عمل تھا یا اپنی شکست پر پردہ ڈالنے کا ایک ڈھنگ کہ اس نے یہ اعلان کیا۔ خفت منانے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

یوکلِس میدانِ جنگ سے نکلا تو رات کے وقت بز فنیہ اپنی ماں لیزا کے پاس گیا تھا۔ یہ ایک احتیاط تھی کہ ہرقل کو پتہ نہ چلے کہ یوکلِس آیا ہے۔ ماں یوکلِس کو دیکھ کر یقیناً حیران ہوئی ہوگی کہ یہ لڑکا واپس کیوں آگیا ہے۔ یوکلِس نے ماں کو سارا واقعہ بتایا اور کہا کہ انتھوینیس نہ ہوتا تو ماں کو اس کی لاش ملتی جس کا سرا لگ ہوتا۔
یوکلِس لیزا کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ تو ایسی چوکی کی اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں اور منہ کھل گیا۔ پھر اس کے چہرے پر غصے کا تاثر آگیا اور وہ دانت پیسنے لگی۔

”ظالم جلاؤ!“ — لیزا نے دانت پیٹتے ہوئے کہا — ”میں اسے زہر پلانے آئی تھی لیکن میرے دل میں اس کی ایسی محبت پیدا ہوئی کہ میں نے اسے صاف بتا دیا تھا کہ میں کسری ایران کی طرف سے اس کے لئے سرپا دھوکہ اور فرشتہ اجل بن کر آئی تھی۔ میں

نے محبت سے اندھی ہو کر اس کے ساتھ شادی کر لی اور آج یہ میرے بیٹے کو قتل کروا رہا ہے۔ اس سے میرا اعتماد شادی کے کچھ دنوں بعد ہی اٹھ گیا تھا لیکن میں اس کے ہاتھوں میں مجبور ہو چکی تھی۔“

لیزا نے یہ بات ایسے انداز سے کہی جیسے وہ اپنے آپ سے بات کر رہی ہو۔ یوکلِس اس کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا کہ ماں کیا کہہ رہی ہے۔

ایک دو دنوں بعد انتھوینیس بھی بز فنیہ پہنچ گیا لیکن اس نے بھی ایسی احتیاط کی کہ ہرقل کو پتہ ہی نہ چل سکا کہ اس کا ایک جرنیل میدانِ جنگ سے آیا ہے۔ وہ اپنے گھر بھی نہ گیا، کسی دوست کے ہاں یا اپنے کسی خفیہ ٹھکانے پر چلا گیا۔ وہ جرنیل تھا اور جرنیل عموماً شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انتھوینیس نے اپنے کسی قابلِ اعتماد دوست یا نوکریا کسی اور کو خفیہ طور پر لیزا کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ وہ اسے آ کر ملے۔

لیزا تو بڑی بے تابی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ انتھوینیس سے پوچھنے کو بے تاب تھی کہ اسے کس طرح پتہ چلا تھا کہ ہرقل اور اس کا بیٹا قسطنطین یوکلِس کو اس طریقے سے قتل کرنا چاہتے تھے جو یوکلِس نے اسے سنایا ہے۔۔۔۔۔ جونہی اسے انتھوینیس کا بیٹا ملا وہ چل پڑی اور انتھوینیس کے پاس پہنچ گئی۔ وہ ایک عام عورت کے لباس میں چہرے پر نقاب ڈالے اس کے پاس گئی تھی تاکہ کوئی اسے پہچان نہ سکے۔

”آؤ لیزا!“ — انتھوینیس نے پوچھا — ”کیا تمہیں اپنا بیٹا زندہ و سلامت واپس مل گیا ہے؟“

”ہاں“ مل گیا ہے — لیزا نے کہا — ”لیکن یہ سب ہوا کیا اور ہوا کیسے؟ میں کچھ سمجھی ہوں اور کچھ جاننا چاہتی ہوں۔“

انتھوینیس نے کہا کہ اس نے اسے یہی بتانے کے لئے بلایا ہے کہ وہ یوکلِس اور موت کے درمیان کس طرح آگیا تھا۔۔۔۔۔ ذرا اس منظر کو سامنے لائیں جب قسطنطین ہرقل کے پاس بیٹھا تھا اور وہ یوکلِس کے اس جرم پر نبالہ خیالات کر رہے تھے کہ اس نے ہرقل کی ہے اور قبائلیوں میں قسطنطین کے خلاف بد اعتمادی کی ہے۔ پھر ہرقل نے یوکلِس کو سزائے موت دینے کا فیصلہ سنایا اور اسے قتل کروانے کا جو طریقہ اس کے سامنے آیا تھا، وہ قسطنطین کو بتادیا۔ پھر اس نے لیزا کو اور یوکلِس کو بھی بلایا تھا اور انہیں

یہ جھانہ دیا تھا کہ وہ یوکلےس کو جرنیل بنانے کا فیصلہ کر چکا ہے اور عملی تجربہ حاصل کرنے کے لئے یوکلےس کو میدان جنگ میں جانا پڑے گا۔

ہرقل کے کمرے میں ایک نوخیز اور بڑی ہی دلکش کینز بھی موجود تھی جو وقفے وقفے سے ہرقل کو شراب پلاتی اور پھر الگ ہٹ کر اس طرح کھڑی ہو جاتی تھی کہ اس کی پیٹھ ہرقل اور قسطنطین کی طرف ہو جاتی تھی یا وہ باہر نکل جاتی۔

کینز پیٹھ کر کے دُور جا کھڑی ہوتی یا کمرے سے نکل جاتی، اس کے کان ہرقل اور قسطنطین کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔ اس نے بڑی اچھی طرح سن لیا تھا کہ یوکلےس کو قتل کروایا جائے گا اور اس مقصد کے لئے انہوں نے اسے جرنیل بنانے کی جو بات کی تھی، وہ ایک جھانہ تھا۔ جب ہرقل نے کہا کہ وہ یوکلےس کو انتھو نیس کے حوالے کر دے گا تو کینز چونک اٹھی تھی اور اب وہ ہرقل اور قسطنطین کی باتیں پہلے سے زیادہ غور اور توجہ سے سننے لگی۔ اس نے یوکلےس کے قتل کی ساری سازش سن لی۔

یہ کینز کم سنی میں اس کی بیوہ ماں سے چھپی گئی تھی اور اسے ہرقل کو بطور تحفہ پیش کیا گیا تھا۔ لڑکی چونکہ غیر معمولی طور پر خوبصورت تھی اس لئے اسے ہرقل کی خاص کینز بنا کر اس کے مطابق تربیت دی گئی تھی۔ انتھو نیس اس کینز کی ماں کو اچھی طرح جانتا تھا اور ماں انتھو نیس کو اپنا ہمدرد سمجھتی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ اس عورت کا خاوند انتھو نیس کا دوست تھا۔ وہ مر گیا تھا۔ کینز کی ماں انتھو نیس کے آگے فریادیں کرتی رہتی تھی کہ اس کی بیٹی اسے واپس مل جائے۔

انتھو نیس نے اس عورت کے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ اس کی بیٹی کو کسی نہ کسی طرح ہرقل کے چنگل سے آزاد کرالے گا۔ کینز اسے اپنا مونس و غم خوار سمجھنے لگی اور دل میں اسے باپ کا درجہ دے دیا۔ کینز انتھو نیس کو یوں خوش کرتی رہتی تھی کہ ہرقل اپنے خاص کمرے میں کسی کے ساتھ کوئی بات کرنا اور اس میں کوئی راز ہو تا تو وہ مولع پیدا کر کے انتھو نیس کو بتا دیتی تھی۔ اسی طرح اس نے یوکلےس کے قتل کی سازش انتھو نیس تک پہنچادی۔ اس نے انتھو نیس کو اس لئے سنائی تھی کہ وہ اس خبر سے لطف اندوز ہو گا۔ اس سے زیادہ انتھو نیس کا اس راز کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا لیکن کینز جان بچا کر یہی کہ انتھو نیس کے لئے یہ خبر کس قدر اہم تھی اور اسے جب اس سازش کی تفصیل معلوم ہوئیں تو وہ کس قدر مسرور ہوا تھا۔ یوکلےس کو انتھو نیس کے ساتھ ہی لگا کر

اس کا شاگرد بنا کر محاذ پر بھیجا گیا تھا۔

انتھو نیس نے یوکلےس کی ماں کو بتایا کہ یوکلےس اس کے ساتھ میدان جنگ میں آیا تو ہر وقت اس پر نظر رکھی کہ ایسا نہ ہو کہ قسطنطین کہیں اسے لڑائی سے پہلے مروا دے۔ انتھو نیس یوکلےس کو اپنے سے الگ ہونے ہی نہیں دیتا تھا۔ آخر جنگ شروع ہو گئی۔ اب تو انتھو نیس یوکلےس کو بالکل ہی اپنے ساتھ رکھتا تھا لیکن یوکلےس موقع دیکھ کر اس سے الگ ہو گیا۔

انتھو نیس نے جس طرح یوکلےس کو بچایا وہ بیان ہو چکا ہے۔

”تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟“ — لیزا نے پوچھا۔

”نہیں لیزا!“ — انتھو نیس نے جواب دیا — ”میں نے کچھ سوچ کر ہی تمہیں نہیں بتایا تھا۔ سوچا یہ تھا کہ تم ہرقل کو جانتاؤ گی اور پھر یوکلےس کو محاذ پر نہیں جانے دو گی تو ہرقل اسے کسی اور طرح قتل کروا دے گا۔ میں نے یوکلےس کو بچانے کا عند کر لیا تھا۔ تم جانتی ہو کیوں!“

”ہاں میں جانتی ہوں“ — لیزا نے کہا — ”یوکلےس تمہارا اپنا بیٹا ہے، یہ ہرقل کا بیٹا نہیں۔ میں نے جن بیٹیوں کو جنم دیا ہے وہ ہرقل کی ہیں۔“

”میں نے تم پر پھر کوئی احسان نہیں کیا“ — انتھو نیس نے کہا — ”یوکلےس میرا اپنا بیٹا ہے۔“

ہو ایوں تھا کہ لیزا نے ہرقل کی محبت سے مجبور ہو کر اس کے ساتھ شادی کر لی تھی لیکن ہرقل کا دل چند دنوں بعد ہی لیزا سے ہٹنا شروع ہو گیا تھا۔ اُس وقت انتھو نیس جرنیل نہیں تھا وہ ہرقل کے شاہی محافظ دستے کا کمانڈر تھا۔ اپنے وقت کا خوب اور جاذب نظر جوان تھا۔ لیزا کو وہ اتنا اچھا لگا کہ اس کے ساتھ اس کی خفیہ دوستی ہو گئی تھی۔ یوکلےس اس دوستی کی پیداوار تھا۔۔۔ انتھو نیس کا بیٹا!

”بادشاہوں کی اندرونی دنیا میں یہی کچھ ہوتا ہے“ — انتھو نیس نے کہا — ”مجھے بہت چلنا کہ ہرقل نے قسطنطین کو یا اپنے کسی اور بیٹے کو قتل کروانے کی سازش کی ہے تو میں اس میں ذرا سی بھی دلچسپی نہ لیتا لیکن یوکلےس کو میں یوں قتل ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ میرے خون کا مسئلہ تھا۔“

”قسطنطین نے ہرقل کو بتا دیا ہو گا کہ تم نے اس کی سازش ناکام بنا دی ہے۔“

لیزانے کہا۔ ”کیا ہر قل تمہارا یہ جرم بخش دے گا؟“
 ”نہ بخشے!“ — انھو نیس نے کہا — ”میں روپوش ہو جاؤں گا جس روز پکڑا گیا
 وہ میری زندگی کا آخری دن ہو گا۔“

”ابھی یہیں چھپے رہو“ — لیزانے کہا — ”کیس بھاگنا ہے تو مجھے اور یو کلس کو
 بھی ساتھ لیتے چلو۔“
 ”ہر قل اور قسطنطین کو شکست کا کڑوا گھونٹ نگل لینے دو“ — انھو نیس نے کہا
 — ”اس کے بعد سوچوں گا مجھے کیا کرنا چاہئے۔“

اُدھر ہر قل کی بھاگی ہوئی فوج کے عہدے دار اور سپاہی بندرگاہ تک جا پہنچے اور
 بحری جہاز میں سوار ہو گئے۔ یہ جہاز انہیں لے کر مصر روانہ ہو گیا۔

امیر المومنین حضرت عمرؓ ابھی حمص سے خاصی دُور تھے کہ ابو عبیدہؓ کا بھیجا ہوا قاصد
 ان تک پہنچا۔ ابو عبیدہؓ نے حمّاز سے امیر المومنین کو پیغام بھیج دیا تھا کہ اللہ نے انہیں فتح
 سے نوازا ہے اور اب اس لشکر کی ضرورت نہیں رہی جو حضرت عمرؓ ساتھ لا رہے تھے۔
 امیر المومنین وہیں رک گئے۔ ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ حمص تک چلے جاتے۔
 ابھی پانچ چھ دنوں کی مسافت باقی تھی۔

ہر قل کو تو فیصلہ کن شکست دے دی گئی لیکن عیسائی قبائل جب اپنے علاقوں میں
 پہنچے تو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف مسلح بغاوت کر دی۔

حضرت عمرؓ اُس وقت جابیہ کے مقام تک پہنچ چکے تھے جب انہیں ابو عبیدہؓ کا پیغام
 ملا کہ رومیوں کو فیصلہ کن شکست دے دی گئی ہے۔ امیر المومنین حضرت
 عمرؓ نے وہیں سے مدینہ کو واپسی کا ارادہ کر لیا۔ پہلے سنایا جا چکا ہے کہ امیر المومنین اپنے
 ساتھ ایک لشکر لے کر گئے تھے لیکن اب اس لشکر کی ضرورت نہیں رہی تھی۔
 امیر المومنین کی مدینہ سے لمبی غیر حاضری مناسب نہیں تھی۔ لڑائی صرف حمص اور اس
 کے گرد و نواح میں ہی نہیں لڑی جا رہی تھی بلکہ اُدھر عراق کی فتح ابھی مکمل نہیں ہوئی
 تھی۔ کسریٰ ایران کی فوجوں کو شکست دی جا چکی تھی اور اب قبضہ مکمل کیا جا رہا تھا اور
 مفتوحہ علاقوں کا انتظام اور محسولات وغیرہ کا نظام رواں کرنے کی مہم جاری تھی۔ مجاہدین
 کے لشکر دُور دُور تک پھیل گئے تھے اور ان کے قاصد مدینہ پہنچتے رہتے تھے۔ احکامات
 اور ہدایات جاری کرنے کے لئے امیر المومنین حضرت عمرؓ کو مدینہ میں ہی رہنا چاہئے تھا۔

حضرت عمرؓ جابیہ سے ابھی واپسی کے سفر پر روانہ نہیں ہوئے تھے، روانگی کی تیاری
 ہو رہی تھی کہ ابو عبیدہؓ کا ایک اور قاصد آگیا۔ یہ قاصد امیر المومنین سے ایک فیصلہ لینے
 آیا تھا۔ صورت یہ پیدا ہو گئی تھی کہ ابو عبیدہؓ نے مدینہ قاصد بھیجا تھا کہ امیر المومنین سے
 کہے کہ حمص بڑے سخت خطرے میں آگیا ہے جس کے لئے کمک کی ضرورت ہے۔
 حضرت عمرؓ نے کمک کے جو انتظامات کئے تھے ان میں ایک یہ تھا کہ سپہ سالار سعد بن ابی
 وقاص کو پیغام بھیجا تھا کہ عتقا بن عمرو کو چار ہزار سوار دے کر فوراً حمص روانہ کر
 دے۔

عتقا بن عمرو برق رفتار پیش قدمی اور چپقلی کی طرح دشمن پر جھپٹنے میں خصوصی

پہلے ایک باب میں بیان ہو چکا ہے کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے کون کون سے سالار کو الجزیرہ کا کون کون سا علاقہ دیا تھا اور یہ حکم صادر فرمایا تھا کہ ان عیسائی قبائل کو چین نہ لینے دیا جائے جو رومیوں کی مدد کو تیس ہزار کی تعداد میں پہنچے تھے۔ یہ سالار اس حکم کے مطابق ان علاقوں میں پہنچ گئے تاکہ یہ قبائل سر نہ اٹھائیں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ پیٹھ پیچھے سے وار کر جائیں۔

امیر المومنین نے یہ سالار مجاز مضبوط کر دیا تھا اور جب دیکھا کہ رومیوں کو شام سے ہیشہ کے لئے بے دخل کر دیا گیا ہے تو جابیہ سے واپسی کے سفر کو روانہ ہو گئے۔

○

یہ اسلامی فتوحات تھیں جو بلا شک و شبہ قابل فخر تھیں لیکن فتوحات کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ اس کے مطابق مجاہدین کی تعداد قلیل تھی۔ یہ امیر المومنین حضرت عمرؓ اور پہلے سالاروں کی عقل و دانش کا کرشمہ تھا کہ اسی قلیل نفری کو ایسے پھیلا دیا کہ فتوحات کی وسعت قابو میں رہی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ فتح بظاہر مکمل تھی لیکن سانپ ابھی مرا نہیں تھا۔ ہر قل بھی بزنطیہ سے نکل گیا تھا۔ اس کا رخ ارض روم کی طرف تھا۔

تاریخ سے یہ پتہ نہیں ملتا کہ ہر قل کہاں جا ٹھہرا تھا۔ تاریخ میں ارض روم لکھا ہے۔ شام سے کچھ آگے روم کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ ہر قل خود تو شکست قبول کر کے چلا گیا تھا لیکن اس کا کچھ نہ ہر پیچھے رہ گیا تھا۔ مسلمان مورخوں نے اس پہلو پر کچھ بھی نہیں لکھا، تین یورپی مورخوں کی تفصیلات ملتی ہیں جو ایک اور ہی ڈرامے سے پردہ اٹھاتی ہیں۔ یہ مسلمانوں پر جو ابلی حملے کی ایک کوشش تھی۔

شکست خوردہ رومی فوج کا کمانڈر یعنی سپہ سالار ہر قل کا اپنا بڑا بیٹا قسطنطین تھا۔ وہ بھی بوکھلا کر بھاگا اور بزنطیہ جانے کی بجائے اس نے اناطولیہ کا رخ کر لیا تھا۔ اسے توقع تھی کہ ہر قل اناطولیہ میں ہی ہو گا اور وہاں سے وہ مصر کو روانہ ہو جائے گا لیکن راستے میں اسے پتہ چلا کہ ہر قل اس وقت بزنطیہ میں ہے نہ اناطولیہ میں بلکہ ایک اور جگہ جا پہنچا ہے۔ قسطنطین اس طرف چلا گیا اور اپنے باپ سے ملا۔

”محترم باپ!“ — قسطنطین نے خفت مٹانے کے انداز سے کہا — ”مجھے دلی صدمہ ہے کہ میں آپ کی توقعات پر پورا نہیں اترتا لیکن اس سے پہلے کہ آپ شکست کا الزام مجھ پر عائد کریں میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ شکست کا اصل ذمہ دار کون ہے۔“

شہرت رکھتے تھے۔ وہ کوفہ سے چار ہزار سوار لے کر گولے کی طرح حمص کو روانہ ہوئے تھے لیکن ابھی وہ راستے میں ہی تھے کہ رومیوں پر حملہ کر کے انہیں شام کی سرحد سے نکال دیا گیا اور اس طرح انہیں فیصلہ کن شکست دے دی گئی۔ تعقلؓ اس وقت عمر پہنچے جب یہ فتح مکمل ہو چکی تھی۔ اس وقت کا قومی اور ذاتی کردار قابل توجہ ہے۔ ابو عبیدہؓ نے حمص کو کیا کہ مال غنیمت کی تقسیم میں تعقلؓ بن عمرو اور ان کے سالار اور کا حصہ بھی ہونا چاہئے لیکن وہ تو اس لڑائی میں شامل ہی نہیں تھے اس لئے ابو عبیدہؓ خود فیصلہ نہ کر سکے اور انہوں نے فوراً ”قاصد امیر المومنین کی طرف جابیہ دوڑا دیا کہ یہ فیصلہ لائے کہ تعقلؓ اور ان کے سارے لشکر کو مال غنیمت کا حصہ دیا جائے یا نہیں۔“

امیر المومنین نے جو تاریخی فیصلہ دیا وہ قاصد کو لکھوا کر ابو عبیدہؓ کے نام بھیجا۔ اس فیصلے کے الفاظ آج بھی تاریخ کے دامن میں محفوظ ہیں۔ انہوں نے لکھا — ”اہل کوفہ کو مال غنیمت میں اتنا ہی شریک سمجھا جائے جتنا لڑنے والے مجاہدین شریک ہیں۔“ تعقلؓ اور اس کے مجاہدین اس پہلو سے مال غنیمت کے حق دار بنتے ہیں کہ ان کی آہ کی خبر رومیوں تک پہنچی تو رومی مرعوب ہوئے اور یہ بھی ایک وجہ تھی کہ رومیوں نے شکست کھائی۔ اللہ کوفہ والوں کو جزائے خیر دے کہ وہ اپنے مفتوحہ علاقے کی حفاظت بھرتے ہیں اور جہاں ضرورت پڑتی ہے وہاں مدد کے لئے بھی پہنچتے ہیں۔“

امیر المومنین نے تعقلؓ بن عمرو اور ان کے سواروں کو اہل کوفہ لکھا۔ پہلے بیان ہوا چکا ہے کہ جب حضرت عمرؓ حمص کی طرف مکہ لے کر جا رہے تھے تو انہوں نے کئی ایک جاسوس الجزیرہ کے عیسائی قبائل میں بھیج دیئے تھے اور رومی علاقے میں بھی جاسوس بھیجے تھے۔ انہیں کام یہ سونپا گیا تھا کہ دشمن کے علاقے میں یہ دہشت پھیلا دیں کہ ابو عبیدہؓ کے لئے عراق سے بھی مدینہ سے بھی اور کئی اور جگہوں میں ہے بھی اتنی کمک آ رہی ہے کہ وہ بڑے سے بڑے طاقتور دشمن کو کچل دے گی۔ یہ ایک نفسیاتی حملہ تھا جو امیر المومنین نے کیا تھا۔ اس کا سب سے زیادہ اثر عیسائی قبائل پر پڑا تھا اور وہ رومیوں ساتھ جھوڑ کر اپنے اپنے علاقے میں واپس چلے گئے تھے۔ امیر المومنین یہ بھی جانتے تھے کہ تعقلؓ بن عمرو پیش قدمی کس طرح کیا کرتے ہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر امیر المومنین نے تعقلؓ بن عمرو اور ان کے چار ہزار سواروں کو مال غنیمت میں سے پورا پورا حصہ

دلوایا۔

ہر قل کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔ وہ چپ چاپ قسطنطین کو دیکھتا رہا۔

”اگر الجیریہ کے قبائل ہمارے ساتھ رہتے تو آج ہم یوں پسپا نہ ہوتے۔“
قسطنطین نے کہا۔ ”انہیں یوکلس نے بھگایا تھا۔ یہ تو آپ کو بھی یقین ہے لیکن لڑائی کے دوران ایک اور بڑا ہی خطرناک غدار سامنے آیا ہے۔ وہ ہے ہمارا ایک جرنیل... انتھونیس.... اس نے میری آنکھوں کے سامنے دو تجربہ کار کمانداروں کو قتل کیا ہے۔“
ہر قل چونک اٹھا اور وہ جو پہلے نیم بیداری کی سی کیفیت میں تھا، یک آن بیدار ہو گیا۔

”ہمارے اس جرنیل نے ان دو کمانداروں کو قتل کیا ہے جنہیں ہم نے یوکلس کو قتل کرنے کا کام سونپا تھا۔“ قسطنطین نے کہا۔ ”میں خود دیکھ رہا تھا۔ یوکلس الگ ہو کر لڑائی میں شامل ہو گیا تھا اور دونوں کماندار ہماری ہدایات کے عین مطابق اس تک پہنچ گئے۔ انتھونیس کچھ دور تھا۔ اس نے یوکلس کی طرف گھوڑا دوڑا دیا۔ ایک کماندار یوکلس پر تلوار کا وار کرنے ہی لگا تھا کہ پیچھے سے انتھونیس نے اس کماندار پر تلوار کا زوردار وار کر کے اسے گھوڑے سے گرا دیا۔ ہمارا دوسرا کماندار اپنے گھوڑے کو یوکلس کے گھوڑے سے آگے کر کے روک رہا تھا لیکن انتھونیس نے عقب سے وار کر کے اسے بھی قتل کر دیا۔ میں وہاں سے چلا گیا۔ انتھونیس کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ہم یوکلس کو قتل کروا رہے ہیں پھر اس نے ان دونوں کمانداروں کو کیوں قتل کیا؟.... صرف اس لئے کہ وہ اپنی فوج کو کمزور کر رہا تھا تاکہ ہمیں شکست ہو۔ میں نے لڑائی کی صورت حال کے مطابق انتھونیس کی طرف قاصد دوڑا لیا کہ اپنے دستے کو فلاں طرف لے جا کر مسلمانوں پر حملہ کرے لیکن قاصد اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر واپس آ گیا۔ نہ اسے انتھونیس ملانہ یوکلس.. کیا یہ کھلی غداری نہیں؟“

”وہ اس وقت ہوں گے کہاں؟“ — ہر قل نے پوچھا۔

”میں یہ بھی معلوم کر آیا ہوں۔“ قسطنطین نے جواب دیا۔ ”وہ دونوں

بزنیہ چلے گئے تھے۔ وہاں جاتے دیکھ گئے ہیں۔“

ہر قل پہلے ہی صدے اور غصے سے نیم پاگل ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے محافظ دستے کے کمانڈر کو بلایا اور بڑی ہی گرجدار آواز میں حکم دیا کہ ابھی بزنیہ جاؤ اور جرنیل انتھونیس کو زنجیروں یا رسیوں سے باندھ کر یہاں لے آؤ۔

سورج کبھی کا غروب ہو چکا تھا اور رات گہری ہو گئی تھی۔ محافظ دستے کا کماندار آٹھ دس محافظوں کو ساتھ لے کر بزنیہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ بزنیہ تک پہنچنے کے لئے تین چار گھنٹے درکار تھے۔ ہر قل کا حکم تھا کہ اس جرنیل کو فوراً لایا جائے۔ محافظوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگادی اور گھوڑے سرپٹ دوڑتے گئے۔

آدھی رات سے کچھ پہلے یہ محافظ سوار بزنیہ پہنچے۔ بزنیہ ایک مضبوط قلعہ تھا اور قلعوں کے دروازے سورج غروب ہوتے ہی بند کر دیئے جاتے تھے لیکن اب بزنیہ کے دروازے کھلے تھے کیونکہ ہر قل نے یہ شرخالی کرنے کا حکم دے دیا تھا۔

کماندار کو انتھونیس کے گھر کا علم تھا۔ اس نے اس گھر پر چھاپ مارا لیکن مکان خالی پڑا تھا اور گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ابھی کئی لوگ شہر میں موجود تھے۔ کماندار نے ساتھ والے تین چار مکانوں پر دستک دے کر سب کو جگایا اور انتھونیس کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ انتھونیس کی بیوی اپنے بچوں کے ساتھ شہر سے نکلے دیکھی گئی تھی لیکن انتھونیس کس نظر نہیں آیا۔

اُس وقت انتھونیس بزنیہ سے پورے ایک دن کی مسافت جتنا دور نکل گیا تھا۔ یوکلس بھی اس کے ساتھ تھا اور یوکلس کی ماں لیزا بھی۔ تینوں گھوڑوں پر سوار تھے اور چوتھے گھوڑے پر انہوں نے کھانے پینے کا سامان اور کچھ ضروری اشیاء لاد لی تھیں۔ ان تک کسی کا پچھنا ممکن نہیں رہا تھا۔

محافظ دستے کے کمانڈر نے واپس جا کر بتایا کہ انتھونیس کا گھر خالی ہے اور اس کے بیوی بچے بھی لا پتہ ہیں۔ قسطنطین نے یہ سنتے ہی کہا کہ وہ غدار اپنے بیوی بچوں کو ساتھ لے کر کہیں بھاگ گیا ہے۔ ہر قل پہلے ہی غصے سے پاؤں لہوا جا رہا تھا۔ اس نے حکم جاری کر دیا کہ یہ جرنیل جہاں کہیں نظر آئے اسے پکڑ کر اس کے سامنے لایا جائے۔

”اور دوسرے غدار یوکلس کے متعلق کیا حکم ہے؟“ — قسطنطین نے ہر قل سے پوچھا۔

”اب میں اسے معاف نہیں کر سکتا۔“ — ہر قل نے کہا۔ ”اس کا اب خاتمہ ہی کرنا پڑے گا اور اگر اس کی ماں نے کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو میں اسے بھی دنیا سے اٹھا دوں گا۔ پورا ملک ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ میں تو اپنے آپ کو بھی معاف کرنے کے لئے تیار نہیں۔“

فلسطين نے ہر قل کو اکسا دیا کہ یو کلس کو گرفتار کر لیا جائے یا خفیہ طور پر وہ جہاں کہیں بھی ہے قتل کروا دیا جائے۔

”وہ لڑائی میں مارے ہی نہ گئے ہوں!“ — ہر قل نے کہا۔

”وہ تو لڑے ہی نہیں“ — فلسطين نے کہا — ”میں معلوم کروا چکا ہوں۔ وہ بہت پہلے میدان جنگ سے نکل گئے تھے۔“

آخر ہر قل نے یہ فیصلہ بھی دے دیا کہ یو کلس کو قتل کروا دیا جائے۔ فلسطين اس فیصلے پر بہت خوش ہوا اور اس نے ہر قل سے کہا کہ وہ یہ کام خود کروائے گا۔ وہ باہر نکلا اور اپنے اعتماد کے دو فوجی کمانڈروں کو بلا کر کہا کہ وہ یو کلس کو ڈھونڈیں اور بتائیں کہ وہ کہاں ہے اور پھر وہ انہیں بتائے گا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔

دونوں کمانڈر حکم لے کر یو کلس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

○

رومی فوج اپنی بے انداز لاشیں اور شدید زخموں کو میدان جنگ میں چھوڑ کر پسپا ہو گئی تو مجاہدین نے بال غنیمت اٹھا کر شروع کر دیا۔ سپہ سالار ابو عبیدہ نے یہ یقین کر کے کہ اب دشمن کی طرف سے جو باقی حملے کا کوئی امکان نہیں رہا تو وہ حمص واپس چلے گئے۔ اس کے فوراً بعد حمص میں رومیوں کے ہتھیاروں کا انبار لگنے لگا اور جو بال غنیمت ملا تھا وہ سپہ سالار کے آگے رکھا جانے لگا۔

یہ کوئی معمولی فتح نہیں تھی۔ اسلام کے سب سے بڑے دشمن کو سرزمین عرب سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ ہر کوئی جشن منانے کے موڈ میں تھا۔ مجاہدین کی جویو بیاں بہنیں اور بیٹیاں ساتھ تھیں، وہ زخموں کو اٹھانے اور ان کی مرہم پٹی کروانے کے لئے میدان جنگ میں چلی گئی تھیں۔ شاریتا بھی اُوھر ہی جا رہی تھی کہ ایک آدمی نے اُسے روک کر کہا کہ روم کی فوج کا وہ افسر جسے ایک کمرے میں نظر بند رکھا ہوا ہے، اُسے بلارہا ہے۔

وہ روتاس تھا۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اسے کس طرح حدید اور شاریتا اس کے دو سپاہیوں کو ہلاک کر کے اسے پکڑ لائے تھے اور اس سے ابو عبیدہ نے معلوم کر لیا تھا کہ رومی فوج کہاں ہے اور ہر قل کی اگلی کارروائی کیا ہوگی۔ روتاس نے جنگی نوعیت کی کچھ باتیں بتادی تھیں اور جو راز اس نے نہیں اگلا تھا وہ شاریتا نے بڑے خوبصورت دعوے

سے اس کے سینے سے نکال لیا تھا۔ شاریتا نے ہی اسے قید خانے کی بجائے ایک بڑے اچھے رہائشی کمرے میں رکھوایا تھا۔ سپہ سالار ابو عبیدہ نے اس کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ رومی فوج کو شکست دے دی گئی تو اسے رہا کر دیا جائے گا۔

شاریتا تو اسے بھول ہی چلی تھی۔ روتاس نے ایک ملازم کو بھیج کر شاریتا کو بلایا تو شاریتا فوراً اس کے پاس پہنچی۔

”معلوم ہوتا ہے سپہ سالار اپنا وعدہ بھول گیا ہے“ — روتاس نے شاریتا سے کہا — ”کیا تم اسے میری رہائی کا وعدہ یاد نہیں دلاؤ گی؟“

”سپہ سالار آج ہی واپس آیا ہے“ — شاریتا نے کہا — ”میں ابھی اس کے پاس جا کر تمہاری رہائی کا حکم لے آتی ہوں۔“

روتاس کے دل پر قبضہ کرنے کے لئے شاریتا اسے یہ تاثر دیتی رہی تھی کہ وہ ایک مسلمان کے ساتھ شادی کر بیٹھی ہے لیکن یہاں نہیں رہے گی اور اپنے خاوند حدید کو اپنے ساتھ لے کر ہر قل کے پاس واپس چلی جائے گی۔ اب روتاس نے اسے کہا کہ وہ اس کے ساتھ چلے گی یا کیا کرے گی۔

”میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکوں گی“ — شاریتا نے کہا — ”اب صورت بالکل ہی مختلف ہو گئی ہے۔ ہر قل نہ جانے کہاں سے کہاں جا پہنچا ہے اور اس کی فوج کا تو وجود ہی نہیں رہا۔ میں حدید کو ساتھ لے کر جاؤں گی کہاں؟ تمہیں یہاں سے نکلوا دوں گی اور جب کبھی موقع ملا میں بھی آ جاؤں گی۔“

شاریتا سپہ سالار ابو عبیدہ سے جا ملی اور انہیں روتاس کی رہائی کا وعدہ یاد دلایا۔ ابو عبیدہ نے اُسی وقت روتاس کو اپنے پاس بلوایا۔ روتاس عربی نہیں جانتا تھا اور ابو عبیدہ اس کی زبان نہیں سمجھتے تھے۔ شاریتا دونوں زبانیں سمجھتی اور بولتی تھی۔ وہ ان کے درمیان ترجمان بن گئی۔

”شاریتا بیٹی!“ — ابو عبیدہ نے کہا — ”اسے کہو کہ فتح اور شکست اللہ کے اختیار میں ہے اس لئے ہم سب سے پہلے اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم اُس کے مشکور اور ممنون ہوتے ہیں جس نے ہماری فتح کے لئے ذرا سا بھی تعاون کیا ہو۔ میری طرف سے روتاس کا شکریہ ادا کرو کہ اس نے ہمارے ساتھ تعاون کیا تھا جس نے ہمیں اس فتح میں مدد دی۔ میں اسے کوئی تحفہ دے کر رخصت کرنا چاہتا ہوں۔“

سپہ سالار ابو عبیدہؓ باہر نکل گئے۔ شاریتا نے روتاس کو اپنی زبان میں بتایا کہ سپہ سالار نے کیا کہا ہے اور یہ بتایا کہ سپہ سالار اسے کوئی تحفہ دینا چاہتے ہیں۔ روتاس یہ کہہ ہی رہا تھا کہ اس کے لئے یہی تحفہ بہت ہی قیمتی ہے کہ اسے باعزت طور پر رہا کیا جا رہا ہے کہ سپہ سالار ابو عبیدہؓ واپس آگئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک صلیب تھی جو بمشکل چھ انچ لمبی تھی۔ اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مصلوب جوت بھی تھا۔ صلیب تو لکڑی کی تھی لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بت سونے کا تھا۔

”یہ عیسائی ہے“ — ابو عبیدہؓ نے کہا — ”میں اسے اس کے مذہب کے مطابق تحفہ دے رہا ہوں۔ یہ صلیب ایک مرے ہوئے رومی فوجی افسر کے پاس تھی۔ یہ میرے پاس مال غنیمت کے طور پر آئی ہے۔ اسے بتاؤ کہ سپہ سالار کو اتنا اختیار حاصل نہیں ہوتا کہ وہ مال غنیمت میں سے ایک ذرہ بھی اپنی مرضی سے لے کر خود رکھ لے یا کسی کو دے دے لیکن اس شخص نے ہماری جو مدد کی ہے اس کا صلہ میں اپنے امیر المؤمنین کی طرف سے اور اپنے تمام مجاہدین کی طرف سے دے رہا ہوں۔“

ابو عبیدہؓ نے یہ صلیب روتاس کو دے دی اور شاریتا سے کہا کہ باہر سے کسی نائب سالار یا کماندار یا عہدے دار کو میرے پاس لے آئے۔

شاریتا باہر گئی اور ایک ذمہ دار مجاہد کو اپنے ساتھ لے آئی۔ سپہ سالار ابو عبیدہؓ نے اسے کہا کہ اس رومی کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور اسے جو گھوڑا پسند آئے اس پر زین وغیرہ ڈال کر اسے دے دو اور کسی ایک مجاہد کو اس کے ساتھ بھیجو جو اسے میدان جنگ سے کچھ آگے تک چھوڑ آئے۔ ابو عبیدہؓ نے یہ انتظام یہ سوچ کر کیا تھا کہ مجاہدین اسے رومی سمجھ کر پکڑ نہ لیں۔

”سپہ سالار کا میری طرف سے شکریہ ادا کرو شاریتا!“ — روتاس نے کہا — ”مجھے آج پہلی بار معلوم ہوا ہے کہ مسلمانوں کا کردار کس قدر بلند اور قابل تعریف ہے۔ میں اب سمجھا ہوں کہ اسلام کیوں اتنی تیزی سے پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ انہیں یہ بھی کہو کہ میں اس جنگ و جدل کو بھول جاؤں گا، ملک شام کو بھی بھول جاؤں گا لیکن سپہ سالار کا حسن سلوک کبھی نہیں بھول سکوں گا۔“

روتاس نے سپہ سالار ابو عبیدہؓ کے ساتھ ہاتھ ملایا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر رومی انداز سے سیلوٹ کیا اور باہر چلا گیا۔

وہاں گھوڑوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اُن رومیوں کے سینکڑوں گھوڑے پکڑے گئے تھے جو مارے گئے تھے یا شدید طور پر زخمی ہو گئے تھے۔ روتاس نے ایک اعلیٰ نسل کا نہایت تندرست گھوڑا پسند کیا جو اس کی اپنی ہی فوج کے کسی مرے ہوئے سوار کا تھا۔ وہ اس گھوڑے پر سوار ہوا اور ایک مجاہد اس کے ساتھ چلا گیا۔ تمس سے کچھ دور جا کر اسے اپنی فوج کی بکھری ہوئی لاشیں نظر آنے لگیں۔ وہ ان لاشوں کو دیکھتا اور اس احتیاط سے گھوڑے کو دائیں بائیں کرتا آگے بڑھتا گیا کہ گھوڑے کا پاؤں کسی لاش یا بے ہوش زخمی پر نہ آجائے۔ تصور میں لایا جاسکتا ہے کہ اپنی فوج کی اتنی زیادہ خون میں نہانی ہوئی لاشیں دیکھ کر اس کی جذباتی کیفیت کیا ہوئی ہوگی۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس نے گھوڑا روک لیا اور اپنے ساتھ آنے والے مجاہد سے ہاتھ ملایا اور اشارے سے کہا کہ وہ اب واپس چلا جائے۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگادی اور گھوڑا دوڑ پڑا۔ اب اس نے نہ دیکھا کہ گھوڑا لاشوں پر پاؤں رکھتا دوڑا رہا ہے یا لاشوں سے بچ بھی رہا ہے یا نہیں۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ روتاس کا رخ بزنیہ کی طرف تھا۔ وہ جب میدان جنگ سے دور نکل گیا تو گھوڑے کی رفتار کم کر دی تاکہ یہ تھک نہ جائے۔ اس کی منزل ابھی خاصی دور تھی۔

اسے خیال آیا کہ وہ بزنیہ جا رہا ہے لیکن ہر قل یا اس کا کوئی جرنیل اس سے پوچھے گا کہ وہ اتنا عرصہ کہاں رہا ہے تو کیا جواب دے گا؟.... وہ پہلے ہی اپنی فوج کی شکست سے دل برداشتہ تھا۔ صدے کا بوجھ اس کے دہی پر ایسا پڑا تھا کہ وہ کوئی صحیح فیصلہ نہ کر سکا۔ اسے خطرہ یہ محسوس ہونے لگا کہ اس کی صحت اور جسمانی حالت اتنی اچھی ہے کہ کوئی مانے گا بھی نہیں کہ وہ مسلمانوں کی قید سے رہا ہو کر آیا ہے۔ قیدی کے ساتھ کوئی ایسا اچھا سلوک نہیں کیا کرتا کہ اسے مسخر ز مہمان سمجھا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اسے اس جرم کا احساس پریشان کرنے لگا کہ اس نے مسلمانوں کے سپہ سالار کو راز کی باتیں بتادی تھیں۔ وہ ہر قل کو بھی جانتا تھا۔ ہر قل فرعون قسم کا بادشاہ تھا جو سزائے موت سے کم بات ہی نہیں کرتا تھا۔ روتاس تذبذب میں مبتلا ہو گیا اور اس کے ذہن میں ایک کشمکش شروع ہو گئی جو اذیت ناک ہوتی چلی گئی۔ اس نے اپنی جیب سے وہ صلیب نکالی جو اسے سپہ سالار ابو عبیدہؓ نے تحفے کے طور پر دی تھی۔ شام ابھی گہری نہیں ہوئی تھی۔ کچھ دُور تک نظر کام کرتی تھی۔ اُس نے صلیب پر مصلوب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بت دیکھا۔

”کہاں جاؤں؟“ — اس نے بُت سے پوچھا — ”یسوع مسیح! میری راہنمائی کریں۔ مجھے اُس راستے پر ڈال دیں جو مجھے بھلائی اور روحانی اطمینان کی منزل تک پہنچا دے۔“

اس نے بُت کو آنکھوں سے لگایا، ہونٹوں سے لگایا پھر جیب میں ڈال لیا اور گھوڑے کی لگام کو ہلکا سا جھٹکا دیا، گھوڑا چل پڑا لیکن روتاس نے گھوڑے کا رخ دائیں طرف موڑ دیا۔ اس نے بز نظیہ کو ذہن سے نکال پھینکا تھا۔ اس نے کوئی واضح فیصلہ نہیں کیا تھا کہ آخر جانے گا کہاں، یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ بز نظیہ نہیں جائے گا اور ہرقل کا سامنا نہیں کرے گا۔

روتاس ہرقل کی جاسوسی کے شعبے کا افسر تھا۔ شام کے چپے چپے سے اور مختلف علاقوں میں رہنے والے لوگوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جس طرف چل پڑا ہے اُدھر عیسائی قبائل رہتے ہیں۔ سوچ سوچ کر وہ اس فیصلے پر پہنچا کہ کسی قبیلے میں جا پناہ لے گا اور پھر سوچے گا کہ وہ کیا کرے اور کہاں جائے۔



ادھر انتھونیس یوکلِس اور اس کی ماں لیزا کو ساتھ لئے بڑی تیز رفتاری سے چلا جا رہا تھا۔ وہ اتنی دور نکل گئے تھے کہ اب تعاقب کا کوئی خطرہ نہیں رہا تھا پھر بھی وہ لوگ کہیں رک نہیں رہے تھے حالانکہ رات گہری ہو گئی تھی اور ان کے گھوڑے ان کے بوجھ تلے دن بھر دوڑتے اور چلتے رہے تھے۔ راستے میں لیزا نے انتھونیس سے تین چار مرتبہ پوچھا تھا کہ آخر وہ انہیں کہاں لے جا رہا ہے؟ انتھونیس نے ہر بار یہی کہا تھا کہ آگے چل کر بتاؤں گا۔

رات گزرتی چلی جا رہی تھی اور اب وہ ہرے بھرے علاقے میں پہنچ گئے تھے جہاں سرسبز اونچی نیچی ٹھیکریاں زیادہ تھیں۔ چاند اوپر آ رہا تھا۔ ایک موزوں جگہ دیکھ کر انتھونیس رک گیا اور گھوڑے سے اترا۔ اس نے بتایا کہ رات گزرنے کے لئے یہ جگہ ٹھیک ہے۔

انہوں نے چوتھے گھوڑے سے کھانے پینے کا سامان نکالا اور کھانے بیٹھ گئے۔

”ہم اپنی جانیں تو بچا لائے ہیں“ — کھانے کے بعد لیزا نے کہا — ”اب ہمیں کہیں روپوش ہونا ہے۔ تم جانتے ہو انتھونیس! میں کسریٰ ایران کے شاہی خاندان کی

شرادی تھی۔ میں ہرقل کے ہاں کسی اور مقصد کے لئے آئی تھی لیکن ہو کچھ اور گیا۔ اب تو میں اپنے شاہی خاندان کی مجرم ہوں۔ اب تو میں وہاں بھی نہیں جاسکتی۔ مجھے عام لوگوں جیسی زندگی گزارنی پڑے گی۔“

”اور مجھے آپ اپنے ساتھ کیوں لے آئے ہیں؟“ — یوکلِس نے کہا — ”میں تو قسطنطین کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ میں شاید اپنے باپ ہرقل کو بھی قتل کر دیتا۔ آپ مجھے ہمیں سے واپس جانے دیں۔ وہ بزدلوں اور فریب کاروں کی طرح مجھے قتل کروا رہے تھے۔ میں ان کے سامنے جا کر اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قتل کروں گا۔“

”اب کوئی ایسی ضرورت نہیں“ — انتھونیس نے کہا — ”اب ایک اور بادشاہی وجود میں آئے گی۔ میں اس کی بنیاد رکھوں گا۔ فارس اور روم کی بادشاہیاں ختم ہو چکی ہیں۔ اب زمین پر ایک اور بادشاہی نمودار ہوگی جو ایران کی نہیں ہوگی نہ روم کی، یہ صلیبِ اعظم کی بادشاہی ہوگی جو ساری دنیا پر پھیلے گی۔ ہرقل کے پاس صرف مصر رہ گیا ہے یا ارضِ روم۔ میں اسے مصر سے نکال کر ارضِ روم میں محدود کر دوں گا۔“

”انتھونیس!“ — لیزا نے کہا — ”تم بہت تھک گئے ہو۔ تم پر یہ خوف بھی غالب ہے کہ پڑے گئے تو ہرقل قتل کروا دے گا۔ سو جاؤ، آرام کرو، دماغ ٹھکانے آ جائے گا۔ تم بیداری میں خواب دیکھ رہے ہو۔“

”نہیں لیزا!“ — انتھونیس نے کہا — ”میں تھکا ہوا بھی نہیں اور میں ڈرا ہوا بھی نہیں۔ اتنا بیدار میں کبھی بھی نہیں ہوا تھا جتنا اب ہوں۔ تم خواب کی بات کرتی ہو، میں نہیں بتاتا ہوں کہ میں کس حقیقت پر یہ ارادے باندھ رہا ہوں۔ الجزیرہ کے یہ عیسائی قبائل میری فوج ہوگی۔ کیا تم نے دیکھا نہیں تھا کہ یہ لوگ کس طرح تیس ہزار کا لشکر ہرقل کے پاس لے کر پہنچ گئے تھے؟ اگر ہرقل ان پر اپنا اعتماد بٹھادیتا تو تیس ہزار کا ایک اور لشکر آ سکتا تھا لیکن ہرقل پر اور ہرقل کی فوج پر ان قبائلیوں کو بھروسہ نہیں تھا۔ یہ لوگ عیسائی ہیں اور مسلمانوں کے خلاف لڑنا چاہتے ہیں۔ میں انہیں جانتا ہوں یہ لوگ اسلام کے آگے دیوار کھڑی کرنے کو بے تاب ہیں۔ میں انہیں اعتماد میں لوں گا۔“

”لیکن اب ہمدلی منزل کیا ہوگی؟“ — لیزا نے پوچھا۔

”کیا یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے!“ — انتھونیس نے کہا — ”اس ملک شام پر ناری حکومت رہی ہے۔ میں سارے ملک میں گھوما پھرا ہوں۔ الجزیرہ میں تو میں بہت

عرصہ رہا ہوں اور مختلف قبائل کے سرداروں کو صرف جانتا ہی نہیں بلکہ بعض کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان میں کون کون سے قبیلے زیادہ طاقتور ہیں۔ میں ان میں سے کسی ایک کے پاس جا رہا ہوں۔ مجھے پوری امید ہے کہ یہ لوگ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ یہ تو خوش ہوں گے کہ انہیں ایک تجربہ کار جرنیل مل گیا ہے۔ میں انہیں ایک فوج کی صورت میں منظم کر لوں گا اور ان کی تربیت اسی طرح کروں گا جس طرح ہم اپنی فوج کی کرتے تھے۔“

انٹونیٹس نے جن دو عیسائی قبیلوں کی طرف اشارہ کیا تھا ان میں ایک تھا بنی ربیعہ اور دوسرا تھا بنی تنوخ۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دو قبیلے اخرا دی قوت اور مالی لحاظ سے بہت طاقتور تھے اور دیگر چھوٹے بڑے قبائل انہیں اپنا لیڈر مانتے تھے۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ کو جب یہ اطلاع ملی تھی کہ الجزیرہ کے عیسائی قبائل تیس ہزار لشکر کی صورت میں ہرقل کے پاس بزنطیہ پہنچ گئے ہیں تو امیر المومنین نے پہلی بات کہی تھی کہ میں جانتا ہوں ان قبائل کی قیادت بنی ربیعہ اور بنی تنوخ کر رہے ہیں۔ امیر المومنین نے ایک حکم یہ دیا تھا کہ ان دونوں قبیلوں کی بستیوں کو تباہ و برباد کر دو تاکہ یہ آئندہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں کیونکہ یہ دو قبیلے جنگ و جدل کے شوقین بھی تھے اور یہ ان کی روایت بھی تھی۔

ایسا طاقتور تیسرا قبیلہ بنو ایاد تھا۔ یہ قبیلہ بھی طاقتور تھا لیکن اس قبیلے میں کچھ ایسے دانشمند بھی تھے کہ وہ حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتے تھے اور اپنے مفاد کی خاطر جھک بھی جایا کرتے تھے۔ یہ تینوں قبیلے حلب کے گرد و نواح میں رہتے تھے اور دوسرے قبائل الجزیرہ میں پھیلے ہوئے تھے۔

یہ تھی ایک اور طاقت جو مسلمانوں کے خلاف اٹھنے والی تھی۔ یہ اس لئے خطرناک تھی کہ اس کا کسی کو علم ہی نہیں تھا اور ایسی خفیہ کہ اسے جاسوس بھی ابھرتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔

”تم جرنیل ہو انٹونیٹس! یقیناً مجھ سے زیادہ جانتے اور سمجھتے ہو“ — لیزانے کا — ”لیکن میں بھی کچھ جانتی ہوں۔ جن مسلمانوں کا مقابلہ اتنی طاقتور فوج نہیں کر سکی ان کے مقابلے میں یہ غیر تربیت یافتہ قبائلی کیسے لڑ سکیں گے؟ یہ لوگ بغاوت کر سکتے ہیں اور ہرقل نے انہیں مسلمانوں کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے کہا بھی تھا۔“

”میں جرنیل ہوں لیزا!“ — انٹونیٹس نے کہا — ”میں فوجوں کی خوبیاں اور خامیاں سمجھتا ہوں۔ مسلمانوں نے ملک شام فتح تو کر لیا ہے لیکن وہ اس قدر تھک چکے ہیں کہ یہاں سے آگے بڑھے تو ان کا دم خم ختم ہو جائے گا۔ ان کے مقابلے میں قبائلی تازہ دم ہیں۔ ابھی تک وہ کہیں بھی نہیں لڑے۔ ذاتی بہادری اور لڑنے کا جذبہ کافی نہیں ہوتا۔ یہ اہلیت اور صلاحیت ان قبائلیوں میں ہے۔ انہیں ایک جرنیل کی ضرورت ہے اور میں ان کی یہ ضرورت پوری کر دوں گا۔“

○

رومی جرنیل انٹونیٹس نے غلط نہیں کہا تھا کہ مسلمان تھک چکے ہیں لیکن مسلمانوں کے امیر المومنین، سپہ سالار اور دیگر سالار دماغی طور پر زندہ و بیدار اور ترو تازہ تھے۔ وہ دشمن کی طرف سے بے خبر ہو کر آرام کرنے بیٹھ نہیں گئے تھے یا مال غنیمت لٹٹنے میں نہیں لگ گئے تھے۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ جب جابیہ سے مدینہ کو واپس چلے تھے تو یہ حکم آگے بھیج کر چلے تھے کہ جن سالاروں کو مختلف علاقے دیئے گئے ہیں ان علاقوں کی بستیوں پر اور چھوٹی بڑی قلعہ بندیوں پر حملے شروع کر دیں۔

یہ علاقے الجزیرہ کے عیسائی قبائل کے تھے۔ امیر المومنین نے سوچا تھا کہ ان قبائل کو ذرا سا بھی دم لینے دیا تو یہ متحد ہو کر ایک لشکر بن جائیں گے۔ ایک بار تو وہ رومیوں کے پاس جا کر بھی واپس آگئے تھے لیکن رومی انہیں ایک بار پھر اپنے مفاد کے لئے استعمال کر سکتے تھے۔

یہ تمام علاقے مسلمانوں نے فتح کر لئے تھے لیکن کچھ چھوٹے بڑے قلعے اور بستیاں ایسی تھیں جہاں مجاہدین کی نفری بہت ہی کم تھی۔ وہ اس لئے کہ ابھی زیادہ سے زیادہ نفری کی ضرورت محض کے میدان جنگ میں تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض علاقوں میں عیسائی قبائل نے بغاوت کر دی اور مسلمانوں کا قبضہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

پہلی بغاوت کی اطلاع ایک قلعہ بند شہر رقعہ سے آئی۔ وہاں مجاہدین کی نفری بہت ہی تھوڑی تھی۔ زیادہ نفری کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی تھی۔ یہ مجاہدین دراصل انتظامیہ کے اہلکار تھے جنہیں وہاں جزیہ اور دیگر محصولات وصول کرنے کے لئے رکھا گیا تھا۔ وہاں کے لوگوں نے جزیہ اور محصولات دینے سے انکار کر دیا اور ان مسلمان اہلکاروں کو ایک جگہ بند کر کے بے بس کر دیا۔

معلوم نہیں وہ کوئی مجاہد تھا جو کسی طرح ان عیسائیوں سے بچ کر نکل آیا یا ان چند ایک عیسائیوں میں سے کوئی تھا جنہیں مسلمانوں نے اپنے جاسوس بنالیا تھا، ان میں سے کسی نے وہاں سے نکل کر پیچھے اطلاع دی کہ رقبہ میں بغاوت ہو گئی ہے۔ یہ علاقہ ایک سالار سہیل بن عدی کی ذمہ داری میں تھا۔ انہیں اطلاع ملی تو وہ اپنے لشکر کے ساتھ فوراً رقبہ کی طرف کوچ کر گئے۔

رقبہ پہنچے تو دیکھا کہ یہ تو اچھا خاصا مضبوط قلعہ ہے جس کے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں۔ عیسائی دیواروں کے اوپر کھڑے مسلمانوں کو لٹکار رہے تھے۔ ان کے پاس کمائیں تھیں جن میں تیر ڈال کروہ دفاع کے لئے تیار تھے۔ بعض کے ہاتھوں میں پھینکنے والی چھوٹی برچھیاں تھیں۔ قلعہ کا دفاع مضبوط نظر آ رہا تھا۔

سالار سہیل بن عدی نے اعلان کروایا کہ فوراً ہتھیار ڈال دو اور قلعہ کے دروازے کھول دو۔ اگر ہم نے لڑکر قلعہ فتح کیا تو سب کو غلام بنا کر عرب بھیج دیا جائے گا اس اعلان میں یہ بھی کہا گیا کہ جنہوں نے ہر قل جیسی طاقتور شاہی فوج کو بار بھگایا ہے ان کے سامنے تم لوگ ایک دن بھی نہیں ٹھہر سکو گے۔ دروازے کھول کر اطاعت قبول کر لو گے تو تمہارے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو ہم لوگ ہر مفتوحہ جگہ کے لوگوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ تمہارے جان و مال اور عزت کی حفاظت ہم کریں گے۔

”ہمت ہے تو آگے بڑھو اور دروازے خود کھول لو۔“
”رومی اس لئے بھاگ گئے ہیں کہ یہ علاقہ ان کا نہیں ہمارا ہے۔“
”یہ علاقہ تمہارا بھی نہیں۔ ہم تمہیں بھی یہاں سے بھگادیں گے۔“

مسلمانوں کے اعلان کے جواب میں ایسی ہی لٹکار سنائی دی اور عیسائی قلعے لگانے لگے۔ انہیں اپنی طاقت پر بھروسہ تھا۔ معلوم ہوا کہ تین چار قبیلے اس قلعے میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ قلعہ کو کوئی فوج ہی بچا سکتی ہے جسے قلعہ بند ہو کر لڑنے کی تربیت دی گئی ہو اور یہ فوج تجربہ اور مہارت رکھتی ہو۔ قلعہ کی دیواریں اور دروازے اندر والوں کو کچھ ہی وقت کے لئے بچا سکتے ہیں۔

سالار سہیل بن عدی نے اپنے تیر اندازوں کو آگے کیا اور دیوار کے تھوڑے سے حصے پر بڑی تیز تیر اندازی کا حکم دیا۔ تیر اندازوں نے تیروں کی بوچھاڑیں پھینکنی شروع کر دیں لیکن دیوار کے اوپر والے تیر اندازوں نے جب تیر پھینکے تو ان کے سامنے ٹھہرا محال

ہو گیا۔ تیروں کے ساتھ برچھیاں بھی آنے لگیں۔
”یہ کم عقل اور اناڑی ہیں“ — سالار سہیل نے کہا — ”برچھیاں ضائع کر رہے ہیں۔ برچھیاں اکٹھی کر لو، یہ ہمارے کام آئیں گی۔“

ان تیروں کے سائے میں سالار سہیل نے اپنے کچھ جانبازوں کو پہلو کے ایک دروازے کی طرف اس مقصد کے لئے دوڑایا کہ وہ دروازہ توڑ دیں۔ یہ جانباز کھانڈوں سے مسلح تھے لیکن دیوار پر کھڑے تیر اندازوں نے اپنے تیروں کا رخ اس طرف کر دیا جس سے جانباز دروازے تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کچھ جانباز تیر اپنے جسموں میں لے کر واپس آئے اور کچھ تیروں کی زد میں آنے سے پہلے ہی پیچھے آ گئے۔

سالار سہیل نے قلعہ کا ایک چکر لگایا۔ وہ اب دیکھ رہے تھے کہ دیوار کہیں سے کمزور نظر آئے تو دیوار توڑی جائے۔ جانبازوں نے کہا کہ دیوار مضبوط ہی سہی، وہ کسی نہ کسی جگہ سے اسے توڑ لیں گے۔ قلعہ توڑنے اور سر کرنے میں مسلمان خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس مہارت کی اصل حقیقت یہ تھی کہ مسلمانوں میں جذبہ تھا۔ ان کا لڑنے کا اصول یہ تھا، فتح یا شہادت۔

یہ تفصیلات خاصی طویل ہیں کہ سالار سہیل بن عدی نے قلعہ توڑنے کے لئے کیسے کیسے اقدامات کئے اور مجاہدین نے کس طرح جانیں پھیلیں پر رکھ کر ہر اقدام کامیاب کرنے کی کوشش کی۔ کوشش تو کوئی بھی کامیاب نہ ہوئی لیکن دشمن پر دھاک بیٹھ گئی اور دیواروں کے اندر کے لوگوں پر خوف و ہراس طاری ہونے لگا۔

تاریخ نویس ابن کثیر اور بلاذری لکھتے ہیں کہ ابھی سات آٹھ دن ہی گزرے ہوں گے کہ قلعہ کے اندر سے اعلان ہوا کہ وہ لوگ صلح کرنا چاہتے ہیں اس لئے لڑائی ملتوی کی جائے اور جو جمل ہے وہیں رہے۔ سالار سہیل بن عدی نے عارضی طور پر جنگ بندی کر دی۔

ان دونوں تاریخ نویسوں نے اس جنگ بندی کا پس منظر یوں بیان کیا ہے کہ جب ان عیسائی قبائلیوں نے دیکھا کہ مسلمان غیر معمولی تابہ توڑ جملے کر رہے ہیں تو وہ جان گئے کہ یہ لوگ قلعہ سر کر کے ہی رہیں گے اور پھر ان کی کوئی شرط قبول نہیں کریں گے۔

قبائل کے سرداروں نے سر جوڑے اور ایک صحرا دان شور نے انہیں صحیح صورت حال سے آگاہ کیا اور کہا کہ اس پر غور کریں۔

یہ شہر دنیا کے نقشے پر موجود نہیں۔ وہاں بھی ہر قل کی جو جائے رہائش تھی وہ شاہی محل سے کم نہ تھی۔ شاہی لوازمات بھی موجود تھے، شراب بھی تھی اور شراب پلانے والی کنیریں بھی تھیں اور حسین و جمیل کنیریں حاضری میں موجود رہنے والی بھی تھیں۔ عورتوں کا حرم بھی ساتھ تھا جس میں یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ بیوی کون اور داشتہ کون ہے۔

ہر قل اپنے خاص کمرے میں سر جھکائے ہوئے ٹھل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تذبذب اور احتجاج تھا۔ فلسطین الگ بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی تو جیسے جرات ہی نہیں ہو رہی تھی کہ باپ کے ساتھ کوئی بات کرے۔ وہ باپ کی جذباتی کیفیت اور مزاج کے عتاب سے واقف تھا.... وہ ٹٹلتے ٹٹلتے رک گیا اور اس نے اپنے بیٹے فلسطین کی طرف دیکھا۔

”صرف انتھونیس ہی غدار نہیں تھا“ — ہر قل نے کہا — ”میری اپنی بیوی لیزا اور بیٹا پولکس بھی مجھے دھوکہ دے گئے ہیں۔ وہ یقیناً“ اکٹھے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ لیزا کو پتہ چل گیا تھا کہ ہم اس کے بیٹے کو قتل کروا رہے ہیں۔“

”محترم باپ!“ — فلسطین نے کہا — ”میں انہیں غدار ہی کہوں گا۔“

”میں پوری فوج کو غدار کہتا ہوں“ — ہر قل نے کہا — ”میں نے ابھی کوئی ایسا فیصلہ کیا تو نہیں لیکن ہو سکتا ہے میں کسی وقت یہ فیصلہ دے دوں کہ جو کمانڈر بچ کر نکل آئے ہیں انہیں قتل کر دیا جائے۔ ان بد بختوں نے اپنے اوپر مسلمانوں کی دہشت طاری کر لی تھی۔ میں اب نئی فوج بناؤں گا اور بہت جلد واپس آکر شام پر حملہ کروں گا۔ ہر قل کوئی ایسا معمولی نام نہیں جو تاریخ سے مٹ جائے گا۔ آنے والی نسلیں ہر قل کو ایک آسمانی طاقت کے طور پر یاد رکھیں گی۔“

اسے میں دربان نے آکر اطلاع دی کہ جرنیل انتھونیس کی بیوی اپنے دو بچوں کے ساتھ آئی ہے اور وہ شاہ ہر قل سے ملنا چاہتی ہے۔ فلسطین چونک کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے ہر قل کی طرف دیکھا کہ وہ اس عورت کو اندر آنے کی اجازت دیتا ہے یا نہیں۔ ہر قل کچھ دیر سر جھکائے سوچتا رہا پھر اس نے سر سے ہلکا سا اشارہ کیا کہ اسے اندر بھیج دو۔ حیثیت کے لحاظ سے وہ کوئی عام سی حیثیت کی عورت نہیں تھی، ایک نامور جرنیل کی بیوی تھی۔

”تم جنگجو بھی ہو سکتے ہو بہادر بھی“ — اس بزرگ دانشور نے کہا — ”لیکن یہ تو سوچو کہ تم کس کی لڑائی لڑ رہے ہو؟ یہ عرب، عجم اور روم کی جنگ ہے۔ ہم عربی بھی نہیں، عجمی بھی نہیں اور ہم رومی بھی نہیں۔ یہ مسلمان اس جرم کی سزا دے رہے ہیں کہ ہم لوگ رومیوں کی مدد کو چل پڑے تھے۔ میں نے اُس وقت بھی کہا تھا کہ پرانی لڑائی لڑنے نہ جاؤ، فائدہ کچھ نہیں ہو گا اور تباہی جو رومیوں کی ہو گی اس میں سے تمہیں بھی حصہ مل جائے گا۔ آج ہم لوگ تباہی کا حصہ وصول کر رہے ہیں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ صلح کر لو اور مجھے یقین ہے کہ مسلمان تمہیں عزت اور تکریم دیں گے۔“

ایک اور سردار نے کہا کہ لڑنا ہے تو تمام قبائل اکٹھے ہو کر ایک لشکر تیار کریں اور پھر مسلمانوں کو لٹکاریں کہ یہ ہماری زمین ہے، یہاں سے چلے جاؤ ورنہ ہم تلواروں کے زور سے تمہیں نکالیں گے۔

سب سردار متفق ہو گئے۔ انہوں نے اُسی وقت مسلمان اہلکاروں کو قید سے آزاد کیا اور اپنے پاس بلا کر پوچھا کہ وہ صلح کا معاہدہ کرنا چاہتے ہیں، اس کا اختیار کون سے سالار کے پاس ہے؟ کیا یہی سالار صلح کر لے گا جس نے محاصرہ کر رکھا ہے؟.... ان مسلمانوں نے انہیں بتایا کہ الجزیرہ کا علاقہ تین سالاروں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان کا سپہ سالار عیاض بن غنم ہے جو اس وقت واسط میں ہو گا۔ صرف اسے صلح کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

ان عیسائی قبائل کے سرداروں نے اپنے دو نمائندے ان مسلمانوں کے ساتھ قلعے سے باہر بھیج دیئے اور مسلمانوں سے کہا کہ انہیں اپنے سپہ سالار تک پہنچا دیں۔ یہ سب سالار سمیل بن عدی کے پاس آئے اور مدعا بیان کیا۔ سالار سمیل نے انہیں واسط بھیج دیا اور سپہ سالار ایاز بن غنم نے صلح کی شرائط تسلیم کر کے سمیل بن عدی کو صلح کی اجازت دے دی۔ اس طرح یہ محاصرہ اٹھالیا گیا اور قلعے میں جو قبیلے موجود تھے انہوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی اور جزیہ بھی ادا کرنے لگے۔

○

صرف علامہ شبلی نعمانی ایک تاریخ نویس ہیں جنہوں نے لکھا ہے کہ ہر قل شام سے پسپا ہو کر ارض روم میں مرج الابیاج کے مقام پر جا پہنچا اور اس نے وہیں قیام کیا تھا۔ آج

وہ ہر قل کے سامنے آئی تو ہر قل نے اس سے پوچھا کہ وہ کیوں آئی ہے اور پھر پوچھا کہ اسے معلوم ہے یا نہیں کہ اس کا خاوند کہاں ہے۔

”یہی تو میں شہنشاہ معظم سے پوچھنے آئی ہوں“ — اس عورت نے کہا — ”میرا پوچھ پوچھ کر یقین کر چکی ہوں کہ انھوں نے مارا گیا تھا یا زخمی ہو گیا تھا لیکن ہر کسی سے یہ جواب ملا کہ وہ زخمی بھی نہیں ہوا اور مارا بھی نہیں گیا۔“

”وہ جنگ ختم ہونے سے پہلے ہی کہیں بھاگ گیا تھا“ — ہر قل نے کہا — ”اگر وہ مجھے مل جاتا تو تمہیں اس کی لاش مل جاتی لیکن وہ لاپتہ ہے.... تم میرے پاس کیا لینے آئی ہو؟“

”پناہ اور سہارا ڈھونڈنے آئی ہوں“ — جرنیل کی بیوی نے کہا — ”میرے ان معصوم بچوں کو دیکھیں۔ ان کا کوئی پرسان حال نہیں رہا۔“

”اس میں میرا کوئی قصور نہیں“ — ہر قل نے کہا — ”یہ اپنے باپ کے جرم کی سزا بھگت رہے ہیں۔“

”لیکن شہنشاہ معظم!“ — اس عورت نے پوچھا — ”مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے؟ میں نے تو اپنے خاوند سے یہ نہیں کہا تھا....“

”میرے خزانے سے کسی غدار کی بیوی اور اس کے بچوں کی پرورش نہیں ہو سکتی“ — ہر قل نے شبانہ انداز سے کہا — ”جاؤ، کسی اور سے شادی کر لو اور بچوں کو سہارا مل جائے گا۔“

انھوں نے بیوی نے منت سماجت شروع کر دی کہ اسے یوں دھتکارا نہ جائے، اس کے خاوند کی آخر فوج میں اتنی زیادہ خدمات بھی تو ہیں۔ ہر قل نے اس پر رحم کرنے کی بجائے اسے ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی۔ ہر قل چپ ہوتا تو مسکین انھوں نے کو برا بھلا کہنے لگتا تھا۔

”شہنشاہ معظم!“ — انھوں نے بیوی نے کہا — ”اگر میرا خاوند غدار تھا تو کیا یہ میرے لئے بہتر نہیں ہو گا کہ مجھے اور میرے بچوں کو سزا کے طور پر قتل کر دیا جائے؟ موت سے بہتر کوئی اور پناہ نہیں ہو سکتی۔“

”میں نے تم پر رحم کیا ہے“ — ہر قل نے کہا — ”رحم نہ کرتا تو میں تمہیں جلاؤ کے حوالے کر چکا ہوتا۔ اگر موت کی خواہش ہے تو خود ہی زہریلو اور ان بچوں کو بھی چلا

وہ۔ یہاں سے چلی جاؤ اور پھر کبھی میرے سامنے نہ آنا۔“

انھوں نے بیوی کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ وہ بھیک مانگنے کے انداز سے بات کر رہی تھی۔ ہر قل کی بات سن کر اس کے مر جھائے ہوئے چہرے پر سرخی آگئی اور آنکھوں میں جو آنسو تیر رہے تھے وہ آنکھوں نے ہی پی لئے۔ اس کی گردن تن گئی۔

”اے شاہ روم!“ — اس عورت نے بالکل ہی بدلی ہوئی اور جاندار آواز میں کہا — ”اب مجھ سے سن لے میرا خاوند کہاں گیا ہے۔ آپ کی ملکہ لیزا اسے اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ میں آپ کے بے رحم عتاب سے واقف ہوں لیکن مجھے اب کسی کا ڈر نہیں۔ میرے خاوند نے اور لیزا نے میری زندگی جہنم بنائے رکھی ہے اور اب آپ مجھے اور میرے بچوں کو سزا دے رہے ہیں۔“

”مجھے لیزا کی کوئی پرواہ نہیں“ — ہر قل نے کہا — ”وہ میرے بیٹے کو بھی درغلا کر ساتھ لے گئے ہیں۔“

”شہنشاہ روم!“ — انھوں نے بیوی نے جرات مندانہ لہجے میں کہا — ”یو کلس آپ کا بیٹا تھا ہی نہیں۔ وہ میرے خاوند کا بیٹا ہے۔ اس سے پہلے کہ آپ کا عتاب مجھ پر نازل ہو کہ میں ملکہ پر جھوٹا الزام عائد کر رہی ہوں، مجھ سے حقیقت سن لیں۔ لیزا میرے گھر میں آکر میرے خاوند کے ساتھ کئی بار تنہائی میں رہی ہے۔ وہ مجھے بڑے قیمتی تحفوں سے خوش رکھنے کی کوشش کرتی رہتی تھی لیکن خاوند کی قیمت تو کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ میں نے جب اسے برا بھلا کہا کہ وہ میری زندگی تباہ کر رہی ہے تو اس نے مجھے یہ ممکنہ دی کہ وہ شاہ روم کی بیوی ہے اور مجھے قید خانے کی سب سے زیادہ غلیظ کوٹھڑی میں بند کروا سکتی ہے.... جب یو کلس پیدا ہوا تھا تو لیزا نے مجھے کہا تھا کہ اب تو وہ انھوں سے دور رہے ہی نہیں سکتی کیونکہ اس نے انھوں نے کا بیٹا پیدا کیا ہے۔ وہ بتاتی تھی کہ آپ نے اسے جوانی میں ہی حرم میں پھینک دیا اور بھول گئے تھے کہ لیزا نام کی بھی آپ کی کوئی بیوی تھی۔ لیزا نے میرے خاوند کو اپنے جذبات کی تسکین کا ذریعہ بنالیا تھا۔ ان کے یہ تعلقات ابھی تک چل رہے تھے۔“

انھوں نے بیوی کی شاید یہ توقع ہو گی کہ ہر قل اس پر برس پڑے گا اور اسے دھکے مے کر محل سے نکال دے گا لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ ہر قل پر خاموشی طاری ہو گئی اور وہ کچھ دیر اس عورت کو دیکھتا رہا۔ اسے یہ تو معلوم ہی ہو گا کہ بادشاہوں کے ہاں یہی

کچھ ہوتا ہے اور جن جواں سال عورتوں کو وہ حرم میں پھینک دیتے اور انہیں بھول جاتے ہیں، وہ اپنی تسکین کا کوئی نہ کوئی خفیہ انتظام کر لیتی ہیں۔ ہر قل کے لئے یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا کہ وہ شدید رد عمل کا اظہار کرتا۔ محل کی ایک عورت اگر کسی کے ساتھ بھاگی تھی تو ہر قل کی نگاہ میں یہ کوئی نقصان نہیں تھا۔ اُس وقت اُس کے دماغ پر اتنی بڑی شکست سوار تھی کہ شام جیسا بڑا ملک اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

”تسطنین!“ — ہر قل نے کہا — ”اسے ابھی محل میں مہمان کے طور پر رکھ اور میں اس کی دوسری شادی کا انتظام کروا دوں گا۔ اُس وقت تک اس کی پوری دیکو بھال ہوتی رہے اور یہ کسی چیز کی کمی محسوس نہ کرے۔“

○

انٹونیس، لیزا اور ان کا بیٹا یوکلِس ایک اور دن کی مسافت طے کر کے رات گزارنے کے لئے ایک اور جگہ رک گئے تھے۔ یہ جگہ بھی سرسبز گھاس سے لدی ہوئی ٹیکریوں میں گھری ہوئی تھی۔ درختوں کی بہتات تھی اور قریب سے ایک شفاف پانی کی ندی گزرتی تھی۔ وہ کھانا کھا چکے تھے اور یوکلِس نوجوانی کی بے فکری کی نیند سو گیا تھا۔ انٹونیس اور لیزا بھی اس کے پاس ہی لیٹے تھے لیکن دونوں اب اس کے پاس نہیں تھے۔ رات آدھی گزر گئی تھی اور وہ دونوں کچھ پرے ہٹ کر چھوٹی سی ٹیکری پر بیٹھے ایک دوسرے میں کھو گئے تھے۔ لیزا ایران کے حسن کا ایک نادر نمونہ یا شاہکار تھی۔ الگ بات ہے کہ ہر قل اس سے جلدی آگیا اور اسے حرم میں پھینک دیا تھا لیکن ہر قل اب بھی اس کے سامنے اس طرح بات نہیں کر سکتا تھا جس طرح بادشاہ کیا کرتے تھے۔ ہر قل جیسا جابر اور ظالم بادشاہ لیزا کا سامنا کرنے سے گھبراتا تھا۔ پہلے یہ بات ہو چکی ہے کہ لیزا نے انٹونیس کو اپنی تسکین کا ذریعہ بنالیا تھا لیکن یہ تعلقات ایسی محبت کی صورت اختیار کر گئے جو دلوں میں اُتر گئی تھی۔

اپنے بیٹے کو سوتا چھوڑ کر وہ الگ جا بیٹھے اور بیٹھے بھی اس طرح جیسے دونوں جسم ایک ہو گئے ہوں۔ لیزا کی عمر ابھی چالیس برس نہیں ہوئی تھی لیکن وہ ابھی تک نوجوان اور حسین تھی۔ انٹونیس اس سے پندرہ سولہ سال بڑا تھا لیکن اس نے اپنی جواں کو برقرار رکھا ہوا تھا۔

”کیا تمہیں اپنی بیوی اور بچے یاد نہیں آتے؟“ — لیزا نے انٹونیس سے پوچھا۔

”تم پاس ہوتی ہو تو مجھے خدا بھی یاد نہیں رہتا“ — انٹونیس نے جواب دیا — ”وہ تو ایک بیوی تھی جسے میں نے بیوی کے مقام پر ہی رکھا ہوا تھا۔ دل میں ابھی کسی کی محبت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میرا دل شاید تمہارا منتظر تھا اور تم آ گئیں۔“

”کیا تم مجھے شہانہ زندگی دے سکو گے؟“ — لیزا نے بڑے ہی جذباتی لہجے میں پوچھا اور کہا — ”تمہیں دلی محبت کی ضرورت تھی اور میں نے تمہاری یہ جذباتی ضرورت پوری کر دی۔ اب میں تمہیں یاد دلا رہی ہوں کہ میں کسریٰ ایران کے شاہی خاندان سے آئی تھی اور ہر قل کے شاہی محل میں اس عمر تک پہنچی۔ ڈرتی ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم یونانی جنگلوں میں بھٹکتے پھریں اور یہیں کہیں زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔“

”میں جس بادشاہی کی بنیاد رکھنے جا رہا ہوں اس کی پہلی ملکہ عالیہ تم ہو گی“ — انٹونیس نے کہا۔

انٹونیس حیوانیت کے غلبے میں آ گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ایسے مخمور اور مدہوش ہو گئے جیسے انہیں احساس ہی نہ رہا ہو کہ وہ کسی شہانہ کمرے میں نرم و گداز پلنگ پر ہیں یا جنگل کی ایک ٹیکری پر۔ لیزا ٹیکری کی سختی میں پلنگ کی نرمی اور ملائمت محسوس کر رہی تھی۔

چاند کچھ اوپر آ گیا تھا۔ منناک جنگل کی چاندنی بڑی صاف اور شفاف تھی۔ وہ دونوں اٹھے۔ انٹونیس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اب سو جانا چاہئے کہ لیزا نے پیچھے دیکھا۔ وہ تو لرز اٹھی۔ یوکلِس تنگی تلوار ہاتھ میں لئے بڑی تیزی سے ٹیکری چڑھتا آ رہا تھا۔

”میرے پیچھے ہو جاؤ انٹونیس!“ — لیزا نے کہا اور یوکلِس کے راستے میں کھڑی ہو گئی۔

انٹونیس نے پیچھے دیکھا تو اسے یوکلِس نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار اور اس کے اوپر آنے کی تیزی سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کیوں اور کس ارادے سے آیا ہے۔ لیزا کے کہنے کے مطابق وہ لیزا کے پیچھے ہو گیا۔

”تم اس شیطان کو مجھ سے نہیں بچا سکو گی ماں!“ — یوکلِس نے قریب آ کر غضبناک لہجے میں کہا — ”ہٹ جاؤ آگے سے۔“ میں نے دیکھ لیا ہے۔ یہ تمہیں دھوکے میں اپنے ساتھ اسی مقصد کے لئے لایا تھا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”رک جاؤ یوکلِس!“ — لیزا نے رعب دار آواز میں کہا — ”کیا تم اس شخص کو

قتل کرنا چاہتے ہو جو تمہیں قتل ہونے سے بچا لیا ہے؟ تمہاری خاطر یہ اپنے بچوں کو چھوڑ آیا ہے۔“

یوکلِس پھٹکار رہا تھا اور ماں بازو پھیلانے سے روک رہی تھی۔ اگر انتھونیس منہ نہ ہوتا تو یوکلِس کا مقابلہ کر کے اس پر قابو پالیتا۔

”اسے بتا دو لیزا، میں کون ہوں؟“ انتھونیس نے کہا۔ ”اسے حقیقت بتا دو۔“ یوکلِس انتھونیس کو لٹکار رہا تھا کہ وہ ایک عورت کو ڈھال نہ بنائے اور مردوں کی طرح سامنے آئے۔

”کیا تم اپنے باپ کو قتل کرو گے؟“ لیزا نے کہا۔
 ”ہاں.... آگے سے ہٹ جاؤ ماں!“ یوکلِس نے غصے سے لرزتی آواز میں کہا۔
 ”اسے قتل کر کے میں واپس جاؤں گا اور اپنے باپ ہر قتل کو بھی قتل کروں گا۔“
 ”ہر قتل تمہارا باپ نہیں ہے۔“ لیزا نے کہا۔ ”وہ میرا صرف خاوند تھا تمہارا باپ یہ ہے.... انتھونیس.... تم اس کے بیٹے ہو۔“

یوکلِس کا جوش اور عتاب کچھ ٹھنڈا پر گیا۔ اس کی تلوار جھک گئی۔
 ”آؤ یوکلِس!“ لیزا نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے تلوار لے کر کہا۔
 ”میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ تم انتھونیس کے بیٹے ہو اور ہر قتل اس حقیقت سے واقف نہیں۔ وہ تمہیں اپنا بیٹا سمجھتا ہے۔ ہم دونوں کسی وجہ سے ہی تمہیں اپنے ساتھ لائے ہیں۔“

انتھونیس اور لیزا نے یوکلِس کو اپنے پاس بٹھالیا۔ لیزا نے یوکلِس کو بتایا کہ اسے کسریٰ ایران نے کس طرح اور کس مقصد کے لئے ہر قتل کے پاس ایک دھوکے کے ذریعے بھیجا تھا اور ہر قتل نے اسے بیوی بنا کر اس کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ لیزا نے یوکلِس کو یہ ساری بات ایسے جذباتی انداز میں سنائی کہ یوکلِس پوری طرح متاثر ہو گیا۔ ان لوگوں کے ہاں اخلاق اور کردار نام کی تو کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ ان کا کلچر ہی کچھ ایسا تھا جس میں حلال اور حرام کا حیا اور نئے حیاتی کا تصور کچھ اور تھا۔

”میں تمہیں شہزادہ بنا کر دم لوں گا۔“ انتھونیس نے یوکلِس سے کہا۔ ”ہر قتل کو قتل نہیں کریں گے۔ اس کی بادشاہی پر قبضہ کر کے اسے بھکاری بنادیں گے اور وہ بازاروں میں بھیک مانگتا پھرے گا۔“

یوکلِس نے اپنی ماں اور انتھونیس کو اس طرح دیکھ لیا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے دیکھا، دونوں وہاں نہیں تھے۔ انہیں دیکھنے کے لئے وہ اٹھا۔ ایک طرف ٹیکری پر وہ اسے نظر آگئے۔ چاند ان کی دوسری طرف سے اوپر آ رہا تھا۔ یوکلِس کو وہ اس طرح دکھائی دیئے جیسے دو سائے ہوں۔ وہ دونوں ایسی حالت میں تھے کہ قریب جا کر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یوکلِس نے تلوار نکالی اور ان کی طرف غیظ و غضب سے چل پڑا۔ یہ تو وہ جانتا ہی تھا کہ اس کی ماں کس قدر خوبصورت عورت ہے۔ یہی ایک خیال اس کے ذہن میں اٹک گیا کہ انتھونیس اس کی ماں کو ورغلا کر لایا ہے اور اب ماں سے خراج وصول کر رہا ہے۔ وہ اپنی ماں کو انتھونیس کے ہاتھوں میں مجبور سمجھ رہا تھا۔

”آخر ہم جا کہاں رہے ہیں؟“ یوکلِس نے پوچھا۔
 ”ایک ہی دن کی مسافت رہ گئی ہے۔“ انتھونیس نے جواب دیا۔ ”کل رات ہم کسی جنگل یا صحرائیں نہیں ہوں گے بلکہ کسی قبائلی سردار کے ہاں آرام وہ بستر میں سوئے ہوئے ہوں گے۔“

انتھونیس کی سوچ اور اس کے ارادے بے بنیاد ہو سکتے تھے اور یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ وہ بیداری میں خواب دیکھ رہا ہے لیکن اُس نے اپنی منزل کا تعین کر لیا تھا۔ کامیابی اور ناکامی تو بعد کے نتائج تھے، اس کے ذہن میں ایسی کوئی الجھن اور کوئی شک نہیں تھا کہ وہ غلط راستے پر جا رہا ہے۔ اس نے اپنے ذہن میں ایک پلان تیار کر لیا تھا اور یہ بھی طے کر لیا تھا کہ وہ کس قبیلے کے سردار سے ملے گا۔

اس کے مقابلے میں بُتنا سن بھی بھٹکتا پھر رہا تھا۔ اس نے یہ فیصلہ کر تو لیا تھا کہ اپنی فوج میں واپس نہیں جائے گا تاکہ ہر قتل سے سامنا نہ ہو لیکن چلتے چلتے وہ اس فیصلے سے یوں ہٹ جاتا جیسے اس کا پاؤں پھسل گیا ہو اور وہ گر پڑا ہو۔ اس کا ذہن چلتا تھا، پھسلتا تھا اور گر کر اٹھتا اور پھر چلتا تھا۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس پر جرم کا بوجھ سوار تھا۔ راستے میں ایک رات آئی اور وہ ایک جگہ سو گیا اور اگلے روز پھر چل پڑا۔

وہ بار بار تجھے میں ملی ہوئی صلیب اور سونے کے عیسائی علیہ السلام کو دیکھتا تھا جیسے یہ بُت اس کی راہنمائی کرے گا لیکن صلیب کے ساتھ چپکا ہوا یہ بُت اس کے کسی کام نہ آ سکا۔ سوچ سوچ کر اسے ایک ہی پناہ نظر آئی اور یہ پناہ اسے کسی عیسائی قبیلے کے ہاں ہی

مل سکتی تھی۔ وہ جب محض میں مسلمانوں کی نظربندی میں تھا تو شارینا سے ملنے جاتی اور روز بروز کی خبریں سناتی رہتی تھی۔ شارینا نے اسے سنایا تھا کہ الجزیرہ کے جو عیسائی قبائل ہر قل کی مدد کو گئے تھے وہ سب بدول ہو کر واپس چلے گئے ہیں۔

یہ سوچ کر روتاس پھر ابھن میں مبتلا ہو جاتا کہ ان قبائلیوں نے اسے قبول نہ کیا اور پناہ نہ دی تو پھر وہ کیا کرے گا۔

ایک بار تو اس نے فیصلہ کر ہی لیا تھا کہ وہ اپنی فوج میں چلا جائے۔ اس نے گھوڑا روک لیا تھا لیکن گھوڑے کا رخ موڑا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے ہر قل اس کے سامنے کھڑا ہو اور اس سے پوچھ رہا ہو کہ تم کہاں جا چھپے تھے.... روتاس یہ تو سمجھ ہی سکتا تھا کہ ہر قل شکست کے بعد کس مزاجی کیفیت میں ہو گا۔ وہ تو ذرا سے شک پر بھی حکم دیتا ہو گا کہ اس شخص کو جلاد کے حوالے کر دو، یہ دانستہ لڑائی سے بھاگا تھا۔ روتاس اسی عمر میں جلاد کے ہاتھوں مرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس نے گھوڑے کا رخ پھر اوڑھ ہی کر دیا جدھر وہ جا رہا تھا۔

دن کا پچھلا پہر تھا جب اسے ایک بڑی خوبصورت اور سرسبز جگہ نظر آئی۔ وہاں چھوٹا سا ایک چشمہ بھی تھا۔ درخت اتنے گھنے اور قریب قریب تھے کہ ان کی ٹھنڈی چھاؤں کو دیکھ کر سو جانے کو جی چاہتا تھا۔ روتاس کی تو کوئی منزل ہی نہیں تھی۔ اتنی روح افزا جگہ دیکھ کر وہ گھوڑے سے اترا اور گھاس پر لیٹ گیا فوراً ہی وہ گہری نیند سو گیا۔

آنکھ کھلی تو رات گہری ہو چکی تھی اور چاند افاق سے اُپر اٹھتا آ رہا تھا۔ روتاس نے سوچا کہ وہ بہت سوچکا ہے اور رات خاصی ٹھنڈی ہے، وہ چل ہی پڑے تو اچھا ہے۔ صبح تک وہ دُور نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اُس منزل کو چل پڑا جس کو وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو کہاں ہے۔

وہ چلتا گیا اور چاند اُپر اٹھتا آیا۔

انٹونیس اور لیزا یو کلس کو اُس جگہ لے گئے جہاں انہوں نے سونے کے لئے کھل بچھائے تھے۔ یو کلس مطمئن ہو گیا تھا۔ ماں نے اس کے ساتھ اتنا پیار کیا کہ وہ اپنے آپ کو چھوٹا سا بچہ سمجھنے لگا۔ تین لیٹ گئے۔

انہیں ایک گھوڑے کے قدموں کی ہلکی ہلکی دھمک سنائی دینے لگی۔ وہ چوکس ہو گئے۔ قدموں کی یہ آہٹ بلند ہونے لگی اور اب کسی کے گانے کی آواز سنائی دی۔ گنا

رومی زبان کا تھا۔ لیزا سرگوشی میں بولی کہ کوئی تعاقب میں آ رہا ہے۔ انٹونیس نے کہا کہ یہ ایک ہی گھوڑا معلوم ہوتا ہے۔ تعاقب ہوتا تو کئی ایک گھوڑے ہوتے۔ یہ کوئی مسافر لگتا ہے یا ہو سکتا ہے لڑائی سے بھاگا ہوا ہو۔

”تم یہیں بیٹھی رہو لیزا!“ — انٹونیس نے کہا — ”میں اور یو کلس چھپ جائیں گے اور دیکھیں گے یہ کون ہے۔ خطرے والا معاملہ ہوا تو ہم دونوں پیچھے سے حملہ کریں گے۔“

انٹونیس اور یو کلس بڑی تیزی سے وہاں سے چلے گئے اور ایک پرانے درخت کے تنے کے پیچھے چھپ گئے۔ انہوں نے گھوڑے ٹیکری کے دوسری طرف باندھے تھے۔ اُنے والا سوار کسی اور طرف سے آ رہا تھا۔ وہ اس جگہ کے قریب سے گزرا تو اس کی نظر لیزا پر پڑی جو پیٹھ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے گھوڑا روک لیا اور کود کر گھوڑے سے اترا۔ گھوڑے کو وہیں چھوڑا اور آہستہ آہستہ لیزا کی طرف گیا۔

ابھی اسے یہ پتہ نہیں چلا تھا کہ یہ عورت ہے۔ یہ پہلا انسان تھا جو اسے اس سفر میں نظر آیا۔ قریب گیا تو اسے پتہ چلا کہ یہ تو عورت ہے۔ کھڑے کھڑے ذرا اس پر بھٹکا تو لیزا اٹھ بیٹھی اور پھر کھڑی ہو گئی۔ سوار کا دل یکھٹ ایک خوف کی گرفت میں آ گیا۔ اس نے اس عورت کو پہچان لیا تھا۔ ہر قل کی بیویاں اور داشتائیں ہر طرف گھومتی پھرتی رہتی تھیں اس لئے ہر کوئی انہیں جانتا پہچانتا تھا۔ ایسی ہر عورت خواہ وہ ہر قل کی بیوی تھی یا داشتہ، ملکہ کہلاتی تھی۔

”آپ؟.... ملکہ لیزا؟“ — سوار نے حیرت زدگی کے لہجے میں پوچھا — ”آپ یہاں؟.... کیا شاہ ہر قل بھی یہیں کہیں قریب ہی ہیں؟“

”تم کون ہو؟“ — لیزا نے ایسے رعب سے پوچھا جیسے وہ واقعی ملکہ ہو — ”کہاں سے آئے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟“

سوار کے لئے یہ بات حیرت ناک تھی کہ شاہ ہر قل کی بیوی اس جنگل میں اکیلی پڑی تھی۔ اسے یقین ہونے لگا کہ یہ بدروح ہے یا جنت جیسی مخلوق میں سے ہے اور اس نے ملکہ لیزا کا روپ دھار رکھا ہے۔ اس کا خوف اور زیادہ بڑھ گیا۔

”نہیں.... نہیں!“ — اس نے ہلکائی ہوئی زبان سے کہا — ”آپ زندہ انسان نہیں ہو سکتیں۔ آپ کو شاہ ہر قل کے ساتھ ارضِ روم میں ہونا چاہئے تھا.... آپ کس

کی روح ہیں؟..... مجھے معاف کر دینا میں آپ کے آرام میں غل ہوا ہوں۔“
وہ وہاں سے اٹھ کر قدم چلنے لگے۔ خوف کے مارے وہ لیزا کی طرف پیٹھ نہیں کر رہا تھا۔

”ٹھہرو!“ — لیزا نے اپنی آواز بدل کر بڑے ہی رعب سے کہا — ”میرے قریب آؤ..... اپنا نام بتاؤ۔ تم روم کی فوج کے آدمی ہو۔“
”میرا نام روتاس ہے“ — سوار نے لیزا کے قریب ہوتے ہوئے کہا — ”میں رومی فوج کا افسر ہوں۔ مسلمانوں نے مجھے قید کر لیا تھا۔ میں فرار ہو آیا ہوں.... کیا میں جاسکتا ہوں؟“

انتھونیٹس اور پولکس درخت کے پیچھے سے بچے اور دبے پاؤں روتاس کی طرف بڑھنے لگے۔ اس طرف روتاس کی پیٹھ تھی۔ دونوں کے ہاتھوں میں تنگی تلواریں تھیں۔ وہ جب روتاس کے بالکل قریب پہنچ گئے تو روتاس نے محسوس کیا کہ اس کے پیچھے کوئی ہے۔ اس نے گھوم کر دیکھا اور بدک کر ایک طرف ہو گیا۔ اس نے یقیناً ”اپنے جرنیل انتھونیٹس اور ہرقل کے بیٹے پولکس کو پہچان لیا تھا۔

”میں یہ سب کیا دیکھ رہا ہوں؟“ — روتاس نے حیرت زدگی کی حالت میں پوچھا — ”آپ سب یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”روتاس!“ — انتھونیٹس نے تلوار کی نوک اس کے دل کے مقام پر رکھ کر کہا — ”کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نہیں جانتا کہ تم ہرقل کی جاسوسی کے محکمے کے افسر ہو؟ کیا تم اس سے انکار کر سکو گے کہ تم ہمارے پیچھے آئے ہو؟“

”آپ کیسے جرنیل ہیں؟“ — روتاس نے کہا — ”آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں تین چار مہینوں سے فوج سے غیر حاضر ہوں.... میں ہرقل کی طرف سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی قید سے فرار ہو کر آیا ہوں۔“

اُس نے یوں جھوٹ بولا کہ وہ جاسوسی کے لئے تمس تک چلا گیا تھا، اس کے ساتھ اس کے محکمے کے دو تجربہ کار آدمی تھے لیکن پکڑا گیا، اس کے دونوں آدمی مارے گئے اور وہ ایب موقع دیکھ کر فرار ہو آیا ہے۔

”پھر اس طرف کیا لینے آئے ہو؟“ — پولکس نے پوچھا اور کہا — ”ہرقل اور اس کی فوج اس طرف تو نہیں آئی۔“

”اس کا چہرہ اور اس کا لباس دیکھو“ — لیزا نے کہا — ”اگر یہ تین چار مہینے دشمن کی قید میں رہا ہوتا تو اس کا چہرہ اتنا تروتازہ اور صحت مند نہ ہوتا اور اس کے کپڑے پھٹے پڑے اور غلط ہوتے.... یہ ہمیں دھوکہ دے رہا ہے۔“

”آپ یقین کریں“ — روتاس نے کہا — ”مسلمان قیدیوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتے ہیں۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے انہوں نے مجھے مہمان رکھا تھا۔“

انتھونیٹس نے اپنی تلوار کی نوک اس کے دل سے ہٹائی اور بائیں ہاتھ سے اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوٹا پھر اس کے کمر بند کو دیکھا جس کے ساتھ تلوار لٹک رہی تھی۔ مسلمانوں نے اسے باعزت طور پر رہا کرتے ہوئے تلوار بھی اسے دے دی تھی۔ انتھونیٹس نے اس کے کمر بند کے چاروں طرف ہاتھ پھینکا کہ اس کے پاس خنجر بھی ہو گا۔ خنجر تو نہیں تھا، کوئی اور چیز اس کے ہاتھ کو لگی تو اس نے یہ چیز کھینچ لی۔ چاندنی میں اس چمکتی ہوئی چیز کو دیکھا تو اس نے یہ چیز لیزا کی طرف بڑھائی۔

”یہ صلیب اس کے جھوٹ کو ثابت کرتی ہے“ — انتھونیٹس نے کہا — ”مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ کس کی ہے۔“

سہ سالار ابو عبیدہ تک یہ صلیب مال غنیمت میں پہنچی تھی۔ یہ کسی رومی افسر کے پاس تھی جو مارا گیا تھا۔ انتھونیٹس نے اس افسر کا نام لے کر لیزا اور پولکس کو بتایا کہ یہ ہر وقت اُس کے پاس رہتی تھی۔

”اب سوچو“ — انتھونیٹس نے کہا — ”اگر یہ شخص مسلمانوں کی قید میں رہا ہوتا تو کیا وہ اتنا وزنی سونا اس کے پاس رہنے دیتے؟“ — انتھونیٹس نے روتاس سے کہا — ”تم بچ کیوں نہیں بولتے؟“

انتھونیٹس نے اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس کے کمر بند سے تلوار کھینچ لی اور ایک بار پھر کہا کہ وہ سچ بول دے ورنہ اس کی لاش یہیں پڑی رہ جائے گی اور اسے جنگل کے درندے کھائیں گے۔

”میں پناہ ڈھونڈتا پھر رہا ہوں“ — روتاس سچ بولنے پر آمیا — ”میں جانتا ہوں ہرقل پسپا ہو کر کس طرف گیا ہے۔ میں اُدھر نہیں جاؤں گا مگر یہ بھی معلوم نہیں کہ میں ہاؤں گا کہاں۔ میں جاسوسی کے لئے گیا تھا لیکن اپنے سینے میں جو راز تھے وہ مسلمانوں نے نکلوا لئے۔“

روتاس نے بالکل صحیح اور سچ سارا واقعہ سنایا کہ وہ کس طرح پکڑا گیا اور مسلمانوں کی قید میں جا پڑا تھا۔

”میں ہر قل کی ایک بیٹی کے دھوکے میں آ گیا تھا“ — روتاس نے کہا — ”آپ شام کو بھولے نہیں ہوں گے۔ وہ وہاں موجود تھی اور اس نے مجھے قید خانے سے بچا کر ایک نہایت اچھے کمرے میں رکھوایا تھا۔ اس نے میرے ساتھ ایسی پیار و محبت کی باتیں کیں اور کہا کہ وہ واپس جانا چاہتی ہے کہ میں اس کے دھوکے میں آ گیا اور اپنی فوج کی کمزوریاں وغیرہ اسے بتا دیں۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں نے میری بتائی ہوئی باتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ صلیب اسی کا انعام ہے جو ان کے سپہ سالار نے مجھے دیا ہے۔“

انٹونیس اور لیزا نے اس کی باتوں کو سچ مان لیا پھر بھی انٹونیس نے اسے کہا کہ جہاں کہیں اس نے دھوکہ دیا، اسے وہاں قتل کر دیا جائے گا۔ اب روتاس نے ان سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ انٹونیس نے اسے صاف الفاظ میں بتا دیا۔

”مجھے آپ ایک وفادار ساتھی پائیں گے“ — روتاس نے کہا — ”میں تو بھٹکا ہوا مسافر تھا، آپ نے مجھے منزل دکھا دی ہے۔ ان قبائلی سرداروں کو میں آپ سے بھی زیادہ بہتر جانتا ہوں۔“

رات بہت تھوڑی رہ گئی تھی۔ وہ ذرا ساسوئے اور پو پھٹنے سے پہلے ہی وہاں سے روانہ ہو گئے۔

○

عراق اور شام کے درمیان وسیع و عریض الجزیرہ کے علاقوں میں عیسائی قبائل کی سرکوبی کی جا رہی تھی۔ ان میں ایک دلچسپ صورت حال بنو تغلب نے پیدا کر دی تھی۔ بنو تغلب کا علاقہ شام عراق سرحد اور دریائے فرات کے درمیان تھا۔ کچھ علاقہ شام میں بھی تھا۔ یہ صحرائی علاقہ تھا۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے بنو تغلب کی سرکوبی کی ذمہ داری ایک سالار ولید بن عقبہ کو سونپی تھی۔ بنو تغلب کئی ایک بستیوں میں آباد تھے جن میں دو یا تین بڑی بستیاں قلعہ بند تھیں۔ سالار ولید بن عقبہ کو ان بستیوں پر قبضہ کرنے کے لئے کئی دشواریاں پیش آئیں جن میں سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ بنو تغلب کے لوگ صحیح معنوں میں جنگجو تھے۔ وہ عربی نسل کے لوگ تھے۔ مجاہدین کے جس لشکر

نے پہلے شعیب بن حارثہ اور اس کے بعد سعد بن ابی وقاص کی قیادت میں کسریٰ ایران کی طاقتور فوج کو ہرمیدان میں شکست دی اس لشکر میں بنو تغلب کے عیسائی بھی شامل تھے اور ان میں سے بعض نے شجاعت کے بڑے ہی حیران کن کارنامے کر دکھائے تھے۔

اب بنو تغلب نے ہر قل کی شہر پر مسلمانوں کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ عراق پر بھی مسلمانوں کا قبضہ مکمل ہو گیا تھا اور شام پر بھی بنو تغلب نے مسلمانوں کے اس قبضے کے خلاف سرکشی شروع کر دی تھی۔

مجاہدین کا لشکر سالار ولید بن عقبہ کی قیادت میں وہاں پہنچا تو اس قبیلے کے لوگوں نے جم کر مقابلہ کیا لیکن کسی بھی جگہ قدم بھانہ سکے۔ مجاہدین کو ایک سہولت یہ حاصل ہو گئی تھی کہ انہیں رومیوں اور ایرانیوں کے بے انداز گھوڑے مل گئے تھے۔ اس طرح مجاہدین کی اکثریت گھوڑ سوار تھی۔ مجاہدین کو ایک اور فائدہ حاصل ہو گیا تھا۔ انہوں نے ہر قل کو شکست دی تھی جو اُس دور میں ایک عجیب بات سمجھی جاتی تھی کیونکہ ہر قل کی جنگی طاقت ایک دہشت کا نام تھا۔ مجاہدین نے اس طاقت کو ملک شام کے جنگلوں اور صحرائوں میں کھیر ڈالا تھا۔ اس طرح مجاہدین کی دھاک ہر طرف بیٹھ گئی تھی۔

الجزیرہ کے عیسائی قبائل لڑنے کے لئے میدان میں آتے جاتے تھے لیکن زیادہ وقت نہیں گزرتا تھا کہ وہ کھٹے ٹیک دیتے تھے۔ بنو تغلب نے بھی ایسی ہی لڑائی لڑی۔ تین چار معرکوں میں انہیں منہ کی کھانی پڑی تو ان کے سردار صلح کا معاہدہ کرنے آ گئے اور انہوں نے اطاعت قبول کر لی۔

سالار ولید بن عقبہ نے بنو تغلب کے سرداروں سے کہا کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ بنو تغلب ان قبائل میں زیادہ جنگجو اور باوقار قبیلہ سمجھا جاتا تھا۔ اس قبیلے کے سرداروں نے اسلام قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ولید بن عقبہ نے کہا کہ انہیں اسلام قبول کرنا ہی پڑے گا ورنہ ان پر ایسی سختیاں عائد کر دی جائیں گی جو وہ برداشت نہیں کر سکیں گے۔ سرداروں نے متفقہ طور پر کہا کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ جو فیصلہ کریں گے وہ اس فیصلے کو قبول کر لیں گے۔

سالار ولید بن عقبہ نے اُسی روز امیر المومنین کو پیغام بھیج دیا جس میں لکھا کہ انہوں نے بنو تغلب سے اسلام قبول کرنے کو کہا تھا جس سے انہوں نے انکار کر دیا ہے اور وہ فیصلہ امیر المومنین پر چھوڑتے ہیں۔

”تم اسے کوئی بھی نام دے دو“ — حضرت عمرؓ نے کہا — ”ہمارے دستور کے مطابق اسے جزیہ کہا جاتا ہے.... میں حیران ہوں کہ تم لوگ کیسی بے معنی بات پر اڑے ہوئے ہو“۔

”امیر المومنین!“ — معمر سردار نے کہا — ”ہم آپ کو امیر المومنین تسلیم کرتے ہیں اور ساتھ یہ درخواست بھی کرتے ہیں کہ ہماری عزت اور قومی وقار کو برقرار رکھنے دیں۔ آپ جانتے ہیں کہ بنو تغلب کا کتنا اونچا نام ہے۔ جزیہ کو بے عزتی اور ذلت سمجھا جاتا ہے۔ یہ نہ بھولیں کہ ہمارے قبیلے کے آدمی آپ کے لشکر میں شامل ہو کر کربلا کی آغوش کے خلاف لڑے تھے۔ اب بھی ہم آپ کی لڑائیاں لڑیں گے، ہم نے آپ کی اطاعت قبول کر لی ہے۔ ہم سے رقم لے لیں، ہماری عزت اور ہماری روایت کو تباہ نہ کریں۔“

حضرت عمرؓ جزیہ کو جزیہ ہی کہنے پر قائم رہے۔ کچھ بد مزگی سی پیدا ہونے لگی تو حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کو ایک سالار سعد بن مالک کا واقعہ یاد دلایا جس نے ایک علاقہ فتح کر کے وہاں کے لوگوں سے جزیہ لینے کی بجائے وگنا صدقہ قبول کر لیا تھا۔ حضرت عمرؓ بلاوجہ اپنی بات پر اڑا نہیں کرتے تھے۔ انہیں وہ واقعہ یاد آگیا اور (مؤرخ لکھتے ہیں کہ) حضرت عمرؓ کو یہ خیال بھی آگیا کہ یہ قبیلہ ایک جنگی طاقت ہے جو اپنے کام آ سکتا ہے۔ آخر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جزیہ کی بجائے صدقہ قبول کر لیا جائے لیکن رقم دگنی ہو گی۔ بنو تغلب کے سرداروں نے یہ فیصلہ بخوشی قبول کر لیا اور رقم ادا کر دی۔ اس طرح ایک طاقتور قبیلہ بھی مسلمانوں کے زیر اطاعت آگیا اور اس قبیلے کے لوگوں نے آہستہ آہستہ اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔



انٹھوئیس، روہاس، لیزا اور یوکلکس حلب کے قریب ایک بستی میں پہنچ گئے۔ یہ جنگل میں چند ایک گھروں کی بستی تھی اور یہ بنو ربیعہ کے لوگ تھے۔ انہوں نے انٹھوئیس اور اس کے ساتھیوں کو دیکھا تو سب گھروں سے باہر آگئے وہ جان گئے ہوں گے کہ یہ رومی ہیں۔ رومیوں کے متعلق ان لوگوں کی رائے اچھی نہیں رہی تھی۔ انٹھوئیس اور روہاس خاصا لمبا عرصہ الجزیرہ کے علاقے میں رہے تھے اس لئے انہوں نے ان کی زبان سیکھ لی تھی۔ انہوں نے بستی والوں سے کہا کہ وہ کسی بڑے آدمی

حضرت عمرؓ کی دوراندیشی اور تدبیر کی تعریف تو غیر مسلم سرداروں نے بھی کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے جواب بھیجا کہ بنو تغلب کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا جائے اور فیصلہ ان پر ہی چھوڑ دیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے یہ بھی لکھا کہ بنو تغلب کے سرداروں سے کہہ دیا جائے کہ ان کے قبیلے میں سے کوئی بھی اپنی مرضی سے اسلام قبول کرنا چاہے تو قبیلے کے لوگ اسے روکیں گے نہیں۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ جب حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ سالار ولید بن عقبہ نے بنو تغلب کے سرداروں وغیرہ کو سنایا تو اس فیصلے سے ہی متاثر ہو کر متعدد عیسائیوں نے اسلام قبول کر لیا۔

امیر المومنین حضرت عمرؓ نے پیغام میں یہ بھی لکھا تھا کہ بنو تغلب سے جزیہ وصول کر کے انہیں ذی قرار دے دیا جائے۔ بنو تغلب کے سرداروں نے جزیہ دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ ذی نہیں کہلائیں گے۔

”اے بنو تغلب!“ — ولید بن عقبہ نے کہا — ”ہم تمہارے لئے اپنا قانون اور دستور بدل نہیں سکتے۔ میں اب یوں نہیں ہونے دوں گا کہ تمہاری ہر ضد مدینہ امیر المومنین کے پاس بھیجوں اور وہاں سے فیصلہ لوں۔ جزیہ تو ہم کبھی معاف نہیں کریں گے۔“

”ہم رقم دینے سے انکار نہیں کر رہے“ — ایک سردار نے کہا۔ — ”آپ جزیہ سے دگنی رقم ہم سے لیں لیکن ہمیں ذی نہ کہیں اور اس رقم کو جزیہ نہ کہیں۔“ آخر طے پایا کہ بنو تغلب کے سرداروں کا ایک وفد امیر المومنین کے پاس مدینہ جائے گا اور ان کے آگے مطلوبہ رقم بھی رکھ دے گا اور اپنا مطالبہ بھی۔

اُسی روز ان کا ایک وفد مدینہ کو روانہ ہو گیا۔ اس وفد میں بنو تغلب کے نو مسلم بھی تھے۔ سالار ولید بن عقبہ نے اپنا ایک نمائندہ ساتھ بھیج دیا تھا۔ مدینہ پہنچ کر یہ وفد حضرت عمرؓ کے حضور پہنچا اور یہی اصرار پیش کیا کہ وہ جزیہ دیں گے اور رقم جس قدر بھی ان سے طلب کی جائے گی وہ فوراً ادا کر دیں گے۔

”ہم نے جو جزیہ مقرر کیا ہے اس سے زیادہ نہیں لیں گے“ — حضرت عمرؓ نے کہا۔ — ”اور اسے ہم جزیہ کہیں گے۔“

”لیکن ہم اسے صدقہ کہنا چاہتے ہیں“ — بنو تغلب کے ایک معمر سردار نے کہا۔

بوڑھے کے مرحلے ہوئے چرے پر رونق اور ہونٹوں پر تبسم آگیا۔ یہاں سے وہ بات چلی جس بات پر انتھونیس قبائل کے سرداروں کو لانا چاہتا تھا۔ بوڑھا جب بولا تو معلوم ہوا کہ وہ انتھونیس کا ہم خیال ہے اور ایسے ہی ارادے اس کے سینے میں بھی تربت رہے ہیں۔

”بھئی ہم ایرانیوں کے غلام ہو جاتے ہیں“ — بوڑھے نے کہا۔ ”کبھی رومی آ کر ہمیں اپنی زر خرید رعایا بنا لیتے ہیں اور اب مسلمانوں نے ہمیں تمہ تیغ کر لیا ہے۔ مجھے اپنے اس تمام علاقے کی خبریں مل رہی ہیں۔ ہمارے قبائل نے بغاوت تو کر دی ہے لیکن الگ الگ ہو کر۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قبیلے کچھ لڑ کر اور فوراً ہی ہتھیار ڈال کر اطاعت قبول کرتے چلے جا رہے ہیں۔ بنو تغلب جیسے طاقتور قبیلے نے بھی مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی ہے۔ صرف حلب رہ گیا ہے جہاں ابھی کچھ نہیں ہوا۔ میری نظر اس قلعہ بند شہر پر ہے۔ دو طاقتور قبیلے ابھی بچے ہوئے ہیں۔ ایک ہے بنی ربیعہ اور دوسرا ہے بنی تونخ۔ اگر ہم حلب میں جم گئے اور مسلمانوں کو ناکام کر دیا تو تمام قبائل کی حوصلہ افزائی ہوگی اور وہ ہمارے پرچم تلے متحد ہو جائیں گے۔“

”کیا آپ ان قبیلوں کے سرداروں کو یہاں بلوا سکتے ہیں؟“ — انتھونیس نے کہا۔ — ”ہم ابھی سامنے نہیں آنا چاہتے۔ خطرہ ہے کہ ہرقل کے مخبر اور جاسوس ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔“

”تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں“ — بوڑھے نے کہا۔ — ”جب تک تم ہمارے پاس ہو، تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ کسی بھی سردار کو یہاں بلانے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہیں حلب میں پہنچا دیں گے اور سردار تمہارے پاس آجائیں گے۔ ہم تمہیں اپنا لباس دیں گے اور غریب سے کسانوں اور مزدوروں کے بہروپ میں طب میں داخل کریں گے۔“

یعنی بزرگ سے ملنا چاہتے ہیں۔ لوگ انہیں ایک گھر میں لے گئے۔ یہاں ایک ضعیف العمر آدمی نے ان کا استقبال کیا اور انہیں عزت و احترام سے بٹھایا۔ یہ بوڑھا کوئی عام سا اور غریب سا آدمی نہیں لگتا تھا۔ اس کے بولنے کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ صاحب حیثیت ہے۔

”تم رومی ہو“ — بوڑھے نے کہا۔ — ”ہمارے دلوں میں اب رومیوں کی وہ عزت نہیں رہی جو ان کی شکست سے پہلے ہوا کرتی تھی لیکن تم ہمارے مہمان ہو۔ دل سے تمہاری عزت کریں گے۔۔۔ کیا تم لوگ کہیں جا رہے ہو؟ کیا تمہیں ہماری کسی بھی قسم کی مدد درکار ہے؟ راستہ بھول گئے ہو تو ہم راستے پر ڈال دیں گے۔“

”قابل احترام بزرگ!“ — انتھونیس نے کہا۔ — ”ہم راستہ نہیں بھولے۔ ہم ایک نیا راستہ بنانے آئے ہیں اور ہمیں آپ کی اور آپ کے قبیلے کی مدد درکار ہے۔“

”کہو“ — بوڑھے نے پوچھا۔ — ”کیسی مدد چاہئے؟ ہم تمہیں مایوس نہیں کریں گے۔“

”ہمیں اپنی ذات کے لئے کچھ بھی نہیں چاہئے“ — انتھونیس نے کہا۔ — ”ہم آپ کی قوم کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں اور کچھ اپنے لئے بھی۔ ہرقل بھاگ گیا ہے۔ اس کی فوج مسلمانوں کے ہاتھوں کٹ گئی ہے اور جو بچ گئی تھی وہ ایسی بکھر کر بھاگی ہے کہ اس کا وجود ہی ختم ہو گیا ہے۔ میں رومی فوج کا جرنیل ہوں۔ اسے بھی جرنیل سمجھیں۔ یہ عورت اور یہ لڑکا کون ہیں، یہ بعد میں بتائیں گے۔ ابھی ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمیں رومی نہ سمجھیں، اپنا ہم مذہب بھائی سمجھیں۔ ہرقل پہلے بادشاہ ہے اس کے بعد عیسائی اور وہ بھی برائے نام۔ ہم پہلے عیسائی ہیں اس کے بعد رومی۔“

انتھونیس نے وہ صلیب اس بوڑھے کو دکھائی جو روماس کو ابو عبیدہ نے خنجر کے طور پر دی تھی۔

”ہم اس کی سلطنت قائم کرنا چاہتے ہیں جو صلیب کے ساتھ لٹکا ہوا ہے۔“ — انتھونیس نے کہا۔ — ”یہ روم اور ایران جیسی بادشاہی نہیں ہوگی، یہ یسوع مسیح کی سلطنت ہوگی۔ اگر الجزیرہ کے تمام عیسائی قبائل اکٹھے ہو جائیں تو میں اور میرا یہ ساتھی انہیں ایک ایسی زبردست فوج میں منظم کر دیں گے کہ تھوڑے سے عرصے میں مسلمانوں کو شام سے دھکیل باہر کریں گے۔“

سرداروں کو پہلے ہی تیار پایا۔ اب یہ پلان بنانا تھا کہ مسلمانوں کے خلاف معرکہ آرائی کی ابتدا کس طرح کی جائے۔ کچھ دیر بات چیت اور بحث و مباحثہ ہوا اور ایک لائحہ عمل تیار ہو گیا۔

اس کے مطابق سرداروں نے اپنے خاص آدمی بلائے اور انہیں کچھ ہدایات دے کر دوڑا دیا۔۔۔۔۔ دو ہی دنوں بعد قلعہ حلب میں آنے والے پناہ گزین قبائلیوں کی تعداد بڑھنے لگی اور بڑھتی ہی چلی گئی۔ جو مسلمان مجاہدین شہر میں موجود تھے، انہوں نے یہ دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ ان پناہ گزینوں کے ساتھ ہتھیار بھی آرہے ہیں۔ ان ہتھیاروں میں زیادہ تر برہمچیاں تھیں اور اس سے زیادہ کمائیں اور تیروں سے بھری ہوئی ترشیں تھیں۔ بعض ہتھیار تو کھلم کھلا آئے تھے اور زیادہ تر ہتھیار چھپا کر لائے جا رہے تھے۔

رومی اس شہر سے بھاگ گئے تھے۔ ان کے مکان اور فوجیوں کی بارکیں خالی پڑی تھیں۔ پناہ گزین ان میں آکر قیام کرتے تھے اور ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ خیمے گاڑنے پڑے۔ انھونیس سرداروں کو فوجی اور جنگی نوعیت کی ہدایات دیتا تھا اور سردار یہ ہدایات اپنے خاص آدمیوں کو دیتے اور اس طرح تمام لوگوں تک یہ پہنچ جاتی تھیں اور لوگ اس کے مطابق تیاریاں کر رہے تھے۔

انھونیس اور اس کے کسی بھی ساتھی کو مسلمان تو پہچانتے ہی نہیں تھے۔ لیزا اور یوکلس تو شاہی خاندان کے افراد تھے۔ انہیں مسلمان پہچان ہی نہیں سکتے تھے۔ البتہ یوکلس کو تقریباً "تمام عیسائی سردار پہچانتے تھے اور یہ بھی ایک وجہ تھی کہ یہ سردار فوراً" انھونیس کے ساتھ ہو گئے تھے۔ یوکلس نے ایک قبائلی لڑکی کو نسطرین کی دست درازی سے اس طرح بچلایا تھا کہ تلوار نکال لی تھی اور اگر محافظ دسنے کا ایک افسردہ میان میں نہ آ جاتا تو ان دونوں بھائیوں میں سے کوئی ایک قتل ہو جاتا۔ پھر یوکلس لڑائی سے پہلے ان قبائلیوں کے لشکر میں گھومتا پھرتا رہا تھا اور سب کے دلوں میں اس واقعہ کی وجہ سے یوکلس کی عزت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ قبائلی یوکلس کو اپنی عزت و آبرو کا محافظ سمجھنے لگے تھے۔ قبائلیوں کا تیس ہزار کا لشکر بدول ہو کر ہرقل کا ساتھ چھوڑ آیا تھا جس کی اور وجوہات تو تھیں لیکن اس میں یوکلس کا عمل دخل بھی تھا۔ اب وہی یوکلس اپنے باپ کا ساتھ چھوڑ کر اور شاہی زندگی ترک کر کے ان کے پاس آ گیا تھا۔

میں اس سوال کا جواب نہیں ملتا کہ حلب جیسے بڑے اور قلعہ بند شہر مسلمانوں نے کیوں اتنا نظر انداز کر رکھا تھا کہ وہاں مجاہدین کی نفرتی آبادی کے لحاظ سے بہت تھوڑی تھی اور یہ چند ایک مجاہدین جزیہ اور محصولات وصول کرنا اور انتظامیہ کا کاروبار چلانے میں مصروف رہتے تھے۔ حلب کی آبادی بڑھتی جا رہی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ الجزیرہ کے علاقوں سے بھاگے ہوئے عیسائی قبائل حلب میں جا کر پناہ لیتے تھے۔ مختلف قبیلوں کے کئی ایک سردار بھی وہاں جا پہنچے تھے یا وقتاً فوقتاً وہاں جاتے رہتے تھے۔ حلب میں ابھی بغاوت اور سرکشی کے کوئی آثار نہیں تھے۔

انھونیس، روتاس، لیزا اور یوکلس جب حلب میں داخل ہوئے تو کسی نے انہیں اچھی طرح دیکھا بھی نہیں۔ کسی کو دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ اس قسم کے خاندان برباد پناہ گزین تو حلب میں آ ہی رہے تھے۔ انھونیس اور اس کے ساتھیوں کو بھی ایسے ہی پریشان حال پناہ گزین سمجھا گیا۔ ان کے ساتھ بوڑھے کے بھیجے ہوئے دو خاص آدمی تھے جو انہیں ایک سردار کے گھر میں لے گئے۔

حلب میں جا کر پتہ چلا کہ جس بزرگ کے پاس یہ لوگ گئے تھے، وہ کوئی معمولی حیثیت کا آدمی نہیں بلکہ ان قبائل کا دانشور تھا جسے سردار بھی پیرو مُرشد کا درجہ دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھونیس جن سرداروں کے پاس گیا انہوں نے اس کی اور اس کے ساتھیوں کی بہت ہی عزت اور پذیرائی کی۔

انھونیس نے ان سرداروں کے ساتھ بات کی تو انہوں نے تین چار اور سرداروں کو بلا لیا جو حلب میں ہی موجود تھے۔ انھونیس نے اپنا مدعا اور عزم بیان کیا تو اس نے

یہاں کیوں آئے ہو؟“
 ”میں بادشاہی کو ٹھوکر مار کر آیا ہوں“ — یوکلے نے کہا — ”اُس روز تمہاری عزت چائی تھی، اب تمہارے قبیلے کی عزت بچانے آیا ہوں۔ اب یہیں رہوں گا۔“

لڑکی کے چہرے پر ایسا تاثر آگیا تھا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کے سامنے کھڑا ہے۔ دوسری لڑکیاں ذرا پرے کھڑی دیکھ رہی تھیں۔ لڑکی نے انہیں ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ چلی جائیں۔ وہ سب قہقہے لگاتی چلی گئیں اور کچھ دیر بعد یوکلے اور لڑکی چشموں کے کنارے ایک پھول دار جھاڑی کے پاس اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ دونوں نے ایک دوسرے کو ایک ایک بازو کے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

اُس روز کے بعد لڑکی یوکلے سے کئی بار ملی۔ وہ ایک قبیلے کے سردار کی بیٹی تھی۔ رات کو بھی وہ یوکلے کے پاس آئی اور دونوں قلعے کی دیوار پر بیٹھے یا ٹھٹھکے رہے۔ وہ تو جیسے ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئے تھے۔ یوکلے نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ اب تو لڑکی نے اسے آسمان سے اُتر آؤا فرشتہ سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

”میرا ایک وہم تم کس طرح ختم کر سکتے ہو؟“ — لڑکی نے ایک روز یوکلے سے کہا۔ ”جو سلطنت یا بادشاہی تم قائم کرنے آئے ہو وہ ہو گئی تو تم پھر شہزادے بن جاؤ گے اور مجھے بھول جاؤ گے۔ تمہارے سامنے تو میری کوئی حیثیت ہی نہیں۔“

یوکلے نے اسے الفاظ میں نہیں، اپنے ساتھ لگا کر عملاً ”یقین دلایا کہ وہ اسے کبھی نہیں بھولے گا اور کتنا ہی اونچا کیوں نہ چلا گیا اس کے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ یوکلے نے اپنے ایک ہی بازو میں لڑکی کو اتنی شدت سے بھینچا جیسے اس کی پسلیاں توڑ ڈالے گا۔“

○

انٹھوئیس نے جنگ کی ابتدا کی جو رات مقرر کی تھی، اُس رات قبائلیوں نے بغیر کسی دشواری کے اُن مجاہدین پر قابو پالیا جو قلعے میں موجود تھے۔ وہ جہاں جہاں رہتے تھے وہاں گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ اس کام کے لئے جو قبائلی منتخب کئے گئے تھے، وہ انٹھوئیس اور روتاس کی ہدایات اور ریسرسل کے مطابق پہنچے اور ان مجاہدین کو مقابلے کی مہلت نہ دی۔ ان سب کو ایک بڑے مضبوط دروازوں والے مکان میں بند کر دیا گیا۔

شہر کے صدر دروازے پر دو مجاہدین ڈیوٹی پر رہتے تھے۔ انہیں کسی طرح پتہ چل گیا کہ شہر میں بغاوت ہو گئی ہے اور ان کے ساتھ پکڑے گئے ہیں۔ یہ دونوں وہاں سے

○
 لیزا تو رات کے وقت کبھی باہر نکلتی اور قلعے کی دیوار پر گھوم پھر لیتی تھی، یوکلے نوجوان لڑکا تھا، وہ ایک گھر میں قید رہی نہیں سکتا تھا اور قید رہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اسے مجاہدین میں سے تو کوئی پہچانتا نہیں تھا۔ ایک روز وہ شہر سے نکلا اور ویسے ہی میر سپائے کے لئے ایک طرف چل پڑا۔ اُس طرف سبزہ زیادہ تھا اور بڑے کھنے اور خوبصورت درخت تھے اور وہیں کہیں ایک چشمہ بھی تھا۔ کچھ کھیت بھی تھی۔ وہ اُس طرف جا رہا تھا کہ چار پانچ لڑکیاں کچھ دور سے ہنسی کھیلتی آ رہی تھیں۔ یوکلے کو دیکھ کر وہ رک گئیں۔ یوکلے نے ان کی طرف دیکھا۔ ایک لڑکی دوڑتی ہوئی یوکلے کے پاس آئی۔ یوکلے اسے ٹھیک طرح پہچان نہ سکا۔

”تم وہی ہو؟“ — لڑکی نے کہا — ”میں تمہیں ساری عمر نہیں بھول سکتی۔ تم نے میری عزت بچائی تھی۔ تم نہ ہوتے تو....“
 ”وہ میرا فرض تھا“ — یوکلے نے مسکراتے ہوئے کہا — ”مجھے تو تمہاری صورت ہی یاد نہیں رہی تھی۔“

وہ بڑی بھولی بھالی، معصوم سی اور بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ ابھی تو وہ بمشکل نوجوان ہوئی تھی۔ جذبات کی شدت سے اس نے یوکلے کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ اس نے محسوس کیا کہ یوکلے کا بیاں ہاتھ دائیں ہاتھ سے بہت ہی مختلف ہے۔ لڑکی نے اس کے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا کر چومے اور پھر دائیں ہاتھ کو غور سے دیکھا۔ یوکلے نے اسے بتایا کہ اس کا بیاں بازو پیدائشی طور پر بے کار اور ٹوکھا ہوا ہے۔ لڑکی کے چہرے پر اداسی آئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”میں تمہیں خوابوں میں دیکھتی رہی ہوں“ — لڑکی نے کہا — ”جب یہ خیال آتا تھا کہ تمہیں ساری عمر نہیں دیکھ سکوں گی تو بہت دکھ ہوتا تھا۔ تم جیسے غیرت مند آدمی مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز لگتے ہیں۔“

”وہ میرا بڑا بھائی تھا جسے میں قتل کرنے کو تیار ہو گیا تھا“ — یوکلے نے کہا — ”میرا ایک بازو نہیں ہے پھر بھی میں تلوار سے، برچھی اور کھڑے سے دو تین آدمیوں کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔“

”سنا تھا تم بادشاہ کے بیٹے ہو“ — لڑکی نے کہا — ”وہ بادشاہ تو بھاگ گیا ہے، تم

نکلنے لگے تو ان پر چند ایک قبائلیوں نے حملہ کر دیا۔ دونوں نے جم کر مقابلہ کیا، زخمی ہوئے لیکن وہاں سے نکل آئے۔ وہاں سے تین میل دور ایک بہتی تھی۔ وہاں پہنچے اور دو گھوڑے لے کر ان پر سوار ہوئے اور گھوڑے دوڑا دیئے۔ تقریباً بیس میل دور قسریں کا شہر تھا۔ خالد بن ولید اُس وقت قسریں میں تھے۔ یہ ایک مضبوط قلعہ تھا اور خاصا وسیع و عریض شہر تھا۔ یہ رومیوں سے خالد بن ولید نے چھینا اور انہیں بھگایا تھا۔ دونوں مجاہد اپنے زخموں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اگلے روز قسریں پہنچے اور خالد بن ولید کو اطلاع دی کہ حلب میں بغاوت ہو گئی ہے۔ خالد بن ولید نے ایک قاصد سپہ سالار ابو عبیدہ کو پیغام دینے کے لئے بھیج دیا اور اپنا لشکر فوراً تیار کر کے حلب کی طرف روانہ ہو گئے۔ خالد بن ولید کی پیش قدمی تیز و تند طوفان کی طرح چلا کرتی تھی۔ ان کی رسد اونٹوں پر اور تیل گاڑیوں پر پیچھے آ رہی تھی جس کی طرف خالد بن ولید کی ذرا سی بھی توجہ نہیں تھی۔ وہ تو بھوکے پیاسے بھی اپنے ہدف پر پہنچنا چاہتے تھے۔

یہ گھوڑ سوار لشکر جب حلب پہنچا تو خالد بن ولید جیسے تاریخ ساز سالار نے بھی محسوس کر لیا کہ اس قلعے کو آسانی سے سر نہیں کیا جاسکے گا۔ مشہور تاریخ دان واقدی لکھتا ہے کہ دُور دُور کے قبائل کے لڑنے والے لوگ بھی حلب میں اکٹھے ہو گئے تھے اور بروقت مسلمانوں کو پتہ نہ چل سکا نہ انہوں نے انہیں غور سے دیکھنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ مسلمان انہیں پناہ گزین سمجھتے رہے اور یہ خیال رکھا کہ انہیں رہائش اور روٹی ملتی رہے اور کوئی محرومی اور محتاجی محسوس نہ کریں۔ اب یہی لوگ چاروں طرف دیواروں پر اس طرح کھڑے تھے کہ ان کے ہاتھوں میں کمائیں اور بعض کے پاس پھینکنے والی برہمچیاں تھیں۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ان کے درمیان سے ہوا بھی نہیں گزر سکتی تھی۔ خالد بن ولید کے لشکر کی تعداد چار ہزار تھی۔ خالد بن ولید نے دیواروں پر کھڑے قبائلیوں پر تیر پھینکے لیکن دیواروں سے جو تیر آئے ان کے سامنے اپنے تیر انداز ٹھہر نہ سکے۔

خالد بن ولید نے سپہ سالار کی طرف ایک قاصد اس پیغام کے ساتھ دوڑایا کہ مزید لشکر کی ضرورت ہے کیونکہ قلعہ بھی مضبوط ہے اور دفاع اور زیادہ مستحکم اور ملک ہے۔ ابو عبیدہ نے سالار عیاض بن غنم کو پانچ ہزار گھوڑ سواروں کے ساتھ حلب پہنچنے کا حکم دیا۔ یہ لشکر بڑی تیزی سے روانہ ہو گیا۔

خالد بن ولید قلعے توڑنے اور سر کرنے کی خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے جانباز گروہ بنا رکھے تھے۔ تاریخ اسلام کا یہ عظیم سپہ سالار محاصرے کو طویل دینے کا قائل نہیں تھا۔ واقدی نے لکھا ہے کہ محاصرہ بہت طویل ہو گیا تھا۔ دو یورپی مورخ لکھتے ہیں کہ خالد بن ولید اس قدر غیض و غضب میں تھے کہ انہوں نے محاصرہ طویل نہ ہونے دیا بلکہ ایسی چالیں چلیں جن سے عیسائی قبائلی ان کے پھندے میں آ گئے۔

انٹونیٹس نے یہ حرکت کی کہ محاصرے کے تیسرے چوتھے ہی روز ان تمام مجاہدین کو قلعے کی دیوار پر پہلو بہ پہلو کھڑا کر دیا جنہیں ایک رات سوتے میں پکڑ کر قید کر دیا گیا تھا۔ سب کے ہاتھ پیٹھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے دیوار پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ محاصرہ فوراً اٹھا لو۔ ہم زیادہ انتظار نہیں کریں گے۔ ان میں پہلے دس آدمیوں کے سر کاٹ کر تہماری طرف پھینک دیں گے۔ محاصرہ پھر بھی نہ اٹھایا گیا تو مزید دس آدمیوں کے سر کاٹ کر باہر پھینکے جائیں گے۔

”محاصرہ نہیں اٹھانا“ — ایک قیدی مجاہد نے بڑی ہی بلند اور پُر جوش آواز میں کہا — ”ہمارے سر کاٹ جانے دو۔ ہم گھروں سے اللہ کی راہ میں سر کوانے ہی نکلے ہیں۔ محاصرہ نہ اٹھانا۔ اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ قلعہ توڑ لو گے۔“

تمام قیدی مجاہدین نے جن کی تعداد کم و بیش ایک سو تھی، نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ وہ سب یہی کہہ رہے تھے کہ محاصرہ نہ اٹھانا، ہمارے سر کاٹ جانے دو۔

ان قیدی مجاہدین کے جذبہ ایثار اور جوش و خروش نے باہر والے مجاہدین کو آگ بگولہ کر دیا۔ یہ تو سالاروں کا کمال تھا کہ انہوں نے مجاہدین کو اپنے قابو میں رکھا اور نہ وہ تو اس قدر جوش میں آ گئے تھے کہ سب کے سب قلعے پر ہلہ بول دینے کو تیار ہو گئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ تیر انداز اوپر دیوار پر تیر پھینکتے رہیں اور وہ دروازے توڑ لیں گے یا دیوار میں کہیں شگاف ڈال لیں گے۔ خالد بن ولید اور عیاض بن غنم ہوش مند سالار تھے۔ وہ جذبات کے جوش سے نہیں جھکی فہم و فراست سے کارروائیاں کیا کرتے تھے۔

ایک دو دنوں کی کوششوں کے بعد خالد بن ولید نے شہر کے اندر افراتفری پھیلانے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ فیتے والے تیر شہر کے اندر پھینکنے شروع کر دیئے۔ یہ آگ لگانے والے تیر تھے۔ انہیں دیواروں کے اوپر سے اندر تک پہنچانا آسان نہیں تھا لیکن شہر کے

ایک طرف کچھ بلند جگہ مل گئی جس پر تیر انداز کھڑے ہو کر تیر انداز پھینک سکتے تھے۔ بعض تیر انداز درختوں پر چڑھ گئے اور وہاں سے آگ والے تیر انداز پھینکنے لگے۔ یہ تیر کچھ زیادہ اثر انداز نہ ہوئے جس کی وجہ یہ تھی کہ آبادی دیواروں سے اتنی دور تھی جہاں تک تیر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ایک میدان میں خیمے لگے ہوئے تھے۔

○

دونوں سالاروں — خالد بن ولید اور عیاض بن غنم — کو قلعے کے اندر کے حالات کا تو کچھ بھی پتہ نہیں تھا۔ اندر اگر کوئی مسلمان جاسوس تھا بھی تو وہ باہر نہیں آسکتا تھا اور باہر سے کسی کو قبائلی عیسائیوں کے بہروپ میں اندر نہیں بھیجا جاسکتا تھا۔ دیواروں پر جو قبائلی تیر اور کمائیں اور پھینکنے والی برچھیاں لگے کھڑے رہتے تھے، وہ روز آؤں کی طرح جوش و خروش میں معلوم ہوتے تھے۔

خالد بن ولید نے اپنے نائب سالاروں سے اور ایک دو مرتبہ مجاہدین کے پورے لشکر سے کہا تھا کہ حلب کو اپنا ہی شہر سمجھو۔ ان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے خالد بن ولید نے پُر اعتماد انداز میں کہا تھا کہ شہر میں کوئی تربیت یافتہ اور تجربہ کار فوج نہیں۔ یہ لوگ فردا "فروا" لڑنا جانتے ہیں یا ہجوم کی صورت میں ہلے بول سکتے ہیں لیکن محاصرے میں ٹھہرا اور محاصرہ توڑنا ان کے بس کی بات نہیں بلکہ ان لوگوں کو اپنے بس میں سمجھو اور تھوڑے ہی عرصے بعد یہ ہتھیار ڈال کر ہماری اطاعت قبول کر لیں گے یا کوئی ایسی حماقت کر بیٹھیں گے جو ان کی شکست کا باعث بنے گی۔

خالد بن ولید کو یقیناً "معلوم نہیں تھا کہ محصورین کی قیادت رومی فوج کے ایک بھگڑے جرنیل کے ہاتھ میں ہے اور اس کا نائب اور معاون رومی فوج کا ہی ایک افسر ہے جو سپہ سالار ابو عبیدہ کی قید میں رہ کر گیا ہے۔ مسلمان سالاروں کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کے ساتھ ہرقل کی ایک بیوی بھی ہے جو ایران کے شاہی خاندان کی عورت تھی اور ہرقل کے شاہی خاندان میں دھوکے داخل ہوئی تھی۔ مسلمانوں کے ہاں توحید کا جذبہ اور دین و ایمان تھا اور ان کا اپنا ایک کلچر تھا جس سے وہ ذرا سا بھی نہیں ہٹتے تھے۔ اس کے مقابلے میں قلعے کے اندر جو رومی قیادت تھی، اس کا اپنا کلچر اور اپنا کردار تھا جس سے وہ لوگ اپنی ضرورت اور اپنے مفادات کے مطابق دستبردار بھی ہو جایا کرتے تھے۔ قلعے کے اندر کے حالات کچھ اس طرح تھے کہ انٹونیس اور روتاس تو جیسے راتوں کو

سوتے بھی نہیں تھے۔ ان کے لئے یہ ایک قلعے یا ایک بڑے شہر کی لڑائی نہیں تھی بلکہ ان کی زندگی اور موت کی لڑائی تھی۔ انٹونیس کا یہ عزم بھی تھا کہ وہ ایک عیسائی سلطنت کی بنیاد رکھے گا اور الجزیرہ کے قبائلی عیسائیوں کو ایک جنگی طاقت کی صورت میں منظم کرے گا۔ اس عزم کی تکمیل کے لئے بھی ضروری تھا کہ وہ حلب کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ روتاس اس کا دست راست بن گیا تھا۔

ہرقل کا بیٹا یوکلکس بھی ان کے ساتھ تھا لیکن وہ نوجوان تھا اور ایک بازو سے معذور بھی۔ وہ ایک ہاتھ سے لڑنا جانتا تھا، قیادت کے قابل نہیں تھا۔ پھر بھی وہ اپنے آپ کو جرنیل ہی سمجھتا تھا۔ اپنی اس حیثیت کو وہ اپنا حق سمجھتا تھا کیونکہ وہ شاہ ہرقل کا بیٹا تھا۔ وہ بھی دن رات بھگتا دوڑتا رہتا تھا اور جب سے حلب محاصرے میں آیا تھا، اس رومی نوجوان نے یہ معمول بنالیا تھا کہ دیوار پر جانا یا نیچے شہر میں گھوم پھر رہا ہوتا تو چند ایک آدمیوں کو اکٹھا کر کے انہیں بتاتا تھا کہ وہ یسوع مسیح کی سلطنت کے قیام کے لئے لڑ رہے ہیں اس لئے آخر فتح ان کی ہوگی۔ اس طرح وہ جوشیلی اور جذباتی باتیں کر کے ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتا رہتا تھا۔ وہ کئی کئی راتیں اپنی ماں کے پاس جاتا ہی نہیں تھا۔ عام طور پر قلعے کے صدر دروازے کے اوپر جو کمرے بنے ہوئے تھے، ان میں سے کسی کمرے میں سو جاتا تھا۔

○

انٹونیس، لیزا اور یوکلکس ایک مکان میں رہتے اور روتاس الگ مکان میں رہتا تھا۔ یہ نہایت اچھے، صاف ستھرے اور اونچے درجے کے مکان تھے۔ روتاس دو چار دنوں کے وقفے سے لیزا کے گھر آیا کرتا تھا اور اس کا یہ آنا محض رسمی ہوتا تھا۔ جب سے حلب محاصرے میں آیا تھا روتاس نے لیزا کے ہاں جانا بہت ہی کم کر دیا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ محاصرے کے سلسلے میں اسے دن رات بھاگ دوڑ کر کرنی پڑتی تھی۔

یہ انٹونیس کا گھر تھا لیکن وہ بھی اب اس گھر میں اس طرح آتا تھا جیسے روتاس کی طرح رسمی طور پر آگیا ہو۔ انٹونیس اور روتاس کا تو یہ عالم تھا کہ الگ الگ بھاگتے دوڑتے رہتے تھے۔ ابھی دیوار پر ہیں تو یوں لگتا تھا جیسے کود کر نیچے آگئے ہوں۔ دیکھنے والوں کو شک ہوتا تھا کہ وہ ہر وقت ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ انٹونیس کبھی بہت دیر سے گھر جاتا اور پٹنگ پر گرتا اور اس کی آنکھ لگ جاتی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ہڑبڑا کر جاگ اٹھتا

باہر ہونا چاہئے۔ کیا تم خود نہیں سوچ سکتیں کہ ان قبائلیوں کی عورتوں کو تم لڑنے کے لئے تیار کر سکتی ہو؟“

انتھونیس لیزا کو پوری طرح نہیں سمجھ سکا تھا جس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ لیزا نے اس کے ساتھ جو دوستی لگائی تھی وہ صرف جسم کے ساتھ تعلق رکھتی تھی اور لیزا نے اسے جسمانی تعلق کی تسکین کے لئے اپنا دوست بنایا تھا۔ لیزا ہر قل کے حرم کی ایک عورت تھی۔ اسے صرف یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ ہر قل کی بیوی تھی اور دوسرا اعزاز یہ کہ وہ ایران کے شاہی خاندان میں سے تھی۔ وہ جانتی تھی کہ شاہی محلات میں خوبصورت عورت کا استعمال کیا ہوتا ہے۔ اس نے ایران کے محلات میں بھی دیکھ لیا تھا اور روم کے بادشاہ کے ہاں بھی۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ لیزا جو ان اور غیر معمولی طور پر حسین و جمیل لڑکی تھی۔ اسے خون کے رشتوں نے ایک مسلمانی دھوکہ بنا کر ہر قل کے ہاں بھیجا تھا کہ اس پر اپنے حُسن کا ظلم طاری کر کے اسے زہر دے کر وہاں سے بھاگ نکلنے کی کوشش کرے۔ ہر قل کے پاس پہنچی تو اس کی بیوی بن گئی۔ وہ بڑی ہی زہریلی ناگن بن کر ہر قل کے پاس آئی تھی لیکن ہر قل کو دیکھ کر اور اس کے جذبات سے متاثر ہو کر وہ ناگن سے وہ انسان بن گئی تھی جس میں جذبات ہوتے ہیں اور دل و جگر بیدار ہو کر اپنا آپ اپنی پسند کے انسان کے حوالے کر دیتے ہیں لیکن ہر قل نے تھوڑے ہی عرصے میں اس کے یہ جذبات کچل ڈالے اور اسے اپنے حرم میں پھینک دیا جو عورتوں کا گودام تھا۔ اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ لیزا کی ذات میں صرف حیوانی جذبات رہ گئے۔ وہ جوان تھی اور اسے ایک جوان ساتھی کی ضرورت تھی۔

اس جذباتی کیفیت میں وہ ایسا آتش فشاں پھاڑ بن گئی تھی جس کا منہ بند تھا اور لاوہ باہر نکلنے کو تڑپ رہا تھا۔ انتھونیس کی جگہ اسے کوئی اور اپنے قریب آتا نظر آ جاتا تو وہ اسی کی ہو کر رہ جاتی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ انتھونیس اس کے قریب آ گیا اور لیزا نے لپک کر اسے اپنے ساتھ چپکالیا اور جب دیکھا کہ اس شخص کے ساتھ ملاقاتیں آسانی سے ہو جاتی ہیں تو فرض کر لیا کہ یہی اس کا خاوند ہے۔ اب تو اس کے بیٹے یوکلُس نے بھی قبول کر لیا تھا کہ اس کا لپ ہر قل نہیں انتھونیس ہے۔

بادشاہوں کی بیویاں اور ان کے حرموں کی عورتوں میں قوی جذبہ نام کو بھی نہیں

اور باہر کو بھاگ جاتا۔ وہ گھر ہوتا تو بھی لگتا تھا گھر سے غیر حاضر ہے۔

یہ دونوں آخر کمائڈر تھے۔ انہیں احساس تھا کہ جن کی وہ قیادت کر رہے ہیں وہ لڑنا تو جانتے ہیں لیکن منظم ہو کر لڑنے کا انہیں کوئی تجربہ نہیں۔ وہ ان لوگوں کو ہدایات دیتے رہتے اور خود دیوار پر گھوم پھر کر دیکھتے رہتے تھے کہ مسلمان دروازوں کے قریب نہ آ جائیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ جوان آدمیوں کو قلعے سے نکل کر مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے بھی تیار کر رہے تھے۔ مختصر یہ کہ دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ وہ محاصرے کے دوران لوگوں کو ٹریننگ بھی دے رہے تھے۔

ایک رات انتھونیس گھر آیا اور آتے ہی لیٹ گیا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ لیزا اسے دیکھتی رہی کہ وہ کوئی بات کرے گا۔ ذرا سنا سنا کر انتھونیس نے محاصرے کی بات شروع کر دی۔ لیزا کے چہرے پر نمایاں طور پر اکتاہٹ کا تاثر آ گیا اور صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ انتھونیس کی باتوں میں ذرا سی بھی دلچسپی نہیں لے رہی۔

”کیا تم میرے ساتھ کوئی اور بات نہیں کرنا چاہتے؟“ — لیزا نے ایسے لہجے میں کہا جسے انتھونیس بڑی اچھی طرح سمجھتا تھا۔

”لیزا!“ — انتھونیس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا — ”کیا تم یہ بات کہہ رہی ہو؟.. میں تو یہ توقع رکھتا ہوں کہ میں گھر آؤں تو تم پہلی بات مجھ سے یہ پوچھو کہ محاصرہ کب ٹوٹے گا اور اسے توڑنے کی کوئی صورت پیدا کی جا رہی ہے یا نہیں؟ تم تو یوں بات کر رہی ہو جیسے حالات معمول کے مطابق ہیں۔ مجھے تو کوئی اور بات سوجھتی ہی نہیں۔“

لیزا کچھ زیادہ ہی اکتاہٹ کا اظہار کر رہی تھی۔ انتھونیس نے اسے غور سے دیکھا تو لیزا کی آنکھوں میں اسے کوئی اور ہی غماز چڑھا ہوا نظر آیا۔ وہ اس غماز سے اور لیزا کے چہرے پر آئے ہوئے تاثرات سے بڑی اچھی طرح واقف تھا۔ ان دونوں کے تعلقات میاں بیوی والے تھے۔ یہ کوئی عشق و محبت والا معاملہ نہیں تھا کہ یہ دونوں ایک دوسرے پر مرتے ہوں۔

”لیزا!“ — انتھونیس نے کہا — ”ہوش میں آؤ اور حقیقت کو دیکھو۔ یہ وقت رومان لڑانے کا نہیں حالات کو دیکھو اور سوچو کہ ہم یہ جنگ ہار گئے تو ہمارے لئے کوئی پناہ نہیں ہوگی۔ ہم یہاں سے بھاگ کر جائیں گے کہاں؟ بنو تغلب جیسے طاقتور قبیلے نے چند اور قبیلوں کے ساتھ مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی ہے۔ ہمیں تو میری طرح گھر سے

لیکن انتھونیس تو جیسے اس کے ہاتھ سے نکل ہی گیا تھا۔

○

اگلی صبح لیزا کی آنکھ اُس وقت کھلی جب سورج کی کرنیں قلعے کی دیواروں کے اوپر سے اندر آگئی تھیں۔ لیزا ابھی اور تمام کمروں میں گھوم پھر آئی۔ وہاں انتھونیس بھی نہیں تھا یوں کھس بھی نہیں تھا۔ یہ تو اس کا روزمرہ کا معمول تھا لیکن اس صبح اُس نے اپنے آپ کو کچھ زیادہ ہی تنہا محسوس کیا اس کی ملازمہ نے اس کے آگے ناشتہ رکھا۔ لیزا ناشتے پر اور ملازمہ فرش پر بیٹھ گئی۔

”خدا آپ کو اور زیادہ عزت اور وقار دے ماکن!“ — ملازمہ نے کہا — ”کچھ ہم غریبوں کو بھی بتادے کیا یہ محاصرہ اٹھ جائے گا؟ آپ کو تو معلوم ہی ہو گا، شہر میں اتناج کم پڑتا جا رہا ہے۔ پانی کی تو کمی نہیں لیکن صرف پانی پر تو زندہ نہیں رہا جاسکتا۔“

”گھبرائو نہیں!“ — لیزا نے کہا — ”محاصرہ اٹھ جائے گا۔ نہ اٹھا تو باہر نکل کر مسلمانوں کے لشکر پر حملہ کریں گے۔“

”آپ کو گرجے میں کبھی نہیں دیکھا“ — ملازمہ نے کہا — ”گرجے میں ہر روز اپنی فتح کی اور مسلمانوں کی شکست کی دعائیں ہوتی ہیں۔ پادری کہتے ہیں کہ گناہوں سے توبہ کرو، یہ بہت بڑی آفت ہے جو ہم پر گناہوں کی وجہ سے نازل ہوئی ہے۔ ہم غریبوں نے کیا گناہ کئے ہیں!“

لیزا نے ملازمہ کی بات پوری نہ ہونے دی اور فس پڑی۔ ملازمہ چپ ہو گئی اور لیزا کے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ ملازمہ نے لیزا کو بتایا کہ شہر کے کچھ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ باہر نکل کر مسلمانوں پر حملہ کیا جائے لیکن بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ دشمنی ختم کر دی جائے اور ان کے لئے دروازے کھول دیئے جائیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمان بڑے اچھے لوگ ہیں۔ جس شہر کو فتح کرتے ہیں اس شہر کے لوگوں کے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک کرتے ہیں۔

لیزا کی ہنسی ایک مسکراہٹ میں سمٹ آئی تھی۔ اس نے ملازمہ کی اس بات کو ذرا کی بھی اہمیت نہ دی اور اس طرح سنتی رہی جیسے وہ کوئی بڑی ہی دلچسپ بات سنا رہی ہو۔ اس نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔

محاصرے کا شور و غل شہر کے اندر بھی سنائی دے رہا تھا۔ محاصرے کی ایک اور

ہوا کرتا تھا نہ انہیں کسی ملک اور وطن سے محبت ہوتی تھی۔ وہ تو اس صورت حال کو بھی قبول کئے رکھتی تھیں کہ کوئی اور بادشاہ اس ملک پر حملہ کرے گا اور انہیں بھی اپنے قبضے میں لے کر اپنی تفریح کا ذریعہ بنالے گا یا کوئی جرنیل یا کوئی شہزادہ انہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ انہیں فتح و شکست کے ساتھ ذرا سی بھی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔

لیزا بھی ایسی ہی عورتوں میں سے ایک تھی۔ اُس وقت اسے حلب کی نہیں انتھونیس کی شدید ضرورت تھی۔ اس نے یہ بھی محسوس نہ کیا کہ انتھونیس بھی ہرقل کی طرح اس سے آگتا سکتا ہے۔ اس نے انتھونیس میں اپنے جذبات کی حرارت پیدا کرنے کی کوشش کی مگر انتھونیس اس کی جذباتی سطح سے بہت اوپر چلا گیا تھا۔ اس نے لیزا کو دھکا مارا تو نہیں لیکن یہ بھی قبول نہ کیا کہ لیزا اس کے پاس بیٹھے۔

”تم اپنی بادشاہی قائم کرنے کی فکر میں ہو“ — لیزا نے یاس انگیز لہجے میں کہا۔

”یہ بادشاہی نہ جانے کب قائم ہوگی لیکن تم ابھی سے شاہ ہرقل بن گئے ہو۔ تم میرے ساتھ اب پہلے کی طرح بیٹھ کر بات ہی نہیں کرتے۔“

انتھونیس بہت ہی تھکا ہوا تھا۔ تھکاوٹ کے علاوہ اس پر محاصرہ اور حلب کی فوج و شکست سوار تھی اور یہی ایک سوچ اس کے ذہن پر غالب رہتی تھی کہ محاصرے کو کس طرح توڑے اور مسلمانوں کو یہاں سے بھگا دے۔ اس نے لیزا کی طرف وہ توجہ نہ دی جس کی وہ طلبگار تھی۔ وہ کبھی جذباتی اور کبھی شائق لہجے میں کچھ نہ کچھ بولتی رہی اور انتھونیس گہری نیند سو گیا۔ لیزا نے اسے سوتے ہوئے دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے وہ مر گیا ہو۔ وہ اس کے چہرے پر نظریں گاڑے دیکھتی رہی اور اسے یوں دھچکا لگا جیسے ایک چشمہ تھا جو اچانک خشک ہو گیا ہو۔

اس کا اپنا بیٹا یوں کھس جسے دیکھ کر وہ جیتی تھی اور جس پر وہ اپنی جان بچھاو کئے رکھتی تھی اس کی طرف پہلی سی توجہ نہیں دیتا تھا۔ وہ تو دو دو اور کبھی تین تین دن اور راتیں گھر سے غائب رہتا تھا۔ کبھی ذرا سی دیر کے لئے لیزا کے پاس آجاتا اور اسے حوصلہ اور تسلی دے کر بھاگ بھاگ چلا جاتا۔ انتھونیس تو کہتا تھا کہ وہ یسوع مسیح کی سلطنت قائم کرے گا لیکن یوں کھس کو اس سلطنت کے ساتھ یہ دلچسپی زیادہ تھی کہ وہ ہرقل اور قسطنطین کو قتل کرے گا۔ لیزا نے کبھی نہ سوچا کہ اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ چپکالے تاکہ وہ لڑائی میں مارے جانے سے محفوظ رہے۔ وہ انتھونیس ہی کی ضرورت محسوس کرتی تھی

خالد بن ولید ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ میں شاہ ہرقل کے جاسوسی کے محکمے کا عہدے دار ہوں۔ میں مجیس بدل کر مسلمانوں کی خیمہ گاہوں میں گیا ہوں اور خالد بن ولید کو قریب سے دیکھا ہے۔ شام سے ہماری فوج کے پاؤں اسی سالار نے اکھاڑے تھے اور اکھڑے بھی ایسے کہ کہیں جم نہ سکے۔

”یہ نام میں نے بھی سنا ہے“ — لیزا نے کہا — ”ہرقل کو یہ کہتے سنا تھا کہ خالد بن ولید کے قتل کا انتظام ہو جائے تو میں مسلمانوں کو صرف شام سے ہی نہ نکالوں بلکہ عرب سے بھی بھاگ کر ہندوستان میں ڈبو دوں۔ قاتلوں کو اس تک پہنچانا ممکن نظر نہیں آتا۔“

”آپ کو پوری طرح معلوم نہیں“ — روتاس نے کہا — ”دو مرتبہ خالد بن ولید کو قتل کرنے کے لئے چار چار آدمی بھیجے گئے تھے۔ وہ مسلمانوں کے لباس میں گئے تھے اور عربی عربوں کی طرح بول سکتے تھے اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ مسلمانوں کے لشکر میں سے کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ کوئی اور ہیں لیکن وہ سب وہاں جا کر خود قتل ہو گئے۔ دونوں جماعتوں کی کہانی الگ الگ ہے لیکن اس وقت ہمارے سامنے مسئلہ اُس محاصرے کا ہے اور اس کا سالار خالد بن ولید ہے جو قلعے توڑنے اور سر کرنے کی خصوصی مہارت رکھتا ہے۔“ — روتاس بولتے بولتے چپ ہو گیا اور باہر کی طرف دیکھ کر بولا — ”وہ دیکھیں، آئیں، میں آپ کو خالد بن ولید دکھاتا ہوں۔“

روتاس لیزا کو دیوار کی برجی کے قریب لے گیا۔ دور دو گھوڑ سوار آگے آگے اور آٹھ دس گھوڑ سوار ان کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔

”اگلے دو سواروں میں جو دائیں طرف ہے وہ خالد بن ولید ہے“ — روتاس نے کہا — ”بائیں طرف عیاض ہے۔ میں اس کا پورا نام نہیں جانتا، یہ بھی سالار ہے۔ آپ اتنی دُور سے خالد بن ولید کا چہرہ اچھی طرح نہیں دیکھ سکتیں۔ قریب سے دیکھیں تو دشمن ہونے کے باوجود آپ بے ساختہ کہہ انھیں گی کہ اس چہرے پر خدا نے اپنا تاثر سما دیا ہے جو دیکھنے والوں کو متاثر کرتا ہے۔ اس سالار کے چہرے پر اس کی روح کی چمک دمک بھی نظر آتی ہے۔ یہ اُن جرنیلوں اور سالاروں میں سے ہے جو صرف فتح کرنا جانتے ہیں اور شکست سے واقف ہی نہیں ہوتے۔“

”تو کیا خالد بن ولید حلب کو فتح کر لے گا؟“ — لیزا نے پوچھا۔

رات گزر گئی تھی۔ شہر کے جو لوگ شہر کے دفاع کے لئے دیوار پر کھڑے تھے، وہ نعرے لگا رہے تھے اور مسلمانوں کو لٹاکار بھی رہے تھے۔ ان کا حوصلہ اور جوش و خروش بظاہر تازہ معلوم ہوتا تھا۔ لیزا آہستہ آہستہ چلتی گئی۔ وہ کسی خاص جگہ پہنچنے کے ارادے سے نہیں نکلی تھی۔ شہر کی عورتیں اسے جانتی تھیں۔ وہ ان کے جرنیل کی بیوی تھی۔ ایک جگہ عورتوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی تھیں۔ اس سے پوچھنے لگیں کہ محاصرہ کب تک رہے گا اور کیا یہ شہر لمبے عرصے کے لئے محاصرے میں ہی رہے گا؟ لیزا اپنے آپ میں آگئی جیسے بیدار ہو گئی ہو۔ اس نے عورتوں کو بہت تسلیاں دیں اور ان کا حوصلہ اس طرح مضبوط کیا کہ انہیں کہا کہ وہ بھی لڑنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ محاصرے کو طویل نہیں ہونے دیا جائے گا اور جلد ہی باہر نکل کر مسلمانوں پر بڑا ہی زوردار حملہ کیا جائے گا۔

اس نے جرنیل کی بیوی کی حیثیت سے ایسی جوشیلی باتیں کیں کہ عورتوں کی گھبراہٹ ختم ہو گئی اور کئی عورتوں نے کہا کہ وہ مردوں کی طرح لڑیں گی اور مسلمانوں کا محاصرہ کامیاب نہیں ہونے دیں گی۔ لیزا کے اپنے ذہن میں بھی کچھ تبدیلی آگئی اور وہ آگے کو چل پڑی۔

کچھ دیر بعد وہ دیوار پر پہنچ گئی۔ دیوار اتنی چوڑی تھی کہ اس پر چار پانچ آدمی پہلو بہ پہلو آسانی سے چل پھر سکتے تھے لیکن اُس وقت دیوار پر چلنے کے لئے راستہ ہی نہیں ملتا تھا کیونکہ شہر کے تقریباً تمام لوگ دیوار پر کھڑے تھے اور ادھر ادھر آ جا بھی رہے تھے۔ لیزا اس ہجوم میں سے راستہ بنا تی چلی جا رہی تھی۔ اسے جانے والے آدمی رک کر سلام کرتے تھے۔ اس کی گردن اس خیال سے تن گئی اور سر اونچا ہو گیا کہ وہ اس شہر کے سب سے بڑے جرنیل کی بیوی ہے۔ وہاں تو اتھوٹے اکیلا ہی جرنیل تھا اور ایک غیر منظم لشکر کا کمانڈر رہنا پڑا تھا۔

لیزا نے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ رک کر پیچھے دیکھا۔ وہ روتاس تھا۔ لیزا کا چہرہ چمک اٹھا۔ اُس نے روتاس سے پوچھا کہ صورت حال کیا ہے اور کیا محاصرہ جلدی توڑا جاسکے گا یا شہر کو خطرہ ہے؟

”محاصرے کو تو ہم نے روکا ہوا ہے“ — روتاس نے جواب دیا — ”لیکن یہ کہنا کہ کوئی خطرہ نہیں اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنے والی بات ہے۔ مسلمانوں کا سپہ سالار

”میں آپ کا حوصلہ نہیں توڑنا چاہتا“ — روتاس نے کہا — ”ہم جانیں لڑاؤں گے لیکن حلب کو بچانے کے لئے ہمیں اس شہر کی آدھی آبادی قربان کرنی پڑے گی۔ موقع ملے ہی ہم باہر نکل کر حملہ کریں گے۔“

روتاس بولتا رہا۔ وہ لیزا کو بتا رہا تھا کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ لیزا کو صورت حال سے تفصیلاً آگاہ کر رہا تھا اور لیزا نے باہر سے نظریں ہٹا کر روتاس کے چہرے پر روک لیں اور اسے نظر بھر کر دیکھا۔ پھر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر ایسا تبسم آگیا جس میں کچھ تشنگی سی تھی۔ لیزا نے بغیر کسی سوچ اور بغیر ارادے کے روتاس کا بازو پکڑا اور اسے اس چھوٹی سی جرحی سے ہٹالائی۔ روتاس اس کے ساتھ پالتو جانور کی طرح چل پڑا۔

○

انتھونیس اور یوکلِس کی طرح روتاس پر بھی بیچانی کیفیت طاری رہتی تھی۔ وہ بھی شہر کے لوگوں کے کمانڈروں میں سے تھا۔ اس کی عمر تیس چالیس سال کے درمیان تھی اور وہ خوب رو آدمی تھا۔ لیزا سے تین چار سال ہی چھوٹا تھا۔ وہ شاہی خاندان کا فرد تھا اور ذمہ دار عہدے پر بھی فائز تھا۔ اس نوجوانی کے لحاظ سے لیزا اس سے چھوٹی لگتی تھی۔ شاہی خاندان کی مناسبت سے روتاس لیزا کا احترام کرتا تھا اور احترام کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لیزا ہرقل کی بیوی تھی۔

”وہ دیکھئے“ — روتاس نے رک کر باہر محاصرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا — ”ایک سوار دستہ جا رہا ہے.... ہو سکتا ہے اس کی جگہ تازہ دم دستہ آجائے لیکن مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے مسلمان محاصرہ آہستہ آہستہ اٹھا رہے ہیں۔“

کم و بیش ایک ہزار گھوڑ سوار خالد بن ولید کے حکم سے محاصرے سے نکل گئے اور ایک طرف کو جا رہے تھے۔ روتاس اور لیزا دیکھتے رہے اور سواروں کا وہ دستہ دُور ہی دُور ہٹا گیا اور پہاڑی کے اندر چلا گیا۔ لیزا نے روتاس کی طرف دیکھا۔ اسے روتاس کے چہرے پر مسرت کے آثار نظر آئے اور وہ کچھ زیادہ ہی خوبو نظر آنے لگا۔ روتاس کے ساتھ لیزا کی کوئی بے تکلفی نہیں تھی۔ وہ محاصرے کے دوران بہت دنوں کے وقفے سے لیزا کے گھر جایا کرتا تھا لیکن اُس وقت جب انتھونیس گھر پر ہوتا تھا۔ وہ لیزا سے نہیں انتھونیس سے ملنے جاتا تھا۔

”میں اس تہائی سے آگیا گئی ہوں روتاس!“ — لیزا نے دوستانہ بے تکلفی سے کہا — ”شہر کی ان عورتوں کے ساتھ تو میں گھل مل سکتی ہی نہیں۔ تم جانتے ہو میں کس اہل سے آئی ہوں۔ انتھونیس دن رات باہر رہتا ہے اور جب آتا ہے تو تھکا ماندہ پلنگ پر گرنا اور سو جاتا ہے۔ میں تو آج تک آکر دیوار پر آئی تھی۔ کتنا اچھا ہوا تم مل گئے۔ کیا تم پسند کرو گے کہ میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر چلوں؟“

روتاس بھلا کیسے انکار کر سکتا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ تو گھر ہی جا رہا تھا۔ رات بھر وہ باہر رہا تھا اس نے لیزا کو ساتھ لیا اور اسے اپنے گھر لے گیا۔

روتاس نے لیزا کو احترام سے بٹھایا اور خود الگ ہٹ کر بیٹھنے لگا لیکن لیزا نے اس کا بازو پکڑ لیا اور کھینچ کر اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنا ایک بازو روتاس کی کمر میں ڈال دیا۔ روتاس پھینکی سی ہنسی نہس کر اس سے الگ ہونے لگا لیکن لیزا نے اپنے بازو کا گھیرا اور زیادہ تنگ اور سخت کر دیا پھر بے تکلفی کا ایک ایسا مظاہرہ کیا جو وہ انتھونیس کے ساتھ ہی کر سکتی اور کیا کرتی تھی، روتاس کو ایسی توقع نہیں تھی کہ وہ اس کے ساتھ اتنا زیادہ بے تکلف ہو جائے گی۔ لیزا نے بڑے ہی جذباتی لہجے میں ایک آدھ بات بھی کہہ دی۔ روتاس بچہ تو نہ تھا اتنے واضح اشارے سمجھ گیا اور جب اس نے لیزا کے چہرے پر نظروں ڈالی تو وہاں کچھ اور ہی تاثر تھا۔

”میرے دل میں آپ کا احترام ہے“ — روتاس نے کہا — ”بے شک آپ شاہی خاندان سے بھاگ آئی ہیں لیکن میں خود اسی خاندان کا فرد ہوں اس لئے آپ کا احترام کرتا ہوں۔ اگر میں یہ ذہن سے آتا دوں کہ آپ شاہی خاندان کی آبرو ہیں تو میں یہ نہیں بھول سکتا کہ آپ میرے جرنیل اور کمانڈر انتھونیس کی دوست ہیں۔“

”میں انتھونیس کی ملکیت نہیں ہوں روتاس!“ — لیزا نے کہا — ”اس وقت تم ہی میرے دوست اور تم ہی میرے ساتھی ہو۔ مجھ سے دور ہونے کی کوشش نہ کرنا۔ اس وقت میں ہرقل کی بیوی بھی نہیں اور انتھونیس کی دوست بھی نہیں۔ اس وقت میں صرف لیزا ہوں اور مجھے احترام سے بلانے کی بجائے پیار سے لیزا کو۔“

”پھر یہ بھی سوچو لیزا!“ — روتاس نے کہا — ”پادری ہر روز فحشی دعا کرتا ہے اور ایک ہی بات دوہراتا چلا جا رہا ہے کہ ہم پر بیٹھے بٹھائے بہت بڑی آفت آن پڑی ہے جس سے نجات کا طریقہ صرف یہ ہے کہ گناہوں سے توبہ کرو اور کوئی گناہ نہ ہو۔“

”میں سر لپا گناہ ہوں“ — لیزا نے کہا — ”ایران کے شاہی خاندان سے ایک بڑا ہی حسین گناہ بن کر ہر قل کے شاہی خاندان میں آئی تھی لیکن اس گناہ میں ناکام رہی اور جب شاہ ہر قل نے میرے ساتھ شادی کر کے تھوڑے ہی عرصے بعد حرم میں پھینک دیا تو میں نے ایک اور گناہ کیا۔“

لیزا نے جذبات سے مغلوب ہو کر روتاس کو تفصیل سے سنایا کہ اس نے انھونیس کو کس طرح اپنی تسکین کا ذریعہ بنایا تھا اور کس طرح اس کے ساتھ یہ دوستی درپردہ نبھاتی رہی۔ اس نے اس راز سے بھی پردہ اٹھا دیا کہ یوکلکس ہر قل کا نہیں انھونیس کا بیٹا ہے۔

”تم غلط سمجھتے رہے ہو“ — لیزا نے کہا — ”تم یہ سمجھتے رہے کہ میں بھی انھونیس کے اس عزم میں شامل ہوں کہ ہم شام میں یسوع مسیح کی سلطنت قائم کریں گے۔ انھونیس بھی یہی سمجھتا ہے کہ میرا بھی یہی عزم ہے لیکن روتاس! میں تمہیں سچ بتاتی ہوں کہ میں اپنے اکلوتے بیٹے یوکلکس کو ہر قل اور اس کے بیٹے فسطین کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچانے کے لئے انھونیس کے ساتھ آگئی۔“

لیزا نے روتاس کو یہ بھی بتا دیا کہ ہر قل اور فسطین یوکلکس کو قتل کروانا چاہتے تھے لیکن انھونیس نے بروقت دیکھ لیا اور قاتلوں کو قتل کر ڈالا۔ لیزا نے یہ واقعہ بھی روتاس کو تفصیل سے سنایا اور کہا کہ انھونیس بھی اس وجہ سے بھاگ آیا ہے کہ یوکلکس اس کا اپنا بیٹا ہے اور دوسرے یہ کہ ہر قل انھونیس کو بھی قتل کروادے گا۔

”میں یہ ساری بات سن کر حیران نہیں ہوا“ — روتاس نے کہا — ”یہ سب کچھ شاہی خاندانوں میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ ایک کی بیوی دوسرے کی واسطہ ہوتی ہے۔ بادشاہ کے بیٹے بادشاہ کی دوسری بیویوں یا وادشاؤں کے ساتھ تعلقات بنا لیتے ہیں۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ بادشاہوں کی شکست کی درپردہ وجہ یہی ہے۔ کیا تم نے کبھی سوچا بھی تھا کہ ایران اور روم جیسی زبردست طاقتیں عرب کے عام اور انتہائی معمولی لوگوں سے شکست کھا جائیں گی؟ شکست بھی ایسی کہ بادشاہ بھاگتے اور پناہیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں؟ مسلمان ہمارے دشمن ہی سہی لیکن میں جاسوسی کے لئے مختلف بہروپ دھار کے مسلمانوں کی آبادیوں میں بھی رہا اور ان کے خیموں میں بھی گھوما پھرا تھا۔ ان کے ہاں عیش و عشرت کا کوئی تصور ہی نہیں اور ان کے کروار پہاڑی چشمے سے پھوٹنے والے پانی

کی طرح شفاف ہوتے ہیں۔ سطح پر دیکھو تو چشمے کی تہ بھی نظر آ جاتی ہے۔ مسلمان بالکل ایسے ہی ہیں۔ یہ ہے ان کی اصل طاقت جس کے سامنے کوئی جنگی طاقت نہیں ٹھہر سکتی۔۔۔۔۔ میرا مشورہ مانو لیزا! اب بھی تم اس گناہ سے بچ سکتی ہو۔ انھونیس کو لے کر گرجے میں جاؤ اور اس کے ساتھ باقاعدہ شادی کر لو۔“

”تم میری بات کیوں نہیں سمجھتے روتاس!“ — لیزا نے اکتاہٹ سے کہا — ”مجھے انھونیس کے ساتھ وہ محبت ہے ہی نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ ہر قل سے محبت ہو گئی تھی لیکن اس نے میرے ساتھ جو سلوک کیا اس سے میں سمجھ گئی کہ یہ شخص محبت کے قابل تھا ہی نہیں۔ میں نے اس کے اس جرنیل انھونیس کے ساتھ دوستی لگا کر اسے دھوکے دیئے۔ میں انسان اور جوان عورت ہوں۔ تمہیں بتایا ہے کہ میں اپنے اکلوتے بیٹے کو قتل سے بچانے کے لئے اسے ساتھ لے کر انھونیس کے ساتھ بھاگ آئی۔“

”اس کے باوجود لیزا!“ — روتاس نے کہا — ”ہمیں انھونیس کے اس عزم کا احترام کرنا چاہئے کہ وہ یسوع مسیح کی سلطنت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ہمیں پورا پورا تعاون کرنا چاہئے۔“

”تم کم عقل انسان ہو روتاس!“ — لیزا نے طنزیہ سی مسکراہٹ سے کہا — ”جاسوسی کے محکمے کے ایک ذمہ دار افسر کو اتنا کم فہم نہیں ہونا چاہئے۔ غور کرو گھمراہی میں جاؤ اور پسپائی اور شکست کا جو تجربہ ہمیں ہوا ہے، اس پر غور کرو۔ انھونیس ایسا خواب دیکھ رہا ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں ہوا کرتی۔ ان تھوڑے سے مسلمانوں نے ایران اور روم کی بادشاہیوں کو کچل ڈالا ہے۔ انھونیس ان کا تجربہ کار قبائلیوں کے بل بوتے پر مسلمانوں کو شکست نہیں دے سکتا۔ یہ بات تم خود سمجھ سکتے ہو۔ یہ تو محاصرہ ہے اور ہم قلعے میں محفوظ ہیں اس لئے اتنے دن گزر گئے ہیں۔ اگر یہ کھلے میدان کی لڑائی ہوتی تو سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے مسلمان لڑائی کا فیصلہ اپنے حق میں کر چکے ہوتے۔“

”اتنی مایوسی لیزا؟“ — روتاس نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا — ”تم انھونیس اور یوکلکس کے ساتھ بھی ایسی ہی باتیں کیا کرتی ہو؟“

”نہیں!“ — لیزا نے کہا — ”ان کے ساتھ تو میں نے اس مسئلے پر کبھی بات کی ہی نہیں۔ ان دونوں کو یقین ہے کہ وہ محاصرہ تو ذکر مسلمانوں کو یہاں سے بھگا دیں گے۔“

لیزا نے روتاس کو کچھ اور قریب کر لیا اور جذباتی سی سرگوشی میں کہا — ”کیا تم پسند

نہیں کرو گے کہ اس وقت ہم اس مسئلے پر بات نہ کریں؟.... کیا تم ابھی تک مجھے نہ سمجھتے؟

روتاس بھی آخر جوان آدمی تھا اور وہ آدمی بھی شاہی خاندان کا تھا، کوئی زاہد پارسا تو نہ تھا۔ اس پر بھی وہی غمار طاری ہونے لگا جس سے لیزا مخمور تھی۔ زیادہ نہیں گزری تھی کہ روتاس اس طرح لیزا کے جذبات کے جال میں آ گیا جیسے کبھی کبڑے کے جالے میں آ جاتی ہے۔

لیزا جب وہاں سے رخصت ہونے لگی تو اس کے چہرے پر تأسف کا شائبہ تک نہ بلکہ وہ مطمئن اور مسرور لگتی تھی۔

”یہ بھی سوچا ہے لیزا!“ — روتاس نے پوچھا — ”اگر انتھونیس کو ہماری دوستی کا پتہ چل گیا تو کیا ہو گا؟“

”بہت بُرا ہو گا“ — لیزا نے ہلکے ہلکے سے لہجے میں جواب دیا — ”انتھونیس شاید تمہیں قتل کر دے.... لیکن ہم اسے پتہ ہی کیوں چلنے دیں گے!“
دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لئے اور پھر لیزا وہاں سے چل دی۔

○

محاصرے کی بات یہاں تک پہنچی تھی کہ مجاہدین نے فلیتے والے تیر شر کے پھینکنے شروع کر دیئے تھے لیکن دیواروں کے اوپر سے تیر آبادی کے اندر تک پہنچا کر نہیں تھا۔ ایک بلند جگہ مل گئی تھی جس پر چڑھ کر تیر انداز تیر پھینکتے تھے اور تیر انداز درختوں پر چڑھ گئے اور وہاں سے فلیتے والے تیر اندر پھینکنے لگے۔ لوگوں مکان دیوار سے دور تھے اس لئے یہ تیر بے اثر ثابت ہو رہے تھے۔

درختوں پر چڑھ کر تیر پھینکنے والے مجاہدین میں سے ایک نے ایک روز دیوار اندر خیمے دیکھ لئے جو دوسری طرف تھے۔ اُس طرف دیوار کے قریب نہ کوئی درخت اور نہ کوئی بلند جگہ۔ یہ دیکھ لیا گیا کہ خیمے اُس طرف کی دیوار تک چلے گئے تھے۔ بیان ہو چکا ہے کہ مختلف قبیلوں کے عیسائی پناہ گزینوں کے روپ میں داخل ہوتے تھے اور وہ ہتھیار چھپا کر اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی تھی کہ کے لئے ایک میدان میں خیمے لگانے پڑے۔ یہ انتظام ان مسلمانوں کا تھا جو شر کا اور دیگر سرکاری امور چلاتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے خیموں کی ایک بستی آباد ہو گئی۔

میں قبائلیوں کے پورے پورے کنبے رہائش پذیر ہو گئے۔
خیموں کو دیکھنے والے مجاہد نے یہ بات سالاروں تک پہنچادی اور انہیں بتایا کہ اس طرف سے اگر تیر پھینکنے جائیں تو دیوار کے اوپر سے ہوتے ہوئے یہ تیر خیموں کے اوپر گریں گے۔

خالد بن ولید اور عیاض بن غنم خود اُس درخت تک گئے جس پر چڑھ کر اس مجاہد نے خیمے دیکھے تھے۔ دونوں سالاروں نے کچھ اور اوپر چڑھ کر خیمے دیکھے۔ وہاں سے خیموں کے صرف اوپر کے حصے نظر آتے تھے کیونکہ درمیان میں شہر کے مکان حائل تھے۔

”خدا کی قسم ابن غنم!“ — خالد بن ولید نے پُرسرت لہجے میں عیاض بن غنم سے کہا — ”ہم شہر میں دہشت پھیلا سکتے ہیں۔ اگر ہم شہر میں خوف و ہراس پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھو ہم نے آدمی فتح حاصل کر لی۔“

”سہ سالار!“ — عیاض بن غنم نے کہا — ”اللہ کے فضل و کرم سے آخر فتح ہماری ہو گی۔ شہر میں کوئی فوج نہیں، شہریوں کا جوہم ہے۔ میرے دماغ میں یہی ایک ترکیب آتی ہے کہ ان لوگوں کو یہ دھوکا دیا جائے کہ ہم محاصرہ اٹھا رہے ہیں لیکن محاصرہ فوراً نہ اٹھایا جائے۔ سواروں کے ایک دو دستے یہاں سے ہٹا دیئے جائیں پھر اپنی سرگرمیاں بھی روک دی جائیں تاکہ شہر کے لوگ یہ سمجھ لیں کہ ہم محاصرے کی کامیابی سے مایوس ہو گئے ہیں۔“

سالار عیاض بن غنم نے یہ بات درخت سے اتر کر کہی تھی۔ خالد بن ولید گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے رک گئے اور پاؤں رکاب سے نکال کر عیاض کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کے چہرے پر ایسا تاثر آ گیا تھا جیسے انہیں یہ مشورہ اچھا لگا ہو۔

”خدا کی قسم ابن غنم!“ — خالد بن ولید نے عیاض کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا — ”تم نے مجھے ایک روشنی دکھا دی ہے۔ آ، کہیں بیٹھ کر سوچتے ہیں کہ ہم انہیں یہ دھوکا کس طرح دے سکتے ہیں۔“

خالد بن ولید نے ایک کارروائی یہ کہ درختوں سے اور بلند جگہ سے تیر اندازوں کو ہٹالیا اور انہیں اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ جب شہر کی اُس طرف پہنچے جس طرف خیمے تھے تو انہوں نے تیر اندازوں کو بتایا کہ اب وہ فلیتے والے تیر کس طرح پھینکیں۔

آگ والے ان تیروں کی کمی نہیں تھی۔ تیر اندازوں کو دیوار سے اتنی دور کر دیا گیا جہاں تک دیوار سے آنے والے تیراں تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ فلیٹے والے تیر آگے اور تیر اندازوں نے کماتوں میں ڈال ڈال کر یہ تیر پھینکنے شروع کر دیئے۔ دو گھوڑ سوار تیر اندازوں نے یہ کارنامہ کر دکھایا کہ کسی بڑے کے حکم کے بغیر گھوڑوں کو ایڑ لگا دی اور دیوار کے قریب جا کر دوڑتے گھوڑوں سے تیر انداز پھینکے۔ شہریوں نے دیوار پر سے ان پر تیروں کی بوچھاڑیں پھینکیں لیکن اللہ نے انہیں محفوظ رکھا۔ انہوں نے گھوڑے کہیں روکے نہیں تھے۔

ان کی دیکھا دیکھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک یا دو گھوڑ سوار تیر انداز اپنے گھوڑے دوڑاتے اور دوڑتے گھوڑوں سے اندر شیر پھینک جاتے تھے۔ دیوار سے جو تیر اندازی ہو رہی تھی وہ اور تیز اور شدید ہو گئی۔ اس میں سے بچ نکلنا بہت ہی مشکل تھا۔ تین چار گھوڑ سوار تیروں کا نشانہ بن گئے تو عیاض بن غنم نے باقی گھوڑ سواروں کو روک دیا کہ وہ اتنا خطرہ مول نہ لیں۔

کسی اور گھوڑ سوار تیر انداز کو دیوار کے قریب جانے کی ضرورت ہی نہ رہی کیونکہ دیوار پر جو عیسائی تیر انداز شیر پھینک رہے تھے، ان میں سے کسی نے بڑی بلند آواز سے کہا کہ خیموں کو آگ لگ گئی ہے۔ اس کی اس گھبرائی ہوئی پکار کی تصدیق دھوئیں نے کر دی جو دیوار کی اوٹ سے اوپر اٹھ آیا تھا اور اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا جا رہا تھا۔ یہ دھواں بڑی تیزی سے پھیلتا اور گھٹا ہوتا جا رہا تھا۔ ان خیموں میں رہنے والوں کی چیخ و پکار باہر بھی سنائی دینے لگی۔

خیمے بہت ہی زیادہ تھے اور ایک دوسرے کے بالکل قریب قریب لگے ہوئے تھے۔ ایک جلتا ہوا خیمہ دائیں بائیں والے خیموں کو جلا رہا تھا اور آگ بڑی تیزی سے پھیلنے جا رہی تھی۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ جلتے ہوئے خیموں میں سے نکلنے والوں میں سے اکثر کے کپڑوں کو آگ لگی ہوئی تھی۔ کئی ایک تو نکل بھی نہ سکے اور زندہ جل گئے۔ دیوار پر جو عیسائی کھڑے تیر اور برچھیاں پھینک رہے تھے، وہ ایسے گھبرائے کہ وہاں سے دوڑ پڑے اور خیموں کی آگ بجھانے کے لئے نیچے اتر گئے۔ دیوار کا خاصا حصہ خالی ہو گیا۔ مجاہدین دو رستے لے کر دیوار تک پہنچے اور کمندیں دیوار پر پھینکیں۔ کمندیں بالکل صحیح جگہوں پر پہنچ کر انک گئیں تو مجاہدین رستوں پر چڑھنے لگے لیکن دائیں اور بائیں سے

ان پر تیروں کی بوچھاڑیں آنے لگیں۔ پیچھے والے بہت سے مجاہدین دوڑتے ہوئے آگے گئے اور دیوار والے تیر اندازوں پر تیر چلانے شروع کر دیئے۔ بہت سے عیسائی تیر انداز تیروں کا نشانہ بنے اور دو تین دیوار کے باہر بھی گرے لیکن وہ اپنا کام کر چکے تھے۔ وہ یہ کہ رستوں پر چڑھنے والے مجاہدین کے جسموں میں کئی کئی تیر اتر گئے تھے اور وہ رستوں سے نیچے آ پڑے تھے۔ دلیری اور جذبہ شہادت کا یہ مظاہرہ بھی کامیاب نہ ہو سکا لیکن اس مظاہرے نے مجاہدین میں نئی روح پھونک دی۔ کئی مجاہدین دیوار کی طرف دوڑے کہ وہ رستوں سے اوپر چڑھ جائیں گے لیکن ایک تو انہیں سالاروں نے روک دیا اور دوسرے یہ کہ اوپر جہاں رستے انک گئے تھے وہاں سے قبائلیوں نے رے اتار پھینکے۔

شہر کے اندر کا شور و غل بتا رہا تھا کہ جلتے ہوئے خیموں نے اندر کسی صورت حال پیدا کر دی ہے۔ وہ افرا تقری پیدا ہو چکی تھی جو خالد بن ولید پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے تیر اندازوں کو پیچھے ہٹا لیا اور جو سوار دیوار کی طرف کچھ آگے بڑھ گئے تھے انہیں بھی واپس بلا لیا۔

رات کے وقت مجاہدین کی ٹولیاں ایک دو دروازوں تک پہنچ جاتی تھیں اور کھاناؤں سے دروازے توڑنے کی کوشش کرتی تھیں لیکن اوپر سے تیر بھی آتے اور برچھیاں بھی آتی تھیں۔ دشمن نے اوپر سے ان پر جلتی ہوئی مشعلیں بھی پھینکی تھیں جن سے دو تین مجاہد کپڑوں کو آگ لگ جانے سے بچ سکتے تھے۔



خالد بن ولید نے ایک روز تقریباً "ایک ہزار سواروں کا دستہ محاصرے سے نکال کر پیچھے بھیج دیا۔ ان سواروں کے جانے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ واپس جا رہے ہوں۔ یہ تھے وہ ایک ہزار گھوڑ سوار مجاہدین جنہیں روتاس نے دیوار پر کھڑے محاصرے سے جاتے دیکھا اور بڑی خوشی سے لیزا کو بھی بتایا تھا کہ شاید مسلمان محاصرے سے مایوس ہو کر اپنا لشکر آہستہ آہستہ واپس بھیج رہے ہیں۔

خالد بن ولید نے ایک چال یہ بھی چلی کہ تمام سرگرمیاں اور قلعہ سر کرنے کی کارروائیاں بالکل ہی بند کر دیں۔ مجاہدین نے تو شجاعت اور شہادت کے مظاہرے اس حد تک کئے تھے کہ چند ایک مجاہدین کھاناؤں سے لے کر تیروں کی بوچھاڑوں میں کسی ایک

دروازے تک جا پہنچتے اور دروازہ توڑنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اوپر سے ان پر تیر بھی آتے تھے اور برہمیاں بھی۔ اس طرح کئی ایک مجاہدین شدید زخمی ہوئے اور شہید بھی۔

خالد بن ولید نے محاصرے کے ایک طرف سے ایک ہزار سواروں کا ایک اور دستہ بھیجے بھیج دیا جو پہلے رخصت ہونے والے دستے کے راستے پر گیا اور ٹیکریوں کی اوٹ میں ہوتا پہاڑی کے پیچھے چلا گیا۔ اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا تھا کہ اس دستے کو بھی واپس بھیج دیا گیا ہے۔ خالد بن ولید اور عیاض بن غنم گھوڑوں پر سوار شہر کے ارد گرد گھومتے پھرتے تو نظر آتے تھے لیکن باقی لشکر کا انداز یہ تھا کہ مجاہدین زیادہ تر خیموں کے اندر رہتے یا کچھ دیر کے لئے بعض مجاہدین باہر آتے اور پھر خیموں میں چلے جاتے یا پیچھے جا کر درختوں کے نیچے بیٹھ جاتے تھے۔

قلعے کے اندر انھونیس تو بہت ہی خوش تھا اور اس پر فتح کا تاثر طاری رہنے لگا تھا لیکن آرام سے وہ پھر بھی کیس بیٹھتا نہیں تھا۔ وہ قبیلوں کے سرداروں کو اکٹھا کر کے انہیں ہدایات دیتا یا دیوار پر جا کر لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتا اور کبھی نیچے آکر لوگوں کو اکٹھا کر کے انہیں فتح کی خوشخبریاں سناتا اور انہیں بتاتا تھا کہ ابھی لڑائی ختم نہیں ہوئی اور ان مسلمانوں کو بھگانا نہیں بلکہ اس لشکر کو لاشوں میں بدل دینا ہے اور پھر جو زندہ رہیں گے انہیں قیدی بنا کر قلعے میں جانوروں کی طرح رکھنا ہے۔

انھونیس پر تو جنونی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور وہ تو جیسے لیزا کو اور دنیا کی ہر دلچسپی کو ذہن سے ہی اتار بیٹھا تھا۔ لیزا نے اب اسے یہ کہنا چھوڑ دیا تھا کہ وہ گھر نہیں آتا اور آتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے اپنا ذہن اور دل باہر ہی چھوڑ آیا ہو۔ انھونیس کی بجائے روتاس لیزا کے ہاں چلا جاتا تھا اور کبھی لیزا اس کے ہاں جا پہنچتی تھی۔

یوکلِس پر تو ایسی جذباتیت غالب آگئی تھی کہ وہ ماں سے جیسے لاتعلق ہی ہو گیا تھا اور اسے کھانے پینے کا بھی ہوش اور احساس نہیں رہا تھا۔

اس داستان کو ہم کچھ دن پیچھے اُس مقام پر لے چلتے ہیں جہاں مسلمانوں کے پھٹکے ہوئے فلیتوں والے تیروں نے اندر خیموں کی بستی کو آگ لگا دی تھی۔ خیموں میں رہنے والوں کا قیامت خیز شور و غل باہر بھی سنائی دے رہا تھا لیکن شہر کے اندر جو قیامت برپا ہو گئی تھی وہ مجاہدین کو نظر نہیں آرہی تھی۔ خیموں کی یہ وسیع و عریض بستی شعلوں میں

دل لگی تھی۔ عورتیں، بچے اور وہ لوگ جو بروقت نکل نہ سکے، زندہ جل رہے تھے۔ شہر کے لوگ گھروں سے نکل آئے اور کنوؤں سے پانی نکال نکال کر آگ پر پھٹکنے لگے لیکن آگ سے ان خیموں کو جو ابھی بچے ہوئے تھے، بچانا ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ شہر کے لوگوں پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ اتنے اونچے جانے والے شعلوں کی دہشت معمولی نہیں ہو کر تھی جسے انسان برداشت کر لیتے۔

کچھ خیمے بچا تو لئے گئے لیکن وہاں خیموں کو نہیں بلکہ انسانوں کو بچانا تھا۔ وہی بچ سکے جو بروقت نکل گئے تھے۔ شہر کے لوگوں پر خوف و ہراس تو طاری تھا ہی لیکن کچھ ایسی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں کہ محاصرہ توڑ دیا شہر مسلمانوں کے حوالے کر دو۔ یہ آوازیں بھی سنائی دیں کہ آج خیمے جلے ہیں کل ہمارے گھر بھی جلیں گے۔

انھونیس، روتاس اور یوکلِس بھی وہاں موجود تھے اور لوگوں کی طرح بھاگ دوڑ کر آگ پر قابو پانے کی کوششوں میں بری طرح مصروف تھے۔ انہوں نے بھی لوگوں کے احتجاجی نعرے سنے اور محسوس کر لیا کہ لوگ محاصرے سے تنگ آ گئے ہیں۔ انھونیس نے بڑی بلند آواز میں لوگوں سے کہنا شروع کیا کہ اپنے قومی وقار اور آزادی کے لئے ایسی قربانیاں دینی ہی پڑتی ہیں۔ ان مسلمانوں کو دیکھو، کتنی دور سے آئے ہیں، مسلسل لڑ رہے ہیں اور اب اتنا زیادہ نقصان اٹھا کر بھی محاصرہ نہیں اٹھانا چاہتے۔

”میں تمہیں یہ بھی بتا دوں“ — انھونیس نے کہا — ”مسلمان محاصرے کی کامیابی سے مایوس ہو گئے ہیں اور انہوں نے اپنے کچھ دستے واپس بھیج دیئے ہیں اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ خود ہی محاصرہ اٹھا کر واپس چلے جائیں گے۔ ایسی باتیں زبان پر مت لاؤ کہ شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا جائے۔“

انھونیس نے شہر کے لوگوں کو اکسایا اور بھڑکایا اور پھر اس کے اشارے پر یوکلِس ایک گھوڑے پر سوار ہو گیا تاکہ سب لوگ اسے دیکھ سکیں۔

”اے اہل صلیب!“ — یوکلِس نے بڑی ہی بلند آواز سے لوگوں سے خطاب کیا — ”میری عمر دیکھو۔ کیا یہ ہنسنے کھیلنے کی عمر نہیں؟ میرا ایک بازو بھی نہیں۔ پھر بھی تم مجھے دیکھتے رہتے ہو کہ آرام اور چین کی نیند اور کھانے پینے کو بھول گیا ہوں۔ تم دیکھو گے کہ میں کس طرح ایک بازو سے لڑتا ہوں۔ میں تمہارا بچہ ہوں اور تمہاری عزت اور آبرو کی خاطر شاہی زندگی چھوڑ کر آیا ہوں۔“

اس شخص کی تائید میں کچھ آوازیں اٹھیں اور فوراً "بعد یوں لگتا تھا جیسے ہر کوئی بول رہا ہو اور ہر کسی کا یہی ایک مطالبہ ہو کہ باہر نکل کر مسلمانوں پر حملہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ آوازیں بھی بلند ہونے لگیں کہ رومی جرنیل کو بلاؤ۔
 انتھونیس کو اطلاع ملی تو وہ روتاس کو ساتھ لے کر دوڑتا ہوا وہاں پہنچا۔ اسے دیکھ کر وہوں نے احتجاجاً "نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ کسی نے یہ بھی کہہ دیا کہ یہ رومی جرنیل یہاں بادشاہ بننے آیا ہے۔

انتھونیس نے جب لوگوں کو اس قدر غم و غصے میں دیکھا تو بڑی مشکل سے لوگوں کو خاموش کرایا۔ اس نے کہا کہ محاصرہ خود ہی اٹھ جائے گا۔
 "ہم اور انتظار نہیں کر سکتے" — ایک آدمی نے کہا — "ہم سب باہر نکل کر لڑیں گے۔"

انتھونیس آخر جرنیل تھا اور روتاس بھی فوجی افسر تھا۔ وہ بڑی اچھی طرح جانتے تھے کہ محصور ہو کر کس صورت حال میں باہر نکل کر حملہ کیا جاتا ہے لیکن لوگ اپنے مطالبے سے ہٹ ہی نہیں رہے تھے۔ انتھونیس اور روتاس نے انہیں باری باری سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔

"اے رومی جرنیل!" — ایک منمر آدمی نے کہا — "ہم مسلمانوں سے دشمنی رکھنا ہی نہیں چاہتے۔ اگر تم باہر نکل کر محاصرہ توڑنے کی کوشش نہیں کرو گے تو ہم خود دروازے کھول دیں گے۔"

"تم جاہل اور احمق ہو" — انتھونیس نے کہا — "تم دروازے مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ اسلام کے لئے کھولو گے۔ مسلمان شہر میں آئیں گے تو سب سے پہلے تمہیں اسلام قبول کرنے کا حکم دیں گے۔ تمہیں اپنے مذہب سے ہی نہیں بلکہ اپنی فطرت و صورت میں ہیوں اور جوان بیویوں سے بھی دستبردار ہونا پڑے گا۔ تم ایک قوم کی صورت میں زندہ رہ ہی نہیں سکو گے۔"

"اے اہل صلیب!" — روتاس بڑی بلند آواز سے بولا — "تم جن مسلمانوں کے لئے دروازے کھولنا چاہتے ہو اور پھر تم جن مسلمانوں کی اطاعت قبول کرو گے، ان کی یہ درندگی اور ظلم بھی دیکھ لو جو جلی ہوئی لاشوں کی صورت میں تمہارے سامنے موجود ہے۔ انہوں نے تمہارے دودھ پیتے بچے بھی جلا ڈالے ہیں۔ اگر تم نے مسلمانوں کے

انتھونیس اور یوکل نے لوگوں سے خطاب اُس وقت کیا تھا جب خیموں کی آگ پر تقریباً "قابو پایا گیا تھا لیکن ابھی لاشیں باہر نہیں لائی گئی تھیں۔ لوگوں کا حوصلہ قائم ہو گیا تھا اور ان کا احتجاج بھی ختم ہو گیا۔ انتھونیس اور یوکل کے بولنے کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ لوگوں نے اس کا اثر قبول کیا۔ شہر میں خوف و ہراس نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ لوگوں نے پہلے سے زیادہ جوش اور جذبے سے آگ پر قابو پانا شروع کر دیا۔

سورج غروب ہونے تک آگ پر قابو پایا جا چکا تھا اور جو لوگ چلتے خیموں میں سے بچ نکلے تھے وہ اپنے بیوی بچوں اور دیگر افراد خانہ کو جملے ہوئے خیموں میں ڈھونڈنے لگے۔ یہ کام رات بھر جاری رہا۔ لوگ لاشیں اٹھا کر ایک جگہ زمین پر رکھتے رہے۔ صبح طلوع ہوئی تو شہر کے لوگ پھر خیموں کی جلی ہوئی بستی کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے۔ ان کے سامنے ایسا منظر تھا جس نے انہیں سر تاپا ہلا کر رکھ دیا۔ جملے ہوئے خیموں سے ذرا ہٹ کر بے شمار لاشیں پہلو بہ پہلو زمین پر رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں جوان آدمیوں کی لاشیں بھی تھیں، بوڑھوں کی، عورتوں اور بچوں کی لاشیں بھی تھیں۔ یہ سب کل کی آگ میں زندہ جل گئے تھے اور کوئی ایک بھی لاش پہچانی نہیں جاتی تھی۔ بعض لاشیں تو ایسے تھیں جیسے بڑی موٹی موٹی لکڑیاں جلی ہوئی ہوں۔ بے شمار لاشیں قابلِ شناخت نہیں تھیں۔

کل تو انتھونیس اور یوکل نے لوگوں کے دلوں سے خوف و ہراس نکل دیا اور ان کے حوصلوں میں نئی روح پھونک دی تھی لیکن اب لوگوں نے یہ جلی ہوئی لاشوں کی لمبی قطار اور پھر لاشوں کی حالت دیکھی تو وہ مجھول ہی گئے کہ کل انہیں انتھونیس اور یوکل نے کیا کہا تھا۔

عورتیں روتی، چیختی، چلاتی اور بین کرتی اپنے بچوں کی لاشوں کو شناخت کر رہی تھیں لیکن وہاں تمام بچے ایک ہی جیسے ہو گئے تھے۔ خیموں میں رہنے والے اپنے عزیزوں رشتہ داروں کو تلاش کر رہے تھے۔ ہر کسی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"کہاں ہے ہمارا رومی جرنیل!" — ایک آدمی نے بڑی ہی بلند آواز میں کہا — "بچے جلتے ہیں تو ہمارے جلتے ہیں۔ مال اسباب جلا ہے تو ہمارا جلا ہے۔ قلعے سے نکل کر مسلمانوں پر حملہ کیوں نہیں کیا جاتا!"

آگے ہتھیار ڈال دیئے تو وہ ہر اُس عیسائی کو قتل کر دیں گے جو ان کا مذہب قبول نہیں کرے گا۔“

”اے رومی!“ — ایک بوڑھے نے آگے آکر کہا — ”جہاں لڑائی ہوتی ہے وہاں بچے بھی مارے جاتے ہیں۔ کیا تم بھول گئے ہو کہ رومی اور ایرانی فوجیں جدبھر بھی گئیں قتل عام کرتی گئیں۔ انہوں نے معصوم بچوں کو اپنے ہاتھوں قتل کیا۔ نوجوان لڑکیوں اور کمسن بچوں کو بھی بے آبرو کر کے مار ڈالا یا اپنے ساتھ لے گئے۔ مسلمانوں کو ہم نے خود اپنا دشمن بنایا ہے۔ پھر ہمارے لوگ رومیوں کی مدد کو چل پڑے اور رومی لڑنے کی بجائے بھاگ گئے۔ مسلمان ہمیں اپنا دشمن کہوں نہ سمجھیں؟.... اگر اپنی عورتوں اور بچوں کا تحفہ اتنا ہی خیال ہے تو باہر نکلو اور حملہ کرو۔ شہر کا بچہ بچہ لڑے گا۔“

وہاں سارا شہر اکٹھا ہو گیا تھا۔ بوڑھے کی اس بات پر لوگوں نے شور و غل مچا کر دیا جس میں یہی ایک مطالبہ سنائی دے رہا تھا کہ مسلمانوں پر حملہ کر کے محاصرہ توڑا جائے۔ اس شور و غوغا میں ایک اور آدمی آگے بڑھا اور اس نے ایک اور بات پیش کر دی۔

”ایک مصیبت اور آری ہے“ — اس آدمی نے کہا — ”شہر میں اناج کم ہوتا جا رہا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں تک قحط پڑ جائے گا۔ مویشیوں اور گھوڑوں کے لئے چارہ نہیں مل رہا۔ کھیت قلعے کے باہر ہیں جہاں سے ہر اچارہ نہیں لایا جاسکتا۔ مویشی انسانوں سے پہلے مر سگے۔ قحط سے تڑپ تڑپ کر مرجائے گا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ ہم اپنے مذہب اور اپنی آزادی کی خاطر ابھی لڑیں اور جانیں قربان کر دیں؟“

انتھونیس اور روتاس کے دماغوں میں صرف لڑائی اور محاصرہ سلایا ہوا تھا۔ یہ دونوں رومی اس خوش فہمی میں بھی مبتلا تھے کہ فتح ان کی ہوگی مگر انہوں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ لڑائی کے کچھ پہلو اور بھی ہوتے ہیں اور کچھ تقاضے بھی۔ جن شہروں میں فوج رکھی جاتی تھی وہاں خوراک اور رسد کا اتنا زیادہ ذخیرہ رکھا جاتا تھا جو عموماً ایک سال سے زیادہ عرصے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ حلب میں کوئی فوج نہیں تھی۔ شہریوں نے ذخیرے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ مسلمانوں نے بھی وہاں فوج نہیں رکھی تھی اس لئے اناج کا ذخیرہ بھی نہ رکھا گیا۔ اب شہریوں کو پتہ چلا کہ شہر میں اناج بڑی تیزی سے کم ہو رہا ہے اور مویشیوں کے لئے ہر اچارہ بھی نہیں مل رہا۔

یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس نے انتھونیس اور روتاس پر خاموشی طاری کر دی اور انہیں

کوئی ایسی بات نہ سوجھی جس سے وہ لوگوں کے دل پر چا سکتے اور انہیں جھوٹی تسلیاں دے کر ان کا حوصلہ قائم رکھ سکتے۔ انتھونیس نے اُسی وقت قبیلوں کے سرداروں کو بلایا اور الگ لے جا کر بٹھایا اور خوراک کی صورت حال ان کے سامنے رکھ کر کہا کہ اب ہمیں یہ محاصرہ باہر نکل کر توڑنا ہی پڑے گا۔ اگر ہم نے انتظار کیا کہ محاصرہ خود ہی واپس چلا جائے گا تو شہر کے لوگ فاقہ کشی کے ڈر سے خود ہی دروازے کھول دیں گے اور اس کا جو نتیجہ ہو گا وہ کہنے کی ضرورت نہیں۔

سرداروں نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا کہ محاصرے پر حملہ کیا جائے اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ انتھونیس نے سرداروں سے کہا کہ وہ ان تمام لوگوں کو اکٹھا کریں جو لڑنے کے قابل ہیں تاکہ انہیں ضروری ہدایات دی جاسکیں۔

○

حلب کے اس محاصرے کے متعلق مؤرخوں نے جو تفصیلات لکھی ہیں ان کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خالد بن ولید دشمن کی نفسیات کے ساتھ کھیلنے کی کوشش میں تھے۔ وہ اب نفسیاتی داؤ پیچ کی جنگ لڑنے کی فکر میں تھے۔ انہیں یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ جو دودستے محاصرے سے ہٹائے ہیں، اس کارروائی کا شہر کے اندر رد عمل کیا ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ شہر میں اناج کی قلت بھی پیدا ہو گئی ہے۔

اپنے ساتھی سالار عیاض بن غنم کے ساتھ صلاح مشورہ کر کے خالد بن ولید نے شہر کے ایک پہلو سے محاصرہ اٹھا ہی دیا اور اس طرف کے دستوں کو واپس بھیج دیا۔

اُس روز انتھونیس، روتاس اور قبیلوں کے سردار دیوار پر کھڑے خالد بن ولید کی یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ اس طرف سے محاصرہ اٹھ ہی گیا ہے تو وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے۔

”ہم مزید انتظار نہیں کریں گے“ — انتھونیس نے اپنا فیصلہ سنایا — ”کل صبح اس طرف کے دونوں دروازے کھول کر باہر نکلیں گے اور ان مسلمانوں کو کاٹ کر رکھ دیں گے۔“

اگلی صبح ابھی طلوع ہوئی ہی تھی کہ شہر کے دو دروازے کھلے اور شہر کے لوگ بڑھیاں اور تلواریں لئے اس طرح دوڑتے باہر نکلے جیسے سیلابی دریا کا بند یا کنارہ ٹوٹ گیا

ہو۔ ان میں گھوڑ سوار بھی تھے۔ مسلمان ایسی حالت میں تھے جیسے وہ ایسا شدید اور تیز حملہ روک ہی نہیں سکیں گے نہ انہیں حملہ روکنے کی تیاری کی مہلت ہی ملے گی لیکن مسلمان سالاروں نے مجاہدین کو ہر وقت تیار رہنے کا حکم دے رکھا تھا اور ساتھ یہ کہا تھا کہ وہ اس طرح چلیں پھریں اور درختوں کے نیچے جا کر لیٹیں جیسے ان پر چھکن اور مایوسیوں کی چٹائیں آپڑی ہوں۔

انھوئیں نے حملے کی سکیم دانشمندی سے تیار کی تھی۔ یوں نہ کیا کہ ایک طرف حملہ کرتا۔ اس طرح اس کے لشکر پر پیچھے سے مجاہدین حملہ کر دیتے۔ اس نے شہریوں کو بتا دیا تھا کہ دروازے سے نکلتے ہی دو حصوں میں بٹ جائیں اور حملہ دائیں اور بائیں کریں تاکہ ان کے عقب محفوظ رہیں۔ ایک حصے کا کمانڈر انھوئیں خود تھا اور دوسرے حصے کی کمانڈر روتاس کے پاس تھی۔ یو کلس روتاس کے ساتھ تھا۔

بظاہر ڈھیلے ڈھالے اور تھکے تھکے سے مجاہدین جب انھیں اور مقابلے پر آئے تو حملہ آوروں نے یقیناً ”محسوس کیا ہو گا کہ وہ بڑی سخت چٹانوں سے جا ٹکرائے ہیں۔ مجاہدین نے بہادری سے اس اچانک حملے کا مقابلہ کیا۔

خالد بن ولید کی دوسری سکیم یہ تھی کہ کبھی بھی اندر سے حملہ آجائے تو حملہ آوروں کے پیچھے سے کھلے دروازے میں داخل ہونے کی کوشش کی جائے لیکن یہ سکیم کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ انھوئیں نے اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دائیں بائیں کو کر دیا تھا۔

گھسان کی لڑائی میں انھوئیں اور روتاس نے اپنے لشکر کو ایک تربیت یافتہ فوج کی طرح لڑانے کی کوشش کی لیکن وہ فوج نہیں تھی۔ وہ لڑنے والوں کا جھوم تھا جو ایک ہی بات سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کو قتل کرنا ہے۔ ہوا یہ کہ قبائلی خود ہی قتل ہونے لگے۔ مجاہدین کی اکثریت گھوڑ سوار تھی۔

انھوئیں جان گیا کہ مسلمان دروازوں کی طرف آنا چاہتے ہیں لیکن اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اس کا لشکر مسلمانوں کو روک نہیں سکے گا۔ اس صورت حال پر اس نے اس طرح قابو پایا کہ اپنے لشکر کو واپس شہر میں آ جانے کا حکم دیا۔ اُس کا حکم چل نہیں رہا تھا۔ اُس نے سرداروں سے کہا کہ اپنے اپنے آدمیوں کو واپس شہر میں دھکیلو۔ یہ سرداروں کا ہی کام تھا کہ وہ اپنے آدمیوں کو لڑائی میں سے نکالنے اور واپس شہر میں لانے میں کامیاب

ہو گئے۔ مجاہدین نے ان کا تعاقب کیا۔ انہیں امید تھی کہ وہ حملہ آوروں کے پیچھے پیچھے شہر میں داخل ہو جائیں گے لیکن دروازے بند ہو گئے۔ اندر والوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ ان کے چند سو آدمی باہر ہی رہ گئے تھے۔ ان آدمیوں نے مقابلہ جاری رکھا۔ چونکہ وہ دیوار کے قریب تھے اس لئے دیوار پر کھڑے تیر اندازوں اور برچھی بازوں نے مجاہدین پر تیروں کا مینہ برسایا اور برچھیاں بھی پھینکیں۔ اس سے مجاہدین کو اچھا خاصا نقصان اٹھانا پڑا اور دشمن کے بہت سے آدمی جو باہر رہ گئے تھے، بچ نکلے۔ ان کے لئے دروازہ کھلا اور وہ اندر چلے گئے۔

دیوار پر کھڑے قبائلیوں نے باہر کا منظر دیکھا۔ دُور دُور تک لاشیں بکھر گئی تھیں اور شدید زخمی اٹھ کر چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس منظر سے قبائلی عیسائیوں کا حوصلہ اور زیادہ بڑھ گیا اور وہ اعلان یہ کہنے لگے کہ وہ ایسا ہی ایک اور حملہ پھر کریں گے۔ انھوئیں نے سب کو فیصلہ سنا دیا کہ ایسا حملہ بلکہ اس سے زیادہ زوردار حملہ ایک بار پھر کیا جائے گا۔

شہر کی عورتیں اپنے بیٹوں، بھائیوں اور خاندانوں کو ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔ وہ اس جھوم پر ٹوٹ پڑی تھیں جو لڑکرواپس آیا تھا۔

ان میں ایک لیزا بھی تھی جو باگلوں کی طرح ”یو کلس یو کلس“ پکارتی پھر رہی تھی۔ اسے اپنا بیٹا نظر نہیں آ رہا تھا۔ یو کلس بھی اس حملے میں شامل تھا۔ لیزا دوڑتی ہوئی دیوار پر جا پڑھی تو دُور سے اسے اپنا اکلوتا بیٹا نظر آ گیا۔ وہ روتاس کے پاس کھڑا تھا۔ لیزا یوں دوڑ کر یو کلس سے جا لپٹی جیسے چیل اوپر سے آ کر چوڑے کو بچوں میں دو بچ کر اوپر لے جاتی ہے۔ لیزا نے بیٹے کو اوپر سے نیچے تک اور ہر طرف سے دیکھا کہ یہ زخمی تو نہیں۔ یو کلس نے اسے حوصلہ دیا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے اور وہ اس کے لئے ایسی دیوانگی کا اظہار نہ کیا کرے۔

یو کلس کی تلاش میں ماری ماری پھرنے والی ایک نوجوان اور بڑی ہی حسین لڑکی روزی بھی تھی جو کسی سے پوچھتی ہی نہیں تھی کہ یو کلس واپس آ گیا ہے یا نہیں یا وہ کہاں ہے۔ یہ وہی عیسائی لڑکی تھی جسے یو کلس نے فسطین سے بچایا تھا۔ یہ لڑکی اسے طلب میں ملی اور پھر ان کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔

روزی بھی دیوار پر چلی گئی اور دُور سے یو کلس کو لیزا کے بازوؤں میں دیکھ لیا۔ وہ

کی نماز کے بعد بہت ہی مختصر الفاظ میں مجاہدین کو ان کے فرائض یاد دلایا کرتے تھے اور ایک بات اکثر کہا کرتے — ”اللہ کی سلطنت کی کوئی سرحد نہیں ہوتی، جہاد اللہ کے نام پر ہوتا ہے اور اس کا اجر اللہ ہی دیتا ہے“ — پھر کبھی کبھی وہ یہ بات بھی کہا کرتے تھے — ”دعا عمل کے بغیر اور عمل دعا کے بغیر اُس پودے جیسا ہے جسے اُگا تو لیا لیکن پانی دینا بھول گئے“۔

خالد بن ولید مجاہدین کو براہ راست جو احکام دینا چاہتے تھے وہ فجر کی نماز اور دعا کے بعد دیا کرتے تھے۔ انہوں نے مجاہدین کو تیار کر رکھا تھا کہ اندر سے دوسرا حملہ آئے گا۔ اس کا انہیں اس طرح یقین ہو گیا تھا کہ جو قبائلی عیسائی زخمی ہو کر گرے اور پھر شہر میں واپس نہیں جاسکے تھے ان سے معلوم کر لیا گیا تھا کہ شہر میں اناج کی اتنی قلت پیدا ہو گئی ہے کہ کچھ ہی دنوں تک صورت خطہ دالی ہو جائے گی۔ ان زخمیوں سے یہ بھی معلوم کر لیا گیا تھا کہ شہر کے لوگ جلدی سے جلدی محاصرہ توڑنا چاہتے ہیں اور کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لینے کے حق میں ہیں۔۔۔ اندر کی صورت حال معلوم ہو جانے سے خالد بن ولید اور عیاض بن غنم کے لئے داؤ پیچ سوچنا اور فیصلے کرنا آسان ہو گیا۔

قلعے کے اندر بھی اگلی دفاعی کارروائی کے متعلق فیصلے ہو رہے تھے۔ انٹھونیس اور روتاس نے دو روز بعد علی الصبح حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بہت سے معمولی زخمی ٹھیک ہو چکے تھے اور پہلے سے زیادہ شہری حملے میں شریک ہونے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ انٹھونیس کا عزم یہ تھا کہ یہ حملہ فیصلہ کن ہو گا۔ اندر کے لشکر کو اب دو کی بجائے چار دروازوں سے نکلنا تھا یعنی حملہ شہر کے دونوں پہلوؤں سے کیا جائے گا۔

یوکلس نے انٹھونیس اور روتاس کو بتائے بغیر اپنا ایک جانباز گروہ تیار کر لیا تھا جس میں اسی جیسے نوجوان شامل ہوئے تھے اور وہ سب گھوڑ سوار تھے۔ انہوں نے طے کیا تھا کہ مسلمانوں کے سپہ سالار پر حملہ کریں گے اور اُسے زندہ یا مردہ شہر کے اندر لائیں گے۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ وہ کہیں اور نہیں لڑیں گے، صرف اُس جگہ پہنچیں گے جہاں سپہ سالار ہو گا۔ وہ جانتے تھے کہ سپہ سالار محافظوں کے حصار میں ہو گا اور انہیں بڑی ہی خونریز لڑائی لڑنی پڑے گی۔

حملے کی صبح میں ایک دن رہ گیا تھا اور ایک رات۔ یوکلس اپنی ماں سے رخصت ہو

دوڑ پڑی اور اُس تک پہنچی۔ ان لوگوں میں حجاب تو تھا ہی نہیں۔ یوکلس نے روزی کو دیکھا تو ماں کے بازوؤں سے نکل کر روزی کو اپنے ایک بازو میں جکڑ کر سینے سے لگایا۔

○

شہر سے باہر مجاہدین اپنے ساتھیوں کی لاشیں اٹھا رہے تھے۔ زخمیوں کو اٹھانے کا کام عورتوں کے سپرد تھا۔ یہ عورتیں مجاہدین کی بیویاں، بہنیں اور بیٹیاں تھیں جو مجاہدین کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان کی رہائش کا انتظام محاصرے سے دور پیچھے خیموں میں کیا گیا تھا۔ ان میں شاریتا بھی تھی جو ہرقل کی بیٹی تھی اور اب ایک مجاہد حدید بن مومن خزنہ کی بیوی تھی۔ وہ دوسری عورتوں کے ساتھ زخمیوں کو پانی پلا رہی تھی اور انہیں اٹھا اٹھا کر پیچھے مرہم پٹی کے لئے بھی لے جا رہی تھی۔

مجاہدین کا جانی نقصان ہوا تھا لیکن اتنا نہیں کہ محاصرے کی تقویت پر اثر انداز ہو۔ زخمیوں کی تعداد کچھ زیادہ تھی لیکن یہ بھی محاصرے کو کمزور نہیں کر سکتی تھی۔ خالد بن ولید نے شہر کے دوسری طرف سے چند سو گھوڑ سواروں کو ہٹا کر اُس طرف کر دیا جہاں سے انہوں نے محاصرہ اٹھایا تھا۔ اس کے سوا انہوں نے کوئی اور سرگرمی نہ دکھائی یعنی قلعے پر حملے کی کوئی کوشش نہ کی اور مجاہدین کو پہلے کی طرح کاروتیہ اختیار کرنے کو کہا۔

یہ بتانا ممکن نہیں کہ محاصرہ کتنا عرصہ رہا۔ اس سلسلے میں مورخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک نے تو یہ عرصہ سات سال لکھا ہے جو کسی پہلو قابل قبول نہیں۔ مختلف مورخوں کی تحریروں سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ محاصرہ چند مہینے رہا تھا۔ پھر کسی تاریخ میں ایسی تفصیلات نہیں ملتیں کہ خالد بن ولید نے ان قبائلی عیسائیوں کو اور کیا کیا دھوکے دیئے تھے کہ وہ اُسی دفاعی کارروائی پر آگئے جو خالد بن ولید چاہتے تھے۔

دونوں فریقوں کو کچھ دنوں کی مہلت درکار تھی تاکہ معمولی زخمی ٹھیک ہو جائیں۔ انٹھونیس اور روتاس اگلے حملے کا پلان بناتے رہے۔ قبیلوں کے سردار ان کے ساتھ رہتے تھے۔ ہر حکم ہر بات ان سرداروں کے ذریعے شہریوں تک پہنچتی تھی۔ اب تو نوحہ لڑکے بھی لڑنے کے لئے تیار ہو گئے تھے اور عورتوں نے بھی کہا تھا کہ ان کی ضرورت محسوس ہو تو وہ بھی لڑیں گی۔

مسلمانوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ نماز کی امامت سپہ سالار کرتا تھا۔ خالد بن ولید فہر

لئے اور وہ دوڑتی صحن میں آئی۔ اس نے دونوں دوستوں کو دیکھا جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے پر وار کرنے کے لئے پیچھے ہٹے۔ دونوں کے یہ پینترے ایسے تھے جیسے دونوں کو یہ یقین تھا کہ وہ دشمن کو مار لیں گے۔ وہ تلواریں بر بھیجی کی طرح سیدھی کر کے ایک دوسرے کو مارنے آگے بڑھے تو لیزا دوڑ کر ان کے درمیان آگئی اور انہیں رک جانے کو کہا لیکن دونوں بڑی تیزی سے آگے بڑھے تھے اور فاصلہ کچھ تھا ہی نہیں اس لئے وہ روک نہ سکے اور ہوا یہ کہ ایک کی تلوار بر بھیجی کی طرح لیزا کی پیٹھ میں اتر گئی اور دوسرے کی تلوار لیزا کے پیٹھ کے دور اندر چلی گئی۔ دونوں نے تلواریں کھینچ لیں لیکن وار اتنے بھرپور تھے کہ لیزا زندہ رہ سکتی ہی نہیں تھی۔ وہ مری اور ایک پہلو کی طرف لڑھک گئی۔ دونوں نے اسے دیکھا پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انٹونیس پیچھے ہٹا جیسے وہ روتاس پر ایک اور حملہ کرے گا۔

”نھر جاؤ انٹونیس!“ — روتاس نے اپنی تلوار بڑی زور سے صحن میں پھینکی۔ تلوار کچے صحن میں اتر کر وہیں کھڑی رہی اور ہلتی رہی۔ روتاس نے کہا — ”ہم دونوں ایک عورت کے پیچھے اپنی حیثیت بھول بیٹھے ہیں۔ کیا ہم نے یسوع مسیح کی سلطنت قائم کرنے کا عزم نہیں کیا تھا؟.... اگر مجھے قتل کرنا چاہتے ہو تو کر دو لیکن اپنے عزم کو نہ بھولنا یہ جو مر گئی ہے ایک بدکار عورت تھی ہمیں ایک عورت کی خاطر ایک دوسرے کا دشمن نہیں ہونا چاہئے۔“

انٹونیس نے بھی تلوار نیام میں ڈال لی اور روتاس کی تلوار صحن سے اکھاڑ کر اس کے ہاتھ میں دے دی اور اسے باہر چلنے کو کہا۔ باہر نکل کر انٹونیس نے روتاس سے کہا کہ جو ہوا ہے وہ دل سے اتار دے اور بھول جائے۔ ہمیں فتح حاصل ہو جائے، عورتوں کی کمی نہیں۔

یوکلکس اپنے جانباز گروہ میں چلا گیا تھا۔ وہ ماں کو کہہ گیا تھا کہ حملے بعد ہی واپس آئے گا۔ اسے بتانے والا کوئی نہ تھا کہ اس کی ماں روتاس کے گھر میں مری پڑی ہے۔ انٹونیس اور روتاس یوں آپس میں پہلے کی طرح شیر و شکر ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

○

مک کا اُجالا ابھی دھندلا تھا جب شہر کے دو دروازے ایک پہلو سے اور دوسرے دو

کر چلا گیا۔ اس نے صرف ماں کو بتایا تھا کہ ایک جانباز گروہ تیار کیا ہے جس کا انٹونیس اور روتاس کو علم نہیں اور اس کا یہ گروہ مسلمانوں کے سپہ سالار کو زندہ یا مرنے اپنے ساتھ لائے گا۔ اس نے ماں سے کہا تھا کہ اب وہ اپنے گروہ میں جا رہا ہے اور واپس گھر حملے کے بعد ہی آئے گا۔ ماں نے اسے پیار اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا تھا۔

انٹونیس بہت مصروف تھا۔ کبھی دیوار پر چلا جاتا اور مسلمانوں کے لشکر کو دیکھتا اور پھر دوڑا نیچے چلا جاتا اور قبائلی سرداروں سے مل کر انہیں پہلے کئی ہوئی باتیں ایک بار پھر کہتا۔ ایک جنوں اور ایک خبط تھا جو اس کے دماغ پر سوار ہو گیا تھا۔

○

دن کا پچھلا سپر تھا۔ انٹونیس کو روتاس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کسی اور بھیجنے کی بجائے وہ خود اس کی تلاش میں چل پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ روتاس اسی کی طرح باہر بھاگتا دوڑتا پھر رہا ہو گا لیکن وہ اسے نہ ملا۔ آخر وہ روتاس کے گھر کو چل دیا۔ وہ اکیلا رہتا تھا اس لئے انٹونیس بغیر اطلاع اندر چلا گیا۔

صحن میں جا کر اس نے روتاس کو آواز دی۔ ایک کمرے میں سے روتاس کی آواز سنائی دی کہ وہ کپڑے بدل کر آتا ہے۔ انٹونیس اس خیال سے اس کے کمرے کی طرف چل پڑا کہ وہ اکیلا ہو گا۔ دروازہ بند تھا لیکن کواڑوں پر ہاتھ رکھا تو کواڑ کھل گئے۔ انٹونیس نے کمرے میں جو منظر دیکھا اس سے اس کا خون کھول اٹھا اور دماغ کو چڑھ گیا۔ لیزا بھی اس کمرے میں موجود تھی اور بڑی تیزی سے کپڑے پہن رہی تھی۔ کئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ اس سے پہلے وہ رہنہ تھی۔ روتاس بھی بڑی ہی تیزی سے کپڑے پہن رہا تھا۔ انٹونیس محاصرے کو اور اگلے دن کے حملے کو بھول ہی گیا اور اس نے تلوار نکال لی۔

”تلوار نہ لو“ — انٹونیس نے روتاس کو لٹکارا — ”صحن میں آ جاؤ پھر زندہ رہے گا یہ عورت اُس کی ہوگی۔“

یہ اُس زمانے کا دستور تھا کہ بعض تنازعات کے فیصلے تلوار کیا کرتی تھی.... روتاس نے فوراً ”چیلنج قبول کر لیا اور تلوار لے کر صحن میں نکل آیا۔ وہ بھی آخر رومی تھا اور اس کا کردار ان کے کلچر کے عین مطابق تھا۔

انٹونیس اور روتاس کی تلواریں ٹکرانے لگیں۔ اتنے میں لیزا نے کپڑے پہن

دوسرے پہلو سے کھلے اور اندر سے لشکر بڑی ہی تیزی سے ان چاروں دروازوں سے نکلے گا۔ اُدھر پانچواں دروازہ کھلا اور یوکلُس اپنے تقریباً ایک سو جانبازوں کے ساتھ شہر سے نکلا۔ یہ دروازہ اسی نے کھلایا تھا۔ انتھونیس نے صرف چار دروازے کھولنے کا حکم دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ حملے کے دوران دروازے کھلے رکھے جائیں۔

اب کے لشکر کے لڑنے کا انداز کچھ اور تھا۔ دائیں بائیں حملے کرنے کی بجائے سیدھے حملے کئے گئے۔ مسلمان حملہ روکنے کے لئے تیار ہو گئے اور تصادم ہوا۔

مجاہدین کے لڑنے کا انداز یہ تھا کہ وہ مقابلہ تو کر رہے تھے لیکن دباؤ ڈالنے کی بجائے پیچھے ہٹتے جا رہے تھے۔ ان قبائلیوں کو معلوم نہ تھا کہ خالد بن ولید کس قدر دانشمند بہ سالار ہیں اور رہتی دنیا تک غیر قومیں بھی ان کے حوالے دیا کریں گی۔ مجاہدین کا اس طرح آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا کہ دشمن کو یہ دھوکا ہو کہ یہ ابھی بھاگ نکلیں گے، مسلمانوں کی ایک خاص جنگی چال تھی جس نے انہوں نے بڑی بڑی جنگی طاقتوں کو شکست دی تھیں۔ انتھونیس اور روتاس بھی اسی دھوکے میں آ گئے اور محسوس ہی نہ کر سکے کہ ان کے لشکر قلعے سے خاصی دور نکل آئے ہیں جہاں سے ان کے لئے واپسی محال ہو جائے گی۔

جب دونوں طرف کے قبائلی لشکر مسلمانوں سے لڑتے لڑتے شہر سے بہت دور نکل گئے تو شہر کے ساتھ والی ٹیکریوں اور پہاڑی میں سے گھوڑ سوار مجاہدین کا ایک سیلاب نکل یا تیز و تند طوفان تھا جو حیران کن رفتار سے شہر کی طرف آیا اور شہر کی دیوار اور قبائلی عیسائیوں کے لشکر کے درمیان حائل ہو گیا۔ یہ وہ گھوڑ سوار مجاہدین تھے جو محاصرے سے نکل گئے تھے اور انتھونیس اور شہر کے لوگوں کو یہ دھوکا ہوا تھا کہ مسلمان محاصرہ اٹا رہے ہیں اور یہ گھوڑ سوار دستے واپس چلے گئے ہیں۔ وہ گئے کہیں بھی نہیں تھے۔ ٹیکریوں اور پہاڑی کے پیچھے جا کر چھپ گئے تھے اور اپنے سپہ سالار کے اشارے کا انتظار کرتے رہے تھے۔

انہیں بہت ہی دنوں بعد اشارہ ملا اور ان کے لئے جو حکم تھا اس کی تعمیل انہوں نے پوری خوش اسلوبی سے کی۔

ان میں سے کچھ شہر کے کھلے دروازوں میں سے اندر چلے گئے اور باقی قبائلی لشکر، ٹوٹ پڑے۔ محاصرہ کرنے والے وہ مجاہدین جو لڑتے لڑتے پیچھے ہٹ رہے تھے، بکثرت

رک گئے اور قبائلیوں پر ہتھ بول دیا۔ اب قبائلی لشکر دونوں طرف نرغے میں آ گئے تھے اور اُدھر مجاہدین شہر میں بھی داخل ہو گئے تھے۔ شہر میں کچھ مزاحمت ہوئی لیکن وہ نہ ہونے کے برابر تھی۔

مجاہدین تمام شہر میں گھوم گئے اور اعلان کرتے گئے کہ تمام آدمی گھروں سے باہر نکل آئیں اور عورتیں گھروں کے اندر رہیں۔ اگر کوئی مرد گھر کے اندر چھپا ہوا پایا گیا تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ عورتیں بالکل نہ ڈریں۔ ان کی طرف کوئی غلط نظر سے دیکھے گا بھی نہیں نہ کسی بوڑھے، بچے یا مریض پر ہاتھ اٹھایا جائے گا نہ کوئی ضعیف العمر یا مریض آدمی گھر سے باہر آئے۔

صرف کہنے پر کون یقین کرتا.... لوگوں نے اپنی عورتوں اور خصوصاً جوان لڑکیوں کو گھروں میں اُدھر اُدھر چھپا دیا اور خود باہر نکل آئے۔ عورتیں ڈر کے مارے باہر نہیں آتی تھیں نہ اپنے مکانوں کی چھتوں پر جاتی تھیں کہ دیکھتیں کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ ہر گھر میں افرا تفری برپا ہو گئی تھی۔ اگر یہ فوج رومیوں یا ایرانیوں کی یا کسی اور غیر مسلم قوم کی ہوتی تو وہ گھروں پر ہتھ بول دیتی، لوٹ مار کرتی اور قتل عام بھی۔ کوئی جوان عورت ان کی دستبرد سے نہ بچتی لیکن مجاہدین نے لوگوں کے گھروں کی طرف دیکھا تک نہیں۔

شہر میں تمام آدمی باہر میدانوں میں اکٹھے ہو گئے۔ شہر کے باہر قبائلی عیسائیوں کا قتل عام ہو رہا تھا۔ وہ خالد بن ولید کے پھندے میں آ گئے تھے۔

یوکلُس اپنے ایک سو جانبازوں کے ساتھ مسلمانوں کے سپہ سالار کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ مسلمانوں کا سپہ سالار بادشاہ نہیں ہوا کرتا جو میدان جنگ سے ذرا دور ایک جگہ کھڑے رہ کر حکم چلاتا ہے۔ خالد بن ولید جنگ کے دوران کسی ایک جگہ تو ٹھہرتے ہی نہیں تھے۔ قاصد اور محافظ ان کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ یوکلُس انہیں ڈھونڈتا ہی رہا کہ وہ بھی اپنے جانبازوں کے ساتھ مجاہدین کے گھیرے میں آ گیا اور نوجوانوں کا یہ دستہ کٹ کٹ کر گھوڑوں سے گرنے لگا اور گھوڑے انہیں پاؤں تلے روندنے میں ملنے لگے۔

”دونوں رومی مارے گئے ہیں“ — کسی بڑی ہی بلند آواز سے کہا —
”انتھونیس بھی نہیں رہا، روتاس بھی قتل ہو گیا ہے۔“

یہ آواز کئی آوازوں میں بدل گئی اور تمام ترمیدان جنگ میں یہ اطلاع پھیل گئی کہ

قبائلیوں کے کمانڈر انتھونیس اور روتاس مارے گئے ہیں۔ قبائلی عیسائیوں کا جوش و خروش ایسا ماند پڑا جیسے جلتی مشعل اچانک بجھ گئی ہو۔ انہوں نے برجھیاں تلواریں اور کمانیں پھینک دیں اور چلا چلا کر کھنکے لگے کہ ہم نہیں لڑیں گے۔ ان میں جو گھوڑوں پر سوار تھے، وہ گھوڑوں سے اتر آئے اور اس طرح جو مرنے سے بچ گئے تھے ہتھیار پھینک کر موت سے محفوظ ہو گئے۔

خالد بن ولید نے جنگ روک دی اور یہ حکم نہیں دیا کہ ہتھیار ڈالنے والوں کو قید میں ڈال دیا جائے بلکہ یہ اعلان کیا کہ جو قبائلی ہتھیار ڈال چکے ہیں وہ شہر کے اندر چلے جائیں لیکن اپنے گھروں میں نہ داخل ہوں۔ اس حکم کے مطابق قبائلی سر جھکائے ہوئے دروازوں میں داخل ہونے لگے اور ایک میدان میں اکٹھے ہو گئے۔ کچھ دیر بعد خالد بن ولید اور سالار عیاض بن غنم شہر کے صدر دروازے سے فاتحین کی حیثیت سے شہر میں داخل ہوئے۔ یہ شام کا آخری قلعہ تھا۔ وہ بھی فتح ہو گیا اور شام کی فتح پر مسلمانوں کی مرثیت ہو گئی۔ خالد بن ولید اُس جگہ گئے جہاں شہر کے لوگوں کو اکٹھا کیا گیا تھا۔ ہتھیار ڈالنے والوں کو بھی وہیں لے گئے اور خالد بن ولید نے ان سے مختصر خطاب کیا۔

”الجزیرہ کے لوگو!“ — خالد بن ولید نے کہا — ”ہم نے یہ شہر لو کر لیا ہے اور تم نے ہمیں جانی نقصان پہنچایا ہے۔ تمہارے ساتھ ہمارا سلوک کچھ اور ہونا چاہئے تھا لیکن میں اُس راستے پر چلوں گا جو مجھے ہمارے امیر المومنین حضرت عمرؓ نے دکھایا ہے۔ ہمارے دستور کے مطابق تم سب کو اسلام قبول کر لیتا چاہئے اور پھر ہمارا حق ہے کہ تم سے تلوان بھی وصول کریں لیکن بنو تغلب نے ہتھیار ڈالے تھے تو ہمارے امیر المومنین نے حکم بھیجا تھا کہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا جائے، اس کی بجائے جزیہ وصول کیا جائے۔ تم سب کو جزیہ دینا پڑے گا اور جزیہ ہر ایک کی حیثیت کے مطابق وصول کیا جائے گا۔ تم لوگ ہمارے خلاف لڑنے کے لئے رومیوں کے ساتھ جا ملے تھے۔ تمہیں اس کی سزا ملنی چاہئے لیکن ہم تمہیں کوئی سزا نہیں دیں گے۔ کیا شہر کے کسی بھی گھر میں لوٹ مار ہوئی ہے؟ کوئی مسلمان کسی گھر میں داخل ہوا ہے؟“

”نہیں.... نہیں سپہ سالار!“ — بہت سی آوازیں آئیں جن کا مطلب یہ تھا کہ نہ لوٹ مار ہوئی ہے نہ کوئی مسلمان کسی گھر میں داخل ہوا ہے۔“

”اور نہ ہو گا“ — خالد بن ولید نے کہا — ”ہم تمہاری عزت و آبرو اور

تمہارے جان و مال کے محافظ ہیں لیکن کسی نے ذرا سی بھی بد امنی یا غداری کی تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔“

مورخ لکھتے ہیں کہ حلب کے غیر مسلموں کے دلوں پر جو خوف بیٹھ گیا تھا وہ نکل گیا اور کئی ایک نے اُسی روز اسلام قبول کر لیا۔

○

سورج غروب ہونے میں ابھی بہت وقت باقی تھا۔ مجاہدین اپنے زخمی ساتھیوں اور شہیدوں کی لاشوں کو اٹھا رہے تھے، ان کی خواتین زخمیوں کو پانی پلاتی پھر رہی تھیں اور ان میں جو ذرا بھی چلنے کے قابل تھے انہیں سارا دے کر وہاں پہنچا رہی تھیں جہاں مرہم پانی کا انتظام تھا۔

وہاں دو ہی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ایک زخمیوں کا کراہنا اور دوسرا پانی، پانی، خدا کے واسطے ایک بوند پانی.... شاریتا بھی اسی کام میں مصروف تھی کہ وہ ایک زخمی کو دیکھ کر رک گئی اور حیرت زدگی کے عالم میں اس کے پاس بیٹھ گئی۔ یہ ایک نوجوان زخمی تھا جس کے چہرے اور سر پر تو کوئی زخم نہ تھا لیکن اس کے تمام کپڑے لال سرخ ہو گئے تھے اور خون اُبل اُبل کر نکل رہا تھا۔

”تم یو کلس تو نہیں ہو سکتے!“ — شاریتا نے کہا — ”شاہ ہر قل کے بیٹے کا یہاں کیا کام.... میں خواب تو نہیں دیکھ رہی!“

”میں یو کلس ہی ہوں شاریتا!“ — زخموں سے نڈھال یو کلس نے کہا — ”میں تمہیں دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں، تم یہاں کیسے؟“

یو کلس بے اچھی طرح بولا نہیں جا رہا تھا۔ وہ بولتا تھا تو اس کی آواز ڈوبنے لگتی تھی۔

”چپ رہو یو کلس!“ — شاریتا نے کہا — ”یہ وقت کمائیاں سننے سنانے کا نہیں کہ تم یہاں کیسے آ گئے اور میں یہاں کس طرح آن پہنچی ہوں۔ یہ لو پانی پیو اور میں تمہیں اٹھوا کر مرہم پٹی کے لئے لے چلتی ہوں۔“

”نہیں شاریتا!“ — یو کلس نے کہا — ”میرا وقت پورا ہو چکا ہے۔ معلوم نہیں ٹما اب تک زندہ کیسے ہوں۔ مجھے یہیں آخری سانس لے لینے دو۔“

یو کلس نے شاریتا کا ایک ہاتھ پکڑ لیا۔ یہ تو الگ بات ہے کہ یو کلس انتھونیس کا بیٹا

تھا لیکن سب اسے شاہ ہرقل کا بیٹا کہتے تھے کیونکہ وہ ہرقل کی ایک بیوی لیزا کا بیٹا تھا۔
شارینا بھی شاہ ہرقل کی بیٹی تھی اس لئے وہ اور یوکلکس ایک دوسرے کو بڑی اچھی طرح
جانتے تھے۔

شارینا نے یوکلکس سے کہا کہ وہ مجاہدین کو بلواتی ہے اور وہ اسے اٹھا کر شہر میں لے
چلیں گے لیکن یوکلکس نے شارینا کا ہاتھ اور زیادہ مضبوطی سے پکڑ لیا اور زور زور سے ہر
ہلا کر کہنے لگا کہ وہ مرہم بیٹی نہیں کروائے گا کیونکہ وہ بے کار ہوگی۔

اُوھر دُور دُور تک بکھری ہوئی لاشوں میں نوجوان روزی یوکلکس کو ڈھونڈتی پھر رہی
تھی۔ عورتوں کے لئے باہر نکلنے کی پابندی تھی لیکن وہ چھپتی چھپاتی کسی طرح گھر سے ہی
نہیں بلکہ شہر سے نکل آئی اور یوکلکس کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ شاید اسے کسی نے بتا دیا
تھا کہ یوکلکس مارا گیا ہے یا بڑی طرح زخمی ہو گیا ہے۔

روزی پاگلوں کی طرح زخمیوں اور لاشوں کو دیکھتی پھر رہی تھی۔ وہ کئی بار کسی نہ
کسی لاش سے ٹھوکر کھا کر گری اور اٹھ کر پھر زخمیوں اور لاشوں کے خون آلود چہرے
دیکھنے لگتی۔ آخر وہ وہاں تک جا پہنچی جہاں شارینا یوکلکس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔
یوکلکس کو دیکھ کر وہ اس کے اوپر گری اور دیوانہ وار اس کے منہ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

”اٹھنے کی کوشش کرو یوکلکس!“ — شارینا نے اپنا ایک بازو یوکلکس کے کندھوں
کے نیچے لے جاتے ہوئے کہا — ”ہم دونوں تمہیں اٹھا کر لے جائیں گی۔“

”ہم اٹھالیں گی یوکلکس!“ — روزی نے کہا۔
”میں تمہارے ہی انتظار میں تھا روزی!“ — یوکلکس نے روزی سے کہا۔

”میری ماں سے کہنا....“ — اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ آنکھیں پتھرا گئیں اور
ہونٹ نیم وار ہے۔

روزی کے سینے سے ایک چیخ نکلی اور وہ لاش سے لپٹ گئی۔ شارینا وہاں سے اٹھی
اور ایک آہ لے کر وہاں سے چلی گئی۔ اُس نے روزی سے یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ کون ہے۔

وہ زمانہ تھا کیا وہ مسلمان اور کیا ان کا ایمان تھا!.... آج کے پیمانوں سے ناپو
تو لگتا ہے کہ حساب غلط ہو گیا ہے، اور یہ جو ہم اسلامی فتوحات کی تاریخی
کہانیاں پڑھتے ہیں یہ افسانے ہیں۔

یہ تو انسانی فطرت کے مظاہر ہیں جو قدرت کے اٹل اصولوں کے تحت ظہور پذیر
ہوتے ہیں اور یہ عمل اور ردِ عمل کا فلسفہ ہے کہ عقلی عمل کے مطابق ہی ہوتا ہے۔
انسان غلط سوچوں میں پڑ جائے تو دماغ کا کمپیوٹر جو جواب دیتا ہے وہ غلط ہی ہوتا ہے....
مسلمان ایمان سے دستبردار ہو جائے تو اس کی نگاہ میں کل کی حقیقت آج کا افسانہ بن
جاتی ہے۔ وہ بھی مسلمان ہی تھے جو ایمان کو ہی اپنی متاعِ عزیز سمجھتے تھے اور ان کی
نگاہوں میں اپنی جانوں کی کوئی اہمیت تھی ہی نہیں۔ وہ ایمان کی طاقت ہی تھی کہ ان
مسلمانوں نے اُس دوز کی دیو بیکل جنگی طاقتوں کو افسانہ بنا ڈالا تھا جیسے ان کی حقیقت تھی
ہی نہیں۔

یہ فارس (ایران) اور روم کی طاقتیں تھیں جو آپس میں ٹکراتی تھیں تو یوں لگتا تھا
جیسے زمین و آسمان ہل رہے ہوں۔ کسریٰ ایران یعنی بادشاہِ وقت کو لوگ خدا کا بیٹا مانتے
تھے۔ جنگی طاقت ہو اور قدموں میں دنیا کا خزانہ پڑا ہوا ہو تو انسان اپنے آپ کو فرعونوں
کی طرح خدا بھی سمجھ لیتا ہے۔ کسریٰ تو اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ خدا کے اور خدا
کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے شیدائی جب پیغامِ حق لے کر نکلے تو ”خدا کا بیٹا“
بزرگِ دہاندار حکومتِ مدائن تمام تر خزانے سمیت مسلمانوں کے قدموں میں پھینک کر
بھاگ گیا۔ یہ ایران کا آخری کسریٰ تھا۔ اس کی پوری سلطنت پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا

اور اس کے ساتھ ہی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو گیا۔

ہم فتح مصر کی جو داستان سنا رہے ہیں اس کے ساتھ یزدگرد کے فرار اور انجام کا کوئی تعلق تو نہیں لیکن ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اسلام کی اصل روح پیش کرنے کے لئے یہ واقعہ مختصراً بیان کر دیا جائے۔ یزدگرد ایران مجاہدین کے حوالے کر کے ترکستان جا پناہ گزین ہوا اور اس امید کو دل میں زندہ رکھا کہ ایک نہ ایک دن ایران میں مسلمانوں میں بغاوت کرانے میں کامیاب ہو جائے گا اور اس موقع پر وہ ایران جا پہنچے گا اور اس کی سلطنت اسے واپس مل جائے گی اور کسی ایک بھی مسلمان کو وہاں سے زندہ نہیں نکلے دے گا۔

برسوں بعد اسے یہ موقع مل گیا۔ اُس وقت حضرت عثمان بن عفان خلیفہ تھے۔ خراسان میں بغاوت ہو گئی۔ یزدگرد نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ترکستان سے مروجہ پہنچا۔ اس نے مختلف سرداروں سے رابطہ کیا اور بغاوت کی آگ پر تیل چھڑکنے کی ہمت کوشش کی لیکن مسلمانوں نے جلدی ہی بغاوت پر قابو پالیا۔

یزدگرد نے کچھ لوگ اپنے گرد اکٹھے کر لئے تھے۔ وہ سب بھاگ نکلے۔ یزدگرد مجبور ہو گیا کہ جہاں سے آیا تھا وہیں بھاگ جائے لیکن اب اس کے لئے بھگنا بھی آسان نہیں رہا تھا۔ اس کے اپنے ایرانی اہلکار مسلمانوں کے جاسوس نکلے۔ سپہ سالار نے حکم دیا کہ یزدگرد کا سراغ لگائیں اور اسے گرفتار کر لیں۔

بھگوڑا سابق کسری روپوش ہوتا پھر رہا تھا اور مجاہدین اُس کے گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ آخر ایک روز وہ دریا کے کنارے ایک پن چکی کے کمرے میں جا چھپا۔ چکی والے نے نشاندہی کر دی اور اسے ڈھونڈنے والے وہاں جا پہنچے۔ وہ عرب کے مسلمان یعنی مجاہدین نہیں تھے بلکہ خراسان کے باشندے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے سپہ سالار سے یہ حکم نظر انداز کر دیا کہ یزدگرد کو گرفتار کر کے لایا جائے۔ اس کی بجائے انہوں نے یزدگرد کو قتل کر کے لاش دریا میں پھینک دی۔

تاریخ میں ایک روایت یہ بھی آتی ہے کہ چکی والا یزدگرد کو جانتا تو نہیں تھا لیکن اس کے شانہ لباس سے اور پھر چھپنے کے انداز سے یقین ہو گیا کہ یہ یزدگرد ہی ہو سکتا ہے جس کی گرفتاری کا اعلان ہو چکا ہے۔ چکی والے نے اپنا کمرہ باہر سے بند کر دیا اور فرار کے حاکم کے پاس جا پہنچا۔ اُسے بتایا کہ یزدگرد اس کے ہاں چھپا ہوا ہے۔ مروجہ حاکم نے

بچے ایک سالار کو حکم دیا کہ یزدگرد کا سر کاٹ کر اس کے پاس لایا جائے۔ چکی والا یہ حکم نہ کر دیا اور خود ہی یزدگرد کا سر کاٹ ڈالا اور جب سالار آیا تو سر اس کے حوالے کر دیا اور لاش دریا میں پھینک دی۔

تاریخ میں یہ اختلاف موجود ہے کہ یزدگرد کو کس نے کس طرح قتل کیا تھا لیکن اس روایت پر تمام مورخ متفق ہیں کہ یزدگرد کو چکی والے کمرے میں قتل کیا گیا اور اس کی لاش دریا میں پھینک دی گئی تھی۔



کسری ایران کی آتش پرست سلطنت یوں تاریخ کے قبرستان میں دفن ہو گئی اور دوسری طرف قیصر روم جو جنگی طاقت اور مال و دولت کے لحاظ سے یقیناً "دیویکل تھا" ہاٹین ڈھونڈ رہا تھا۔ اسے شام سے جس طرح بے دخل کیا گیا تھا، وہ سنایا جا چکا ہے۔ حلب شام کا آخری قلعہ تھا، وہ بھی مجاہدین نے فتح کر لیا تو قیصر روم شاہ ہرقل کے ساتھ وہی ایت بن گئی، نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔

شام تو قلعوں کا ملک تھا اور بعض قلعے اس قدر مضبوط تھے کہ انہیں ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا لیکن کوئی بھی قلعہ ہرقل کو پناہ نہ دے سکا۔ اس کی فوج تو لڑتی اور پسپا ہوتی رہتی جاری تھی اور جب آدھا شام مجاہدین نے فتح کر لیا تو ہرقل نے اپنی فوج کو مجاہدین کے رحم و کرم پر چھوڑ کر راہ فرار اختیار کر لی۔ اسے یہ خطرہ صاف نظر آنے لگا تھا کہ وہ گرفتار ہو جائے گا۔ وہ گرفتاری سے بچنے کے لئے بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔

آخر اسے اظاکہ ایک محفوظ مقام نظر آیا اور وہاں جا پناہ لی لیکن سپہ سالار ابو عبیدہ ہاں بھی جا پہنچے اور ہرقل کی محصور فوج بھاگ نکلی۔ ہرقل وہاں سے بھی زندہ و سلامت نکلا گیا اور اسے رہا ہوا مقام نظر آیا۔ یہاں کا قلعہ خاصا مضبوط تھا لیکن مجاہدین اسلام ہاں بھی جا کر بے اور ہرقل نکل بھاگا۔

حلب ایک آخری شامی قلعہ بند شہر رہا تھا۔ مجاہدین نے وہ بھی لے لیا لیکن ہرقل طبعاً سست و سلاخ تھا اور اس نے اور دور بھاگ جانا بہتر سمجھا۔ اس نے قسطنطنیہ جادہ لیا۔

قارئین کرام کی معلومات کے لئے یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قسطنطنیہ ترکی کا ایک شہر تھا اور ہرقل کے زمانے میں ترکی پر رومیوں کی حکومت تھی۔ قسطنطنیہ کا ایک نام بزنطیہ تھا۔ یہ نام اُس وقت رکھا گیا تھا جب وہاں بازنطینی حکومت تھی۔ ہرقل کے ایک

جائے۔ یہ تو مسلمانوں کا کردار تھا کہ وہ مفتوح بستیوں کے لوگوں کو مفتوح نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان لوگوں کو اپنی پناہ میں لے لیتے اور ان کی تمام ضروریات اپنے ذمے لے لیا کرتے تھے۔

پیش قدمی روک دینے کا فیصلہ دانشمندانہ تھا اور یہ حضرت عمرؓ کی جنگی فہم و فراست کا کرشمہ تھا۔ یہ تو انہیں معلوم تھا کہ مجاہدین فتح کی مسرتوں سے سرشار ہیں، ان میں جذبہ جہاد بھی اور شوق شہادت بھی ہے لیکن انہیں یہ بھی احساس تھا کہ وہ آخر گوشت پوست کے انسان ہیں، لوہے کے بنے ہوئے نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جسم جواب دے جائیں اور شام سے بھاگ جانے والے رومی کہیں قدم بجا کر پلٹ آئیں اور شکست کو فتح میں بدل لیں۔

مجاہدین کی خوشیوں کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مجاہدین نے کس طرح خوشیاں منائی ہوں گی۔ سالاروں نے شکرانے کے نوافل باجماعت پڑھائے ہوں گے۔ سپہ سالار ابو عبیدہؓ کو حلب کی فتح کی اطلاع ملی تو وہ محض سے فوراً وہاں پہنچے۔ تاریخ سے یہ تو پتہ نہیں چلتا کہ سپہ سالار ابو عبیدہؓ نے کون سی نماز کی امامت کی تھی، یہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے نماز باجماعت پڑھائی اور اس کے بعد مجاہدین سے خطاب کیا۔ ان کا یہ مختصر سا خطاب تاریخ کے دامن میں لفظ بہ لفظ موجود ہے۔ انہوں نے شام کی فتح کی مبارک باد کے بعد کہا:

”اللہ نے قرآن میں جس مدد کا وعدہ فرمایا ہے، اس مدد کے صدقے ہم نے اپنا یہ فرض ادا کر دیا ہے کہ باطل کی ایک اور طاقت کو کچل کر اسلامی سلطنت کی سرحد اور وسیع کر دی ہے۔ اسلامی سلطنت کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ ہم اپنی بادشاہی نہیں بلکہ اللہ کی مقررانی قائم کرنے کے لئے گھروں سے نکلے ہیں۔ یہ ساری زمین اللہ کی ہے۔ روئے زمین پر صرف اللہ کا حکم چلے گا۔ شہیدوں نے اللہ کی راہ میں اس کی خوشنودی کی خاطر جانیں قربان کی ہیں۔ شہیدوں کو تو اللہ نے اپنے ہاں پناہ دے دی ہے، قربانی اُن کی دیکھیں جو بازوؤں یا ٹانگوں یا بینائی سے محروم ہو گئے ہیں اور زندہ ہیں اور باقی عمر معذوری میں گزاریں گے لیکن وہ کسی کے محتاج نہیں رہیں گے۔ اللہ نے ان کا اور ان کے بال بچوں کا اور ان کے بوڑھے ماں باپ کا رزق اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ شہیدوں اور معذور ہو جانے والوں کے بیوی بچوں اور لواحقین کو یہ زمین رزق دے گی جس زمین کو

بیٹے کا ذکر اس داستان میں آیا ہے جس کا نام قسطنطین تھا۔ اس بیٹے کے ساتھ ہرقل کو اتار پارتھا کہ اس نے بزنطیہ کا نام تبدیل کر کے قسطنطین رکھ دیا تھا۔ موجودہ صدی میں پہلی جنگ عظیم کے بعد اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا کی حکومت بنی تو قسطنطین کا نام بدل کر استنبول رکھ دیا گیا۔ آج یہ استنبول ترکی کا ایک بڑا شہر ہے۔

نقشے پر اٹلاکیہ دیکھیں اور پھر استنبول دیکھیں۔ ہرقل اٹلاکیہ سے بھاگ کر استنبول پہنچا۔ فاصلہ تقریباً 900 کلومیٹر ہے۔

اُس وقت کی دوسری بڑی جنگی طاقت جسے ہم نے دیوہیکل کہا ہے، شام سے بیشہ کے لئے نکل بھاگی۔ ابھی سلطنت روم قائم تھی۔ ترکی اور مصر اس سلطنت میں شامل تھے اور قیصر روم کے پنجے ان ملکوں پر گہرے اُترے ہوئے تھے۔ پھر بھی یوں کہا جاسکتا ہے کہ ایک بہت بڑے اور بڑے ہی زہریلے سانپ کی کمر توڑ دی گئی تھی اور اب اس کا دم خم تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ یہ تو پہلے سنایا جا چکا ہے کہ ہرقل نے مصر سے جو کمک اپنے بیٹے قسطنطین کی زیر قیادت منگوائی تھی وہ آدھی کے قریب کٹ مری اور باقی واپس مصر کو بھاگ گئی تھی۔

یہاں ایک اور وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ پہلے ذکر آیا ہے کہ ہرقل نے بزنطیہ خالی کر دینے کا حکم دیا تھا اور خود پہلے ہی نکل گیا تھا لیکن تاریخ کے اگلے باب حتم یقین کے ساتھ اس غلط فہمی کی تصحیح کرتے ہیں کہ اس نے بزنطیہ (استنبول) جاپناہ لی تھی اور اٹلاکیہ اور حلب کے فوجیوں اور شہریوں کو کہا تھا کہ وہ ان شہروں سے نکل جائیں اور اپنی حفاظت اور اپنے مسائل و امور کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔

○
ہرقل خوش قسمت تھا کہ مجاہدین اس کے تعاقب میں نہ چلے گئے۔ وہ فتح پہ فتح حاصل کرتے جا رہے تھے اور اسی جوش و خروش میں شام کی سرحد سے آگے نکل جانے کا بھی عزم کئے ہوئے تھے لیکن امیر المومنین حضرت عمرؓ کو یہ خوشخبری سنائی گئی کہ شام کا آخری قلعہ بھی فتح کر لیا گیا ہے اور رومی شام سے نکل گئے ہیں تو امیر المومنین نے پہلا حکم یہ دیا کہ مزید پیش قدمی نہ کی جائے اور جو علاقے فتح کر لئے گئے ہیں، ان کے انتظامات اور ان کا دفاع مستحکم کیا جائے۔ ایسا حکم یا ایسی ہدایت دینے کی ضرورت نہیں تھی کہ مفتوح آبادیوں کے لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور کسی کو پریشان نہ کیا

انہوں نے اپنے خون سے سچا ہے۔ اپنے آپ کو اس دنیا کی نظر سے نہ دیکھو۔ تمہارا تعلق براہ راست اللہ کے ساتھ ہے۔ تم ہر روز قرآن پڑھتے ہو۔ کیا تم نے پڑھا یا سنا نہیں کہ اللہ نے تمہیں بہترین اُمت کہا ہے اور تمہیں اعزاز یہ بخشا ہے کہ تم بنی نوع انسان کی بھلائی کا کام کرتے ہو اور لوگوں کو برائی سے بچاتے ہو۔ اس سے بڑی بھلائی اور کیا ہو گی کہ لوگوں کو ظالم بادشاہوں سے نجات دلائی جائے اور انہیں باطل کی زنجیروں سے آزاد کر کے حق کے راستے پر ڈالا جائے۔ اپنے آپ کو بے یار و مددگار نہ سمجھنا۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے۔“

○

ہم اس داستان کو کچھ دن پیچھے اُس مقام پر لے جاتے ہیں جب حلب فتح ہو گیا تھا، مجاہدین شہر میں داخل ہو گئے تھے اور داخل ہو رہے تھے اور شہر کے ارد گرد قبائلی عیسائیوں کی لاشیں دور دور تک بکھری ہوئی تھیں۔ شہر کی عورتیں اور ان کے بچے شہر سے نکل گئے تھے اور اپنے عزیزوں کی لاشیں ڈھونڈ رہے تھے۔ ان کی آہ و بکا سے دل دہل رہے تھے۔ ایک عورت بڑی بلند اور چیخ مٹا آواز میں کہتی پھر رہی تھی کہ ہمارے آدمیوں نے آخر کس کی لڑائی لڑی ہے اور کس کی خاطر کٹ مرے ہیں؟

”دو رومی جرنیلوں نے ہمارے آدمیوں کو گمراہ کیا تھا“ — یہ بھی ایک عورت کی آواز تھی جو کئی عورتوں کی آواز بن گئی۔

”ایک بڑی خوبصورت چڑیل آئی تھی“ — ایک اور آواز سنائی دی — ”وہ عورتوں کو بھی لڑنے کے لئے تیار کر رہی تھی۔“

”وہ ہے کہاں؟“ — کسی عورت نے پوچھا۔

”زندہ نظر آجائے تو اسے بھی اسی طرح کاٹ دو جس طرح ہمارے آدمی کٹ گئے ہیں“ — یہ ایک اور عورت کی جلی کئی آواز تھی۔

یہ رونا اب عورتوں کے لئے ہی تھا جن کے آدمی مارے گئے یا اتنے زخمی ہو گئے تھے کہ ان کے زندہ رہنے کی امید کچھ زیادہ نہیں تھی۔ بچے گھروں میں روتے پھر رہے تھے۔ عورتیں ہر قل کی بیوی لیزا کو کوس رہی تھیں۔ اسے عورتیں انھوئیس کی بیوی سمجھتی رہی تھیں۔ لیزا کو اس لڑائی کے ساتھ ذرا سی بھی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ پہلے تفصیل سے بیان ہو چکا ہے کہ اس نے اپنے خاوند شاہ ہر قل کو دھوکہ دے کر رومی فوج

کے جرنیل انھوئیس کے ساتھ قابل اعتراض مراسم قائم کر لئے تھے اور اس کا ایک بیٹا پیدا کیا تھا جس کا نام یوکلکس تھا۔ حلب میں آکر لیزا نے انھوئیس سے بے وفائی کی اور روم کے فوجی افسرے روتاس کے ساتھ ویسے ہی ناز و تعلقات قائم کر لئے تھے اور اس گناہ کی سزا اسے یوں ملی کہ ان دونوں نے تلواروں کے جوہر ایک دوسرے پر کئے تھے وہ لیزا پر بڑے اور دونوں تلواریں اس کے جسم کے پار ہو گئی تھیں۔

لیزا یہی کچھ تھی اور یہی اس کا کردار تھا لیکن عیسائی قبائلیوں کی عورتیں اس کے پاس آجائیں تو وہ انہیں مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتی اور کہتی تھی کہ اپنے آدمیوں کو مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لئے تیار کریں اور خود بھی تیار ہو جائیں۔ لڑائی کا جو نتیجہ نکلا وہ ان عورتوں نے دیکھ لیا اور اب وہ اپنے آدمیوں کا ماتم کر رہی تھیں۔ انہیں اب محسوس ہونے لگا کہ ان کے آدمیوں نے ایک بے مقصد لڑائی لڑی اور جانیں ضائع کی ہیں۔ اسے وہ دھوکہ کہہ رہی تھیں جو انہیں لیزا نے دیا تھا۔

”کسی نے بتایا ہے اس کا جرنیل خاوند مارا گیا ہے“ — ایک عورت ہر کسی کو بلند آواز سے بتاتی پھر رہی تھی — ”دو سرا رومی جرنیل بھی سنا ہے مارا گیا ہے۔ اس کے بیٹے کا کچھ پتہ نہیں۔“

”اس ڈائن کو ڈھونڈو کہاں ہے!“ — ایک معمر عورت نے کہا — ”مل جائے تو اسے خنجروں سے چھلنی کر دو۔“

عورتیں شہر میں ایک جگہ اکٹھی ہو گئی تھیں۔ کسی نے انہیں بتایا کہ لیزا اسی مکان میں مری پڑی ہے جس میں رومی فوج کا دو سرا جرنیل یعنی روتاس رہتا تھا۔ یہ سب عورتیں اُس طرف دوڑ پڑیں۔ مکان کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر جا کر سب نے دیکھا کہ لیزا گھن میں خون میں نہائی پڑی تھی۔ عورتوں نے اپنے اپنے الفاظ اور انداز میں نفرت اور حقارت کا اظہار کیا۔ کسی نے کہا کہ اس لاش تھیکٹ کر باہر پھینک دو۔ ایک بولی کہ لاش میں بڑی رہنے دو اور مکان بند کر دو، اسے یہیں کیڑے مکوڑے کھا جائیں گے۔

زخمیوں کو اٹھا اٹھا کر شہر کے اندر لایا جا رہا تھا۔ ان کے لئے فوجی بارکیں موجود تھیں اور کچھ لوگ اپنے زخمی عزیزوں کو اپنے گھروں کو لے جا رہے تھے۔ دوست اور دشمن کی تیز ختم ہو گئی تھی۔ زخمی عیسائی تھا یا مسلمان، مسلمانوں نے مرہم پٹی کی ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ مجاہدین کی عورتیں اسی کام میں مصروف تھیں۔ شاربنا بھی یہی کام کرتی

تھی۔ اس سے اتنا بھی نہ پوچھا تھا کہ وہ ہے کون۔ اب شاید روزی کو کسی نے بتایا ہو گا کہ یوکلے کی ماں کی لاش فلاں مکان میں پڑی ہے۔ وہ دوڑی آئی اور لیزا کی لاش کو اس طرح جھنجھوڑنے لگی جیسے اسے نیند سے جگاری ہو۔

”تم نہیں مر سکتیں ماں!“ — روزی نے لیزا کی لاش کے سر کو ہلاتے ہوئے کہا — ”تم کہتی تھیں کہ مجھے یوکلے کی دلہن بنائیں گی۔ اٹھو یوکلے کے پاس چلیں وہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

شارینا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ جان گئی کہ یہ لڑکی یوکلے کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کر سکی اور اس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں رہا۔ شارینا نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھایا۔

”روزی!“ — شارینا نے کہا — ”میں اسے اٹھا لوں گی۔ یہ گہری نیند سوئی ہوئی ہے۔ یہ تمہاری کیا لگتی ہے؟“

”یہ یوکلے کی ماں ہے“ — روزی نے جواب دیا — ”یہ میری کچھ بھی نہیں لگتی لیکن میرا سب کچھ یہی ہے۔ مجھے یوکلے کے ساتھ دیکھ کر یہ بہت خوش ہوتی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ میں اپنے بیٹے کے لئے تم جیسی ہی دلہن کی تلاش میں تھی۔“

شارینا کو اس لڑکی پر ترس آنے لگا اور وہ سوچنے لگی کہ اسے کس طرح حقیقت میں لانے کہ یہ قبول کر لے کہ یوکلے بھی مر چکا ہے اور یوکلے کی ماں بھی مر گئی ہے اور یہ دونوں اب کبھی اس دنیا میں واپس نہیں آئیں گے لیکن روزی تصوراتی دنیا میں کھو گئی تھی۔ شارینا اس کے ساتھ باتیں کرتی رہی لیکن یہ نہ کہا کہ یہ عورت جو صحن میں پڑی ہے زندہ نہیں۔

اتنے میں ایک اور عورت اس مکان میں آگئی اور اس لڑکی کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ یہ عورت عمر اور شکل و صورت سے روزی کی ماں معلوم ہوتی تھی۔ وہ روزی سے کہنے لگی کہ وہ گھر چلے لیکن روزی اس طرح جواب دے رہی تھی جیسے لیزا زندہ تھی۔

”تم یہاں سے چلی جاؤ ماں!“ — روزی نے کہا — ”میں یوکلے کو بلانے جا رہی ہوں۔ وہ آکر اپنی ماں کو اٹھائے گا۔“

شارینا نے روزی کی ماں کو اشارہ کیا کہ وہ روزی کو ابھی آزاد چھوڑ دے۔ شارینا روزی کی ماں کو ایک کمرے میں لے گئی اور اس سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ شارینا یہ

پھر رہی تھی۔ وہ ایک گلی میں سے گزری تو اس کے کانوں میں یہ آواز پڑی کہ اس مکان کے اندر روی جرنیل کی بیوی کی لاش پڑی ہے۔ شارینا مکان میں چلی گئی۔ وہاں اب دو تین عورتیں رہ گئی تھیں۔

شارینا نے دیکھا تو حیران رہ گئی وہ تو لیزا کی لاش تھی۔ لیزا کو وہ بہت ہی اچھی طرح جانتی تھی۔ لیزا کے سامنے ہی وہ ہرقل کے محل میں جنی پٹی اور جوان ہوئی تھی۔ اس کی اپنی ماں بھی ہرقل کی بیوی تھی۔

شارینا ایک تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہوئی کہ لیزا یہاں تک کس طرح پہنچی؟ حیرت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اسے قتل کس نے کیا؟ مسلمان تو عورت پر ہاتھ اٹھانا گناہ کبیرہ سمجھتے تھے۔

شارینا نے جب یہ سنا تھا کہ دو روی جرنیل بھی مارے گئے ہیں تو اس نے دونوں کی لاشیں دیکھی تھیں۔ وہ چونکہ شاہی خاندان کی لڑکی تھی اس لئے اپنی فوج کے تمام جرنیلوں کو جانتی تھی۔ انٹوینس کی لاش دیکھ کر بھی وہ حیران ہوئی تھی روتاں کو تو وہ اور ہی اچھی طرح جانتی تھی۔ روتاں کو محض میں سپہ سالار ابو عبیدہ کے حکم سے نظر بند رکھا گیا اور شارینا اسے ملتی ملاتی رہتی تھی۔

اب اس نے لیزا کی لاش دیکھی تو اسے اس سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا کہ یہ عورت یہاں تک کس طرح اور کیوں آئی۔ انٹوینس اور روتاں کے متعلق تو اس نے خود ہی سوچ لیا کہ حلب کے عیسائیوں کو ان دونوں نے ہی مسلمانوں کے خلاف لڑایا ہے اور انٹوینس کو اس مقصد کے لئے ہرقل نے بھیجا ہو گا لیکن ہرقل نے اپنی ایک بیوی کو کیوں بھیج دیا؟.... وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔

جو دو تین عورتیں لاش کے پاس کھڑی تھیں وہ بھی باہر چلی گئیں اور شارینا حیران پریشان اکیلی وہاں کھڑی لاش کو دیکھتی رہی۔

”نہیں.... نہیں“ — شارینا کو ایک نسوانی آواز سنائی دی — ”یہ نہیں ہو سکتا۔ سب جھوٹ بولتے ہیں۔“

شارینا نے چونک کر دیکھا۔ یہ وہی فوجی اور خوبصورت لڑکی تھی جو اسے یوکلے کی لاش پر ملی تھی۔ یوکلے نے اسے روزی کے نام سے پکارا تھا اور اس کے فوراً بعد مر گیا تھا۔ شارینا اس لڑکی کو یوکلے کی لاش کے پاس بیٹھے اور چیخ کر روتے چھوڑ آئی

تو سمجھ گئی تھی کہ یوکلکس اور روزی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے لیکن شارنا کو اور بھی سننا چاہتی تھی۔ وہ روزی کی ماں نے اسے سنا دیا۔

روزی کی ماں نے اس کے اس خیال کی تائید کر دی کہ یوکلکس اور روزی ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار تھے۔ یوکلکس نے جو کچھ بھی روزی کو بتایا تھا وہ روزی اپنی ماں کو بتاتی رہتی تھی۔ یوکلکس نے روزی کو بتا دیا تھا کہ اس کا باپ شاہ ہرقل اور اس کا ایک بیٹا فلسطین اسے قتل کرنا چاہتے تھے کیونکہ ہرقل فلسطین کو اپنا جانشین مقرر کر رہا تھا۔ یوکلکس نے روزی کو بتایا تھا کہ اس طرح انتھونیس اسے اور اس کی ماں کو ساتھ لے کر فرار ہو آیا تھا۔ یوکلکس نے روزی کو یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ہرقل کا نہیں بلکہ انتھونیس کا بیٹا ہے۔

روزی نے یہ ساری باتیں اپنی ماں کو بتا دی تھیں اور اب ماں یہ ساری باتیں شارنا کو بتا رہی تھی۔ شارنا یہ سن کر ذرا سی بھی حیران نہ ہوئی کہ یوکلکس کی ماں کا خاندان تو ہرقل تھا لیکن اس کا باپ ایک جرنیل تھا۔ یہ تو بادشاہوں کے ہاں ایک معمول تھا۔ روزی کی ماں نے شارنا کو یہ بھی بتایا کہ انتھونیس مسلمانوں کے خلاف لڑ کر اپنی سلطنت بنانا چاہتا تھا۔ اسے وہ یسوع مسیح کی سلطنت کہتا تھا.... روزی کی ماں اور شارنا کمرے میں یہ باتیں کہہ سن رہی تھیں کہ باہر سے روزی کی چیخ نما آواز سنائی دی۔

”یوکلکس اور اس کی ماں کو ہرقل نے قتل کروایا ہے“ — روزی چلا چلا کر کہہ رہی تھی — ”میں ہرقل کو قتل کرنے جا رہی ہوں۔“

روزی کے دوڑتے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں اور وہ مکان سے نکل گئی۔ روزی کی ماں اس کے پیچھے دوڑتی نکل گئی اور شارنا دل پر رنج و غم کا بوجھ لئے کمرے سے نکلی لیزا کی لاش کو دیکھا اور مکان سے نکل گئی۔ باہر جا کر اس نے دیکھا کہ روزی شہر کے صدر دروازے کی طرف دوڑی جا رہی تھی اور اس کی ماں چلائی جا رہی تھی — ”اسے پکڑنا۔۔ اسے روکنا۔“

وہاں صورت حال ایسی بنی ہوئی تھی کہ کوئی بھی ماں بیٹی کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ وہاں تو یہ حال بنا ہوا تھا کہ کچھ لوگ لاشیں اٹھا کر لا رہے تھے اور بعض لہولہا زخمیوں کو سہارا دے کر ان کے گھروں کو لے جا رہے تھے۔ فضا میں موت کی بو بچی بسی ہوئی تھی۔

○

امیر المومنین حضرت عمرؓ نے تو حکم دے دیا تھا کہ شام کی سرحد تک ہی محدود رہا جائے اور مزید پیش قدمی نہ کی جائے۔ ابو عبیدہؓ اور خالد بن ولیدؓ جیسے جوشیلے اور تارخ ساز سپہ سالاروں نے بھی امیر المومنین کا یہ حکم وانشندانہ اور وقت کی ضرورت کے عین مطابق سمجھا تھا۔ انہیں احساس تھا کہ مفتوحہ علاقے وسیع و عریض ہیں اور ان کے لقمہ و سق کو رواں اور چراگرا کر انہماک ضروری ہے۔ یہ کوئی دانشمندی نہیں کہ فتح کرتے چلے باؤ، آگے بڑھتے جاؤ اور مفتوحہ لوگوں کو فراموش کرتے جاؤ۔ اس طرح لوگ باغی بھی بنے ہیں اور ایک دوسرے کو ٹوٹنے بھی لگتے ہیں۔

تمام سالار امیر المومنین کے حکم کو پسند کر رہے تھے لیکن ایک سالار ایسا تھا جس کے دن کا بل ٹھنڈا ہو ہی نہیں رہا تھا۔ یہ تھے سالار عمرو بن عاصؓ۔ شام کی فتح کے جشن میں وہ دل و جان سے شامل تھے۔ شامل کیوں نہ ہوتے، انہوں نے دن رات ایک کر کے رجمان تھیلی پر رکھ کر یہ فتح حاصل کی تھی لیکن وہ ابھی مطمئن نہیں تھے۔

جس وقت حلب میں سپہ سالار ابو عبیدہؓ پہنچے تھے اور انہوں نے مجاہدین سے خطاب یا اُس وقت عمرو بن عاصؓ کسی اور شہر میں تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی تھے اپنی بے چینی راہی بے قراری چھپانہ سکے۔ انہوں نے صاف الفاظ میں امیر المومنین کے حکم کو دانشندانہ بھی کہہ دیا۔ کچھ دنوں بعد ان کی یہ بے چینی اور یہ احتجاجی باتیں سپہ سالار عبیدہؓ تک پہنچ گئیں۔ ابو عبیدہؓ حلب سے اُس مقام تک پہنچے جہاں عمرو بن عاصؓ تھے۔ سالار نے تو مفتوحہ شہر کا دورہ کرنا اور وہاں کے حالات دیکھ کر ضروری احکامات جاری کرنے تھے لیکن وہ عمرو بن عاصؓ کے ساتھ خاص طور پر بات کرنا چاہتے تھے۔

وہاں پہنچ کر انہوں نے عمرو بن عاصؓ سے پہلی بات یہ پوچھی کہ وہ ایسی اکھڑی بی باتیں کیوں کرتے ہیں جن کا مجاہدین پر اثر تخریبی بھی ہو سکتا ہے۔

”میں رومیوں کا تعاقب کرنا چاہتا تھا“ — عمرو بن عاصؓ نے کہا — ”میں مصر پہنچنا چاہتا ہوں۔ رومی تترہتر ہو کر ڈری ہوئی، بھیڑ بکریوں کی طرح بھاگ رہے تھے ہم کے تعاقب میں جاتے تو بڑی آسانی سے مصر میں داخل ہو سکتے تھے۔“

”میں حیران ہوں ابن عاص!“ — سپہ سالار ابو عبیدہؓ نے کہا — ”کیا تو اتنی جلدی مانگ رہا ہے کہ عیسائی قبائل نے صرف اس لئے ہر شہر میں بغاوت کر دی تھی کہ وہاں

ہماری نفری بہت تھوڑی تھی؟ یہ تو اللہ کا خاص کرم ہے کہ ہم نے ہر جگہ بغاوت فرو کرنی ہے لیکن ذرا سوچ، ہمارے لشکر اس ملک سے نکل کر آگے جائیں تو پھر پیچھے بغاوت ہو جائے گی۔“

مستند مؤرخوں کی لکھی ہوئی تاریخ گواہی دیتی ہے کہ عمرو بن عاص عام سطح کے سالار نہیں تھے نہ ان کی سوچ سطحی اور جذباتی تھی۔ مصر کو سلطنت اسلامیہ میں شامل کرنا ان کا ایک عزم تھا اور عزم بھی ایسا جیسے اللہ تعالیٰ نے انہیں اسی کام کے لئے ہی پیدا کیا ہو۔ فتح مصر تو ان کے لئے ایک جنون اور ایک خط بن گیا تھا جس سے امیر المومنین حضرت عمرو بن ہوری طرح واقف تھے۔

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بیان کر دیا جائے عمرو بن عاص کے مصر کے متعلق ارادے کیا تھے اور امیر المومنین کے ساتھ ان کی کیا اور کب باتیں ہوئی تھیں.... کچھ ہی عرصہ پہلے جب فلسطین میں رومیوں کے خلاف جنگ ہو رہی تھی تو حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کی فتح کی ذمہ داری عمرو بن عاص کو سونپی تھی اور کہا تھا کہ وہ شکست کی خبر بد نہیں بلکہ فتح کی خوشخبری سنانا چاہتے ہیں۔

”اللہ امیر المومنین کو فتح ہی کی خوشخبری سنائے گا“ — عمرو بن عاص نے تاریخی الفاظ کہے تھے۔



اُس وقت بیت المقدس میں رومیوں کا ایک بڑا ہی مشہور جرنیل موجود تھا جس کا نام اطربون تھا۔ اس جرنیل کی جنگی فہم و فراست اور دشمن کو دھوکہ دینے کے لئے مکاری اور چال بازی اتنی زیادہ تھی کہ تاریخ کے مطابق ہر قتل بھی کبھی کبھی اس کے آگے سر جھکا دیتا تھا۔ سالار عمرو بن عاص کا مقابلہ اس جرنیل کے ساتھ تھا۔

اس سلسلے کی کچھ تفصیلات اس داستان کے پہلے باب میں پیش کی جا چکی ہیں۔ یہاں ہم مختصراً بیان کریں گے۔ تفصیلات کے لئے پہلا باب ایک بار پھر پڑھ لیں۔

عمرو بن عاص خالد بن ولید کی طرح ایسے سالار تھے کہ قیادت کی عمدگی کے علاوہ دشمن کو دھوکہ دینے کے ڈھنگ خوب جانتے تھے۔ حضرت عمرؓ بھی عمرو بن عاص کی اس صلاحیت اور خوبیوں سے خوب واقف تھے۔ اسی لئے انہوں نے بیت المقدس کی فتح کی ذمہ داری انہیں ہی سونپی تھی۔ اس طرح امیر المومنین نے عمرو بن عاص کو اطربون

سے مقابلے میں بھیجا تو انہوں نے یہ تاریخی الفاظ کہے تھے — ”ہم نے عرب کے اطربون کو روم کے اطربون سے ٹکرایا ہے۔ اب دیکھتے ہیں اس کا نتیجہ کیا سامنے آتا ہے۔“

حضرت عمرو بن ہوری کی جنگی چالوں سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ میدان جنگ میں لومڑی جیسی مکاری اور چالاک کی کو اس طرح استعمال کرتا ہے کہ اس کا دشمن چکر جاتا اور سمجھ نہیں پاتا کہ کیا ہوا ہے کیا کرنا چاہئے تاکہ دشمن دھوکے میں مارا جاتا ہے۔ امیر المومنین یہ بھی جانتے تھے کہ یہی اوصاف اور یہی صلاحیتیں عمرو بن عاص میں بھی ہیں۔

عمرو بن عاص بیت المقدس کی طرف بڑھے تو انہوں نے دیکھا کہ اطربون اپنی فوج کے ساتھ اجنادین کی طرف جا رہا تھا۔ اجنادین اور بیت المقدس میں فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا۔ عمرو بن عاص نے اطربون کی فوج دیکھی اور پھر اپنا لشکر دیکھا تو انہیں احساس ہوا کہ انہیں ملک کی شدید ضرورت ہے ورنہ اطربون کے سامنے اپنی کم نفری ٹھہر نہیں سکے گی۔

حضرت عمرؓ نے اطلاع ملتے ہی فوراً ”ملک بھیج دی اور عمرو بن عاص اجنادین اور بیت المقدس کے قریب جا خیمہ زن ہوئے۔ فوجی حملے سے پہلے انہوں نے یہ ترکیب سوچی کہ اطربون پر نفسیاتی حملہ کیا جائے جس کا طریقہ انہوں نے یہ اختیار کیا کہ اپنے دو اپنی اطربون کی طرف اس پیغام کے ساتھ بھیجے کہ وہ صلح کا معاہدہ کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ اپنی دراصل جاسوس تھے جنہیں کام یہ سونپا گیا تھا کہ وہ قلعے کے اندر جا کر دیکھیں کہ اندر کتنا لشکر اور دفاعی انتظامات کیسے ہیں اور دروازے کتنے کچھ مضبوط ہیں وغیرہ۔

اطربون نے دونوں اہلیوں کو پورے احترام سے بٹھایا اور بات چیت کی اور انہیں رخصت کر دیا۔ اطربون کوئی ایسا اٹاڑی جرنیل نہ تھا کہ ان اہلیوں کو شہر میں کھلا پھرنے دیتا۔

اہلی واپس آئے تو سالار عمرو بن عاص ان سے پوچھنے لگے کہ قلعے کے اندر کیا کچھ ہے اور وہ کیا دیکھ کر آئے ہیں۔ دونوں اہلیوں نے انہیں یہ جواب دے کر مایوس کر دیا کہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکے۔

عمرو بن عاص نے فیصلہ کیا کہ وہ خود اپنے اہلی بن کر جائیں گے اور یہ ظاہر نہیں

ہونے دیں گے کہ وہ خود اپنے لشکر کے سپہ سالار ہیں۔ انہوں نے بھیس بدلا اور اچھی طرح اپنا جائزہ لے کر چلے گئے۔

اطربون نے ان کا استقبال بھی عزت و احترام سے کیا۔ عمرو بن عاص نے یہ ظاہر کیا کہ وہ اپنے سپہ سالار عمرو بن عاص کے ایلچی ہیں اور سپہ سالار نے انہیں اس لئے بھیجا ہے کہ پہلے دو ایلچی صلح کے معاہدے کی بات ٹھیک طرح نہیں کر سکے اور اب وہ مزید ہدایات لے کر آئے ہیں۔

صلح کی بات چیت شروع ہوئی تو عمرو بن عاص نے کہا کہ وہ یہ بات اپنے سپہ سالار تک پہنچائیں گے اور ان کا حکم لے کر پھر حاضر ہوں گے۔

”میری نظروں نے مجھے کبھی دھوکہ نہیں دیا“۔ اطربون نے مسکراتے ہوئے کہا — ”میں کسی ایلچی سے نہیں بلکہ عرب کے سپہ سالار عمرو بن عاص کے ساتھ ہی بات کر رہا ہوں.... کیا تم عمرو بن عاص نہیں ہو؟“

”نہیں!“ — عمرو بن عاص نے جواب دیا — ”اگر میں عمرو بن عاص ہوتا تو اپنے اوپر جھوٹا پردہ ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہمارے سپہ سالار عمرو بن عاص اتنے نڈر اور بے خوف انسان ہیں کہ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔“

اطربون ہنس پڑا اور اس نے ایسا تاثر دیا جیسے اس نے تسلیم کر لیا ہو کہ وہ عمرو بن عاص نہیں بلکہ ان کے ایلچی ہیں۔ باتوں باتوں میں اطربون باہر نکل گیا اور واپس آ کر پھر مذاکرات شروع کر دیے۔

اطربون جب باہر نکلا تھا تو عمرو بن عاص سمجھ گئے کہ اب ان کی خیر نہیں۔ اب ہو گا یہ کہ انہیں پکڑ کر کال کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے گا یا قتل ہی کر دیا جائے گا۔ عمرو بن عاص دماغ پر زور دینے لگے کہ یہاں سے کس طرح نکلا جائے۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اگر یہ ملاقات قلعے سے باہر ہو رہی ہوتی تو بھاگ نکلنے کا موقع پیدا کیا جاسکتا تھا لیکن شہر کے اندر سے نکل بھاگانا ممکن تھا۔

آخر ایک ترکیب دماغ میں آئی گئی۔ عمرو بن عاص نے ایسا انداز اور رویہ اختیار کر لیا جیسے وہ اطربون کی پیش کی ہوئی شرائط مان گئے ہوں۔ انہوں نے ایسا تاثر پیدا کر دیا جیسے وہ رومیوں کی جنگی طاقت سے خائف ہوں۔

عمرو بن عاص نے اطربون سے کہا کہ وہ سپہ سالار عمرو بن عاص کے بھیجے ہوئے

ایلچی نہیں ہیں بلکہ انہیں امیر المومنین حضرت عمرؓ نے بھیجا ہے اور ان کے ساتھ دس مشیر ہیں جو قلعے سے کچھ دور ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ اب ان کے پاس جائیں گے اور انہیں ساتھ لائیں گے اور پھر ہمیں فیصلہ کر دیا جائے گا کہ انہیں اطربون کی شرائط منظور ہیں۔

اطربون یہ سن کر خوش ہوا کہ ایک ہی نہیں بلکہ دس مسلمان جال میں آ گئے ہیں۔ اس نے عمرو بن عاص سے کہا کہ وہ اپنے مشیروں کو یہاں لے آئیں۔

عمرو بن عاص وہاں سے نکلے، ان کے لئے قلعے کا دروازہ کھلا اور باہر نکلتے ہی انہوں نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور اس طرح بچ کر نکل آئے۔ ان کے ساتھ کوئی اور مشیر نہیں گیا تھا، وہ اکیلے تھے اور اطربون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل آئے۔

تاریخ گوای دیتی ہے، یورپی مؤرخوں نے بھی لکھا ہے کہ اطربون مذاکرات کے دوران باہر نکلا تھا تو اس نے اپنے محافظ دستے کے کمانڈر کو یہ کام سونپا تھا کہ یہ عربی جو اندر بیٹھا ہے جب قلعے سے نکل کر واپس جا رہا ہو گا تو اسے قتل کر دیا جائے لیکن اطربون کو عمرو بن عاص نے جو دھوکہ دیا اس سے اطربون نے پھر باہر جا کر محافظ دستے کے کمانڈر سے کہا تھا کہ اب اس شخص کو جانے دیتا یہ کچھ اور آدمیوں کو ساتھ لے کر واپس آ رہا ہے۔

اطربون کو جب پتہ چلا کہ مسلمانوں کے سپہ سالار عمرو بن عاص اسے دھوکہ دے کر زندہ نکل گیا ہے تو وہ غصے سے آگ بگولہ ہونے لگا اور پھر جو بھی سامنے آتا اس پر غصہ جھانڑنا شروع کر دیتا۔

پھر جس طرح بیت المقدس فتح ہوا اس کی تفصیلات پہلے دو ابواب میں پیش کی جا چکی ہیں۔ ان تفصیلات میں اب ہم یہاں کچھ اضافہ کر رہے ہیں۔

بیت المقدس عیسائیوں کے لئے بھی اتنا ہی اہم مقام تھا جتنا مسلمانوں کے لئے لیکن رومی عیسائیوں نے دیکھا کہ مسلمان پے در پے فتوحات حاصل کرتے آرہے ہیں تو انہوں نے بیت المقدس کے تبرکات اور یادگار اشیاء قسطنطنیہ کو منتقل کرنی شروع کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی ہرقل نے وہاں فوج کی تعداد بڑھادی اور اس کی قیادت اپنے جرنیل اطربون کے سپرد کر دی۔ عیسائی فوج اور شہریوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکانے

تفصیلات سے ہم گریز کر رہے ہیں۔

انتا ہی بتائیں گے کہ جب حضرت عمرؓ بیت المقدس میں داخل ہوئے تو بیت المقدس کے ایک بڑے پادری نے انہیں کہا کہ آپ شرمیں داخل ہو رہے ہیں، ذرا اچھے کپڑے پہن لیں اور گھوڑے پر سوار ہو جائیں تاکہ رومیوں کی نگاہ میں آپ کی عظمت کا اندازہ غلط نہ ہو۔

حضرت عمرؓ نے اس پادری کو جو جواب دیا وہ تاریخ کے دامن میں آج تک محفوظ ہے۔ امیر المومنین نے کہا — ”ہمیں اللہ نے جو عزت بخشی ہے وہ صرف اسلام کے مددے بخشی ہے۔ اسلام میں لباس اور گھوڑے عزت اور عظمت کا باعث نہیں بن سکتے۔ ہمیں ایسی چیزوں کی ضرورت نہیں۔ عظمت انسان کی ہوتی ہے، لباس اور اعلیٰ نسل کے گھوڑے کی نہیں۔“

اسقف اعظم صفریوس خود حضرت عمرؓ کے استقبال کے لئے باہر آیا اور عزت و احترام سے اپنے ہاں لے گیا۔ توقع تو یہ تھی کہ مذاکرات ہوں گے، دونوں فریق اپنی اپنی شرائط پیش کریں گے اور بحث مباحث ہو گا اور شاید پھر بھی مذاکرات کامیاب نہ ہوں لیکن ہوا یہ کہ اسقف اعظم صفریوس نے کہا کہ معاہدے کی شرائط حضرت عمرؓ اپنے ہاتھ سے لکھیں۔

حضرت عمرؓ نے معاہدہ اپنی شرائط کے مطابق لکھا جو صفریوس نے بلا چون و چرا قبول کر لیا اور یوں بیت المقدس مجاہدین کی جھولی میں آگرا۔

امیر المومنین اور ان کے سالار حیران تھے کہ اطربون کہاں ہے۔ امیر المومنین نے صفریوس سے پوچھا تو جواب ملا کہ اطربون اپنے ساتھ کچھ فوج لے کر رات کے اندھیرے میں نکل گیا تھا اور اس کی منزل مصر ہے۔ مطلب یہ کہ اطربون مسلمانوں کی پے در پے فتوحات اور طوفانی پیش قدمیاں دیکھ کر جان گیا تھا کہ یہ مسلمان بیت المقدس بھی لے لیں گے اور اس کی فوج کا قتل عام ہو گا۔

جنگی مصر اور واقع نگار لکھتے ہیں کہ اطربون نے اپنی فوج کی ذہنی حالت بھی دیکھ لی تھی۔ اس کی فوج پر مسلمانوں کی دہشت چھا گئی تھی اور اس فوج کے سپاہی لڑنے سے پسپا دیکھ لیتے تھے کہ وہ کس راستے سے بھاگیں گے۔ اطربون بڑی دور اندیش جرنیل تھا۔ اپنی جنگی طاقت ضائع کرنے کی بجائے اس نے بہتر یہ سمجھا کہ فوج کو اپنے ساتھ مصر

کے لئے اسقف اعظم صفریوس موجود تھا۔ اس نے رومی فوج کو مذہبی معاملے میں اتنا جذباتی کر دیا تھا کہ بظاہر یہ فوج طوفانی سی ہو گئی تھی۔ رومی اتنی آسانی سے بیت المقدس سے دستبردار نہیں ہو سکتے تھے۔

سپہ سالار عمرو بن عاص نے بیت المقدس کو محاصرے میں لے لیا لیکن مقابلہ اتنا شدید اور خون ریز تھا کہ محاصرہ کامیاب ہو تا نظر نہیں آتا تھا۔ عمرو بن عاص نے مکہ کی شدید ضرورت محسوس کی اور امیر المومنین کو پیغام بھیجا کہ جس قدر زیادہ مکہ بھیجی جا سکے فوراً بھیج دی جائے۔

امیر المومنین حضرت عمرؓ میدان جنگ کی اور ہر محاذ کی تازہ بہ تازہ صورت حال سے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔ بیت المقدس کے محاذ کو تو وہ اور ہی زیادہ جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ بیت المقدس میں اطربون جیسا منجھا ہوا اور گھاگ جرنیل موجود ہے اور ہر قل کی تمام تر توجہ بھی بیت المقدس پر ہے۔ ان حالات کے پیش نظر امیر المومنین نے فیصلہ کیا کہ وہ خود مکہ لے کر بیت المقدس کے محاذ پر جائیں گے۔

امیر المومنین اچھی خاصی مکہ لے کر مدینہ سے روانہ ہوئے اور جابیہ کے مقام پر جا قیام کیا۔ سپہ سالار عمرو بن عاص اور دیگر سالاروں کو وہیں بلا لیا اور جنگ کا نیا نقشہ مرتب کیا۔

تاریخ میں واضح طور پر لکھا ہے کہ رومیوں کے جاسوس ہر جگہ موجود تھے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کو ان کی لائی ہوئی مکہ دیکھی اور پھر یہ دیکھا کہ انہوں نے تمام سالاروں کو بلایا ہے تو یہ ساری خبر اطربون تک پہنچائی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اطربون خود بھیس بدل کر گیا اور مسلمانوں کا یہ سارا لشکر دیکھا۔

عارضی طور پر مسلمانوں نے بیت المقدس کا محاصرہ اٹھا لیا تھا۔ ایک معجزہ ہوا۔ وہ یہ کہ اسقف اعظم صفریوس نے ایک ایلیچی اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ حضرت عمرؓ خود بیت المقدس آئیں تو صلح کا معاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

حضرت عمرؓ اور تمام سالار یہ سمجھ کر رومی جرنیل اطربون انہیں دھوکہ دے رہا ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد حضرت عمرؓ بیت المقدس جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ پھر حضرت عمرؓ جس لباس میں اور جس طرح بیت المقدس کو روانہ ہوئے وہ ایک دلچسپ، دولہ، انگیز اور خیال افروز داستان ہے لیکن یہاں موضوع کچھ اور ہے اس لئے دیگر

لے جائے اور اس کی نئے سرے سے تربیت کرے اور نئی فوج تیار کر کے مسلمانوں کو لٹکارا جائے۔ مختصر یہ کہ اطربون فلسطین سے چپکے سے کھسک گیا اور مصر جا پہنچا۔

○

بیت المقدس کی فتح کا واقعہ ہم نے صرف اس لئے بیان کیا ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ فتح مصر کا خیال کس کے دماغ میں آیا تھا اور کس نے امیر المومنین کو قائل کیا تھا کہ مصر پر فوج کشی کی جائے۔ بیت المقدس میں ہی ایک شام عمرو بن عاص حضرت عمرؓ کے پاس جا بیٹھے اور کہا کہ وہ ایک ضروری بات کرنے آئے ہیں۔ حضرت عمرؓ ان کی بات سننے کو تیار ہو گئے۔

”یا امیر المومنین!“ — عمرو بن عاص نے کہا — ”خدا کی قسم“ آپ اطربون کو اس طرح جانتے ہیں جس طرح آپ کا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کو جانتا ہے۔ میں کبھی نہیں مانوں گا کہ ہمارے امیر المومنین اس خوش فہمی میں مبتلا ہوں گے کہ اطربون ہم سے ڈر کر بھاگ گیا ہے۔ ہم اللہ کے حضور امید رکھنے والے لوگ ہیں، ہم خواب نہیں دیکھا کرتے اور اپنے آپ کو فریب دینا مجاہدین اسلام کا شیوہ نہیں۔“

”عاص کے بیٹے!“ — حضرت عمرؓ نے عمروؓ کی بات روک کر کہا — ”کیا یہ بہتر نہیں کہ تو وہ بات کر دے جس کی تو تمہید باندھ رہا ہے۔ میں سن رہا ہوں۔“

”یا امیر المومنین!“ — عمرو بن عاص نے کہا — ”میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ہمیں اطربون کے پیچھے جانا چاہئے۔“

”کیا تو اسے ابھی کافی نہیں سمجھتا کہ ہم نے ایک بڑا ہی کٹھن محاذ سر کر لیا ہے؟“ — حضرت عمرؓ نے کہا۔

”میں اسے کافی نہیں سمجھتا یا امیر المومنین!“ — عمرو بن عاص نے کہا — ”اگر ہم اس فتح کو کافی سمجھ کر بیٹھ گئے تو اطربون فوج تیار کر کے ہم پر حملہ آور ہو گا۔ ہرقل اور اطربون ایک اہلیس کے دو نام ہیں۔ اطربون اتنی عقل اور فہم و فراست رکھتا ہے کہ الجزمیرہ اور فلسطین کے عیسائی قبائل کو بغاوت پر اکسا سکتا ہے اور زمین کے نیچے رہ کر اس بغاوت کی ہدایت کاری بھی کر سکتا ہے۔ وہ مصر ایسی ہی تیاریوں کے لئے گیا ہے۔ ہماری ضرورت یہ ہے کہ ہم اسے چین سے بیٹھنے کی مہلت نہ دیں۔ آپ کی اجازت چاہئے، میں مصر کی طرف پیش قدمی اور حملے کی قیادت کروں گا۔“

”صرف اطربون پر اپنی توجہ تو محدود نہ کر ابن عاص!“ — حضرت عمرؓ نے کہا۔ ”کیا تو دیکھ نہیں رہا کہ ہم کسری ایران کے خلاف لڑ رہے ہیں اور شام میں بھی ہم نے روم جیسی بڑی جنگی قوت کے خلاف محاذ کھول رکھا ہے؟ اگر ہم نے اتنی دور ایک اور محاذ کھول دیا تو ایسا نہ ہو کہ ہمارے باقی محاذ کمزور ہو جائیں۔“

عمرو بن عاص کی امیر المومنین حضرت عمرؓ کے ساتھ یہ گفتگو یہیں پر ختم نہیں ہو گئی تھی۔ انہوں نے امیر المومنین کے آگے مصر کی پوری تاریخ رکھ دی تھی۔ پھر انہوں نے آیات قرآنی بھی سناؤں تھیں جن میں مصر کا ذکر آتا ہے۔ انہوں نے بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خاص طور پر ذکر کیا اور پھر سنایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ فرعونوں سے کس طرح فرار ہوئے تھے اور کس طرح اللہ کے حکم سے دریائے نیل نے انہیں راستہ دے دیا تھا اور پھر فرعون رعمیس دوم دریا کے دیئے ہوئے اس راستے پر اُتر آ تو دریا اپنی روانی میں آگیا اور رعمیس غرق ہو گیا تھا۔ عمرو بن عاص نے حضرت یوسف علیہ السلام کا خاص طور پر ذکر کیا اور کہا کہ عرب کے مسلمان حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کو تو کبھی بھول ہی نہیں سکتے اور اس قصے کے حوالے سے ملی لوگ مصر کو اپنے دل میں بسائے ہوئے ہیں۔ قرآن میں متعدد آیات میں یہ قصہ اللہ تعالیٰ نے اپنی زبان مقدس سے بیان فرمایا ہے۔

امیر المومنین حضرت عمرؓ چپ چاپ عمرو بن عاص کی یہ باتیں سن رہے تھے۔ ایسی بات تو تھی ہی نہیں کہ حضرت عمرؓ کے لئے یہ باتیں نئی تھیں، وہ مصر کی تاریخ سے اور قرآن میں مصر کے ذکر سے بڑی اچھی طرح واقف تھے لیکن انہوں نے عمرو بن عاص کو روکا نہیں کہ وہ سب جانتے ہیں۔ حضرت عمرؓ دیکھ رہے تھے کہ عمرو بن عاص کس نیت و در کس جذبے سے یہ باتیں کر رہے تھے۔ ایسی بات تو تھی ہی نہیں کہ عمرو بن عاص خود مصر کے بادشاہ بننا چاہتے تھے بلکہ ان کا موقف یہ تھا کہ مصر کے بغیر اسلامی سلطنت مکمل ہونی نہیں سکتی۔

عمرو بن عاص عرب اور مصر کے تعلقات کی تاریخ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام تک لے گئے۔ انہوں نے کہا کہ اہل حجاز خاص طور پر اہل مکہ عرب اور مصر کے تجارتی تعلقات کو بھول نہیں سکتے۔ حضرت ابراہیمؑ کے صاحبزادے حضرت اسحاقؑ عربوں کے جدِ ثانی تھے اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ اصل نسل سے مصری تھیں۔ وہ اس طرح کہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی زوجہ حضرت سارہ کے ساتھ عراق سے فلسطین اور فلسطین سے مصر چلے گئے تھے۔

مصر کے بادشاہ نے حضرت ابراہیم کی خدمت میں حضرت ہاجرہ کو پیش کیا تھا۔ حضرت ابراہیم نے حضرت ہاجرہ کے ساتھ شادی کر لی تھی اور ان کے بطن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔ حضرت ابراہیم کی پہلی بیوی حضرت سارہ نے دیکھا کہ حضرت ابراہیم ان کی نسبت حضرت ہاجرہ کو زیادہ توجہ دیتے ہیں تو وہ ناراض ہو گئیں اور قسم کھائی کہ حضرت ہاجرہ کے ساتھ نہیں رہیں گی۔

حضرت ابراہیم حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو ساتھ لے کر الجوزینۃ العرب چلے گئے اور وہاں جا قیام کیا جہاں آج کل مکہ مکرمہ آباد ہے۔

حضرت اسماعیل نے قبیلہ جرہم کی ایک دو شیرہ سے شادی کر لی جس کے بطن سے بارہ لڑکے پیدا ہوئے۔ یہی لڑکے عربوں کے آباؤ اجداد بنے۔ چونکہ حضرت اسماعیل نے نہ خیال مصری تھے اس لئے یہ عربوں کے ساتھ ایک مقدس رشتہ بن گیا۔

پھر عمرو بن عاص نے عرب اور مصر کے تجارتی تعلقات کا تفصیلی ذکر کیا اور کہا کہ مصر کے ساتھ عربوں کے تعلقات تجارتی ہی نہیں جذباتی بھی ہیں بلکہ انہیں انہوں نے روحانی تعلقات کہا۔ پھر یوں وضاحت کی کہ عرب مصر کے متعلق تو بہت کچھ جانتے ہیں لیکن قرآن نازل ہوا تو عربوں کو مصر کی وہ باتیں بھی معلوم ہوئیں جو ان کے ذہن میں کبھی آئی ہی نہیں تھیں۔ مصر میں ایرانیوں اور رومیوں کی جنگ بڑا المیہ عرصہ جاری رہی تھی۔ ایرانیوں نے 616 عیسوی میں مصر پر فوج کشی کی تھی اور رومیوں کو شکست دے کر مصر پر نو سال تک قابض رہے تھے۔

پھر ہرقل اٹھا اور اس نے ایرانیوں پر فوج کشی کر کے انہیں مصر اور شام سے نکال دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بذریعہ وحی انکشاف کر دیا کہ رومی ایک نہ ایک دن ایرانیوں پر غالب آئیں گے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ روم شام میں مغلوب ہو گئے ہیں اور اس کے چند برس بعد پھر غالب آئیں گے۔ یہ قرآن پیش گوئی پوری ہوئی اور پھر رومیوں نے ایرانیوں کو ان کے اپنے ملک میں دھکیل دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ کو ہجرت فرما چکے تھے اور جب مسلمانوں کے حالات ٹھیک ہو گئے اور مجاہدین کے لشکر بھی تیار ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ

آلہ وسلم نے کسریٰ ایران، قیصر روم، حیرہ اور غسان کے بادشاہوں اور اور مصر کے فرمان روا کے پاس اپنی بھیجے کہ وہ سب اسلام قبول کر لیں۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکتوب مبارک کا پورا متن یہاں پیش کیا جائے۔ تاریخ نویس ابن عبدالحکم نے ”مصر کی فتوحات اور حالات“ میں لکھا ہے کہ مصر جانے والے اپنی حضرت حاطبؓ تھے۔ مکتوب مبارک کے الفاظ یہ تھے:

”بسم اللہ الرحمن الرحیم اللہ کے رسول محمدؐ کی طرف سے عظیم القبط مقوقس کے نام۔ سلامتی ہو اس پر جو حق کی پیروی کرے۔ ابابعد میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر تم نے اسلام قبول کر لیا تو تم بھی سلامت رہو گے اور اللہ تعالیٰ اس کا دو گنا اجر عطا فرمائے گا۔ اے اہل کتاب! اس حقیقت کی طرف آ جاؤ جو ہم تم دونوں میں یکساں طور پر مسلم ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی چیز کو اور کسی انسان کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے جسے اللہ کو چھوڑ کر اسے اپنا پروردگار بنالیا ہو۔ پھر اگر لوگ رُوگردانی کریں تو کہہ دو کہ ہم تو خدا کو ماننے والے ہیں۔“

ابن عبدالحکم نے لکھا ہے کہ دوسرے جن بادشاہوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ مکتوب ملا تھا انہوں نے آنحضرتؐ کے اہلیوں اور اس مکتوب کے ساتھ بڑا ہی توجہ آمیز سلوک کیا تھا۔ خصوصاً کسریٰ ایران نے تو یہ مذموم حرکت کی تھی کہ آنحضرتؐ کا مکتوب پھاڑ کر اس کے پُرزے بکھیر دیئے تھے۔ اس کی اطلاع جب آنحضرتؐ کو ملی تو آپؐ نے فرمایا کہ اس شخص کی سلطنت کے اسی طرح پُرزے اڑیں گے۔

ہم نے اپنی تاریخی کتاب ”حجاز کی آمد“ میں اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور جس طرح کسریٰ ایران کی سلطنت کے پُرزے بکھر کر اڑ گئے تھے وہ لمحہ بہ لمحہ کی داستان کے طور پر سنایا ہے۔

ابن عبدالحکم نے لکھا ہے کہ مقوقس نے آنحضرتؐ کے مکتوب کو احترام سے وصول کیا اور پوری توجہ سے پڑھا۔ رات کے وقت شاہ مصر مقوقس نے حضرت حاطبؓ کو تہائی میں اپنے پاس بلایا اور پوری تعظیم دے کر بٹھایا پھر کہا کہ اے اپنے رسولؐ کے متعلق کچھ بتائے۔ حضرت حاطبؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام تر

صفات بیان کیں اور ثبوت کے طور پر کچھ زندہ اور قابل یقین مثالیں پیش کیں۔

”میں جانتا تھا کہ ایک پیغمبر بھی آئے گا“۔ ابن عبدالحکم لکھتا ہے کہ متوقس نے کہا — ”لیکن میرا خیال تھا کہ یہ نبی شام میں آئے گا کیونکہ اس سے پہلے تمام پیغمبر وہیں مبعوث ہوئے تھے لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ ایک نبی مصیبت زدہ سرزمین عرب میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ قبلی تمہارے اس نبی کی حلقہ گوشی میں میرا ساتھ نہیں دیں گے۔ یہ احتیاط کرنا کہ یہاں کسی کو میری اور تمہاری اس گفتگو کا علم نہ ہو۔ میں یہ محسوس کر چکا ہوں کہ اس ملک پر تمہارے پیغمبر کا غلبہ ہو گا۔۔۔۔“

”تمہارے پیغمبر کے ساتھی اس کے بعد ہمارے ان (مصر کے) میدانوں میں اتریں گے اور ان میدانوں پر غالب آئیں گے، لیکن میں قبلیوں سے اس کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا تم اپنے دوست (آنحضرتؐ) کے پاس واپس چلے جاؤ۔“

اگلی صبح متوقس نے حضرت حاطبؓ کو پھر بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر کاتب کو بلایا اور عربی زبان میں یہ مکتوب لکھوایا — ”عبداللہ کے بیٹے محمدؐ کو عظیم القبط متوقس کا سلام! اما بعد“ میں نے آپ کا خط پڑھا اور جو کچھ آپ نے اس میں تحریر کیا ہے اور جو دعوت دی ہے، اسے میں نے سمجھا ہے۔ میں جانتا تھا کہ ایک پیغمبر بھی آتا باقی ہے لیکن میرا خیال تھا کہ وہ ملک شام میں ظہور پذیر ہو گا۔ میں نے آپ کے قاصد کا احترام کیا ہے اور میں آپ کی خدمت میں دو لڑکیاں جو قبلیوں میں اونچے درجے اور حیثیت کے خاندانوں کی ہیں پیش کر رہا ہوں اور آپ کی سواری کے لئے ایک اعلیٰ نسل کا بچہ بھی تحفے کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔“

ان لڑکیوں میں سے ایک لڑکی حضرت ماریہؓ کے نام سے ازواج مطہرات میں شامل کر لی گئی تھیں۔ مصری تاریخ نویس محمد حسنین پیکل نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ قبلیوں کے ساتھ خوش سلوکی سے پیش آنے کا حکم مانو کہ تم پر ان کا حق ہے اور تم سے ان کا رشتہ بھی ہے۔

○

عمروؓ بن عاص نے امیر المومنین حضرت عمرؓ کو مصریوں سے اپنا یہ رشتہ بھی یاد دلایا۔ قبلی عیسائی تھے لیکن انہوں نے اپنا الگ ایک فرقہ بنا لیا تھا۔ اب مصر پر بادشاہی ہرقل کی تھی۔ وہ بھی عیسائی تھا لیکن قبلیوں کے فرقے کے سخت خلاف تھا۔ عیسائیوں کے ایک

یاد فرقے اور بھی بن گئے تھے اور یہ فرقے آپس میں جنگ و جدل میں لگے رہتے تھے۔ ہرقل نے مختلف فرقوں کے مشترک عقیدوں پر مبنی ایک سرکاری مذہب بنا ڈالا اور حکم باد جاری کیا کہ سب اس مذہب کو صحیح تسلیم کریں۔ اس نے مصر کے دارالسلطنت اسکندریہ میں مذہبی پیشوائیت کی سربراہی قیروس نامی اسقف کے سپرد کردی اور اسے اتنے وسیع اختیارات دے دیئے کہ وہ ظلم و تشدد کے ذریعے لوگوں سے سرکاری عیسائیت منوائے۔ دوسرے فرقے تو دب گئے لیکن قبلیوں نے سرکاری مذہب کے خلاف محاذ قائم کر لیا۔ قیروس نے ان پر جو وحشیانہ مظالم توڑے، اگر انہیں تفصیل سے بیان کیا جائے تو انسان کی روح بھی کانپ اٹھتی ہے۔ پورے دس سال قبلی عیسائی قیروس کی وحشت اور بربریت کا شکار ہوتے رہے۔ ان کی سننے والا کوئی نہ تھا۔

عمروؓ بن عاص نے امیر المومنین سے کہا کہ قبلیوں کو اس ظلم و تشدد سے نجات دلانا ہمارا نبی فریضہ ہے۔

اس کے بعد عمروؓ بن عاص نے امیر المومنین کے سامنے مصر کی زرخیز زمین اور شادابی اور پھرتی پتھروں اور کالوں کے ذخیرے اور بے انداز دولت کا ذکر کیا اور کہا کہ اللہ کی زمین سے حاصل ہونے والی یہ ساری دولت رومی بادشاہوں کے محلات میں چلی جاتی ہے اور لوگ بھوکے اور رنگے رہ جاتے ہیں۔ محنت اور مشقت کرنے والوں کو بڑی مشکل سے دو وقت روٹی ملتی ہے اور ان کی محنت کا پورے کا پورا ثمر شاہی محلات میں چلا جاتا ہے۔

”یا امیر المومنین!“ — عمروؓ بن عاص نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا — ”میری روح کہہ رہی ہے کہ ہمیں وہ سرزمین پکار رہی ہے جہاں نیل بہتا ہے۔۔۔ میں اپنا ایک ذاتی واقعہ سنانا چاہتا ہوں جسے میں اللہ کا اشارہ سمجھتا ہوں۔“

ہم یہ واقعہ اس داستان کے پہلے باب میں تفصیل سے سنا چکے ہیں۔ یہاں ہم فقیرانہ پھر سنا دیتے ہیں۔ یہ اُس دور کا واقعہ ہے جب مصر پر ایرانی قابض تھے اور اس کے ذرا بعد مصر پھر رومیوں کے تسلط میں آ گیا تھا۔ اُس وقت عمروؓ بن عاص نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔

وہ تجارت کے سلسلے میں اہل قریش کے ایک قافلے کے ساتھ بیت المقدس گئے۔ ایک روز قافلے کے اونٹ قریبی جنگل میں چرے چٹکنے کے لئے لے جانے کی باری عمروؓ

بن عاص کی تھی۔ وہاں انہیں ایک نیم جان عیسائی ملا جو پیاس سے مر جا رہا تھا۔ اس کا نام شمس تھا۔ عمرو بن عاص نے اسے اپنا سارا پانی پلا دیا اور وہ موت کے منہ سے نکل آیا۔

شمس وہیں گہری نیند سو گیا۔ عمرو بن عاص اس سے ذرا دور کھڑے تھے کہ انہوں نے ایک بڑا لمبا اور زہریلا سانپ شمس کی طرف ریگتا دیکھا۔ کمان اور ترکش ان کے پاس تھی۔ انہوں نے وہیں سے تیر چلایا جو سانپ کے جسم سے پار ہو گیا اور سانپ مر گیا۔ شمس کی آنکھ کھلی تو سانپ کو دیکھ کر اس کا رنگ ہی پیلا پڑ گیا۔

تاریخ میں یہ واقعہ یوں بیان ہوا ہے کہ شمس بڑا ہی دولت مند تاجر تھا اور وہ مصر کے دار السلطنت اسکندریہ کا رہنے والا تھا۔ اس نے عمرو بن عاص کو یہ انعام دینا چاہا کہ انہیں کہا کہ وہ اس کے ساتھ اسکندریہ چلیں۔

شمس نے اسکندریہ کا ایسا چرکش نقشہ پیش کیا کہ عمرو بن عاص راضی ہو گئے اور اس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ اسکندریہ کو انہوں نے اس سے زیادہ خوبصورت اور دولت مند شہر پایہ تخت شمس نے انہیں بتایا تھا۔

انہی دنوں وہاں ایک جشن منایا جا رہا تھا جس میں شاہی خاندان خاص طور پر شریک ہوا تھا۔ یہ جشن ہر سال انہی دنوں منایا جاتا تھا۔ شمس عمرو بن عاص کو اس جشن میں لے گیا۔ چونکہ وہ اونچی حیثیت کا آدمی تھا اس لئے اسے تماشائیوں میں سب سے آگے جگہ دی گئی۔ عمرو بن عاص کو اس نے اپنے ساتھ بٹھایا۔

اس جشن میں ایک تقریب منعقد ہو رہی تھی۔ لوگ درجہ بہ درجہ دائرے میں بیٹھے تھے اور ایک طرف شاہی خاندان بیٹھا محو تماشا تھا۔ تقریب یوں تھی کہ ایک آدمی تماشائیوں کے درمیان دائرے میں کھڑا ہو کر اور آنکھیں بند کر کے ایک گیند اوپر پھینکتا تھا۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ گیند کسی کے ایک بازو پر گرے تو وہ شخص کتنا ہی غریب اور معمولی آدمی کیوں نہ ہو، وہ مرنے سے پہلے بادشاہ ضرور بنتا ہے۔

گیند پھینکنے والے نے چند مرتبہ گیند اوپر پھینکی لیکن گیند واپس زمین پر ہی گری۔ تین چار مرتبہ گیند کسی نہ کسی آدمی پر گری لیکن جسم کے کسی اور حصے پر آپڑی، ایک بازو پر نہ گری۔

آخر گیند عمرو بن عاص کے ایک بازو پر گری اور تماشائیوں کے جھوم نے تالیاں بجائیں اور خوشی کے نعرے بھی لگائے لیکن شاہی خاندان کے افراد نے کہا کہ وہ اس

نہیں کو اچھی طرح دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ یہ ہے کون۔ شمس نے بڑے کرشماتی خاندان کو بتایا کہ اس شخص کا نام عمرو بن عاص ہے اور یہ عربی ہے اور مکہ سے یہاں آیا ہے۔

لوگوں نے قہقہے لگانے شروع کر دیئے اور ایسی آوازیں بھی انہیں کہ عرب کا یہ بدو بادشاہ نہیں ہو سکتا۔

جھوم کی یہ آوازیں بھی سنائی دیں کہ یہ چھوٹا اور ٹھٹھکا سا بدو مصر کا بادشاہ ہو ہی نہیں سکتا۔

عمرو بن عاص عرب کے عام لوگوں کی طرح دراز قد نہیں تھے۔ ان کا قد چھوٹا، سر ہاتھ اور پاؤں قد کے مطابق زیادہ ہی بڑے تھے۔ ان کی ہنسی گھنی تھیں، منہ ذرا زیادہ چوڑا تھا، داڑھی لمبی تھی اور سینہ کچھ زیادہ ہی چوڑا تھا۔ البتہ ان کی سیاہ چمکی آنکھوں میں اور چہرے پر بشارت اور زندہ دلی کا تاثر رہتا تھا لیکن اسکندریہ کے لوگوں نے ان کا مذاق اڑایا۔ تقریباً تمام مہورخوں نے لکھا ہے کہ عمرو بن عاص کو غصہ آتا ہی نہیں تھا۔ ان کے ہونٹوں پر تبسم سہا رہتا تھا۔

ابن عبدالحکم لکھتا ہے کہ عمرو بن عاص مصر سے واپس آ گئے لیکن مصر اور اسکندریہ ان کے ذہن پر ایسے سوار ہوئے کہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ وہ مصر میں ہی جا کر بڑبڑاتا چاہتے ہیں۔

”یا امیرالمومنین!“ — یہ واقعہ سنا کر عمرو بن عاص نے کہا — ”میں ایسا خیال اپنے بنائیں کبھی بھی نہیں لاؤں گا کہ گیند کا اشارہ یہ تھا کہ میں ایک نہ ایک دن مصر کا بادشاہ بنوں گا۔۔۔۔۔ بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور یہ میرا عزم ہے کہ مصر میں اللہ کی بادشاہی قائم رہے۔ مجھے آپ کی اجازت چاہئے۔“

حضرت عمرؓ بڑے قہقہے اور انہماک سے عمرو بن عاص کی یہ باتیں سنتے رہے۔ مہورخ لکھتے ہیں کہ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ قائل ہو گئے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ حضرت قائل ہو گئے تھے لیکن مصر پر فوج کشی کی اجازت اتنی جلدی نہیں دے سکتے تھے۔

پھر حضرت عثمانؓ بن عفان اور مدینہ کے کچھ صحابہ کرام سے مشورہ کیا تو ان میں سے کسی نے بھی تائید نہ کی اور یہی کہا کہ ابھی ہم اس قائل نہیں کہ اتنی دور کا ایک دور نہیں دے سکتے۔

حضرت عمرؓ نے عمرو بن عاص کے ان خیالات اور عزم کو بہت سراہا اور ان کی حوصلہ افزائی کی اور اس کے بعد حضرت عمرؓ نے ویسے ہی ایک بات چھیڑ دی۔ انہوں نے کہا کہ قبلی عیسائیوں کے ساتھ ہمارا رشتہ تو بنتا ہے اور ہم انہیں رومیوں کے ظلم و تشدد سے نجات دلائیں گے لیکن سنا ہے کہ ان کے ہاں ایک بڑی ہی ظالمانہ رسم چل رہی ہے۔ رسم یہ تھی کہ قبلی اس وہم میں مبتلا تھے کہ جب فصلوں کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو دریائے نیل کی روانی رک جاتی ہے یعنی دریا ٹھہر جاتا ہے۔ قبلی سال میں ایک بار ایک کنواری لڑکی کو اس کے والدین کی رضامندی سے الگ کر لیتے تھے اور اسے بوسے قبلی لباس اور زیورات پہنا کر دریائے نیل میں پھینک دیتے تھے۔ لڑکی ڈوب مرتی تھی اور قبلی کہتے تھے کہ دریائے نیل اب رکے گا نہیں اور یہ بتا ہی رہے گا۔

عمرو بن عاص نے امیر المومنین کی تائید کی اور کہا کہ انشاء اللہ قبلی قبول اسلام پر آجائیں گے اور ان کی تمام بے بنیاد رسمیں ختم ہو جائیں گی۔

○

اب ہم اس داستان کو اُس مقام پر لے جاتے ہیں جہاں حلب میں عیسائی قبائل نے متحد ہو کر مسلمانوں کے خلاف جنگ لڑی تھی اور مسلمانوں کے ہاتھوں اپنا قتل عام کروا کے ان کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔

سہ سالار ابو عبیدہؓ جب حلب پہنچے تھے تو قبائل کے سرداروں نے ان کے پاس جا کر اعتراف کر لیا تھا کہ انہیں اپنی لغزش اور کم فہمی کی سزا ملی ہے۔

سرداروں نے سہ سالار ابو عبیدہؓ کو یہ بھی بتایا کہ ان کی قیادت رومی فوج کا ایک جرنیل اور ایک افسر کر رہے تھے اور انہوں نے ہی انہیں مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لئے تیار کیا تھا۔ ابو عبیدہؓ کو شارینا کے خاوند حدید بن مومن خزرج سے پہلے ہی پتہ چل چکا تھا کہ انھوں نے ان قبائلیوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لئے تیار کیا تھا۔ حدید نے سہ سالار کو یہ بھی بتایا تھا کہ ہر قل کی ایک بیوی اور اس کا نوجوان بیٹا بھی فرار ہو کر یہاں آ گئے تھے۔ حدید کو یہ ساری باتیں شارینا نے بتائی تھیں۔

”اللہ اکبر.... اللہ اکبر“ — سہ سالار ابو عبیدہؓ نے کہا — ”سلطنت روم ایک تناور درخت تھا۔ اب دیکھو اس کی شکیں کس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی ہیں۔ ایک رومی جرنیل باقی ہو کر ادھر آ گیا“ قیصر روم کی اپنی ایک بیوی اپنے بیٹے کے ساتھ اس

جرنیل کے ساتھ آ گئی۔ یہ لوگ یہاں اپنی سلطنت کی بنیاد رکھنے آئے تھے۔ اللہ کے اس اشارے کو سمجھو کہ سلطنت روم کا تناور درخت اب اسی طرح ٹپٹی ٹپٹی ہو کر بکھر جائے گا اور زمین اس کی جڑوں کو پانی سے محروم کر دے گی۔“

سہ سالار ابو عبیدہؓ کچھ دن حلب میں گزار کر واپس حمص چلے گئے اور انہوں نے شام کے مختلف علاقے مختلف سالاروں کے سپرد کر دیئے اور کہا کہ ان کے سرکاری انتظامات، جزیہ اور دیگر محصولات کی وصولی کا نظام برواں کیا جائے۔ اس طرح شام کے حالات معمول پر آ گئے۔

حلب اور انطاکیہ کے درمیان تقریباً 45 میل فاصلہ ہے۔ اُس دور میں یہ تمام علاقہ کچھ اس طرح ہوا کرتا تھا کہ زیادہ تر جنگلات تھے، کچھ حصہ چٹانی تھا جس میں چٹانوں کے علاوہ ٹیلے اور ٹیکریاں بھی تھیں اور تھوڑا سا علاقہ ریگستانی تھا۔ انطاکیہ بحیرہ روم کے ساحل پر واقع ہے اور تاجروں کے بحری جہاز یہیں آتے اور یہیں سے سلمان وغیرہ لاد کر ابیں جایا کرتے تھے۔ مصر میں تاجروں کے لئے سکندریہ بندرگاہ تھی۔ اس تمام علاقے پر اب مجاہدین اسلام کا تسلط ہو گیا تھا۔ اس علاقے میں عیسائیوں کے دو تین قبیلے آباد تھے اور ان کی بستیاں ایک دوسرے سے دور دور تھیں۔

حلب کی فتح کے بہت دنوں بعد انطاکیہ سے حلب آنے والے اور حلب سے انطاکیہ جانے والے لوگوں نے بتایا کہ اُس علاقے میں ایک چرنیل یا بدروح بھکتی پھر رہی ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ کسی وقت چیختی اور چلاتی ہے اور کچھ کہتی بھی ہے جو کسی کو بھی سمجھ نہیں آتی۔ لوگ اس کی آواز سن کر دوڑ بھاگ جاتے تھے۔

آج کے سائنسی دور میں بھی لوگ چرنیلوں اور بدروحوں کو مانتے ہیں۔ تیرہ صدیاں پہلے تو اس معاملے میں لوگوں میں زیادہ ذہنی پسماندگی پائی جاتی تھی۔ کوئی جھوٹ بولنا کہ اس نے چرنیل یا بدروح دیکھی ہے یا اس نے کہیں جنات کو بیٹھے دیکھا ہے تو لوگ بلا چون و چراچ مان لیتے تھے۔ حلب اور انطاکیہ کے درمیانی علاقے کی چرنیل کی آوازیں تو بہت سے لوگوں نے سنی تھیں۔ ان خبروں کی تردید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ایک روز ایک مسافر حلب میں داخل ہوا اور سرائے میں ٹھہرا۔ اُس پر خوف و ہراس طاری تھا اور اس کے منہ سے ٹھیک طرح بات بھی نہیں نکلتی تھی۔ سرائے میں ہر کانے محسوس کر لیا کہ اس نے راستے میں کوئی خوفناک یا پراسرار چیز دیکھی ہے۔ وہ

اس کی حوصلہ افزائی کرنے لگے اور اسے کہا کہ وہ سب کو بتا دے کہ وہ کیا دیکھ آیا ہے تاکہ کوئی اور مسافر اس راستے سے نہ گزرے۔

اس نے سنایا کہ وہ اپنی بستی سے حلب کی طرف خچر پر سوار چلا آ رہا تھا۔ اسے ذرا قریب سے آوازیں سنائی دیں۔ ”میں اُس کا خون پی لوں گی.... اُس نے میرا خون بہا ہے۔“ اس کے بعد اس مسافر کو چھین سنائی دیں۔ آواز بلا شک و شبہ عورت کی تھی۔ ایک تو جنگل گھناتا تھا اور اس میں ٹیکریاں بھی تھیں اس لئے کچھ نظر نہیں آتا تھا کہ یہ کون ہے اور کیا یہ انسان ہے یا کوئی پراسرار مخلوق۔ اس کے دل پر خوف طاری ہو گیا اور خچر کو ایڑ لگائی کہ تیز چلے مگر وہ گھوڑا نہیں خچر تھی۔ خچر کو جتنی بھی ایڑ لگاؤ مارو پیڑھا ذرا ساجیز چلنے لگتی ہے لیکن گھوڑے کی طرح سرپٹ نہیں دوڑتی۔

اس مسافر کا راستہ ٹیکریوں میں سے گزرتا ایک ٹیکری کے قریب سے گزرتا تھا۔ وہاں سے گزرتا تو اچانک ایک نوجوان لڑکی اس کے راستے میں آگئی۔ اس کے بال کھر ہوئے تھے اس کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا بہت ہی خوبصورت تھی۔ کپڑے کئی جگہوں سے پٹے ہوئے تھے۔

مسافر کو خیال آیا کہ اس جنگل میں اس عمر کی لڑکی کا کیا کام ہو سکتا ہے؟ یہ کسی مڑا ہوئی لڑکی کی بدروح ہوگی یا چڑیل انسان کے روپ میں آگئی تھی۔ مسافر نے اس سے نہ پوچھا کہ وہ کون ہے؟ انسان ہے یا آسمان سے آئی ہوئی کوئی مخلوق ہے؟.... اس نے دلی طور پر یقین کر لیا کہ یہ بدروح یا چڑیل ہے۔ وہ خوف سے لرزاں خچر سے اترا اور اس چڑیل کے آگے دو زانو ہو کر ہاتھ جوڑے۔

”میں غریب مسافر ہوں۔“ اس نے چڑیل یا بدروح سے التجا کی۔ ”چھو۔ چھوٹے بچے ہیں، ان کا پیٹ پالنے کے لئے در بدر خوار ہوتا پھر رہا ہوں۔ مجھے بتاؤ تیری کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ میری جان بخشی کر دے۔“

چڑیل نے کوئی بات نہ کی۔ وہ خچر تک گئی زین کے ساتھ ایک تھیلہ بندھا ہوا جس میں مسافر کا کھانے پینے کا سامان تھا اور تھیلے کے ساتھ چھوٹا سا پانی کا مشکیزہ بھی تھا۔ چڑیل نے تھیلہ بھی اتار لیا اور مشکیزہ بھی۔ وہ دو زانو بیٹھے مسافر کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔

”ہر قل کہاں ہے؟“ — چڑیل نے پوچھا۔

”میں صحیح جواب نہیں دے سکوں گا۔“ مسافر نے باپی کانپتی آواز میں کہا۔ ”اتنا ہی جانتا ہوں کہ ہر قل مسلمانوں سے شکست کھا کر ملک شام سے بھاگ گیا ہے۔ کہاں گیا ہے؟ میں یہ نہیں بتا سکتا۔ یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ مصر گیا ہو گا۔ مصر میں اس کی بادشاہی ہے اور سنا ہے کہ سکندریہ میں اس کا محل ہے اور وہ وہیں رہتا ہے۔“

”میں اُس کا خون پینے جا رہی ہوں۔“ چڑیل نے دانت پیس کر کہا۔ ”اُس نے میرا خون بہایا ہے۔ اُس نے مجھے قتل کروایا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے تو بتا دو ورنہ تمہارا خون پی لوں گی۔“

”میرے بچوں پر یہ ظلم نہ کرنا۔“ مسافر نے روتے ہوئے کہا۔ ”میں غریب آدمی بادشاہوں کے بارے میں بتانے سے معذور ہوں۔ اگر تم خدا کو مانتی ہو تو اسی کے نام پر میری جان بخشی کر دو۔“

مسافر نے سرائے میں سنایا کہ چڑیل نے تھیلہ اور مشکیزہ اٹھایا اور ایک طرف کو چل دی۔ مسافر اسے دیکھتا رہا اور وہ ٹیکری کی اوٹ میں چلی گئی۔ مسافر خچر پر سوار ہوا اور حلب کی طرف چل پڑا۔

کچھ ہی دنوں بعد انطاکیہ میں ایسے ہی دو مسافر پہنچے۔ ان کی حالت بھی اسی مسافر جیسی ہو رہی تھی۔ وہ خوف و ہراس میں مبتلا تھے۔ وہ لوگوں کو بتاتے جا رہے تھے کہ فلاں راستے سے کبھی نہ گزرتا کیونکہ وہاں ایک چڑیل یا کسی مقتول لڑکی کی بدروح گھومتی پھرتی اور چٹختی چلاتی رہتی ہے۔

انہوں نے چڑیل کا وہی حلیہ بتایا جو حلب پہنچنے والے مسافر نے بتایا تھا۔ ان سے بھی چڑیل نے کھانے پینے کی اشیاء لی تھیں اور جنگل میں غائب ہو گئی تھی۔ ان سے بھی اس نے ہر قل کے متعلق پوچھا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ انہوں نے بھی اسے بتایا تھا کہ وہ شام سے شکست کھا کر بھاگا اور سکندریہ چلا گیا ہو گا۔

چڑیل نے انہیں بھی کہا تھا کہ وہ ہر قل کا خون پینے جا رہی ہے اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ہر قل نے میرا خون بہا دیا تھا.... یہ بات سن کر لوگوں نے پورے یقین کے ساتھ کہہ دیا کہ یہ کوئی ایسی لڑکی کی بیگم تھی ہوئی روح ہے جسے ہر قل نے قتل کروایا ہو گا۔ یہیں سے یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ چڑیل نہیں بدروح ہے۔

ایسی شہادت کہیں سے بھی نہیں ملی کہ اس نے کسی انسان کو ذرا سا بھی نقصان

پنچایا ہو یا کسی کو پریشان کیا ہو سوائے اس کے یہ جس مسافر کے بھی سامنے آتی تھی اس سے کھانے پینے کا سامان لے لیتی تھی۔

اس علاقے میں جو قبائلیوں کی چھوٹی بڑی بستیاں تھیں، ان میں رہنے والوں نے بھی اس کی پکار اور چیخ سنی لیکن وہ کبھی کسی بستی میں داخل نہ ہوئی۔ لوگوں نے شام کے بعد گھروں سے نکلتا چھوڑ دیا تھا۔ وہ صرف مسافروں کو نظر آتی اور انہیں روکتی تھی۔ اسے جتنے بھی مسافروں نے دیکھا، سب نے ایک جیسا ہی حلیہ بتایا اور کہا کہ بگڑے ہوئے حال حملے میں صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ جوان ہے اور بہت ہی خوبصورت ہے۔

مسافروں نے اس کے متعلق جو خبریں ادھر ادھر پنچائیں، ان سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اٹھاکہ کی طرف جا رہی ہے۔ اٹھاکہ پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس وقت اٹھاکہ کون سے سالار کے سپرد کیا گیا تھا۔

○

یہ بدروح تھی یا چڑیل یا کوئی پاگل لڑکی تھی، اٹھاکہ کے مضافات میں جا پہنچی۔ لوگوں تک اس کی خبریں پہلے ہی پہنچ گئی تھیں اس لئے لوگوں کو جب پتہ چلا کہ وہ قریب آگئی ہے تو ان پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ خوف و ہراس بھی ایسا کہ بعض مسافر پناہ سفر ملتی کر دیتے تھے۔

ایک روز تین چار آدمی جو اٹھاکہ کے غیر مسلم باشندے تھے، مسلمانوں کے سالار کے پاس گئے اور کہا کہ ایک عرصے سے ایک چڑیل یا بدروح کی خبریں سن سن کر لوگوں پر ایسا ڈر و اثر ہوا ہے کہ شام کے بعد کوئی گھر سے باہر نہیں نکلتا اور سفر بھی پُر خطر ہو گیا ہے۔

”ہم اسلام کے بارے میں کچھ سن کر آئے ہیں“۔ اس وفد کے سردار نے کہا۔ ”ہم جانتے ہیں کہ چڑیل یا بدروح یا جنت کے سامنے انسان بالکل بے بس اور مجبور ہوتا ہے۔ کوئی انسان ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن کسی نے بتایا ہے کہ اسلام کے بعض عالموں کے پاس ایسی طاقت ہوتی ہے جو ان پر اسرار اور پُر خطر چیزوں پر قابو پالیتے ہیں۔“ یہ دراصل شہریوں کی طرف سے بھیجا ہوا وفد تھا اور شہریوں کی درخواست یہ تھی کہ مسلمانوں کے پاس اگر کوئی ایسی طاقت ہے تو اس چڑیل یا بدروح سے نجات دلانی جائے۔

”ہاں، تم نے ٹھیک سنا ہے“۔ سالار نے کہا۔ ”اسلام میں ایسی طاقت ہے کہ نات، چڑیلوں اور بدروحوں پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اس طاقت کا راز یہ ہے کہ جو مرجاتا ہے وہ واپس نہیں آتا۔ نہ حقیقی روپ میں نہ بدروح کے روپ میں۔ اسلام ایک حقیقت پسند مذہب ہے جو بدروحوں اور چڑیلوں کو نہیں مانتا۔ اسلام قبول کرو اور یہ انت تم میں بھی پیدا ہو جائے گی پھر تم اس بدروح یا چڑیل کا سامنا کر کے دلیری سے دچھو گے کہ تم کون ہو۔“

سالار نے محسوس کیا کہ یہ علمی باتیں ہیں اور یہ دین اسلام کے باریک مسائل ہیں تو یہ لوگ ابھی نہیں سمجھ سکیں گے۔ سالار نے اپنے محافظ دستے کے کماندار کو بلایا اور اس کو یہ کام سونپا کہ وہ اپنے ساتھ جتنے بھی آدمی لے جانا چاہے لے جائے اور دیکھے کہ یہ چڑیل یا بدروح کون ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے۔

”قابل احترام سالار!“۔ وفد کے ایک آدمی نے کہا۔ ”آپ کا مذہب جو کچھ بھی کہتا ہے، ہم اس پر اعتراض نہیں کرتے لیکن اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ آپ کو خبردار کر دیں کہ اپنے آدمیوں کا نقصان نہ کرا بیٹھیں۔ ہو سکتا ہے وہ آپ کے آدمیوں کو دیکھ کر غائب ہی ہو جائے۔ اس طرح آپ کے آدمیوں کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ اگر وہ غائب نہ ہوئی تو نقصان ضرور کرے گی۔ آپ کے آدمی مارے بھی جاسکتے ہیں۔“

سالار نے ان کی یہ بات سن کر محافظوں کے کماندار سے کہا کہ وہ انہیں دیکھ کر غائب نہ ہوئی تو اسے پکڑ کر یہاں لے آئیں۔

محافظ دستے کے کماندار نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا اور سب سے پہلے مختلف لوگوں سے پوچھا کہ یہ بدروح کہاں کہاں دیکھی گئی ہے۔ مختلف لوگوں نے تین چار جگہیں بتائیں اور ایک دو نے ایک خاص علاقے کی نشاندہی کی۔

کماندار نے بہت سے محافظوں کو ساتھ لیا اور چار چار پانچ پانچ کی ٹولیوں میں تقسیم کر کے شہر کے ایسے مضافات میں پھیل دیا جہاں جنگل ذرا گھٹنا تھا اور ایسی جگہیں بھی تھیں جہاں ٹیلے اور کھڈا تالے تھے۔

سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے ایک جگہ سے محافظوں کی ایک پارٹی کو چیخیں سنائی دیں اور یہ الفاظ بھی سنائی دیئے کہ میں ہر قل کا خون پیئے جا رہی ہوں۔ محافظوں کی اس پارٹی نے ایک اور پارٹی کو بھی بلا لیا اور اس طرح یہ بارہ چودہ محافظ اکٹھے ہو گئے۔ وہ

پھیل کر آگے بڑھنے لگے۔ انہوں نے ایک ذرا زیادہ عمر کے محافظ کو اسلامی اصولوں کے تحت اپنا امیر یعنی کمانڈر بنالیا تھا۔

اس کمانڈر نے کہا کہ دل میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا نام ہو اور کسی نہ کسی آیت قرآنی کا ورد دل ہی دل میں کرتے جائیں.... کمانڈر کی ہدایت کے مطابق وہ محاصرے کی صورت میں بڑھتے گئے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے بدروح کی چیخ یا پکار سنائی دیتی تھی جو معلوم ہوتا تھا کہ دور بنتی جا رہی ہے۔

آخر انہیں وہ نظر آگئی۔ محافظوں نے اُسے اُسی حال چلنے میں دیکھا جو انہوں نے متعدد بار سنا تھا۔ محافظ نیم دائرے کی شکل میں اُس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ اُلٹے قدم آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہی تھی۔ فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔

”تم چڑیل یا بدروح ہو تو فوراً غائب ہو جاؤ“۔ کمانڈر نے کہا اور اپنی برچھی ہاتھ میں یوں تولی جیسے اس پر برچھی پھینکے گا۔ اس نے کہا۔ ”اگر انسان ہو تو ہمارے پاس آ جاؤ اور تمہارے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کیا جائے گا۔ ہم تم سے نہیں ڈر رہے تم ہم سے نہ ڈرو۔“

”مجھے ہر قل تک پہنچاؤ“۔ وہ جو کوئی بھی تھی بولی۔ ”ہر قل نے میرا خون بلایا ہے“ میں اس کا خون پینے جا رہی ہوں۔“

”ہم تمہیں ہر قل تک پہنچا دیں گے“۔ کمانڈر نے کہا۔ ”تم جانتی ہو ہر قل ہمارا دشمن ہے۔ ہم خود چاہتے ہیں کہ وہ قتل ہو جائے۔ ہم تمہارے ساتھ اپنا ایک آدمی بھیجیں گے۔ تم محفوظ بھی رہو گی اور ہمارا آدمی تمہارا کام بھی کر دے گا۔“

کمانڈر گھوڑے سے اتر کر اس کی طرف گیا۔ اس نے برچھی اپنے ہاتھ میں تیار رکھی۔ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے کمانڈر نے شفقت اور پیار کی اور اس کی ہم خیالی کی باتیں جاری رکھیں اور اُس تک پہنچ گیا۔ اسے بازو سے پکڑا اور کہا کہ ہمارے ساتھ آؤ اور عزت و آبرو کے ساتھ ہمارے ہاں چلو۔

لڑکی بغیر مزاحمت کے بڑے آرام سے کمانڈر کے ساتھ چل پڑی۔ اپنے گھوڑے کے قریب لے جا کر کمانڈر نے لڑکی کی بغلوں میں ہاتھ رکھے اور اسے اٹھا کر گھوڑے پر سوار کر دیا۔ گھوڑے کی باگ پکڑی اور گھوڑے کے آگے آگے پیدل چلنے لگا۔ تمام محافظ گھوڑوں پر سوار تھے۔ واپسی کے وقت وہ لڑکی کو بھی دیکھتے رہے۔ ان کی نظریں لڑکی سے

بنتی ہی نہیں تھیں۔ انہیں غالباً یہ توقع تھی کہ یہ لڑکی ابھی غائب ہو جائے گی لیکن سالار کے دروازے تک پہنچ گئے لڑکی غائب نہ ہوئی۔

○

سورج کبھی کا غروب ہو چکا تھا۔ سالار اپنے محافظوں کا انتظار بڑی ہی بے تابی سے کر رہا تھا۔ غالباً اسے بھی یہ خطرہ نظر آنے لگا تھا کہ یہ لڑکی کوئی جن بھوت ہوا یا بدروح ہوئی تو وہ محافظوں کو نقصان پہنچائے گی اور ہو سکتا ہے نقصان پہنچا بھی چکی ہو.... اتنے میں سالار کو دربان نے اطلاع دی کہ محافظ ایک لڑکی کو لائے ہیں۔ سالار تو جیسے حیرت سے بدک گیا ہو۔ اس کے کہنے پر محافظ دستے کا کمانڈر لڑکی کو سالار کے کمرے میں لے گیا۔ صرف محافظ کو سالار کے کمرے میں لے جایا گیا جو لڑکی کو لایا تھا۔

سالار کے گھر کے باہر بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ شہر کے جو آدمی سالار کے پاس یہ درخواست لے کر آئے تھے کہ اس بدروح یا چڑیل کا کچھ کیا جائے انہوں نے شہر میں یہ خبر پھیلا دی تھی کہ سالار نے اپنے محافظوں کو بھیجا ہے کہ وہ جا کر دیکھیں کہ یہ کیا چیز ہے۔ اس خبر پر ہی لوگ پہلے ہی وہاں اکٹھے ہونے شروع ہو گئے تھے۔

سالار کو بتایا گیا کہ لوگ باہر یہ دیکھنے کے لئے دیر سے اکٹھے ہو گئے ہیں کہ محافظ کیا کر کے آتے ہیں یا ان پر کیا گزرتی ہے۔ سالار نے لڑکی کو دیکھ لیا تھا جس سے اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ تو انسان ہے۔ اس نے کہا کہ ان لوگوں میں سے چند ایک معزز اور نمائندہ نم کے آدمیوں کو اندر بلالیا جائے تاکہ وہ بھی دیکھ لیں کہ یہ کیا چیز ہے۔

دس بارہ آدمی اندر آ گئے اور سالار نے انہیں بٹھالیا۔ سب کی نظریں لڑکی پر لگی ہوئی تھیں اور لڑکی یوں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی جیسے اسے احساس ہی نہ ہو کہ وہ اتنے مارے آدمیوں میں بیٹھی ہوئی ہے۔

”تمہارا نام کیا ہے لڑکی؟“۔ سالار نے اس سے پوچھا۔

”میرا نام یوکلِس ہے“۔ لڑکی نے جواب دیا۔

کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں کھسپ پھڑپھڑ ہوئی اور ایک نے کہا کہ یہ تو مردانہ نام ہے اور ایسے نام رومیوں کے ہوتے ہیں۔

”میں یوکلِس ہوں“۔ لڑکی نے کہا۔ ”اور یوکلِس روزی ہے.... یوکلِس زندہ ہے اور روزی قتل ہو گئی ہے۔“

کے قابو سے نکل گیا تھا اس لئے جنگلوں اور بیابانوں میں بھٹکتی اور چیختی چلائی انطاکیہ تک جا پہنچی۔

○

سالار کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ اس لڑکی کا کیا کرے۔ اس کے پاس اس لڑکی کے پاگل پن کا کوئی علاج نہیں تھا اور یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ مجاہدین اسلام کے لشکر کا سالار لڑکی کو پاگل سمجھ کر اسے گھر سے نکال دیتا۔

لڑکی کو سب کے سامنے لے آئے کا فائدہ یہ ہوا کہ لوگوں کو اس خوف و ہراس سے نجات مل گئی کہ یہ کوئی چڑیل یا بدروح یا جنت میں سے ہے۔ اگر وہ اتنا ہی بتا دیتی کہ وہ کس کی بیٹی ہے اور کہاں سے آئی ہے تو سالار اسے وہاں بھیج دیتا اور وہ اپنے گھر پہنچا دی جاتی۔ اگر مسلمان سالار کی جگہ کوئی رومی جرنیل ہو تا تو لڑکی کو پاگل قرار دے کر قتل کروا دیتا اور اس کی لاش جنگل میں پھینک دی جاتی لیکن وہاں کسی سالار اور کسی جرنیل کا حکم نہیں چل سکتا تھا وہاں اب اللہ کی حکمرانی تھی اور اللہ کے دین کے احکام کی پیروی لازمی تھی۔

سالار روزی کو اپنے ساتھ اپنے گھر کے اندر لے گیا اور اسے مستورات کے حوالے کر کے کہا کہ اسے منامیں اور اچھے کپڑے پہنائیں اور پھر اسے کھانا کھلائیں۔ واپس آکر سالار ان لوگوں میں بیٹھ گیا جو اس کے ملاقات والے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”اب مجھے مشورہ دیں“ — سالار نے حاضرین سے کہا — ”میں اس لڑکی کو گھر میں بھی نہیں رکھ سکتا اور اس حالت میں گھر سے نکال بھی نہیں سکتا۔ اس کی دیکھ بھال اور اس کی آبرو کی حفاظت میری ذمہ داری ہے۔ میں اسے کسی مخلص اور دردمند آدمی کے سپرد کرنا چاہتا ہوں جو اسے اپنے گھر میں رکھے۔ میرا طبیب اس کا علاج کرنے کی کوشش کرے گا۔ ہو سکتا ہے یہ ٹھیک ہو جائے اور یہ بتادے کہ یہ کس کی بیٹی ہے اور کہاں کی رہنے والی ہے۔“

سب پر سکوت طاری ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک پاگل لڑکی کی ذمہ داری کوئی بھی لینے کو تیار نہیں..... وہاں سب سے پیچھے تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے آپس میں سرگوشیوں میں صلاح مشورہ کیا۔

”روزی کو کس نے قتل کیا ہے؟“ — سالار نے پوچھا۔

”ہرقل نے؟“ — لڑکی نے جواب دیا — ”میں ہرقل کو قتل کرنے جا رہی ہوں اور میں اُس کا خون پیوں گی.... تم میں سے کوئی آدمی مجھے اس راستے پر ڈال دے جو مجھے ہرقل تک پہنچا دے۔“

”کیا تم اپنی روح ہو؟“ — سالار نے پوچھا — ”یا اپنا جسم ہو؟“

”میری روح یوکلس ہے۔“ — لڑکی نے کہا — ”یوکلس کی روح مجھ میں ہے۔“

اس سے پوچھا گیا کہ وہ کس کی بیٹی ہے اور کہاں سے آئی ہے تو وہ کچھ بھی نہ بتا سکی۔ اس نے کچھ نہ کچھ جواب تو دیئے لیکن وہ بے معنی اور ناقابل فہم تھے۔ سالار سمجھ گیا کہ اس لڑکی کا دماغی توازن ٹھیک نہیں۔

وہ حلب کی روزی تھی جسے یوکلس کے ساتھ والمانہ محبت تھی اور یوکلس دل میں اس کی محبت بسائے ہوئے تھا۔ یوکلس حلب کے محاصرے میں مارا گیا تھا اور روزی نے اُس کی لاش اُس وقت دیکھی تھی جب شاریتا یوکلس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس وقت تک یوکلس زندہ تھا۔ اس نے شاریتا اور روزی کے ہاتھوں میں جان دی تھی۔ پھر روزی یوکلس کی ماں لیزا کی لاش پر گئی اور اس کا جو ردِ عمل تھا وہ پہلے سنایا جا چکا ہے۔ روزی کی ماں وہیں آگئی تھی اور روزی باہر نکلی اور دوڑ پڑی۔ ماں اس کے پیچھے گئی تھی لیکن روزی کو جیسے زمین نے نگل لیا تھا۔ وہ اتنی تیز بھاگی تھی کہ ماں اس تک نہ پہنچ سکی نہ دیکھ سکی کہ وہ گئی کس طرف ہے۔

یوکلس نے اسے بتا دیا تھا کہ ہرقل اور اس کا بیٹا قسطنطین اسے قتل کروانا چاہتے تھے لیکن اسے پتہ چل گیا اور اس کی ماں جرنیل انتھونیس کے ساتھ اسے یہاں لے آئی۔ ہرقل کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یوکلس اور اس کی بیوی لیزا کہاں چلے گئے ہیں۔

روزی نے یوکلس کی خون آلود لاش دیکھی تو صدمے نے اس کے دماغ کو غیاہوں تک ہلا کر رکھ دیا اور یہ خیال اس کے ذہن میں بیٹھ گیا کہ یوکلس کو مسلمانوں نے نہیں بلکہ ہرقل نے قتل کروایا ہے۔ وہ اتنا ہی جانتی تھی کہ انطاکیہ سے بڑی کشتیاں اور جہاز مصر جایا کرتے ہیں اور ہرقل مصر چلا گیا ہے۔ وہ یوکلس کے قتل کا انتقام لینے کے لئے چل پڑی تھی۔ پینتالیس میلوں کا فاصلہ کوئی معمولی فاصلہ نہ تھا۔ وہ عام راستے سے بٹ کر جنگلوں میں سے گزرتی جا رہی تھی تاکہ اسے کوئی دیکھ نہ سکے۔ چونکہ اس کا دماغ اس

”امیر اظاکیر!“ — ان میں سے ایک آدمی نے کہا — ”ہم تین آدمی مصر سے آئے تھے اور اپنا کام کر کے واپس جا رہے ہیں۔ یہاں سے گزر رہے تھے تو لوگوں نے بتایا کہ ایک بدروح کو پکڑ کر لائے ہیں۔ ہم اسے دیکھنے کے لئے رک گئے اور اب پتہ چلا ہے کہ یہ بدروح نہیں۔ ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ یہ لڑکی مسلمان نہیں، کسی عیسائی قبیلے کی ہے۔ ہم قبلی عیسائی ہیں۔ اگر آپ کو ہم پر اعتماد ہے تو ہم اس لڑکی کو ساتھ لے جائیں گے، اس کا علاج بھی کرائیں گے۔ اگر یہ ٹھیک ہو گئی اور اس نے واپس آنا چاہا تو ہم اسے اس کے گھر چھوڑ آئیں گے اور اگر یہ شادی پر رضامند ہو گئی تو اس کی کسی کے ساتھ شادی کر دیں گے۔ لڑکی نوجوان ہے اور اس کی خوبصورتی اس کے لئے خطرہ بن سکتی ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ یہ یقیناً ”عیسائی“ ہے اور ہم بھی عیسائی ہیں اس لئے یہ ہمارے ہی سپرد کی جائے تو ہم پوری ہمدردی سے اس کی دیکھ بھال کریں گے۔“

حاضرین مجلس میں سے تین چار آوازیں اس شخص کی تائید اور حمایت میں انھیں اور آخر سالار نے فیصلہ دے دیا کہ لڑکی ان کے حوالے کر دی جائے۔

”اگر لڑکی نے تمہارے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تو پھر کیا ہو گا؟“ — سالار نے پوچھا۔

”امیر اظاکیر!“ — اس آدمی نے کہا — ”لڑکی کچھ بھی سمجھنے کے قابل نہیں اس کے دماغ میں یہی خط بیٹھ گیا ہے کہ یہ ہرقل کو قتل کرنے جا رہی ہے۔ میں اسے کون گا کہ میرے ساتھ چلو، میں تمہیں اپنے پاس رکھوں گا اور ہم دونوں مل کر ہرقل کو قتل کریں گے۔“

اس کی اس بات کو سب نے سراہا اور اس بات سے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ یہ آدمی کچھ اچھی حیثیت والا اور عقل و دانش والا ہے۔

لڑکی جب بلائے پر واپس سالار کے ملاقاتی کمرے میں آئی تو کمرے میں ستانا چھایا۔ اسے منمایا گیا، کھانا کھلایا گیا اور اچھا لباس پہنایا گیا تھا۔ وہ اتنی حسین تھی کہ سب حیرت زدگی کے عالم میں چلے گئے تھے۔ اس کے چہرے پر معصومیت تھی۔ سالار نے اسے کہا کہ اس نے اس کے لئے تین آدمی تیار کر لئے ہیں جو اسے ساتھ لے جائیں گے اور ہرقل کے قتل میں ساتھ ہوں گے۔

لڑکی کے ہونٹوں پر تبسم آ گیا۔ اسے ساتھ لے جانے والے آدمی نے بڑے پیار

اور اعتماد سے باتیں کیں تو لڑکی اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔

سالار نے آخری فیصلہ یہ سنایا کہ آج رات لڑکی اس کے گھر کی مستورات کے پاس مہمان رہے گی اور کل فجر کی نماز کے فوراً بعد ان آدمیوں کے سپرد کر دی جائے گی اور یہ آدمی اُسی وقت مصر کو روانہ ہو جائیں۔



دوسری صبح نماز فجر کے بعد سالار واپس گھر آیا تو ان تینوں آدمیوں کو منتھرایا۔ اس نے روزی کو ان کے حوالے کر دیا اور وہ چلے گئے۔ اظاکیر سے سکندریہ تک خشکی کا راستہ بھی تھا لیکن ایک دو دنوں بعد ایک بحری جہاز سکندریہ جا رہا تھا۔ انہوں نے سکندری راستہ اختیار کیا۔

راستے میں روزی ایک ہی بات کرتی تھی کہ وہ ہرقل کو قتل کر کے اس کا خون پیئے گی۔ تینوں آدمی اس کی حوصلہ افزائی کرتے اور کہتے تھے کہ وہ اس کے ساتھ ہوں گے۔ رات کو روزی سو جاتی تھی تو یہ تینوں آدمی جہاز کے عرشے پر کچھ دیر کے لئے جا بیٹھے اور گپ شپ لگا کر سوتے تھے۔

”ہورٹس!“ — ان تین میں سے ایک آدمی نے اپنے ایک ساتھی سے کہا — ”مجھے تو یقین ہو گیا کہ تمہاری بیٹی بچ جائے گی۔ یہ لڑکی کتواری معلوم ہوتی ہے۔“

”امید تو یہی ہے“ — ہورٹس نے کہا — ”میں نے تو اپنے آپ کو اس صدمے کے لئے تیار کر لیا تھا کہ میری بیٹی کی قربانی دے دی جائے گی۔ یہ تو خدا کی خاص مدد ہے کہ یہ لڑکی مل گئی ہے۔ ہمارا اسقف اس لڑکی کو قبول کر لے تو میں صدمے سے بچ جاؤں گا۔“

”بچ جاؤ گے“ — اس کے دوسرے ساتھی نے کہا — ”تمہیں خدائی مدد مل گئی ہے۔“

روزی کو اپنے ساتھ لانے سے ہورٹس کا ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ یہ مسئلہ اس کے لئے ایک ایسا صدمہ تھا جسے وہ ناقابل برداشت کہتا تھا۔ مسلمانوں کے سالار کو جو امیر اظاکیر تھا، ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوا تھا کہ یہ شخص انسانی ہمدردی اور نیکی کے پردے میں اسے اور روزی کو بہت بڑا دھوکہ دے رہا ہے۔ روزی تو کچھ سمجھنے کی ذہنی حالت میں تھی ہی نہیں۔ اس کا تو دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔

ہوئیں کو جب اسقف نے کہا تھا کہ اب اس کی بیٹی کی قربانی دی جائے گی تو اس نے بلا حیل و حجت سر جھکا لیا تھا۔ قربانی کی رات ابھی ڈیڑھ دو مہینے دور تھی۔ ہوئیں کو اکلوتی بیٹی کا غم کھانے لگا تھا۔ اپنے کاروبار کے سلسلے میں اسے اپنے دو کاروباری ساتھیوں کے ساتھ اٹالکھ اور ایک دو جگہوں پر جانا پڑا۔

اس کے ساتھی اس کا دل یہ کہہ کر بھلاتے رہے تھے کہ وہ خدا کے نام پر بیٹی قربان کر رہا ہے اور یہ قربانی ایسی ہے جو بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے ہے اس لئے خدا اس کا غم خوشی میں بدل دے گا اور اسے اور نہ جانے کیا اجر ملے لیکن ہوئیں پر کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا اور وہ غموں کے بوجھ تلے کراہتا ہی رہتا تھا۔

○

وہ اب اپنے کام سے فارغ ہو کر واپس مصر جا رہا تھا۔ جہاز کے انتظار میں اسے اٹالکھ میں رکن تھا۔ اتفاق سے اسے پتہ چلا کہ امیر اٹالکھ نے ایک بدروح یا چڑیل پکڑی ہے تو وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ امیر اٹالکھ کے ملاقاتی کمرے میں جا بیٹھا۔ امیر اٹالکھ جو وہاں کی فوج کا سالار بھی تھا، جب پوچھا کہ اس لڑکی کو کون اپنے گھر رکھنا چاہتا ہے تو ہوئیں کے دماغ میں بڑی اچھی بات آگئی اور اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ سرگوشیوں میں صلح مشورہ کیا تو ساتھیوں نے بھی تائید کر دی اور کہا کہ یہ لڑکی لے لو۔ اس طرح روزی اس کے قبضے میں آگئی۔

واپسی سفر کے دوران ایک رات ہوئیں اور اس کے ساتھیوں نے روزی کو بھی جہاز کے عرشے پر بٹھالیا اور اس کا دل اپنے قبضے میں رکھنے کے لئے ہر قل کے خلاف باتیں شروع کر دیں۔ ہوئیں نے اس سے پوچھا کیا وہ کنواری ہے؟

”ہاں تو!“ — روزی نے جواب دیا — ”میں اتنی ہی کنواری ہوں جتنی وہ مریم کنواری تھی جس نے حضرت عیسیٰ کو جنم دیا تھا۔۔۔۔۔ یہ کیوں پوچھتے ہو؟“

”ہمیں تم پر کوئی شک نہیں“ — ہوئیں نے کہا — ”یہ اس لئے پوچھا ہے کہ بزرگوں نے بتایا تھا کہ مظلوم کنواری اگر کسی ظالم کو قتل کر دے تو یہ اس کا گناہ نہیں ہوتا۔ ہر قل سے زیادہ ظالم بادشاہ ہم نے کبھی نہیں سنا تھا۔“

جہاز سکندریہ کی بندرگاہ سے جاگا، مسافر اترے اور اپنے اپنے ٹھکانوں کو چل پڑے ہوئیں سکندریہ سے خاصی دور کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ان کی منزل دور تھی

ہوئیں کی اس فریب کاری کا پس منظر یہ تھا کہ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، قبلی عیسائی ہر سال ایک خاص رات دریائے نیل کو ایک نوجوان کنواری لڑکی کی قربانی دیا کرتے تھے۔ تاریخ میں آیا ہے کہ جس لڑکی کی قربانی دینی ہوتی تھی اس کے والدین کی رضامندی اس میں شامل ہوتی تھی۔ ایسا کبھی بھی نہ ہوا کہ کسی لڑکی کو زبردستی اٹھا کر دریا میں پھینک دیا گیا ہو۔

اب کے جس قبیلے کے ذمے یہ قربانی تھی اس میں صرف ہوئیں کی بیٹی نوجوان اور کنواری تھی۔ باقی سب کی بیٹیاں بہت چھوٹی تھیں یا شادی شدہ تھیں۔ ہوئیں کو اسقف نے بتا دیا تھا کہ اس سال وہ اپنی بیٹی کو قربان کرے گا۔ ہوئیں کی کل اولاد یہی ایک بیٹی تھی اور اس بیٹی کے ساتھ اسے اور بیٹی کو اس کے ساتھ والمانہ پار تھا۔ بے شک اسقف یعنی بڑے پادری نے اس کی اجازت کے بغیر اس کی بیٹی کو قربان نہیں کرنا تھا پھر بھی ہوئیں کو معلوم تھا کہ وہ اپنے سب سے بڑے مذہبی پیشوا کا حکم ٹال نہیں سکتا۔ اس کے گھر میں تو باقاعدہ ماتم شروع ہو گیا تھا۔

ہوئیں اپنی بیوی کو کوستا تھا کہ اس نے اسے بیٹی کی شادی جلدی نہ کرنے دی۔ شادی ہو جاتی تو آج یہ زندہ تو رہتی۔ بیٹی خود بھی قربانی کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس نے صدمے کی کیفیت میں یہاں تک کہہ دیا کہ وہ اسقف اعظم کو گرجے میں کھڑے ہو کر کہہ دے گی کہ اس کی شادی تو نہیں ہوئی لیکن وہ کنواری نہیں۔ وہ کہتی تھی کہ وہ یہاں تک کہہ دے گی کہ وہ بہت بڑی گناہگار ہے اور اپنے جیسے دو نوجوانوں کے ساتھ گناہ کر چکی ہے اس لئے اس کی قربانی قبول نہیں ہوگی اور نیل کا بہاؤ رک رہے گا۔

ہوئیں اور اس کی بیوی نے بیٹی کو سختی سے منع کر دیا اور کہا کہ جھوٹ بولنا بھی گناہ ہے اور اس جھوٹ سے ان کے خاندان کی اور پورے قبیلے کی بے عزتی ہوگی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان پر یہ الزام عائد ہو جائے کہ یہ لڑکی اپنی جان بچانے کے لئے جھوٹ بول رہی ہے۔

ان لوگوں کا یہ عقیدہ غلط ہی سہی اور یہ ان کا وہم ہی سہی کہ نیل کا بہاؤ رک جانا ہے لیکن یہ لوگ اپنے عقیدوں کی پابندی بڑی ہی سختی سے کرتے تھے۔ ہر قل نے جو سرکاری عیسائیت رائج کی تھی، اس کے مطابق یہ قربانی قتل جیسا جرم تھا لیکن یہ لوگ یعنی قبلی عیسائی دن کی بجائے رات کو یہ رسم پوری کر لیا کرتے تھے۔

ائے گئے تھے اور اسے جو زیورات پہنائے گئے تھے وہ بھی ہوشیاری کی بیٹی کے تھے۔
 ریش نے اپنی بیٹی کو بچانے کے لئے اس کے سونے کے زیورات قربان کر دیئے تھے۔
 اپنی بیٹی کی قیمت دے رہا تھا۔

دس گیارہ سال پہلے یہ رسم اعلانیہ ادا کی جاتی تھی۔ ہر طرف منادی کرا دی جاتی تھی
 آج رات نیل کے کنارے فلاں جگہ ایک لڑکی کی قربانی دی جا رہی ہے۔ لوگ جوق
 جوق وہاں اکٹھے ہو جاتے تھے اور اس لڑکی کو مقدس سمجھ کر اس کے ہاتھ چومتے تھے
 ان ہر قل نے ایسی باندیاں عائد کر دی تھیں کہ اس قربانی کو قتل قرار دے دیا تھا پھر بھی
 لوگ چوری چھپے ہر سال یہ رسم ادا کر دیا کرتے تھے اور اس کا اعلان نہیں ہوتا تھا۔

روزی کو ایک جگہ جو بستیوں سے دور تھی دریائے نیل کے کنارے لے گئے۔
 ریش نے اسے بتایا تھا کہ دریا پر ایک کشتی ملے گی اور وہ اسے اس کشتی سے سکندر یہ
 لے جائے گا۔ اسقف وہاں موجود تھا اور قبیلوں کے دو چار سردار بھی تھے۔

اسقف نے روزی پر خوشبودار پانی چھڑکا اور اس کے سامنے کھڑے ہو کر کچھ بڑھا
 رہا۔ اس کے دونوں کندھوں پر باری باری انگلیاں رکھیں اور پھر اس کے سینے پر انگلی
 بکھی اور اسے بازو سے پکڑ کر دریا کے کنارے لے گیا۔ وہاں کنارہ خاصا بلند تھا۔ پیچھے ہو
 کر اسقف نے روزی کو دھکا دیا اور وہ دریا میں جا پڑی۔

رات تاریک تھی۔ اسقف اور باقی لوگ ایک مذہبی گیت گنگٹانے لگے۔ دریا خاصا
 گہرا تھا لیکن بہاؤ میں تیزی اور مٹندی نہیں تھی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کوئی لڑکی دریا
 میں زندہ نکل آئی ہو۔ ہر وہ لڑکی جسے پھینکا جاتا تھا وہ ڈوب کر مر جاتی تھی لیکن روزی
 کے معاملے میں کچھ اور ہی ہو گیا۔

روزی اپنے قبیلے کے سردار کی بیٹی تھی اور بڑی ہی شوخ اور چلبلی لڑکی تھی۔ ان کی
 بہتی کے قریب سے دریائے فرات گزرتا تھا۔ روزی اپنی دو تین ہم جولیوں کو لے کر دریا
 پہ چلی جاتی اور تیراکی کرتی تھی۔ جوں جوں بڑی ہوتی گئی وہ دریا میں آگے ہی آگے یعنی
 وسط میں جانے لگی جہاں بہاؤ خاصا تیز و تند ہوتا تھا۔ وہ اونچے سے اونچے کنارے پر جا کر
 دریا میں کودا بھی کرتی اور تیر کر نکل آتی تھی۔ اس کے باپ نے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ وہ
 آدمی اس کے اور اس کی ہم جولیوں کے ساتھ دریا پر بھیجا کرتا تھا تاکہ خطرے کے وقت
 لڑکیوں کو دریا سے نکال لے۔

اس لئے انہوں نے اونٹ کرائے پر لئے اور رات گہری ہو گئی تھی جب وہ اپنے گاؤں
 پہنچ گئے۔

اگلی صبح ہوشیاری اپنے دونوں ساتھیوں کو ساتھ لے کر اس گاؤں پہنچا جو ان لوگوں کا
 مذہبی مرکز تھا۔ وہ سب سے بڑے مذہبی پیشوا جسے اسقف کہتے تھے سے ملا اور اسے یہ
 جھوٹا بیان دیا کہ اظاکیہ میں انہیں ایک قبلی عیسائی ملا تھا اور اس نے کہا کہ اس کا کاروبار
 بہت ہی خراب ہو گیا ہے اور نوبت فاقوں تک آن پہنچی ہے۔ خواب میں اسے حضرت
 عیسیٰ نے کہا ہے کہ اپنی اس کنواری بیٹی کو دریائے نیل پر قربان کر دو تو تمہارا کاروبار بھی
 صحیح ہو جائے گا اور نیل کے کنارے رہنے والوں کا بھی بھلا ہو گا اور ان کی دعائیں تمہیں
 اور زیادہ دنیاوی فائدے پہنچائیں گی۔

ہوشیاری کے ساتھی بھی اس کے ساتھ تھے۔ گرجے میں بیٹھے ہوئے انہوں نے
 ہوشیاری کی تائید کر دی اور بتایا کہ اس قبلی عیسائی نے اپنی بیٹی ان کے حوالے کر دی
 ہے۔ وہ کہتا تھا کہ اس سال اس کی بیٹی کو قربان کیا جائے۔

ہوشیاری نے کہا کہ اس لڑکی کو ضرور قربان کیا جائے کیونکہ یہ ایک لعنت ہے جس
 میں خیانت نہیں ہونی چاہئے.... اسقف نے دو چار سوال پوچھے اور کہا کہ لڑکی کو اس
 کے سامنے لایا جائے۔

اگلے روز روزی کو گرجے میں لے گئے اور اسقف نے اسے دیکھ کر صرف یہ پوچھا
 کہ وہ اپنی مرضی سے آئی ہے یا اسے زبردستی بھیجا گیا ہے۔ روزی نے کچھ بھی نہ سمجھتے
 ہوئے جواب دیا کہ وہ اپنی مرضی سے آئی ہے۔

روزی تو اپنے ہوش و حواس میں تھی ہی نہیں۔ وہ پوری خود اعتمادی اور خوشی سے
 بول رہی تھی جیسے اسے کوئی شک و شبہ نہ تھا۔ اسقف نے منظوری دے دی کہ اس لڑکی
 کو قربان کیا جائے۔



ہوشیاری اور اس کی بیوی نے روزی کو بڑے پیار سے اپنے گھر میں رکھا اور اس کے
 بگڑے ہوئے ذہن کے مطابق اس کے ساتھ باتیں کرتے رہے اور روزی کی زندگی کا
 آخری دن اکیلا اُس رات اسے دریائے نیل میں پھینک دیتا تھا۔

شام کے وقت روزی کو گرجے میں لے گئے۔ اسے ہوشیاری کی بیٹی کے قیمتی کپڑے

اب روزی کو نیل میں پھینک دیا گیا تو نہ جانے اسے کیسے کیسے خیال آئے ہوں گے لیکن سب سے پہلا اور اہم خیال یہ تھا کہ دریا میں سے زندہ نکلنا ہے۔

وہ دریا میں گری تو سطح پر آنے کی بجائے پانی کے نیچے ہی تیرنے لگی اور کچھ دور چلی گئی۔ جب دم ٹوٹنے لگا تو پانی سے ابھری اور دوسرے کنارے کی طرف تیرنے لگی۔ تاریکی میں اسے کوئی دیکھ نہ سکا۔ دیکھتا بھی کون؟ اسے دریا میں پھینکنے والے وہاں سے چلے گئے تھے کہ پکڑے نہ جائیں۔

روزی بہت دور جا کر دوسرے کنارے جا گئی اور دریا سے نکل گئی۔ اس نے سب سے پہلے تو یہ محسوس کیا جیسے وہ ایک خواب دیکھ رہی تھی اور اچانک بیدار ہو گئی ہو۔ اس کی حقیقی سوچیں واپس آ گئی تھیں اور دماغ نارمل حالت میں آ گیا تھا۔ اس نے اپنا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ یہ زیورات اسے کس نے پہنائے ہیں۔

وہ وہیں کھڑی رہی اور سوچنے لگی کہ اب کیا ہو گا؟ اسے تو یہ بھی یاد نہیں تھا نہ ایسا احساس تھا کہ وہ اپنے گھر سے کتنی دور نکل آئی ہے اور کیا یہ دریا ئے فرات ہے؟ تھک بار کر وہیں بیٹھ گئی۔

رات تو تاریک تھی، اس کا ذہن روشن ہونے لگا۔ اسے لڑائی یاد آئی خوزیر لڑائی اسے اچانک یوکلِس یاد آ گیا۔ یوکلِس کی محبت تو اس کی روح میں اُتری ہوئی تھی۔ یوکلِس کی یاد نے اس کے ذہن اور جسم کو شدید دچک دیا۔ اسے یاد آ گیا کہ وہ خون میں نہائی ہوئی لاشوں اور تڑپتے کراہتے ہوئے زخمیوں میں یوکلِس کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔

اُس کا ذہن کھلنے لگا یوکلِس کی لاش ایک مکان میں یوکلِس کی ماں کی لاش ... روزی کو یاد آ گیا یہی لاشیں دیکھ کر اسے کچھ ہوا تھا اور وہ خواب و خیال کی دنیا میں چلی گئی تھی، حقیقت سے تعلق ٹوٹ گیا تھا۔

وہ تو جذبات کی شدت تھی جس نے ذہنی طور پر اسے ماؤف کر دیا تھا۔ وہ پاگل تو نہیں ہو گئی تھی کہ اس کا ذہن حقیقت کو قبول ہی نہ کرتا۔ اب ایک اور دچک لگا کہ وہ حقیقی دنیا میں لوٹ آئی۔ ہر قل یاد آیا، یہ بھی کہ وہ ہر قل کے قتل کے ارادے سے نکل کھڑی ہوئی تھی پھر جنگل میں بھٹکنا اسے چڑیل سمجھ لیا گیا تھا۔ کوئی اس کے سامنے آ جاتا، اس سے خوفزدہ ہو جاتا تو اس سے روزی کھانے پینے کا سامان لے لیتی تھی۔ اس طرح وہ بھوک نہ رہی، پیاسی بھی نہ رہی۔

اسے وہ آدمی بھی یاد آ گئے جو اسے پیار اور شفقت سے بحری جہاز میں لائے تھے۔ تب اسے یاد آیا کہ وہ مصر کا نام لیتے تھے اسے یقین ہو گیا کہ وہ مصر میں ہے۔ یہ بھی یاد آ گیا کہ اسے نئے کپڑے پہنا کر دو عورتوں نے اسے زیورات پہنائے تھے۔ اسے شاید لگا گیا تھا کہ آؤ ہر قل کے قتل کو چلیں۔ وہ مسرور تھی کہ یوکلِس کے خون کا انتقام لے گی۔

روزی کو گزرے ہوئے دنوں کی باتیں یاد آ گئیں لیکن یہ کچھ دھندلی سی تھیں اور جو حقیقت اس کے سامنے آ گئی تھی وہ روشن تھی لیکن اسے اس سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا کہ اسے دریا میں کیوں دھکیلا گیا تھا۔



یوکلِس کی یاد نے اس کے آنسو تو نکل دیئے لیکن اب یہ صدمہ اتنا شدید نہیں تھا کہ پہلے کی طرح اس کے ذہن کو پھر ماؤف کر دیتا۔ اب اس کے ذہن میں بڑی خطرناک حقیقت آ گئی تھی۔ ایک یہ زیورات تھے جو بہت قیمتی تھے اور اس سونے سے زیادہ قیمتی

وہ خود تھی۔ نوجوان بھی تھی اور خوبصورت اتنی کہ اسے قیصرِ روم ہر قل دیکھ لیتا تو اپنے
حرم کی زینت بنالیتا۔

اپنے آپ کو تو وہ نہیں چھپا سکتی تھی، زیورات چھپائے جاسکتے تھے۔ اس نے بڑی
تیزی سے زیورات اتار لئے تاکہ ڈاکوؤں کے لئے کشش نہ رہے۔ پہلے اس نے سوچا کہ
یہ سارا سونا دریا میں پھینک دے لیکن اس خیال سے رکھ لیا کہ اس کے عوض کسی
مدد حاصل کر لے گی۔

زیورات کو چھپانے کے لئے اس کے لباس میں جیب نہیں تھی۔ اسے گاگرہ
پہنایا گیا تھا۔ پاؤں کے قریب سے اس نے گاگرے کا کچھ ٹکڑا پھاڑ لیا۔ زیورات اس میں
باندھ کر پوٹلی لباس کے نیچے باندھ لی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی۔ روز
نوجوانی کی عمر میں تھی۔ اس کی سوچوں پر نیند غالب آنے لگی۔ قریب ہی ایک درخت
تھا۔ وہ اس کے نیچے لیٹی اور نیند نے اسے خوابوں کی دنیا میں پہنچا دیا۔

○

آنکھ کھلی تو دن کی روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اپنے ارد گرد اسے کچھ
آدمیوں کا احساس ہوا۔ ہڑبدا کو وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی۔ وہاں تو بہت سے آدمی اس
کے ارد گرد کھڑے اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

”کون ہو؟“ — ایک آدمی نے پوچھا — ”یہاں کیوں پڑی ہو؟“
”سب کچھ بتاؤں گی“ — روزی نے کہا — ”مجھے کسی ایسے گھر لے چلو جس گھر
میں عورتیں ہوں۔ میں دھوکے میں یہاں تک پہنچی ہوں۔ میں دریا سے نکلے ہوں۔“
روزی نے دیکھ لیا تھا کہ مزدور سی قسم کے لوگ ہیں۔ بدکردار یا مجرمانہ ذہنیت کے
لوگ ہوتے تو اسے یوں خاموشی سے کھڑے دیکھتے نہ رہتے۔ وہاں زبان کا کوئی مسئلہ
تھا۔ مصر میں بھی عربی بولی جاتی تھی۔ لب و لہجے میں کچھ فرق تھا۔
”ہمارا بابا آ رہا ہے“ — ایک آدمی نے کہا — ”وہی بتاتے گا کہ تمہیں گھر لے جا
ہے یا کیا کرنا ہے.... تمہارا مذہب کیا ہے؟“

”میں عیسائی ہوں۔“

”پھر ڈرنا نہیں“ — اس آدمی نے کہا — ”ہم سب عیسائی ہیں.... قطعی عیسائی!“
”میں بھی قطعی ہوں“ — روزی نے ان لوگوں کے ساتھ رشتہ بپا کرنے کی نیت

سے جھوٹ بولا۔

ذرا ہی دیر بعد کسی نے اعلان کے انداز سے کہا — ”ہٹ جاؤ، بابا آ رہا ہے۔“
سب اس طرح پیچھے ہٹے کہ ایک طرف سے راستہ چھوڑ دیا۔ ایک معمر آدمی روزی کے
سامنے آیا۔ اس کے چہرے، لباس اور چلنے کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ اونچی حیثیت کا
فخض ہے۔ روزی کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک کے رہ گیا۔ ایسا چونکا کہ چند قدم دور ہی رک گیا
اور اس کے چہرے پر ایسی تبدیلی آئی جسے چھپایا نہیں جاسکتا تھا۔
”میں تمہیں اپنے گھر لے چتا ہوں“ — بابا نے کہا — ”وہاں میری بیوی ہے، دو
بیٹیاں اور ایک بہو ہے۔“

”میں ایسے ہی گھر جانا پسند کروں گی جہاں عورتیں ہوں“ — روزی نے کہا۔
بابا اسے ساتھ لے چلا۔ روزی نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ ایک طرف دریا نئے نیل
تھا۔ ساحل پر چھوٹی بڑی کشتیاں بندھی ہوئی تھیں۔ تھوڑی ہی دور آگے اور بھی بڑی
بادیوں والی کشتیاں کھڑی تھیں۔ لوگ ایک دو کشتیوں سے اتر بھی رہے تھے، سوار بھی
ہو رہے تھے۔ یہ تین تھا جہاں سے لوگ دریا کے پار یا دوسرے مقامات کو جاتے تھے۔
دریا سے اڑھائی تین فرلانگ دور ایک قصبہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں چھوٹے بڑے
جھونپڑے بھی تھے اور اچھی قسم کے بکے مکان بھی۔ یہ کشتی رانوں اور ماہی گیروں کی
آبادی تھی اور تمام تر آبادی عیسائیت کی پیروکار تھی۔ تین پر لوگوں کی آمد و رفت شروع
ہو گئی تھی۔

بابا کی حیثیت قبیلے کے سردار جیسی تھی۔ وہ عیسائیت کے قبلی فرقے سے تعلق
رکھتا تھا۔ اس فرقے میں بھی اسے سرداروں جیسا رتبہ حاصل تھا۔ وہ روزی کے ساتھ
بات کئے بغیر اسے اپنے گھر لے گیا اور ایک کمرے میں بٹھادیا۔ پھر گھر کی عورتوں کو بلایا
اور روزی سے کہا کہ وہ بیان کرے کہ اس پر کیا گزری ہے۔
روزی نے اسے تفصیل سے سنایا کہ وہ کس ذہنی حالت میں اظہار تک پہنچی پھر
مصر کے اس مقام تک کس طرح لائی گئی تھی۔

بابا خاموشی سے سنتا رہا۔ روزی بات سنا چکی تو اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اسے
نہلاؤ، کپڑے تبدیل کرو اور کھانا کھلاؤ.... اس نے روزی کے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑی
شفقت سے کہا کہ اس گھر کو وہ اپنا گھر سمجھے اور اسے اس کے ٹھکانے پر پہنچا دیا جائے گا۔

بابا ہر نکلا اور ایک آدمی کو دو تین نام بتا کر کہا کہ انہیں فوراً یہاں لے آئے۔

○

بابا کا مکان ایک کشادہ حویلی تھی جس سے بابا کی اونچی حیثیت کا پتہ چلتا تھا۔ وہ اس حویلی کے ایک اور کمرے میں بیٹھا تھا۔ وہ آدمی آگئے تھے جنہیں اس نے بلایا تھا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ سنا ہے ایک اکیلی لڑکی پکڑی گئی ہے۔

”وہ میرے گھر میں ہے“ — بابا نے کہا — ”میں نے اسی لئے تمہیں بلایا ہے۔ تم جانتے ہو گذشتہ رات نیل کو ایک لڑکی کی قربانی دی گئی تھی۔ وہ یہی لڑکی تھی۔ یہ دریا سے زندہ نکل آئی ہے۔ نیل نے ہماری قربانی قبول نہیں کی۔ اگل کر باہر پھینک دی ہے۔ نیل ہم سے ناراض ہے۔ اس کا ہمارا رک جائے گا یا اتنا سیلاب آئے گا کہ اناج کے فصل ہمالے جائے گا اور بستیاں غرق ہو جائیں گی۔ قحط پڑ جائے گا۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ گذشتہ رات مجھے بھی قربانی کی تقریب میں بلایا گیا تھا اور میں نے لڑکی کو دیکھا تھا۔ آج صبح مجھے اطلاع ملی کہ ایک لڑکی دریا کے کنارے سوئی ہوئی ہے جس کی حالت بتاتی ہے کہ دریا سے نکل ہے۔“

”ہمارے لئے کیا حکم ہے؟“ — ایک نے پوچھا۔

”یہ اسقف بتائے گا“ — بابا نے کہا — ”میں اس کے پاس جا رہا ہوں۔ تم میں سے کوئی ایک میرے ساتھ چلو۔ فیصلہ اسقف نے ہی کرنا ہے کہ اسی لڑکی کو پھر دریا کے سپرد کیا جائے یا کسی اور لڑکی کی قربانی دی جائے گی۔ میں ایک بات نہیں سمجھ سکا۔ قربانی کے وقت لڑکی کو خاصا زیور پہنایا گیا تھا۔ اب ایک چیز بھی اس کے جسم کے ساتھ نہیں۔ انگلی میں انگوٹھی بھی نہیں۔ میں نے اس سے اس لئے پوچھا نہیں کہ اسے یہ معلوم نہ ہو سکے کہ میں نے اسے قربانی سے پہلے دیکھا تھا۔ یہ تو اسے معلوم ہی نہیں کہ اسے دریا میں کیوں پھینکا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے اسے پتہ چل جائے کہ ایک بار پھر دریا میں پھینکا جائے گا تو یہ یہاں سے غائب ہو جائے گی۔“

بابا کو معلوم نہیں تھا کہ روزی عورتوں کو زیورات کھول کر دکھا رہی تھی اور کہا تھا کہ اسے جو کوئی اس کے ماں باپ کے پاس پہنچا دے گا اسے وہ یہ سارے زیورات دے دے گی۔

بابا ایک آدمی کے ساتھ اسقف (بڑے پادری) سے ملنے چلا گیا۔ وہ گھوڑوں پر تھے

تھے۔ اسقف کسی اور بستی میں رہتا تھا جو وہاں سے خاصی دور تھی۔ روزی رات کی تنہی باری نما کر اور کھانا کھا کر سو گئی۔

○

سورج غروب ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی جب بابا واپس آگیا۔ روزی ابھی تک سوئی ہوئی تھی۔ بابا نے بیوی کو بتایا کہ اسقف نے کہا ہے کہ آج ہی رات اس لڑکی کو پھر اُسی جگہ لے جا کر دریا میں پھینک دیا جائے اور اب اس کے ہاتھ باندھ کر پھینکا جائے تاکہ یہ تیر کر نکل نہ سکے۔

بیوی نے بابا کو بتایا کہ لڑکی کے پاس زیورات ہیں جو اس نے چھپا کر رکھے ہوئے تھے۔ بابا نے کہا کہ لڑکی کو فوراً تیار کرے، زیورات پہنا دے، اسے لے جانے والے آ گئے ہیں بیوی اُس کمرے میں جانے لگی جس میں روزی سوئی ہوئی تھی تو بابا نے کہا کہ اسے فوراً جگا دو۔

”ابھی جگا کر تیار کرتی ہوں“ — بیوی نے کہا — ”اس نے تو نیل کی آغوش میں ہمیشہ کی نیند سو جاتا ہے۔“

بابا کی بیوی نے یہ الفاظ روزی کے کمرے میں داخل ہو کر کہے۔ اُس وقت روزی جاگ اٹھی تھی اور اس نے یہ الفاظ سن لئے۔ یہ بوڑھی عورت روزی کو اٹھا کر تیار کرنے لگی تو روزی نے پوچھا کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ بیوی کو بابا نے بتایا تھا کہ لڑکی کو صحیح بات نہیں بتائی۔ پھر بھی اس نے کوئی ایسی بات کہہ دی جس سے روزی کو شک ہو گیا اور وہ بگڑ گئی۔

بابا کو بتایا گیا۔ وہ روزی کو ہسلانے پھسلانے اور درغلانے کے جتن کرنے لگا۔ بابا کو یہ خطرہ بھی نظر آ رہا تھا کہ یہ بات کھل گئی کہ روزی کو قربانی کے لئے لے جایا جا رہا ہے تو کسی سرکاری اہلکار یا افسر تک پہنچ جائے گی اور سب کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا جائے گا۔

بابا آخر معمر اور جہاندیدہ آدمی تھا۔ اس نے شفقت اور فریب کاری کا حربہ استعمال کیا۔ اسے کہا کہ وہ زیورات نہ پہنے۔ روزی کہتی تھی کہ یہ زیورات وہ اپنے پاس رکھے گی ہی نہیں نہ یہ اس کے ہیں۔

سورج غروب ہو گیا۔ روزی کو باہر لایا گیا۔ یہ خبر لوگوں تک پہنچ گئی تھی کہ صبح جو

لڑکی ملی تھی اسے رات نیل میں قربانی کے لئے پھینکا گیا تھا اور آج رات اسے بھر پھینکا جائے گا۔ اس کا ڈوب مرنا لازمی ہے ورنہ نیل ناراض ہو کر تباہی اور بربادی پھیلانے لگا۔ لوگ روزی کو دیکھنے کے لئے باہر کھڑے تھے۔ اس قصبے کی ساری آبادی قبطی عیسائیوں کی تھی۔ صرف قبطی عیسائی لڑکی کی قربانی دیتے تھے۔ وہ روزی کو ایک مقدس اور متبرک لڑکی سمجھ کر دیکھنا چاہتے تھے۔ انہیں یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ لڑکی کو قریب کاری سے لے جایا جا رہا ہے۔ روزی کو باہر لائے تو لوگ اس کے ہاتھ یا کپڑے کو عقیدت سے چومنا یا چھونا چاہتے تھے۔

”وہ آگئی“ — کئی آوازیں اٹھیں — ”قربانی والی لڑکی آگئی“۔

ایسی اور بھی بہت سی آوازیں تھیں جو روزی کے کانوں میں پڑیں۔ وہ سمجھ گئی کہ اسے دھوکے سے لے جایا جا رہا ہے۔ اس نے ان دو آدمیوں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا جن کے حوالے پایا نے اسے کیا تھا۔ وہ دونوں اسے بازوؤں سے پکڑ کر آگے کو چلانے لگے لیکن روزی نے اودھم مچا کر دیا۔ لوگ کچھ اور سمجھے تھے لیکن وہاں کچھ اور ہی متشابہن گیا۔

”اٹھالو“ — پایا نے حاکمانہ آواز میں کہا — ”اور کشتی میں پھینک کر لے جاؤ۔“ روزی بیٹھ گئی اور دونوں آدمی اسے اٹھانے لگے۔ روزی ان کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔

○

تین آدمی آگے بڑھے اور ان دونوں آدمیوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ ان تینوں میں سے ایک نے روزی کو اٹھنے کو کہا۔ روزی چیخ چلا رہی تھی۔ اس نے اس آدمی کو دیکھا تو وہ یوں چپ ہو گئی جیسے مر گئی ہو۔ اس کے چہرے کا رنگ روپ بالکل ہی بدل گیا اور اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ اس آدمی نے ان دونوں آدمیوں کو جو روزی کو اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے، دور پیچھے ہٹا دیا۔

”تم؟“ — روزی نے اس آدمی سے حیرت زدہ سرگوشی میں پوچھا — ”تم راہن ہی ہونا؟“

”راہن ہوا کرتا تھا“ — اس آدمی نے کہا — ”بھول گئی ہو میں کتنے عرصے سے راہن نہیں اولیس ہوں؟“

”تمہیں انتقام لینے کا بہت اچھا موقع مل گیا ہے“ — روزی نے کہا۔
 ”غفل باتیں مت کرو“ — ان تینوں میں سے ایک اور نے کہا — ”اگر زندہ بنا چاہتی ہو تو خاموشی سے ہمارے ساتھ چل پڑو۔“
 ”میرے دل میں تمہاری دشمنی تو نہیں“ — اولیس نے کہا — ”میں نے تمہاری بات کو زندہ رکھا ہوا ہے۔“
 ”اتنی باتوں کا یہ موقع نہیں اولیس!“ — تیسرا بولا — ”اسے ان لوگوں کے قبضے سے نکالو۔“

یہ باتیں سرگوشیوں میں ہو رہی تھیں۔
 ”اے قبطیو!“ — اولیس نے تماشاویوں سے مخاطب ہو کر اعلان کیا — ”یہ لڑکی دل کو خوش کرنے کے لئے اپنی جان دینے کو تیار ہے۔ یہ اُس جگہ تک ہمارے ساتھ لائے گی جہاں اسے لے جا رہے تھے۔“

”ٹھہرو!“ — پایا نے آگے بڑھ کر کہا — ”تم تینوں میرے لئے اجنبی ہو۔ میں دُش ہوں کہ یہ کارِ خیر تم نے اپنے ذمے لے لیا ہے لیکن میں اپنے اطمینان کے لئے ہمارے ساتھ اپنے دو آدمی بھیجوں گا۔“

اولیس اور اس کے ساتھیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
 ”دو نہیں، ہمارے ساتھ چھ آدمی بھیج دیں“ — اولیس نے کہا — ”ہم قبطی ہیں۔ قبطیوں کو دھوکہ نہیں دیں گے۔“

دو آدمی جو پہلے روزی کو گھسیٹ اور اٹھا رہے تھے، پایا کے کہنے پر اولیس اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ہو گئے۔ روزی پر تو اولیس نے جیسے جاو کر دیا تھا۔ کہاں وہ اتنی شدید مزاحمت کر رہی تھی کہاں وہ ان کے ساتھ بڑے آرام اور اطمینان سے جا رہی تھی۔ لوگ آگے بڑھ کر روزی کو چھوئے کی کوشش کر رہے تھے۔

جن پر درمیانہ سازگی ایک کشتی تیار کھڑی تھی۔ ملاح بھی تھا لیکن جو دو آدمی ساتھ جا رہے تھے وہ تھے تو اچھی حیثیت والے لیکن کشتی ران قبیلے کے آدمی تھے اس لئے کشتی ران کے ماہر تھے۔ کشتی دو بادبانوں والی تھی۔ انہوں نے ملاح سے کہا کہ وہ خود کشتی لے جائیں گے۔ ملاح کشتی سے ہٹ گیا۔

روزی، اولیس اور اس کے دونوں ساتھی کشتی میں سوار ہو گئے۔ پھر دونوں آدمی

کشتی میں گئے اور بادبان کھول دیئے۔ بابا نے کہا کہ وہ رات کو بروقت پہنچ کر قریب میں شامل ہو جائے گا۔

کشتی چل پڑی۔ اسے دریا کے بہاؤ کے مخالف رخ جانا تھا۔ ہوا تو تھی لیکن دریا کا بہاؤ تیز تھا اس لئے کشتی کی رفتار سست تھی۔ سورج غروب ہو گیا تھا۔ شام تاریک ہوتی جا رہی تھی۔ تین پیچھے ہٹا جا رہا تھا اور شام کے گہرے ہوتے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

○

تقریباً آدھا فاصلہ طے ہو گیا تھا۔ کشتی چلانے والے دونوں آدمی کشتی کے درمیان بیٹھ گئے تھے۔ اولیس اپنے دو ساتھیوں اور روزی کے ساتھ پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ تینوں نے خنجر نکال لئے۔ ان کا شکار تین چار قدم آگے بیٹھا ہوا تھا۔ تینوں اٹھے اور پیشتر اس کے کہ ان دو آدمیوں کو پتہ چلتا، خنجر اوپر سے نیچے آکر ان کے دلوں میں اتر چکے تھے۔ تینوں نے انہیں اٹھا کر دریا میں پھینک دیا۔

”اب کم روزی!“ — اولیس نے کہا — ”مجھ پر اعتبار آیا ہے یا کچھ شک ہے!“
 ”ہاں اولیس!“ — روزی نے کہا — ”میرے دل میں کوئی شک نہیں رہا لیکن مجھے لے جاؤ گے کہاں؟“

”شام.... حلب!“ — اولیس نے جواب دیا — ”تمہارے ماں باپ کے پاس.... ہم مسلمان ہیں روزی! ہم بھلائی چاہتے ہیں اور بھلائی کرتے ہیں۔“

”تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟“ — روزی نے پوچھا۔

”تجارت“ — اولیس نے کہا — ”ہمارا مال سکندریہ پڑا ہے۔ یہاں ہم ایک تاجر سے ملنے آئے تھے۔“

اولیس نے جھوٹ بولا تھا۔ ان تینوں کا تجارت کے ساتھ دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ تینوں اسلامی لشکر کے مجاہدین تھے اور ان کا تعلق جاسوسوں کے گروہ کے ساتھ تھا۔ اولیس جو ان سال آدمی تھا اور عیسائی ہوا کرتا تھا۔ دو اڑھائی سال پہلے وہ مسلمانوں کے خلاف کسی لڑائی میں شدید زخمی ہو گیا تھا۔ اس کا زندہ رہنا ممکن نہ تھا۔ اس کے اپنے ساتھیوں نے اسے نہ اٹھایا۔ اس پر آخری غشی طاری ہو رہی تھی۔

مجاہدین اپنے زخمیوں کو اٹھا رہے تھے۔ اولیس نے جو اُس وقت راہن ہوا کرتا تھا ایک مجاہد کے آگے ہاتھ جوڑ کر التجا کی کہ اسے بچالیں۔ مجاہد نے پہلے اسے پانی پلایا پھر

ی کو آواز دی اور خود چلا گیا۔ دو مسلمان عورتیں آئیں اور یہ دیکھنے کے باوجود کہ یہ سائی ہے اور اپنا دشمن ہے، اولیس کو اٹھا کر وہاں لے گئیں جہاں زخمی مجاہدین کی مرہم ہورہی تھی۔

دو تین دنوں بعد اولیس پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا۔ کچھ دن اور گزرے تو وہ اپنے پھرنے لگا۔ وہ مسلمانوں کے حسن سلوک سے بہت ہی متاثر ہوا۔ کسی نے اسے ٹھن اور غیر مسلم سمجھا ہی نہیں۔ اصل بات تو یہ تھی کہ دو مسلمان عورتیں اسے موت کے منہ سے نکال لائی تھیں۔ اس کے اپنے ساتھیوں نے دیکھ کر اسے نہیں اٹھایا تھا کہ یہ مر رہا ہے۔

وہ جب پوری طرح صحت یاب ہو گیا تو اس کی حیثیت جنگی قیدی کی تھی لیکن سالار کے حکم سے اسے آزاد کر دیا گیا۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ اس نے خود درخواست کی کہ اسے اپنے پاس اٹھالے چلیں۔ اب اسے آزاد کر دیا گیا تو اس نے اپنی زندگی کا بہت بڑا فیصلہ کر لیا۔ اس نے کہا کہ وہ واپس نہیں جائے گا اور وہ اسلام قبول کرنا چاہتا ہے۔ اسے سالار کے پاس لے گئے۔ سالار امام بھی ہوا کرتا تھا۔ اس نے اولیس کو حلقہ بخش اسلام کر لیا اور اس کا نام اولیس رکھا۔ وہ حلب کا رہنے والا تھا۔

روزی اولیس کے قبیلے کی لڑکی تھی۔ اسے اولیس اتنا اچھا لگتا تھا کہ اس کے دل میں یہ خوبرو جوان محبوب کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اولیس کی روزی کے ساتھ جذباتی وابستگی کا یہ عالم تھا کہ روزی اس کی روح میں اتر گئی تھی لیکن انقلاب یہ آیا کہ روزی کو یوگلس مل گیا اور جس طرح اسے یوگلس ملا وہ پہلے تفصیل سے ایک باب میں بیان ہو چکا ہے۔ اولیس نے اس دوران اسلام قبول کر لیا۔

اولیس کو پتہ چلا کہ روزی ایک رومی جرنیل کے بیٹے پر فریفتہ ہو گئی ہے تو اولیس نے اس سے بے وفائی کا شکوہ کیا۔ روزی نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اسلام قبول کر چکا ہے اور اس نے اپنے مذہب سے بے وفائی کی ہے اس لئے اس کے ساتھ وہ کوئی تعلق نہیں رکھے گی۔

اولیس نے کہا کہ وہ بھی کسی جرنیل کا بیٹا ہوتا تو روزی اس سے قطع تعلق نہ کرتی۔ اس بات پر اولیس اور روزی میں تلخ کلامی ہو گئی۔ روزی اسے کہتی تھی کہ وہ اپنے مذہب کو واپس آجائے۔ اولیس نے کہا کہ مسلمانوں نے اسے نئی زندگی دی ہے اور اسے پہلی

بارپتہ چلا ہے کہ مسلمانوں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا ہے یہ اسلام کے احکامات ہیں جو اس مذہب کی تعلیمات میں شامل ہے.... اس کے بعد روزی یوگلکس کی ہو کے رہ گئی۔

○

اولیں مجاہدین کے لشکر میں شامل ہو گیا۔ تھوڑے سے ہی وقت میں اس نے اپنے اوصاف سب پر عیاں کر دیئے۔ وہ پرجوش اور جذبہ جملہ سے سرشار مجاہد ہی نہیں تھا، شہسواری، تیغ زنی، برہمچی بازی اور تیراندازی میں خصوصی طور پر ماہر تھا۔ پھر اس کا یہ وصف کھل کر سامنے آ گیا کہ اس میں وہ ذہانت بدرجہ اتم موجود ہے جو دشمن ملک میں بھیجے جانے والے جاسوسوں اور تخریب کاروں کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ ایسے دیگر اوصاف بھی اس میں موجود تھے۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سپہ سالار حضرت عمرو بن عاص پر مصر کی فتح کا جنون طاری تھا۔ انہوں نے ہر پہلو سے دلائل دے کر امیر المومنین حضرت عمرؓ کو قائل کر لیا تھا کہ انہیں مصر پر فوج کشی کی اجازت دی جائے۔ صحابہ کرام اس تجویز کی مخالفت کر رہے تھے۔ ان کے متفقہ مشورے سے حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ شام کے تمام تر سرکاری انتظامات اور امور کو رواں اور دفاع کو مستحکم کر لیا جائے تو مصر پر حملے کی اجازت دے دی جائے گی۔

عمرو بن عاص شام کے ساتھ عراق کے بھی دفاع کے لئے ضروری سمجھتے تھے کہ مصر پر فوراً چڑھائی کر دی جائے۔ جواز یہ پیش کرتے تھے کہ قیصر روم ہرقل کی فوج شام سے بہت بُری شکست کھا کر بھاگی ہے اور بکھر گئی ہے۔ خود ہرقل کو کوئی جائے پناہ نہیں مل رہی تھی۔ یہ شکست خوردہ اور خوفزدہ فوج مصر جا پہنچی ہے اور اس کی آدمی سے زیادہ نفری ماری گئی ہے۔ اگر اس فوج پر فوراً حملہ نہ کیا گیا تو ہرقل اور مصر میں اس کا جرنیل اطربون اس فوج کو لڑنے اور جوابی حملہ کرنے کے قابل بنالیں گے۔ اسے ستانے اور سنبھالنے کا موقع نہ دیا جائے۔ آدمی سے زیادہ فوج ماری گئی تھی۔

حضرت عمرؓ بہت ہی محتاط رویہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ عمرو بن عاص مصر کے سیاسی مذہبی اور معاشرتی حالات سے بڑی اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے اپنے طور پر دو جاسوس مصر بھیج کر مصر کے داخلی امور کے متعلق تفصیلی رپورٹ حاصل کر لی تھی۔ عمرو بن عاص نے امیر المومنین سے خاص طور پر کہا تھا کہ عیسائیت چار فرقوں میں

بٹ گئی تھی.... قطبی، یعقوبی، ملکانی اور ہرقل نے ایک فرقہ سرکاری بنا ڈالا تھا۔ پہلے تفصیل سے بیان ہو چکا ہے کہ ہرقل نے عیسائیت سے فرقے ختم کر کے ایک سرکاری عیسائیت بنا ڈالی اور حکم نامہ جاری کر دیا تھا کہ یہ صحیح عیسائیت ہے اور اس سے اختلاف سنگین جرم ہے۔ دوسرے فرقوں نے اس سرکاری مذہب کو ایک فرقہ قرار دے کر اسے قبول نہ کیا۔ ہرقل نے غیر انسانی تشدد کے ذریعے اپنا سرکاری مذہب منوانے کا حکم دے دیا اور قیصر نام کے ایک بڑے ہی ظالم اور درندہ صفت پادری کو استقف مقرر کر کے اسے ظلم و تشدد اور ایذا رسانی کے وسیع اختیارات دے دیئے۔

عیسائیوں کا سب سے بڑا فرقہ قطبی تھا۔ قطبی عیسائیوں نے ہرقل کی سرکاری عیسائیت کے خلاف محاذ بنالیا اور قیصر کے وحشیانہ مظالم کا نشانہ دس گیارہ سال بنے رہے تھے۔ عمرو بن عاص نے امیر المومنین حضرت عمرؓ سے کہا تھا کہ قطبیوں کی مدد کو پہنچنا ہمارا فرض ہے۔

○

عمرو بن عاص نے دیکھا کہ امیر المومنین مصر پر فوج کشی کے لئے آمادہ تو ہو گئے ہیں لیکن یہ معلوم نہیں وہ کب حملے کا حکم دیں تو انہوں نے اپنا ایک پلان بنالیا۔ انہیں یہ خطرہ نظر آرہا تھا کہ رومی فوج جو شام سے بہت بُری حالت میں بھاگی تھی، اسے اس کے جرنیل پھر منظم کر کے مزید فوج تیار کر لیں گے اور ہرقل شام پر جوابی حملہ کرے گا۔

انہوں نے اس کا تذکرہ یہ سوچا کہ جس طرح الجوزیرہ کے عیسائیوں نے مسلمان فاتحین کے خلاف بغاوت کر دی تھی اسی طرح مصر میں بغاوت کرائی جائے۔ ایک روز انہوں نے اپنے ماتحت سالاروں کو مشورے کے لئے طلب کیا اور انہیں اس صورت حال سے آگاہ کر کے بتایا کہ ان کا پلان کیا ہے۔

”مصر کے قطبی عیسائیوں کو ہرقل اور اطربون کے خلاف اکسایا جاسکتا ہے۔“ عمروؓ نے کہا۔ ”وہاں سب سے زیادہ مظلوم اور ہرقل کے قہر کا شکار قطبی ہو رہے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے وہ بغاوت کی ہمت نہ رکھتے ہوں۔“ ایک سالار نے کہا۔ ”انہیں اپنے زیر اثر لیا جاسکتا ہے اور تیار کیا جاسکتا ہے کہ ہم مصر پر حملہ کریں تو قطبی ہمارا ساتھ دیں اور وہ قطبی جو رومی فوج میں ہیں وہ بے دلی سے لڑیں اور بھاگ نکلیں۔“

اولیس اور اس کے ساتھی یہ جانتے تھے کہ کشتی کا رخ بدلنے اور موڑنے کے لئے اس کے پیچھے ایک بڑا چٹو موجود ہے۔ ان میں سے ایک نے اس چٹو کو ایک طرف موڑا۔ کشتی تو کنارے کی سمت مڑ گئی لیکن بادبانوں کی پوزیشن کو بھی اس کے مطابق ذرا دائیں بائیں کرنا تھا۔

کشتی کا رخ بدلنے سے ہوا کا رخ بدل گیا۔ اس وقت ہوا زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ ان تینوں کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ بادبان گرائے یا لپیٹے کس طرح جاتے ہیں۔ ہوا اور بادبانوں نے کشتی کو ایک پہلو سے اٹھا دیا اور اس کا دو سرا پہلو پانی کے اندر چلا گیا۔ پانی بڑی تیزی سے کشتی میں آ گیا۔

”لڑکی کو سنبھالو اولیس!“ — ایک مجاہد نے گھبرا کر کہا۔
 ”میری فکر نہ کرو“ — روزی نے کہا — ”میں تیر سکتی ہوں۔ ایک بار اس دریا سے نکل چکی ہوں۔“

انہیں کچھ اور کہنے سننے کی مہلت نہ ملی۔ بادبانوں نے ہوا کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے کشتی کو الٹ دیا اور چاروں دریا میں جا پڑے۔ وہ سب تیر جانتے تھے کنارے کی طرف تیرنے لگے۔ اولیس روزی کو پکار رہا تھا۔ روزی بے خوف و خطر کنارے کی طرف تیرتی جا رہی تھی.... چاروں کنارے تک پہنچ گئے۔

نیل نے اپنی قریبی ایک بار پھر اگل دی۔ اس کا ہواؤ قریبی نہ ملنے سے رکا نہیں.... نیل بہتا رہا!

○

اب مسئلہ یہ تھا کہ روزی کو کہاں چھپائیں اور اسے شام تک کس طرح پہنچائیں۔ یہ ان کے فرائض میں شامل نہیں تھا لیکن اولیس نے روزی کو بچانے اور شام تک پہنچانے کا فرض اپنے سر لے لیا تھا۔ یہ تینوں دراصل قبلی عیسائیوں کے اسقف بنیامین کے پاس جا رہے تھے۔

بعض تاریخ نویسوں نے بنیامین کا نام ابو میامین لکھا ہے لیکن مستند مؤرخوں نے متفقہ طور پر بنیامین کو صحیح نام کہا ہے۔

بنیامین کسی بستی میں نہیں رہتا تھا بلکہ ایک مقام قوص سے کچھ دور ایسے ریگستان میں رہتا تھا جسے نیلیوں اور نشیب و فراز نے دشوار گزار بنا رکھا تھا۔ عوام جو ہر قل کی

عمرو بن عاص نے سالاروں سے کہا کہ انہیں تین یا چار ایسے مجاہدین کی ضرورت ہے جو مصر جائیں اور قبیلوں میں گھل مل کر انہیں ہر قل کے خلاف تیار کریں۔
 جاسوسی کا محکمہ موجود تھا لیکن اس کام کے لئے خاص قسم کے افراد کی ضرورت تھی۔ سالاروں نے دو مجاہدین کو منتخب کر لیا۔ انہی دنوں اولیس اپنے خصوصی اوصاف کا وجہ سے نام پیدا کر رہا تھا۔ اسے بھی اس مہم کے لئے الگ کر لیا گیا اور تینوں کو عمرو بن عاص کے حوالے کر دیا گیا۔ عمرو بن عاص نے انہیں اپنے پاس رکھ لیا اور انہیں اس مہم کے لئے تیار کرنے لگے۔

چند دنوں بعد انہیں مصر روانہ کر دیا گیا۔ وہ تاجروں کے بہروپ میں وہاں گئے تھے۔ ایک مہینے کے اندر اندر انہوں نے دو تین عیسائیوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کر لئے اور ان عیسائیوں نے انہیں رہنے کو اپنے ہاں جگہ دے دی تھی۔

○

اب وہ اسی سلسلے میں کہیں جا رہے تھے کہ اولیس نے روزی کو دیکھ لیا۔ روزی کو جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اولیس اور اس کے ساتھی اس کی طرف توجہ ہی نہ دیتے۔ اولیس سے رہا نہ گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ اس لڑکی کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے اور وہ حیران ہے کہ یہ یہاں کس طرح پہنچ گئی ہے۔

اولیس نے تماشائیوں سے معلوم کر لیا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ تماشائیوں نے بتایا کہ اس لڑکی کو نیل کی قریبی کے لئے لے جا رہے ہیں اور یہ جانیں رہی۔ اولیس اور اس کے ساتھیوں نے ساری معلومات حاصل کر کے طے کر لیا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ تینوں خصوصی ذہانت کے مالک تھے اور اداکاری کے ماہر تھے۔ وہ قبلی عیسائیوں کے بہروپ میں آگے بڑھے اور ان دو آدمیوں سے جا ملے جو روزی کو لے جا رہے تھے۔

ان کی یہ کوشش کامیاب رہی۔ انہوں نے دونوں آدمیوں کو قتل کر کے دریا میں پھینک دیا۔ وہاں دریا زیادہ چوڑا تھا اور کشتی دریا کے وسط میں جا رہی تھی۔ کشتی کو کنارے لگانا اور وہاں سے غائب ہو جانا تھا مگر اس وقت تک عربوں میں یہ کمزوری موجود تھی کہ کشتی رانی کے فن سے ناواقف تھے۔ دجلہ اور فرات میں چٹوؤں والی کشتی چلا سکتے تھے۔ تمام مجاہدین چٹو مار سکتے اور کشتی کا رخ بھی بدل سکتے تھے لیکن بادبانوں کے صحیح استعمال سے ناواقف تھے۔

اس کا اصل حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا اور اسے لوگوں پر مسلط کرنے کا شاہی فرمان جاری کر دیا۔ عیسائیت کے علماء نے تو اسے قبول کرنا ہی نہیں تھا، عوام نے بھی اسے قبول نہ کیا۔ ہرقل نے ایک بڑے پادری قیرس کو وسیع اختیارات دے دیئے کہ وہ جبری طور پر یہ مذہب لوگوں پر مسلط کرے۔

قیرس نے سکندریہ میں ایک مذہبی اجتماع منعقد کیا اور اپنے سرکاری مذہب کی تبلیغ کی۔ بیت المقدس امیر المومنین حضرت عمرؓ کے حوالے اور اپنی شکست کے معاہدے پر دستخط کرنے والا استغفر اعظم صفریوس سکندریہ میں موجود تھا۔ اس نے قیرس کو الگ بٹھا کر دلائل سے بھی اور منت سماجت سے بھی قائل کرنے کی کوشش کر ڈالی کہ وہ عیسائیت کو آسمانی کتاب انجیل کے مطابق رہنے دے لیکن قیرس کے دل میں خدا کا نہیں ہرقل کا خوف تھا، اور پھر ہرقل نے اسے لوگوں کی جانیں لینے تک کے جو اختیارات دے دیئے تھے انہوں نے اسے فرعون بنادیا تھا۔

صفریوس تو تاریخ کے کسی تاریک گوشے میں جا گم ہو گیا، بنیامین ہرقل اور قیرس کے خلاف میدان میں اتر آیا۔ ایلفرڈ بٹلر لکھتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں بنیامین کی محبت بھی تھی، تعظیم و تکریم بھی۔ وہ دانشمند اور اپنے مذہب کا عالم تھا۔ مذہب کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرتا تھا۔

ہرقل نے اس کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ بنیامین کے پاس کوئی جنگی طاقت نہیں تھی پھر بھی اس نے عیسائیت کے دفاع کا فیصلہ کر لیا اور روپوش ہو گیا۔ سکندریہ سے کچھ دور ایک صحرائی بستی قوص ہوا کرتی تھی۔ بنیامین اس سے کچھ دور دشوار گزار صحرائیں چلا گیا اور وہاں گر جا ہلایا۔ اس کا خفیہ رابطہ اپنے کارندوں کے ساتھ تھا جو تبلیغ کرتے پھرتے اور لوگوں کو بنیامین کی ہدایت دیتے رہتے تھے۔ اس طرح بنیامین روپوش ہوتے ہوئے بھی لوگوں میں موجود اور سرگرم رہا۔

قیرس کو بنیامین کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ اس نے بنیامین کے بڑے بھائی کو گرفتار کر لیا۔ تاریخ میں اس بھائی کا نام نہیں ملتا۔ قیرس کو معلوم تھا کہ بنیامین کے مشن کو اس کا یہ بھائی چلا رہا ہے۔ اسے لگایا کہ وہ ہرقل کی عیسائیت قبول کر لے اور اپنے بیٹوں کا رد کو یہ عیسائیت قبول کرنے کو کہے۔

سرکاری عیسائیت کو قبول نہیں کرتے تھے، بنیامین کو اپنا روحانی پیشوا مانتے تھے۔ ہرقل نے قیرس کو بنیامین کے قتل کی اجازت دے دی تھی۔ بنیامین کو بروقت پتہ چل گیا اور فرار ہو گیا۔

یہ عمرو بن عاص کے ان تین جاسوسوں کا کمال تھا کہ انہوں نے بنیامین کا ٹھکانہ معلوم کر لیا تھا۔ یہ اپنے آپ کو کٹر قبطی ظاہر کرتے تھے اور قبطی عیسائیوں کے گرجوں میں بھی جاتے اور ان کی طرح عبادت کرتے تھے۔

یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اوہیں اپنے اصل فرائض اور مشن کو چھوڑ کر روزی کو اس کے ماں باپ کے حوالے کرنے کے لئے ملک شام کو چلا جاتا لیکن روزی کو ساتھ بھی نہیں رکھا جاسکتا تھا اور اسے تنہا بھی نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ تینوں نے اس مسئلے پر تبادلہ خیالات کیا۔

”کیوں نہ اسے اپنے ساتھ ہی لے چلیں“ — ان تین جاسوسوں کے امیر (کمانڈر) نے کہا — ”اور یہ ظاہر کر کے کہ یہ بھی قبطی ہے“ اسے بنیامین کے حوالے کر دیں گے اور اسے کہیں گے کہ اس لڑکی کو طلب پہنچا دے۔“

”اسے پتہ چل گیا کہ اس لڑکی کو نیل کی قربانی سے فرار کرایا گیا ہے تو....“

”یہ خطرہ دل سے نکال دو“ — امیر نے کہا — ”میرے کانوں میں یہ بات پڑی تھی کہ بنیامین اس قربانی کو گناہ سمجھتا ہے لیکن ابھی اس لئے خاموش ہے کہ قبیلوں کی غالب اکثریت اس قربانی کو برحق مانتی ہے۔“

انہیں یہ معلوم تھا کہ وہ کہاں ہیں اور بنیامین کا ٹھکانہ کہاں اور کتنی دور ہے۔ دریا کے کنارے زیادہ دیر رکے رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ وہ اُس طرف چل پڑے جہاں بنیامین کا ٹھکانہ تھا۔ صبح تک انہیں بہت دور نکل جانا چاہئے تھا۔

بنیامین ہی ان مسلمان جاسوسوں کے کام کا آدمی تھا۔ انہوں نے بنیامین کے متعلق تمام ضروری معلومات حاصل کر کے اس کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ تفصیلات تاریخ کے دامن میں محفوظ ہیں۔ مشہور تاریخ دان ایلفرڈ بٹلر نے یہ تفصیلات اپنی انگریزی زبان کی کتاب — ”مصر میں عربوں کی فتوحات“ — میں یکجا کر دی ہیں۔

یہ تفصیلات مختصراً اس طرح ہیں کہ ہرقل نے عیسائیت کو سرکاری شکل دے کر

بڑے بھائی نے صاف انکار کر دیا اور کہا وہ خدا کا حکم مانے گا، کسی انسان کا نہیں۔ ہرقل صرف سلطنتِ روم کا بادشاہ اور ایک گناہ گار بندہ ہے۔ اصل بادشاہ خدا ہے، اس دنیا کا بھی اور اگلے جہان کا بھی۔

قیس کے حکم سے بنیامین کے بڑے بھائی پر جو تشدد کیا گیا، اس کی تفصیلات ایلنڈو بلٹرنے بیان کی ہیں۔ اسے برہنہ کر کے فرش پر لٹا دیا گیا اور اس کے جسم پر مشطیں رکھ دی گئیں۔ ذرا تصور میں لائیں کہ مشعلوں کے شعلوں نے اس کے جسم کو کس طرح جلایا ہو گا۔

”کو قیصر روم شاہ ہرقل کا مذہب سچا ہے“ — اسے کہا گیا — ”اور یہ کہ باقی سب جھوٹے ہیں۔“

”لغت اُس پر جو ہرقل کے مذہب کو سچا سمجھتا ہے“ — بنیامین کے بھائی نے کہا — ”سچا مذہب انجیل کا ہے۔“

تاریخ میں لکھا ہے کہ اس کے دونوں پہلوؤں سے چربی پکھل پکھل کر فرش پر بہ رہی تھی۔ مشطیں ہٹا کر اس سے کہا گیا کہ وہ انتہائی بتادے بنیامین کہاں ہے۔ ”اگر مجھے معلوم ہے تو بھی نہیں بتاؤں گا“ — اس نے جواب دیا۔

اس کا ایک دانت اکھاڑ کر پھر پوچھا بنیامین کہاں ہے۔ اس نے پھر وہی جواب دیا۔ اس کا ایک اور دانت اکھاڑ کر پے پھینک دیا گیا۔ پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا کہ اسے ہرقل کی سرکاری عیسائیت تسلیم کرنے کو کہتے تو وہ انکار کر دیتا۔ اس کا ایک دانت اوزار سے پکڑ کر اکھاڑ دیا جاتا۔ پھر پوچھتے بنیامین کہاں ہے۔ وہ نہ بتاتا تو اس کا ایک دانت کھینچ کر نکال دیا جاتا۔ اس طرح اس کے تمام دانت نکال دیئے گئے اور اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔

اس کے عقیدے اور جذبے کی پختگی کا یہ عالم کہ ابھی تک ہوش میں تھا۔ اس کے بعد اسے تین بار کہا گیا کہ وہ ہرقل کی عیسائیت کو تسلیم کرے۔ اس نے تینوں بار انکار کیا۔ قیس کے حکم سے اسے سمندر میں پھینک دیا گیا اور وہ ڈوب کر مر گیا۔

○

ایلنڈو بلٹرنے ایک اور پادری سیموئیل کا واقعہ بیان کیا ہے۔ یہ پادری بھی بنیامین کا پیروکار تھا اور اس نے محرمات میں کہیں گرجا بنا رکھا تھا۔ وہ قبطی تھا اور ہرقل کے مذہب

خلاف محاذ قائم کئے ہوئے تھا۔ قیس نے اس کے نام ایک پیغام لکھا جس میں اسے بتایا کہ وہ ہرقل کا سرکاری مذہب قبول کر لے۔ یہ پیغام ایک فوجی افسر لے کر گیا جس کے ساتھ ایک سوپاہی تھے۔ اس نے پیغام سیموئیل کو دیا۔

”ہمارا سردار بنیامین کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا“ — سیموئیل نے پیغام پھاڑ کر پٹختے ہوئے کہا — ”لغت خدا کی ان پر جنہوں نے یہ پیغام بھیجا ہے۔ لعنت اس رومی لعنت پر جس نے ہم پر جھوٹا مذہب ٹھونسا ہے۔“

پیغام لے جانے والے فوجی افسر کو قیس نے تمام حکم دے دیئے تھے۔ سیموئیل نے پیغام پھاڑ کر تو بین آمیز الفاظ کہے تو فوجی افسر نے اسے گرفتار کر لیا۔ اس کے بازو پیٹھ پیچے باندھ دیئے گئے۔ فوجی افسر گھوڑے پر سوار تھا۔ سیموئیل پیدل جا رہا تھا۔ اسے پری طرح ذلیل و رسوا کرنا مقصود تھا۔ لوگ اسے دیکھنے کے لئے اکٹھے ہو گئے۔

”اے لوگو!“ — سیموئیل نے بڑی ہی بلند اور جاندار آواز میں کہا — ”میں آج ات خوش ہوں۔ آج حضرت عیسیٰ کی ناموس اور صداقت پر میرا خون بنے گا۔ اے لوگو! اپنے مذہب کی سچائی کو مانو۔ کسی بادشاہ سے نہ ڈرو“ — اس نے قیس کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔

فوجی اسے مارتے پٹیتے ہوئے قیس کے پاس اس حالت میں لے گئے کہ اس کے سر در چند اور جگہوں سے خون بہہ رہا تھا۔ قیس نے فوجیوں کو حکم دیا کہ اس کی اور پٹائی کی بائیں تاریخ شاہد ہے کہ اسے اس قدر پٹیا گیا کہ اس کے کپڑے خون سے لال ہو گئے۔ ”اوبد بخت پادری!“ — قیس نے سیموئیل سے کہا — ”تجھے کلیسا کا سربراہ کس نے بنایا ہے اور تجھے یہ اختیار کس نے دیا ہے کہ تیرے ماتحت پادری اور پیروکار میرے خلاف میرے مذہب کے خلاف تبلیغ کرتے پھریں؟“

”اوبے مذہب دجال“ — سیموئیل نے گرجتی آواز میں کہا — ”نیک خدا کی عبادت اور بنیامین کی اطاعت اور پیروی میں ہے۔ تو ایلیس کی اولاد ہے۔ تیری اور تیرے مذہب کی اطاعت گناہ ہے۔“

قیس نے حکم دیا کہ اس کے منہ پر اتنے کتے مارے جائیں کہ اس کا منہ سوچ جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔

”اب جواب دے“ — قیس نے پوچھا — ”تو مصر کے حاکم اور مذہبی پیشوا کا حکم

کیوں نہیں جانتا؟ کیا تو نہیں جانتا کہ تیری زندگی اور موت میرے ہاتھ میں ہے؟“
 ”کیا تو ابلیس کو نہیں جانتا.... اے قیرس!“ — سیموئیل نے شدید زخمی حالت میں بھی بلند آواز میں کہا — ”ابلیس ملائکہ کا سردار تھا لیکن غرور اور تکبر نے اسے خدا کا حکم ماننے سے روک دیا۔ خدا نے اسے لعنتی قرار دے دیا۔ اے قیرس! تو ابلیس سے بڑھ کر لعنتی ہے۔“

قیرس نے حکم دیا کہ اسے باہر لے جا کر اس کا سر اڑا دو.... اس حکم کی تعمیل ہونے والی تھی کہ ایک حاکم اعلیٰ جس کا تاریخ میں نام نہیں لکھا گیا، اُدھر آ نکلا۔ اس نے سیموئیل کی جان بخشی کر دی اور اسے ملک بدر کر دیا۔



قیرس کے ظلم و تشدد اور قتل و غارت گری کی یہ دو ہی مثالیں کافی ہیں۔ عمرو بن عاص کا پلان یہ تھا کہ مصر کے عیسائیوں کو ہر قل کے خلاف بغاوت پر اکسایا جائے لیکن وہاں صورت حال یہ تھی کہ مصر کے لوگوں کے دلوں میں ہر قل کی نفرت پیدا ہو چکی تھی جو روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور یہ آتش فشاں کسی بھی وقت پھٹ سکتا تھا۔ عمرو بن عاص یوں زمین ہموار کر لینا چاہتے تھے کہ وہ مصر پر حملہ کریں تو عیسائی ان کا ساتھ دیں یا اتنا ہی کریں کہ ہر قل کے لئے جنگی طاقت نہ بنیں۔

اُدھر مای گیروں اور ملاحوں کی بستی کا سردار بابارات کو قربانی والی جگہ کی طرف کشتی میں روانہ ہوا۔ دریائی راستہ چھوٹا تھا۔ دریا کا رخ اُدھر ہی تھا جدھر سے سردار کی کشتی جا رہی تھی۔ آدھا فاصلہ طے ہو گیا تو آگے سے ایک الٹی ہوئی کشتی بستی آرہی تھی۔ اس کے بادبان ساتھ ساتھ تیر رہے تھے۔ یہ کشتی سردار کی کشتی کے قریب سے گزری۔ اندھیرے میں اتنا ہی پتہ چل سکتا تھا کہ یہ کشتی ہے۔ یہ دیکھنا ممکن نہیں تھا کہ یہ کشتی کس کی ہے۔ انہیں بتانے والا کوئی نہ تھا کہ ان کے اپنے آدمیوں کی کشتی ہے اور ان کی قربانی ایک بار پھر غائب ہو گئی ہے۔

قربانی والی جگہ پہنچے تو ایک پادری اور چند ایک سرکردہ افراد پہلے ہی پہنچے ہوئے تھے۔ انہوں نے مای گیروں اور کشتی رانوں کے پیاسے پوچھا لڑکی کہاں ہے؟ اس نے حیرن سا ہو کے بتایا کہ اسے پانچ آدمیوں کے ساتھ پہلے ہی بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں تو ماتم جیسی کیفیت پیدا ہو گئی۔ بابائے کہا کہ انہوں نے ایک بادبانی کشتی اٹلی

جتی دیکھی ہے لیکن دونوں کشتی ران پرانے تجربہ کار تھے۔ کشتی کسی وجہ سے الٹ ہی مٹی تھی تو وہ بچ کر نکل آتے۔ لڑکی بھی تیرا ک تھی۔
 ”کشتی میں تین آدمی اجنبی تھے“ — بابائے بتایا — ”وہ نہ ہوتے تو لڑکی کو قربانی کے لئے تیار کرنا ناممکن ہو جاتا۔“

”نیل کو اس لڑکی کی قربانی قبول نہیں“ — پادری نے کہا — ”نیل کے عتاب سے بچنا ہے تو اُسی لڑکی کی قربانی دینی پڑے گی جسے پہلے منتخب کیا گیا تھا.... ہوریشش کی بیٹی.... اسے ابھی لا کر دریا میں پھینک دیا جائے۔“

پچھلے باب میں بیان ہو چکا ہے کہ اپنی بیٹی کو قربانی سے بچانے کے لئے ہوریشش نام کا ایک آدمی اظہارِ کیم سے روزی کو دھوکے سے مصر لے گیا اور اسقف کے آگے یہ جھوٹ بولا تھا کہ اس کے باپ نے اپنی بیٹی کو نیل کی قربانی کے لئے بھیجا ہے۔

پادری نے کہا کہ ہوریشش کو ابھی جگا کر کہا جائے کہ اپنی بیٹی ساتھ لے کر آجائے.. ہوریشش بیٹی کو لے کر آ گیا۔ اس نے پادری کو بتایا کہ اس نے اپنی بیٹی کے سارے زیورات اُس لڑکی کو پہنا دیئے تھے جو لاپتہ ہو گئی تھی اور اب اپنی بیٹی کو پہنانے کے لئے زیورات کی کوئی ایک چیز نہیں۔ اس نے یہ بات اس امید پر کہی تھی کہ اس کی بیٹی بچ جائے گی لیکن پادری نے کہا کہ زیورات اتنے اہم نہیں، قربانی ایک جسم کی دی جاتی ہے اور جسم ایک کنواری لڑکی کا ہونا لازمی ہے۔

پادری کا حکم ٹالا نہیں جاسکتا تھا۔ اسی لڑکی کو گھر سے لا کر دریا میں پھینک دیا گیا جسے بچانے کے لئے لڑکی کا باپ روزی کو دھوکہ دے کر لے گیا تھا۔



اُس وقت روزی نیل سے بہت دور نکل گئی تھی۔ اویس اور اسکے ساتھی کوئی ایسے مسافر تو نہیں تھے جن کے پاس نہ پیسہ ہو نہ کوئی اور وسیلہ۔ وہ جاسوس تھے۔ ان کے پاس رقم بھی تھی عقل بھی تھی۔ انہوں نے کرائے کے اونٹ لے لئے اور قوص جاپہنچے۔

قوص اُن عیسائیوں کا مرکز تھا جو ہر قل اور قیرس کی عیسائیت کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ یہاں بھی ان تینوں نے اپنے آپ کو عیسائی ظاہر کیا۔ انہوں نے روزی کو اس طرح چادر میں لپیٹا ہوا تھا کہ اس کا چہرہ تھوڑا سا ہی دکھائی دیتا تھا۔

اونٹوں نے انہیں جلدی ہی قوص پہنچا دیا تھا۔ شام گہری ہو گئی تھی۔ انہیں رات

وہیں گذارنی تھی۔ وہاں سرائے موجود تھی۔ وہ سرائے میں چلے گئے۔ کھانے کے بعد باتیں کرنے بیٹھ گئے۔

”اب بتاؤ روزی!“ — ایک مجاہد جاسوس نے اس سے پوچھا — ”ہمارے متعلق تمہارے دل میں کوئی شک تو نہیں؟“

”نہیں!“ — روزی نے کہا۔

اسے کوئی شک ہونا بھی نہیں چاہئے تھا۔ وہ گذشتہ رات سے ان کے ساتھ تھی۔ اگر یہ تینوں بدنیت ہوتے تو اب تک عملاً ”بدنیتی کار نکاب“ کر چکے ہوتے۔ زیادہ خطرہ اولیس کی طرف سے تھا۔ روزی نے اسے یوٹلس کے مقابلے میں دھتکار دیا تھا۔ اولیس سوچ سکتا تھا کہ انتقام لینا اس کا حق ہے لیکن اس نے روزی کے ساتھ سلوک برتاؤ اور انداز ایسا رکھا جیسے روزی نوخیز اور حسین لڑکی نہیں بلکہ اس کا کوئی مجاہد رفیق ہو۔

”اولیس!“ — روزی نے کہا — ”تم نے کہا تھا کہ تمہیں مسلمانوں نے نئی زندگی دی اور تم نے دیکھا کہ مسلمانوں نے تمہیں احسان نہیں جتنا بلکہ اسلام کا حکم ہی یہی ہے تو تم نے اسلام قبول کر لیا۔ اب تم نے اور تمہارے ان ساتھیوں نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ اب میرے ہاتھ باندھ کر دریا میں پھینکیں گے۔ تم نہ آ جاتے تو اس وقت میری لاش کو دریائی مخلوق نوچ رہی ہوتی۔“

”اللہ کا حکم تھا تم زندہ رہو گی“ — اولیس نے کہا — ”اللہ نے اس کا سبب یہ بنایا کہ مجھے وہاں بھیج دیا جہاں تمہاری زندگی اور موت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ ہم تینوں وہاں اللہ کے بھیجے ہوئے پہنچے تھے۔ تمہیں میں نے نہیں اسلام نے نئی زندگی دی ہے۔“

”پھر مجھے اسلام میں داخل کر لو اولیس!“ — روزی نے کہا اور اس کے آنسو بہہ نکلے پھر بولی — ”مجھے ذرا سی بھی توقع نہیں تھی کہ تم مجھے بخش دو گے۔ میں تم سے اور تمہارے ان ساتھیوں سے اتنی متاثر ہوئی ہوں کہ باقی عمر تمہارے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”ابھی نہیں روزی!“ — اولیس کی پارٹی کے سردار نے کہا — ”تم اپنے ماں باپ کے پاس پہنچو گی تو ہو سکتا ہے تمہارے خیالات بدل جائیں۔ یہاں تم خوف و ہراس کی کیفیت میں ہو اور تم کسں بھی ہو۔ ہم تمہیں تمہارے ماں باپ کے پاس پہنچا دیں گے۔ وہاں آزادی سے فیصلہ کرنا۔“

روزی فیصلہ کر چکی تھی۔ تینوں مجاہدین نے اسے کہا کہ اسلام میں داخل ہونے کا فیصلہ آزادی سے کیا جاتا ہے لیکن وہ رو پڑی۔ کبھی تھی ماں باپ کے پاس جائے گی ہی نہیں۔ اولیس نے اسے بتایا تھا کہ وہ تجارت کے سلسلے میں مصر آئے ہیں۔ روزی کی ضد یہ تھی کہ وہ ان کے ساتھ واپس جائے گی۔

اسے بتایا نہیں جا سکتا تھا کہ ان تینوں کا مشن کچھ اور ہے اور وہ اسے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے لیکن روزی کی ضد اور آہ و زاری نے انہیں پریشان کر دیا۔ اس نے آخر یہ کہہ دیا کہ وہ اب مسلمان ہے عیسائی نہیں۔

مجاہدین کے لئے روزی نے ایسا مسئلہ کھڑا کر دیا کہ ان کے لئے کوئی راہ فرار نہ رہی۔ روزی اعتماد اور جرأت کے ساتھ بات کرنے والی لڑکی تھی۔ وہ کسی پولوڈر پوک لڑکی نہیں تھی۔ جماعت کے امیر نے ساتھیوں سے صلاح مشورہ کر کے روزی کو اپنے ہاتھ پر مسلمان کر لیا اور اس کا نام رابعہ رکھ دیا۔ اسے معلوم تھا کہ غیر مسلم کو کس طرح اسلام میں داخل کیا جاتا ہے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ رابعہ کو اپنی اصلیت اور مشن سے آگاہ کیا جائے یا نہیں۔ اسلام کے احکام ایسے تھے کہ وہ ایک دو شیرہ کو اس کے حال پر نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اب تو یہ لڑکی مسلمان ہو گئی تھی۔ بہت ہی غور و فکر کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ رابعہ کو اپنے راز میں شریک کر لیا جائے۔

تینوں نے رابعہ کو پاس بٹھا کر بتایا کہ وہ مصر میں کیا کرنے آئے ہیں اور وہ قطبی پادری بنیامین سے ملنے جا رہے ہیں۔ اس پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا جائے گا کہ وہ مسلمان ہیں بلکہ یہ بتایا جائے گا کہ ہم قطبی عیسائی ہیں اور شام کے عیسائی سرداروں کا پیغام لائے ہیں۔

”میں ہر طرح تمہارے ساتھ ہوں“ — رابعہ نے کہا — ”جان بھی دے دوں گی لیکن اس طرح نہیں کہ مجھے نیل میں ڈبو دیا جائے.... یہ بھی سوچ لو کہ جس کے پاس بارہ ہو وہ قطبی ہے۔ اس کے پاس اور لوگ بھی آتے ہوں گے۔ کسی نے مجھے پہچان یا تو پھر میں ان سے بچ نہیں سکوں گی۔“

یہ بھی ایک مسئلہ تھا مگر ان کے پاس ہر مسئلہ کا حل موجود نہیں تھا۔ انہوں نے یہ مسئلہ اللہ پر چھوڑ دیا۔

بنیائیں روپوشی کی حالت میں تھا اس لئے اس کا ٹھکانہ معلوم کرنا آسان کام نہیں تھا۔ یہ تینوں جاسوس تھے۔ انہوں نے کسی طریقے سے اپنی اس منزل کا سراغ لگالیا تھا۔ وہ جگہ دور نہیں تھی لیکن علاقہ دشوار گزار تھا۔ ریتلے ٹیلے اور گھائیاں تھیں، کہیں زمین نیچے اور کہیں اوپر چلی جاتی تھی۔

وہ دن کے پچھلے پہر وہاں پہنچ گئے۔ وہ چھوٹا سا نخلستان تھا جیسے جلتے بھلساتے ہوئے جنم میں چھوٹی سی جنت ہو۔ ایک گر جا تھا۔ اس کے ارد گرد چھوٹے بڑے خیمے لگے ہوئے تھے۔ گر جا پتھروں اور گارے کا بنایا گیا تھا۔ بنیائیں گرجے کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ اسے اطلاع دی گئی کہ تین آدمی اور ایک لڑکی آئے ہیں۔ بنیائیں نے انہیں اسی وقت بلا لیا۔

تین مجاہدین کی اس جماعت کے امیر نے اپنا تعارف کرایا کہ وہ حلب کے رہنے والے عیسائی ہیں اور قبلی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ رابعہ کا تعارف اس طرح کرایا کہ یہ اوئیس کی بیوی ہے، ابھی ابھی ان کی شادی ہوئی ہے اور رابعہ مصر دیکھنے اور بنیائیں سے ملنے کو بے تاب تھی.... انہوں نے اپنے نام عیسائیوں والے بتائے۔ ہر ایک نے اپنے گلے سے چھوٹی سی صلیب لٹکا رکھی تھی۔

”کیا آپ مجھے صرف ملنے آئے ہیں؟“ — بنیائیں نے پوچھا — ”یا کوئی اور بات ہے؟.... آپ کے ملک شام میں عیسائی کس حال میں ہیں؟“ — امیر جماعت نے کہا — ”اور ہم شام سے صرف آپ سے ملنے آئے ہیں“ — امیر جماعت نے کہا — ”ایک خاص بات بھی ہے.... شام میں رومیوں نے عیسائیوں کو بہت بڑا دھوکہ دیا ہے۔ ہم تیس ہزار کالکربن کر ہرقل کے پاس گئے کہ رومیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر حملہ کریں گے لیکن ہرقل اور اس کے بیٹے قسطنطین نے ان کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا۔ ہمارے سرداروں نے فیصلہ کیا کہ ہم مسلمانوں سے دشمنی مول لے کر آئے ہیں مگر رومی ہمیں آگے کر کے خود بھاگ نکلنے کی فکر میں ہیں....“

”رومیوں کے کہنے اکسلنے پر ہم نے مسلمان فاتحین کے خلاف بغاوت کر دی۔ رومی پھر بھی ہماری مدد کو نہ آئے۔ ہم مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور ہتھیار ڈال دیے۔ مسلمان ہمارا قتل عام کر سکتے تھے۔ ہماری بیٹیوں کو لونڈیاں بنا لیتے اور ہماری

بنیائیں روپوشی کی حالت میں تھا اس لئے اس کا ٹھکانہ معلوم کرنا آسان کام نہیں تھا۔ یہ تینوں جاسوس تھے۔ انہوں نے کسی طریقے سے اپنی اس منزل کا سراغ لگالیا تھا۔ وہ جگہ دور نہیں تھی لیکن علاقہ دشوار گزار تھا۔ ریتلے ٹیلے اور گھائیاں تھیں، کہیں زمین نیچے اور کہیں اوپر چلی جاتی تھی۔

وہ دن کے پچھلے پہر وہاں پہنچ گئے۔ وہ چھوٹا سا نخلستان تھا جیسے جلتے بھلساتے ہوئے جنم میں چھوٹی سی جنت ہو۔ ایک گر جا تھا۔ اس کے ارد گرد چھوٹے بڑے خیمے لگے ہوئے تھے۔ گر جا پتھروں اور گارے کا بنایا گیا تھا۔ بنیائیں گرجے کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ اسے اطلاع دی گئی کہ تین آدمی اور ایک لڑکی آئے ہیں۔ بنیائیں نے انہیں اسی وقت بلا لیا۔

تین مجاہدین کی اس جماعت کے امیر نے اپنا تعارف کرایا کہ وہ حلب کے رہنے والے عیسائی ہیں اور قبلی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ رابعہ کا تعارف اس طرح کرایا کہ یہ اوئیس کی بیوی ہے، ابھی ابھی ان کی شادی ہوئی ہے اور رابعہ مصر دیکھنے اور بنیائیں سے ملنے کو بے تاب تھی.... انہوں نے اپنے نام عیسائیوں والے بتائے۔ ہر ایک نے اپنے گلے سے چھوٹی سی صلیب لٹکا رکھی تھی۔

لڑکی کو دریائے نیل میں پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ بدعت قبطی عیسائیوں میں پائی جاتی ہے۔ کیا آپ اس ظالمانہ رسم کو روک نہیں سکتے؟

”میں اس رسم کو صحیح نہیں مانتا“ — بنیامین نے کہا — ”میں یعقوبی فرتے کا قبطی ہوں۔ یعقوبی اس رسم کو قتل جیسا گناہ سمجھتے ہیں لیکن میں ابھی اس بحث میں پڑنے سے گریز کر رہا ہوں۔ لڑکی کی قربانی دینے والے قبطی بھی مجھے اپنا پیشوا مانتے ہیں اور ہرقل کے خلاف ہم نے جو محاذ بنایا ہے اس پر میری ہر ہدایت اور حکم پر عمل کرتے ہیں۔ اگر میں نے یہ حکم جاری کر دیا کہ لڑکی کی قربانی گناہ ہے تو کم فہم اور کٹھن قبطی نہیں مانیں گے اور تفرقہ پیدا ہو جائے گا۔ اس کا نتیجہ ہمارے محاذ کے لئے اچھا نہیں ہو گا.... ابھی تم وہ بات کرو جس کے لئے آئے ہو۔“

”وہ بات تو ہو چکی ہے“ — امیر جماعت نے کہا — ”ہمیں آپ کے جواب اور حکم کی ضرورت ہے جو ہم اپنے سرداروں تک پہنچائیں گے۔“

”اپنے سرداروں تک نہیں“ — بنیامین نے مسکراتے ہوئے کہا — ”اپنے سالار عمرو بن عاص تک تم یہ پیغام پہنچاؤ گے۔ تم نے اتنی زیادہ باتیں کی ہیں کہ تم نے اپنے اوپر جو پردہ ڈال رکھا تھا وہ اتنا زیادہ سرک گیا کہ میں نے تمہاری اصلیت دیکھ لی۔ اس لڑکی کو دیکھ کر میں سوچ رہا ہوں کہ تم اسے اپنے ساتھ کیوں لئے پھرتے ہو۔ مسلمان عورت کو میدان جنگ میں نہیں لڑاتے نہ عورت کو جاسوسی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔“

”میں نو مسلم ہوں“ — رابعہ نے کہا — ”کل اسلام قبول کیا ہے۔ شام کے شہر حلب کی رہنے والی ہوں۔“

رابعہ پر جو جیتی تھی وہ اس نے سنا دی۔ کوئی بات چھپائی نہیں نہ مبالغہ آمیزی کی۔ ”ان مسلمانوں نے اپنے فرائض سے ہٹ کر مجھے نئی زندگی دی ہے“ — رابعہ نے آخر میں کہا — ”میں ان کے کروار سے اتنی متاثر ہوئی کہ ان کا مذہب قبول کر لیا۔ انہوں نے مجھے ایک مقدس اور پاک چیز جان کر مجھے اپنے ساتھ رکھا۔“

”اور میں بھی نو مسلم ہوں“ — اولیس نے کہا — ”اپنی جان اسلام کے لئے وقف کر دی ہے“ — اولیس نے بنیامین کو سنایا کہ اس نے کیوں اسلام قبول کیا تھا۔ تاریخ دان ا۔ لفریڈ بلٹر اور عربی مؤرخوں نے بنیامین کی شخصیت کا جو عکس پیش کیا

ہے وہ ایک ہی جیسا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بنیامین مصر کے قبطیوں کا استغفب اعظم تھا۔ لوگ دل و جان سے اس کی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ بنیامین تھا ہی عظیم الشان اور غیر معمولی طور پر دانشمند۔ اس کے کردار کی بنیاد نیکی اور بنی نوع انسان کی بھلائی اور محبت تھی۔ عیسائیت کے ان مذہبی پیشواؤں اور قبائل کے سرداروں کا جانی دشمن تھا جو ہرقل کی سرکاری عیسائیت کے پیروکار تھے۔ اس کی فہم و فراست اور دور بین نگاہیں مستقبل کے پردے چاک کر سکتی تھیں۔

”اپنے سپہ سالار سے کہنا“ — بنیامین نے کہا — ”ہرقل ہمارا مشترکہ دشمن ہے۔ اگر آپ مصر پر فوج کشی کریں گے تو ایسا ہو گا ہی نہیں کہ عیسائی ہرقل کا ساتھ دیں گے۔ ہم اس وقت کو نہیں بھولے جب فوکس قیصر روم تھا۔ عیسائیوں کا تو وہ دشمن تھا۔ ہرقل نے اس کے خلاف بغاوت کی تو ہم نے اس کا ساتھ دیا اور فوکس کا تختہ الٹ کر ہرقل کو قیصر روم بنایا تھا....

”ہرقل خود عیسائی تھا لیکن عیسائیوں کے تعاون اور ان کی قربانیوں کو نظر انداز کر کے اس نے عیسائیوں پر عرصہ حیات تک کر دیا۔ عیسائیوں کے لئے وہ قصاب اور درندہ بن گیا۔ اس کے حکم سے عیسائی کسانوں کا پیدا کیا ہوا اناج چھین کر بزنس لے لیا۔ عیسائیوں کو اس نے نیم فاقہ کش بنا کر ان پر ظالمانہ لگان عائد کر دیا تھا....

”عیسائیوں پر جو دستور ستم کی داستان بہت طویل ہے۔ شام کے عیسائی قبائل کو ہرقل نے دھوکے دیئے۔ مسلمانوں کے سامنے انہیں ڈھال بنانا چاہا۔ شام میں جو ہوا وہ مجھے معلوم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مسلمان مفتوحہ ملک کے لوگوں کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتے۔ محکموں پر جو دستور استبداد کا تو ان کے ہاں تصور ہی نہیں۔ جزیہ ادا کر کے ہر کوئی اپنے مذہب پر قائم رہ سکتا ہے....

”میری نظریں آنے والے وقت کو دیکھ رہی ہیں۔ مسلمانوں کا یہ رویہ قائم رہا تو عیسائیت اپنے پیروکاروں کو اسلام کی آغوش میں ڈالنا شروع کر دے گی اور مصر اسلامی ملک بن جائے گا۔ رومی مصر میں نہیں ٹھہر سکیں گے۔ مسلمانوں نے مصر پر فوج کشی کی تو ہلال کے عیسائی خاموش تماشائی بنے رہیں گے اور یہ کوئی حیرت ناک بات نہیں ہو گی کہ رومی اہل مصر کے ہم مذہب ہیں لیکن اہل مصر مسلمانوں کا استقبال کریں گے....

”تم واپس چلے جاؤ۔ عیسائیوں کو رومیوں کے خلاف بھڑکانے کی کسی کوشش کی

ضرورت ہی نہیں۔ ہم بغاوت نہیں کریں گے۔ ہمارے پاس رومیوں جیسی جنگی طاقت نہیں۔ ہم رومیوں کو اس دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں کہ ہم ان کی وفادار رعایا ہیں۔“

○

ان تینوں مجاہدین کا مشن کامیاب تھا۔ انہیں مصر کے کسی اور علاقے میں جاکر عیسائیوں کو بھڑکانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے اسقف اعظم نے وہ کام کر دیا تھا جو یہ تینوں کرنے آئے تھے۔ اولیس کو تو کچھ زیادہ ہی کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ وہ بنیامین سے رخصت ہوئے۔ رات قوص کی سرائے میں گذاری۔ صبح طلوع آفتاب سے بہت پہلے کرائے کے اونٹوں پر اسکندریہ کو روانہ ہو گئے۔ انہیں خطرہ یہ نظر آ رہا تھا کہ پہچانے جائیں گے رابعہ کو بھی پہچان لیں گے۔ اسے اس سے چھین کر نیل میں پھینک دیں گے۔ وہ خوش قسمت تھے کہ انہیں ایک جہاز تیار مل گیا۔ وہ اس جہاز میں سوار ہوئے اور جہاز روانہ ہو گیا۔

تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ تینوں مجاہدین کتنا عرصہ مصر میں رہے تھے اور جب عمرو بن عاص نے انہیں مصر بھیجا تھا اس وقت عمرو کہاں تھے، البتہ یہ واضح ہے کہ یہ مجاہدین واپس آئے تو اس وقت وہ بیت المقدس میں تھے۔ مجاہدین کو راستے میں ہی کسی نے بتا دیا تھا۔ انہیں عمرو بن عاص نے بھیجا تھا اس لئے وہ بیت المقدس جا پہنچے۔ عمرو بن عاص نے اطلاع ملنے پر انہیں فوراً بلالیا۔

”کیا کر آئے؟“ — سپہ سالار عمرو نے ان سے پوچھا۔

امیر جماعت نے تمام تر کارگذاری سنائی اور بنیامین نے جو باتیں کی تھیں وہ لفظ بہ لفظ سنائیں۔

”یہ تو قبیلوں کے اسقف اعظم کی باتیں ہیں“ — امیر جماعت نے کہا۔ ”ہم نے وہاں ہر عیسائی کے دل میں رومیوں کے خلاف نفرت بھری ہوئی دیکھی ہے۔ ہر محفل میں، ہر جوں میں، سراؤں میں، سفر میں اس نفرت کا کھلم کھلا اظہار ہوتا ہے۔“

”بنیامین نے جو کہہ دیا ہے اسے میں حرف آخر سمجھتا ہوں“ — عمرو بن عاص نے کہا۔

”میرا مشورہ قبول کریں“ — ایک اور مجاہد نے کہا — ”مصر پر حملہ کرنا ہے تو فوراً کریں۔ رومی فوج کی ذہنی اور جسمانی حالت ابھی تک نہیں سنبھلی اور عیسائی اس

فوج کے دشمن ہو گئے ہیں۔“

عمرو بن عاص یہ رپورٹ سن کر بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے کہ وہ پہلی فرصت میں مدینہ جائیں گے اور امیر المومنین سے مصر پر حملے کی اجازت لے لیں گے۔

کام کی باتیں ہو چکیں تو رابعہ کی بات سپہ سالار کو سنائی گئی۔ رابعہ باہر بیٹھی ہوئی تھی۔ اولیس نے سپہ سالار سے کہا کہ وہ اس کار رابعہ کے ساتھ نکاح پڑھا دیں۔ عمرو بن عاص نے رابعہ کو اندر بلایا اور اس سے پوچھا کہ وہ کس طرح اولیس کے پاس آئی ہے۔ رابعہ نے وہی کہانی سنائی جو سپہ سالار پہلے سن چکے تھے۔ وہ دراصل تصدیق چاہتے تھے اور یہ بھی کہ اس کس دن دوشیزہ پر جبر نہ ہو رہا ہو۔ رابعہ نے انہیں مطمئن کر دیا اور شادی کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے اولیس اور رابعہ کا نکاح پڑھا دیا۔

○

عمرو بن عاص مدینہ جانے کا موقع پیدا کر رہے تھے۔ امید بندھ گئی تھی کہ انہیں مصر پر حملے کی اجازت مل جائے گی۔ تین چار ہی دن گزرے ہوں گے کہ مدینہ سے امیر المومنین حضرت عمرؓ کا ایک پیغام لئے قاصد آ گیا۔ عمرو بن عاص نے پیغام پڑھا تو لرز کر رہ گئے۔ اتنے حوصلہ مند اور پُر عزم سپہ سالار کے ہاتھ کانپنے لگے۔

پیغام صرف اتنا تھا — ”عمرو بن عاص کے نام۔ السلام علیکم۔ اما بعد۔ کیا تم مجھے میرے ساتھیوں کو اور ان لوگوں کو جن کا میں ضامن اور ذمہ دار ہوں، ہلاک ہوتا دیکھو گے اور خود اپنے ساتھیوں کے ساتھ زندہ رہو گے؟ مدد، مدد، مدد!“

یہ پیغام اسی نوعیت کا تھا جسے موجودہ دور میں SOS کہا جاتا ہے۔

”کیا آفت آن پڑی ہے؟“ — عمرو بن عاص نے قاصد سے پوچھا۔

”قطعا!“ — قاصد نے جواب دیا — ”عرب کی جنوبی سرحد سے لے کر شمالی سرحد تک قحط انسانوں کی اور مویشیوں کی جانیں بے دردی سے لے رہا ہے۔ مدینہ کو میری دہائی تک نہ جانے کتنی اور جانیں لے چکا ہو گا۔ اناج کا ایک دانہ کہیں نظر نہیں آتا۔ لوگ پانی کو ترس رہے ہیں۔ دودھ دینے والے مویشی ہڈیوں کے ڈھلچے بن کر مر رہے ہیں۔ ان کے جسموں میں نمی کا ایک قطرہ نہیں، دودھ کہاں سے دیں۔“

یہ تاریخی قحط 639ء بمطابق 18 ہجری میں پڑا تھا۔

قاصد نے قحط کی تباہ کاری سنائی اور سننے والے لرزہ بر اندام ہو گئے۔ عمرو بن عاص

کسی قسمی لیکن آپ نے میرا جواز رد کر کے مجھے رقم وصول کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ابو عبیدہ نے چار ہزار درہم لے لئے اور شام کے اُس علاقے کو واپس چلے گئے جہاں کہ وہ امیر مقرر ہوئے تھے۔

○

اس داستان کا یہ باب اُس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک اس خوفناک قحط میں ہر المومنین اور ان کے ماتحت افسروں کی فرض شناسی اور انسان دوستی کا تذکرہ نہ کیا جائے۔

قحط کا باعث یہ ہوا کہ آسمان بادلوں سے خالی ہو گیا۔ بادلوں کی غیر حاضری میں سورج نے زمین و آسمان کو جلانا شروع کر دیا۔ کھیتوں کی مٹی آکر گئی اور زمین چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹنے لگی۔ آسمان کے تیر دیکھ کر کسانوں نے ہل نہ چلائے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اُس کی ایک پتی بھی ہری نہیں رہ گئی تھی۔ فصل جو پکنے کے لئے اوپر ہی اوپر اٹھ رہے تھے، جہاں تک پہنچے تھے وہیں جل کر راکھ ہو گئے۔ اناج کی پیداوار کی امیدیں دم لگ گئیں۔

فلسطین صُکھ گئے۔ ہریالی کا کس نام و نشان نہ رہا۔ ہوا چلتی تو دھول اُڑتی تھی۔ درخت کا ایک پتہ بھی ہر آنہ رہا۔ درخت خشک لکڑیاں بن کے رہ گئے۔ بھیڑ بکریوں اور مویشیوں اور دیگر جانور ایسی تیزی سے مرنے لگے جیسے موت جھاڑوئے رہی ہو۔ مان فاقوں مرنے لگے۔ جن لوگوں کے پاس روپیہ پیسہ تھا وہ بھی مر رہے تھے۔ اناج کا سدانہ نہ تھا۔ روپیہ پیسہ محض بیکار تھا۔

اس قحط والے سال کو ”عام الرمادہ“ یعنی خاک والا سال کہا گیا تھا۔ اب دیکھئے اُس وقت کے سربراہ ملت و حکومت کا کردار اور حسن تدبیر۔ امیر المومنین زید بن الخطابؓ کا ذاتی کردار تو بلند تھا ہی لیکن غور اس پر کریں کہ یہ کردار اسلام کی تعلیمات، مانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ انہوں نے جلسوں میں تقریریں نہیں کیں کہ ہم عوام کو انہیں مرنے دیں گے۔ ذخیرہ اندوزی ختم کرنے کے لئے قانون بنایا جا رہا ہے، ہم تباہ کر دیں گے، کمین بنادی گئی ہے.... ایسی بڑھک نما تقریروں کے بعد رات گھر جا کر اُن کھانے اور سو گئے۔

حضرت عمرؓ نے عراق، شام اور فلسطین سے آنے والے خوراک کے قاتلوں کے

نے امیر المومنین کے نام پیغام لکھوایا۔ تاریخ کے مطابق، تحریر اتنی سی ہی تھی کہ ”امیر المومنین کے نام۔ السلام علیکم۔ ابابعد۔ اطمینان رکھئے۔ خوراک کا ایسا قافلہ بھیج رہا ہوں جس کا اگلا سرا آپ کے پاس اور دوسرا میرے پاس ہو گا۔“

امیر المومنین نے ایسے ہی پیغام معاویہ بن ابی سفیان اور ابو عبیدہ کو شام بھیجے تھے جو وہاں کے امراء اور سپہ سالار تھے۔ پھر ایسا ہی پیغام عراق کے امیر اور سپہ سالار سعد بن ابی وقاص کو بھی بھیجا۔ ان سب نے امیر المومنین کو ایسا ہی جواب دیا جیسا عمر بن عاص نے لکھ بھیجا تھا۔

تاریخ میں جو اعداد و شمار آئے ہیں یوں ہیں:

عمر بن عاص نے فلسطین سے ایک ہزار اونٹ آنے اور گھی سے لدے ہوئے خشکی کے راستے اور انہی اشیاء سے لدے ہوئے بیس ہجری جہاز ایلہ (موجودہ عقبہ) کی بندرگاہ سے روانہ کئے۔ خوراک کے علاوہ عمر بن عاص نے پانچ ہزار کبیل بھی بھیجے۔ شام سے معاویہ بن ابی سفیان نے آنے سے لدے ہوئے تین ہزار اونٹ بھیجے۔ خوراک کے علاوہ تین ہزار چغنے بھی ساتھ تھے۔

سعد بن ابی وقاص نے عراق سے ایک ہزار اونٹ بھیجے۔ یہ بھی اناج سے لدے ہوئے تھے۔

شام کے ایک اور حصے کے امیر اور سپہ سالار ابو عبیدہ بن الجراح نے چار ہزار اونٹوں پر اناج اور دیگر اشیاء خور و نوش لدوائیں اور خود اس قافلے کے ساتھ چل پڑے۔ مدینہ پہنچے تو امیر المومنین نے قحط زدہ لوگوں میں اس خوراک کی تقسیم کا کام ابو عبیدہ کے ہی سپرد کر دیا۔ تمام مؤرخوں نے لکھا ہے کہ امیر المومنین نے حکم دیا کہ ابو عبیدہ کو چار ہزار درہم ادا کئے جائیں۔

”امیر المومنین!“ — ابو عبیدہ نے کہا — ”مجھے اس معاوضے کی ضرورت نہیں۔ میں نے جو معاونت کی ہے یہ اللہ کی خوشنودی کے لئے کی ہے۔ مجھے دنیاوی مفاد کی طرف نہ کھینچیں۔“

”یہ معاوضہ تم نے طلب نہیں کیا۔“ — امیر المومنین نے کہا — ”اس لئے یہ لے لینے میں کوئی قباحت نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مجھے ایسا ہی ایک واقعہ پیش آچکا ہے۔ تم نے جو بات مجھ سے کہی تھی وہی میں نے رسول اکرم کی خدمت

بت اور ایثار کی صرف ایک مثال کافی ہوگی۔ مٹورخوں نے ایسے متعدد واقعات لکھے ہیں۔ امیر المومنین سب کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا کرتے تھے۔ ایک روز دسترخوان پر گھی میں چوری کی ہوئی روٹی تھی۔ حضرت عمرؓ نے ایک بڈو کو اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ دونوں ایک ہی پلیٹ سے چوری کھانے لگے۔

بڈو بد تمیزی سے کھا رہا تھا۔ پلیٹ میں جدھر گھی دیکھتا دھڑکے سے بہت بڑا لقمہ بنا کر منہ میں ڈال لیتا۔ امیر المومنین نے اس سے پوچھا کہ تو نے کبھی گھی والی روٹی نہیں کھائی؟ ”ایسا امیر المومنین!“ بڈو نے لجاجت کے لہجے میں کہا۔ ”جب سے قحط پڑا ہے نہ گھی دیکھا ہے نہ روٹی نہ کسی اور کو گھی روٹی کھاتے دیکھا ہے۔“

امیر المومنین نے قسم کھائی کہ جب تک قحط ہے وہ گھی والی روٹی نہیں کھائیں گے۔ سب نے دیکھا کہ انہوں نے گھی کے علاوہ گوشت کھانا بھی چھوڑ دیا۔ ان کی بھاگ دوڑ کا یہ عالم تھا کہ ابھی مدینہ میں کھانے کا انتظام دیکھ رہے ہیں اور ابھی کسی دور کے علاقے کی طرف دیکھنے جا رہے ہیں کہ وہاں لوگوں کو ٹھیک طرح کھانا مل رہا ہے یا نہیں۔

مسلل مشقت، بھاگ دوڑ اور پریشانی کے اپنے اثرات تھے۔ اس کے ساتھ امیر المومنین نے اپنی روزمرہ غذا کم کر دی تھی۔ ان کا رنگ سرخ و سپید ہوا کرتا تھا جو سیاہ پڑ گیا اور جسم لاغر ہوتا چلا گیا۔ بیت میں کوئی تکلیف بھی رہنے لگی۔ ان کے رفقاء کار کو پریشانی لاحق ہو گئی کہ امیر المومنین نے پوری غذا کھانی شروع نہ کی تو یہ صورت ان کے لئے ملک ثابت ہو سکتی ہے۔

ان رفقاء نے جن میں معتبر صحابہ کرام بھی تھے، امیر المومنین سے کہا کہ آرام کریں نہ کریں اپنی روزمرہ غذا پوری لیں۔ امیر المومنین نے جو جواب دیا وہ تاریخ کے دامن میں محفوظ ہے۔ انہوں نے کہا۔ ”مجھے لوگوں کی تکلیف کا احساس اسی طرح ہو سکتا ہے کہ مجھ پر بھی وہی گزرے جو لوگوں پر گزر رہی ہے۔“

اگر ہمارے آج کے حکمران حضرت عمرؓ کے ان الفاظ کو اپنا اصول حیات بلکہ ایمان کا جز بنا لیں تو پاکستان کا اُچھا گلستان سرسبز و شاداب ہو جائے۔

حضرت عمرؓ اللہ کے حضور بتے آنسوؤں سے گڑ گڑاتے تھے۔ ”یا اللہ! یہ قحط اگر ہم سے کسی گناہ یا اپنے فرائض سے کوتاہی کی سزا ہے تو مجھے بخش دے میری قوم کو سزا نہ دے۔“

کوئی دعا قبول نہیں ہو رہی تھی۔ آسمان جل رہا تھا، زمین کو جلا رہا تھا۔

لئے حکم دیا کہ یہ متاثرہ علاقوں میں چلے جائیں اور اشیاء لوگوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ دوسرا حکم یہ دیا کہ قافلوں کے اونٹ واپس نہ کئے جائیں۔ انہیں ذبح کر کے ان کا گوشت لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے۔۔۔۔۔ قحط زدہ علاقوں میں ایک بھی اونٹ زندہ نہیں رہا تھا۔ اگر کوئی اونٹ زندہ نظر آتا تھا تو وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوتا تھا، گوشت کا نام و نشان نہیں۔ زرخیز علاقوں سے آئے ہوئے اونٹ نومند اور تروتازہ تھے۔ کم و بیش دس ہزار اونٹ ذبح کر کے فاقہ کش لوگوں کو کھلا دیئے گئے۔

مدینہ دار الخلافہ بھی تھا اور ہر لحاظ سے عرب کا مرکزی شہر بھی۔ وہاں خوشحال لوگ رہتے تھے۔ ان کے گھروں میں خوراک کا ذخیرہ تھا۔ مدینہ کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ قحط سے بھاگے ہوئے ہزار ہا لوگ، پورے پورے کنبے، مدینہ میں آ گئے اور ان کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ یہ سب بھوکے تھے، ان کے بچے بھوکے، ان کی عورتیں بھوکے تھیں۔ ماؤں کے دودھ سُکھ گئے اور دودھ پیتے بچے مر رہے تھے۔

حضرت عمرؓ نے مدینہ کے لوگوں سے کہا کہ وہ گھروں میں دگنا کھانا پکایا کریں اور ان پناہ گزینوں کو آپس میں بانٹ کر گھروں میں لے جائیں۔ لوگوں نے فوراً اس پر عمل کیا لیکن پناہ گزینوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ حضرت عمرؓ گھوم پھر کر جائزہ لینے رہتے تھے۔ مدینہ کے خوشحال لوگ پورا پورا تعاون کر رہے تھے۔ کچھ لوگ پھر بھی بھوکے رہ جاتے تھے۔

امیر المومنین نے اس کا حل یہ نکالا کہ حکم جاری کر دیا کہ کسی شہری کے گھر کھانا نہیں کپے گا۔ تمام خوراک ایک جگہ اکٹھی کر کے مشترکہ طور پر کھانا کپے گا اور سب ایک دسترخوان پر کھانا کھایا کریں گے۔ امیر المومنین نے اس کی ابتدا اپنے گھر سے کی۔ کھانا ایک جگہ پکے لگا۔ امیر المومنین اپنے اہل و عیال کے ساتھ اسی دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے۔

مسلم اور غیر مسلم تاریخ دانوں نے لکھا ہے کہ اس دسترخوان پر ہر روز دونوں وقت کھانے والوں کی تعداد دس ہزار کے لگ بھگ ہوتی تھی۔ مریض، بوڑھے، معذور، عورتیں، بچے جو دسترخوان تک نہیں پہنچ سکتے تھے، انہیں وہاں کھانا پہنچایا جاتا تھا جہاں حملہ ان کا قیام تھا۔ ان کی تعداد پچاس ہزار کے لگ بھگ تھی۔

امیر المومنین حضرت عمرؓ کے کردار کا اور اُچھا نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ہزار سے کچھ زائد تھی اور بوڑھے بچے اور مریض جو دسترخوان پر نہیں آ سکے اور انہیں
جہاں جہاں تھے کھانا پہنچایا گیا تھا، ان کی تعداد چالیس ہزار سے ذرا زیادہ تھی۔
امیر المومنین حضرت عمرؓ نے اس رات بھی وہی کھانا کھایا جو باقی سب نے کھایا تھا۔
انہوں نے پانی مانگا تو انہیں وہ پانی دیا گیا جس میں شہد ملا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک گھونٹ پی
کر بالہ رکھ دیا۔

”خدا کی قسم!“ — حضرت عمرؓ نے کہا — ”میں ایسا کام نہیں کروں گا جس کی روز
نہایت مجھ سے جواب طلبی ہو۔“

پھر ایک واقعہ یہ بھی قابل غور و فکر ہے کہ ایک روز امیر المومنین نے اپنے ایک
بھوئے بیٹے کو تربوز کا ایک ٹکڑا کھاتے دیکھا تو بولے — ”واہ امیر المومنین کے بیٹے تو
بچل کھا رہا ہے اور رسول اللہ کی اُمت بھوکی مر رہی ہے۔“

بچہ اپنے عظیم باپ کی سخت مزاجی سے واقف تھا۔ وہ رو پڑا۔ امیر المومنین کو بچے کا
رد نامتاثر نہ کر سکا۔ کسی نے انہیں بتایا کہ بچے نے تربوز کا یہ ٹکڑا چند ایک کھجوروں کے
بلے لیا ہے تو انہیں اطمینان ہوا اور انہوں نے بچے کو بہلا لیا۔

○

قطر ملت نظر نہیں آ رہا تھا۔ عراق اور شام سے اناج اور اجناس آرہی تھیں جو نہایت
انچھے انتظامات کے تحت مدینہ سے دور دراز علاقوں تک بھی پہنچائی جا رہی تھیں۔
امیر المومنین خود جا کر تقسیم کے انتظامات دیکھتے تھے۔ چھ سات مہینے گزر گئے تھے۔

ایک روز حضرت عمرؓ مدینہ سے تھوڑی ہی دور ایک بستی میں گئے تو وہاں دو گھروں
میں ام کی آہ و بکا دیکھی۔ ایک عورت کا جوان بیٹا اور ایک عورت کا خاوند مر گیا تھا۔
حضرت عمرؓ نے پہلی بات یہ پوچھی کہ یہ بھوکے تو نہیں مرے؟ یہ جواب سن کر انہیں
الطمان ہوا کہ انہوں نے ایک وقت کا بھی فائدہ نہیں کیا تھا۔ موت کا سبب کوئی ایسی
بیماری تھی جسے کوئی بھی نہ سمجھ سکا۔

حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ ان کے کفن بیت المال سے دیئے جائیں۔ کفن آگئے۔
انہوں کی نماز جنازہ حضرت عمرؓ نے خود پڑھائی تھی۔

یہ پراسرار بیماری بڑھنے لگی۔ بیماری ایسی تھی کہ علاج کی مصلحت ہی نہیں دیتی
تھی۔ یہ وبا کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ کسی بھی مؤرخ نے نہیں لکھا کہ اس

سرزمین عرب کا دشمن ہو گیا تھا۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ کے انتظامات اور
آسمان ان کی اپنی بھاگ دوڑ لوگوں کو قطع سے نہیں فائدہ کئی سے نجات دلا سکتی تھی
جو انہوں نے دلا دی لیکن صحابہ کرام اور دیگر اکابرین حضرت عمرؓ کی بڑی تیزی سے کرتی
ہوئی صحت کے متعلق پریشان تھے۔ حضرت عمرؓ تو کھلے جا رہے تھے۔ انہوں نے جسمانی
توانائی برقرار رکھنے والی غذا ترک کر دی تھی اور کہتے تھے کہ یہ غذا اُس وقت کھاؤں گا
جب میری قوم کے ہر فرد کو یہ غذا میسر آنے لگے گی۔

تاریخ نویس ابن سعد نے اپنی ایک کتاب ”طبقات“ میں لکھا ہے کہ بزرگوں کے
کتنے پر بعض جواں سال افراد نے کھانے کے وقت حضرت عمرؓ کو کسی بہانے دسترخوان
عام سے ہٹا کر الگ بٹھایا اور گوشت کے ساتھ گھی میں پکائی ہوئی روٹی ان کے آگے رکھ
دی اور انہیں باتوں میں لگا لیا۔ انہوں نے عہد کر لیا تھا کہ امیر المومنین کو گوشت اور گھی
کھلا کر ہی رہیں گے لیکن امیر المومنین نے یہ کھانا ایک طرف سرکادیا۔

”دسترخوان پر گھوم پھر کر دیکھو“ — امیر المومنین نے کہا — ”جو کوئی فائدہ کئی
سے بہت ہی نحیف ہو گیا ہو یہ کھانا اُسے کھلا دو۔ میرے لئے عام روٹی اور سب کے لئے
پکا ہوا سالن زیادہ اچھا رہے گا۔“

ابن سعد نے تین مؤرخوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس شام
حکم دیا کہ دسترخوان عام پر جو لوگ موجود ہیں ان کی گھنٹی کی جائے۔ گھنٹی کی گئی۔ سات

بیاری کی علامات کیا تھیں۔ امیر المومنین جو ذرا سا آرام کرتے تھے وہ بھی چھوڑ دیا اور اس بیماری کی روک تھام کے لئے بستی بستی بھاگنے دوڑنے لگے۔ طبیب بھی پریشان ہو گئے۔ ان کی دوائیوں کا اتنا سا ہی اثر ہوا تھا کہ مریض کی موت کچھ دن ٹل جاتی تھی لیکن وہ آخر موت کے منہ میں چلا ہی جاتا تھا۔

طبیب اتنا ہی سمجھ سکے کہ اس بیماری کا تعلق قحط اور خشک سالی کے ساتھ ہے۔ حضرت عمرؓ نے حکم جاری کر دیا کہ اس بیماری سے مرنے والوں اور قحط ختم ہونے تک کسی بھی بیماری سے مرنے والے کا کفن بیت المال سے ملے گا۔ حضرت عمرؓ جہاں تک پہنچ سکتے وہاں نماز جنازہ خود پڑھاتے تھے۔

امیر المومنین کسی بیمار کی وفات کی اطلاع پر جاتے تو کچھ اس قسم کے الفاظ ان کے کانوں سے ٹکراتے تھے — ”یا امیر المومنین! آپ نے بھوک سے تو بچا لیا ہے موت سے نہیں بچا سکیں گے“ — یا یہ کہ — ”یا امیر المومنین! روٹی دے سکتے ہو زندگی نہیں دے سکتے۔“

اس پُر اسرار اور ظالم بیماری نے تمام تر عرب پر دہشت طاری کر دی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ پہلے حضرت عمرؓ ہر نماز کے بعد قحط سے نجات کی دعا کرتے تھے؛ بیماری نے زور پکڑا تو وہ رات رات بھر نوافل پڑھتے اور اس طرح قحط اور بیماری سے نجات کی دعا کرتے تھے کہ روتے روتے ان کی ہچکی بندھ جاتی تھی۔

”یا اللہ! یا غفور الرحیم!“ — حضرت عمرؓ دعا میں یہ الفاظ ضرور کہتے تھے — ”میرے گناہوں کی سزا اپنے رسولؐ کی اُمت کو نہ دے.... اپنے بندوں کو میرے ہاتھوں ہلاک نہ کرا پروردگار!“

یوں لگتا تھا جیسے اللہ نے سرزمینِ عرب سے نگاہیں پھیر لی ہوں۔ دعاؤں کو قبول حاصل ہو ہی نہیں رہی تھی۔

آخر امیر المومنین حضرت عمرؓ کی حالت ایسی ہو گئی جیسے بالکل ہی بار کر بے دست ہا ہو گئے ہوں۔ انہوں نے ہر طرف قاصد اس پیغام کے ساتھ دوڑا دیئے کہ تمام لوگوں کو اپنی اپنی جگہ اکٹھا کر کے نماز استسقاء پڑھی جائے اور اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعائیں کی جائیں کہ قحط کے عذاب سے اللہ چھڑا دے۔ پیغام میں یہ بھی کہا گیا کہ جو لوگ رات یا

راتِ مدینہ پہنچ سکیں پہنچ جائیں۔

قاصد فوراً ہی روانہ ہو گئے تھے۔ دور کے علاقوں کو جانے والے قاصد رات کو بھی چلتے رہے تھے۔ مدینہ منورہ میں نماز استسقاء کا وقت اگلے روز دوسرے کا مقرر کیا گیا تھا.... جہاں جہاں پیغام پہنچا گیا، لوگوں نے نماز کا وقت مقرر کر کے اعلان کر دیا۔

اگلے روز مدینہ کے لوگ اور مدینہ میں آئے ہوئے پچاس ساٹھ ہزار پناہ گزین زمین و آسمان کو جلاتی ہوئی دوسرے وقت نماز استسقاء کے لئے باہر نکلے اور میدان میں صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ زمین دھکتے ہوئے انگاروں کی طرح گرم تھی جس پر ننگے پاؤں کھڑا ہونا ممکن نہ تھا لیکن لوگ اللہ کی ذات باری میں جیسے تحلیل ہو گئے تھے کہ انہیں پاؤں جلنے کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ حضرت عمرؓ امامت کے لئے آگے آئے۔ انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ردائے مبارک اپنے جسم پر لے رکھی تھی۔

جن مؤرخوں نے اس نماز کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے، اُس وقت کے وقائع نگاروں کے حوالوں سے وہ منظر بیان کیا ہے جب مدینہ کے لوگ نماز استسقاء پڑھ رہے تھے۔ لوگوں کی سسکیاں اور ہچکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں اور یہی کیفیت امیر المومنین پر طاری تھی۔

نماز کے بعد امیر المومنین دعا کے لئے اٹھے۔ ان کا کوئی لفظ واضح طور پر سمجھ میں نہیں آتا تھا کیونکہ وہ بچوں کی طرح بلبلا اور رو رہے تھے۔ مؤرخوں نے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے آنسو ان کی داڑھی سے یوں نچنے لگے تھے جیسے انہوں نے اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے ہوں۔ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب ان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ دعا کے دوران حضرت عمرؓ نے ان کا بازو پکڑا اور اٹھا کر اپنے پہلو میں کھڑا کر لیا پھر ان کے دونوں ہاتھ پکڑ کر دعا کے انداز میں آسمان کی طرف کئے۔

”یا اللہ!“ — حضرت عمرؓ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی ہی بلند آواز میں کہا — ”ہم تیرے رسولؐ کے چچا کو تیرے حضور شفاعت کے لئے لائے ہیں۔ ہماری نہیں تو ان کی ہی سن لے۔“

”یا پروردگار!“ — حضرت عباسؓ نے حضرت عمرؓ کی آواز سے بھی بلند آواز میں کہا — ”اپنے رسولؐ کے صدقے اپنی رحمت کے چند قطرے....“

حضرت عباسؓ کی آواز رقت میں دب گئی اور اس طرح ہچکیاں لے لے کر روئے گئے جیسے اپنے آپ پر قابو نہ پاسکیں گے۔

مدینہ سے دور دور تک جہاں جہاں امیر المومنین کا پیغام پہنچا تھا اس وقت نماز استسقاء پڑھی جا رہی تھی۔ ہر آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے اور لوگ اس عذاب سے اللہ کی پناہ مانگ رہے تھے۔ نماز کے بعد حضرت عمرؓ بلند آواز سے درود کرتے جاتے تھے۔
”اللہ رحمن اور رحیم ہے۔“

پھر جلتے اور جلاتے ہوئے اس دن کا سورج بھی غروب ہو گیا۔ ایک اور رات آئی۔ موسم کی تبدیلی کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے لیکن اس رات کے بطن سے جس صبح نے جنم لیا اسے دیکھ کر کسی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ سورج جیسے طلوع ہوا ہی نہ ہو کیونکہ آسمان پانی سے لدے ہوئے سرمئی اور سیاہ بادلوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا، اور جب یہ بادل پھٹ پڑے تو دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف جل تھل ہو گیا۔ بارش ایسی موسلا دھار کہ اس کی دھند میں کچھ دور تک نظر کام نہیں کرتی تھی۔

نومینوں کی پیاسی زمین اللہ کی رحمت سے سیراب ہو گئی.... یہ تاریخی قحط پورے نو مہینے رہا تھا۔

دو تین دنوں بعد بارش کا زور تھا تو حضرت عمرؓ مدینہ کے اندر اور باہر ان پچاس ساٹھ ہزار پناہ گزینوں میں دوڑتے پھرے جو نومینوں سے وہاں پڑے تھے۔ وہ ان لوگوں سے یہ کہتے پھرتے تھے کہ اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ لوگوں کو ان کے گھروں کو بھیجنے پر امیر المومنین کچھ زیادہ ہی زور دے رہے تھے۔ انہوں نے بعد میں اپنے مصاحبین سے کہا کہ وہ ان پناہ گزینوں کو اس خیال سے مدینہ سے نکال رہے تھے کہ انہیں آرام سے حاصل ہو جانے والی روٹی کا چکانہ پڑ جائے۔ حضرت عمرؓ کا خیال یہ تھا کہ لوگ فوراً بھتی باڑی میں لگ جائیں۔

○

ہم اس داستان کو پیچھے اُس مقام پر لے جاتے ہیں جہاں روزی ایک بار پھر قربانی سے بچ گئی تھی اور پادری اور اس کے ساتھی اس کے انتظار میں نیل کے کنارے اُس جگہ کھڑے تھے جہاں سے روزی کو نیل میں پھینکنا تھا۔ ماہی گیروں کا سردار بابا اس توقع پر وہاں پہنچا تھا کہ روزی کو اُن تین آدمیوں نے اُس جگہ پہنچا دیا ہو گا جن تین آدمیوں نے

اسے یقین دلایا تھا کہ وہ روزی کو قربانی کی جگہ پہنچا دیں گے لیکن انہوں نے راستے میں ششی رانوں کو قتل کر کے دریا میں پھینک دیا اور روزی کو لے اڑے۔ اس کے بعد روزی راجہ بن گئی۔

ماہی گیروں کے سردار نے وہاں پہنچ کر پادری کو بتایا کہ اس نے روزی کو تین اجنبی آدمیوں کے ساتھ پہلے ہی بھیج دیا تھا تو سب حیران ہوئے کہ لڑکی کئی کہاں!.... بڑے پادری نے یہ فتویٰ دیا کہ نیل کو اس لڑکی کی قربانی قبول نہیں، نیل اُسی لڑکی کو چاہتا ہے جس کو قربانی کا فیصلہ پہلے ہوا تھا۔

وہ لڑکی ہوریش کی اکلوتی بیٹی تھی جسے دریا میں ڈوب مرنے سے بچانے کے لئے اس نے روزی کو دھوکا دیا اور انطاکیہ سے اسے ساتھ لے گیا تھا۔ قربانی کے دستور کے مطابق اس نے اپنی بیٹی کے سارے زیورات روزی کو پہنا دیئے تھے۔ وہ بڑے ہی قیمتی زیورات تھے جو باپ نے اپنی بیٹی کی زندگی پر قربان کر دیئے تھے مگر ہوا یہ کہ زیورات بھی گئے اور روزی بھی ہاتھ سے نکل گئی، اور اب پادری نے یہ فیصلہ دے دیا کہ ہوریش کی بیٹی کو ہی نیل کے حوالے کر دیا جائے اور اسے زیورات سے سجانے کی کوئی ضرورت نہیں، چنانچہ ہوریش کی بیٹی کو چگا کر لے آئے اور پاروی نے اپنے ہاتھوں اسے دریا میں پھینک دیا۔

یہاں سے یہ داستان یوں آگے چلی کہ بیٹی کے صدے نے ہوریش کے دل دو باغ کو ماؤف کر دیا۔ یہ بیٹی اس کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس پر وہم طاری ہونے لگے جن میں ایک یہ تھا کہ ان لوگوں نے اس لڑکی یعنی روزی کو قربانی سے بچانے کے لئے خود غائب کیا ہے اور اس کی بیٹی کو مروا ڈالا ہے۔ ہوریش اپنے مذہب کو بھول ہی گیا اور اس کی جگہ انتقام کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ بیٹی کے صدے کے ساتھ یہ چوٹ بھی کچھ کم نہ تھی کہ اس کے بڑے ہی قیمتی زیورات بھی ضائع ہو گئے تھے۔

ہوریش کی سبقتی سے تقریباً تین میل دور روی فوج کی ایک چوکی تھی جس میں انفر، ایک عمدیدار اور چند ایک سپاہی رہتے تھے۔ شاہ ہرقل کو بڑی اچھی طرح احساس ہو گیا تھا کہ مصر کے لوگ اس کے حق میں نہیں رہے۔ وجہ بڑی صاف تھی جس کا تفصیلی ذکر پیچھے ایک باب میں آگیا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے جو سرکاری عیسائیت رائج کی تھی، اسے لوگ قبول نہیں کر رہے تھے۔ لڑکی کی قربانی کو تو اس نے قتل جیسا

جرم قرار دے دیا تھا۔ پھر بھی قطبی عیسائی چوری چھپے لڑکیوں کی قربانی دے رہے تھے۔ لوگوں پر دہشت طاری رکھنے کے لئے اور لڑکی کی قربانی روکنے کے لئے ہر قتل نے مصر کے دیہاتی اور دور دراز علاقوں میں بھی چھوٹی بڑی چوکیوں کی صورت میں اپنی فوج پھیلا رکھی تھی۔ ان چوکیوں کے فوجی اپنے اپنے علاقے میں گشت کرتے رہتے اور لوگوں کو ڈراتے رہتے تھے۔ ہوریش کی بستی سے کچھ دور ایسی ہی چوکی تھی جس کے فوجی اکثر اس بستی میں گشت کے لئے آتے رہتے تھے۔

ہوریش کو اس چوکی کا خیال آیا تو اس کے اندر انتقام کی جو آگ سلگ اٹھی تھی وہ بہت بڑا شعلہ بن گئی اور وہ اس چوکی کی طرف چل پڑا۔ چوکی پر جا کر چوکی کے کمانڈر سے ملا اور اسے بتایا کہ ان کے پادری نے اس کی بیٹی کو اس کی مرضی کے خلاف زبردستی گھر سے اٹھا کر دریا میں پھینک دیا ہے۔

رومی افسر غصے سے بھڑک اٹھا اور پادری اور دیگر ذمہ دار افراد کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہوریش نے اسے روک لیا اور کہا کہ وہ یہ کارروائی اس طرح کرے کہ یہ ظاہر نہ ہو کہ ہوریش نے خبری کی ہے۔ ہوریش کو ڈر یہ تھا کہ بستی والوں کو صحیح بات کا علم ہو گیا تو وہ اسے اور اس کی بیوی کو قتل کر دیں گے۔ ہوریش نے یہ بھی کہا کہ وہ گھر پہنچ جائے تو کچھ دیر بعد فوجی آئیں اور ہوریش کے ساتھ اس طرح بات کریں جیسے وہ بھی اپنی بیٹی کی قربانی کا مجرم ہے۔

رومی افسر بات سمجھ گیا اور ہوریش کو واپس بھیج دیا۔ ہوریش نے اپنی بیوی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کیا کر رہا ہے۔

○

دن آدھے سے کچھ زیادہ گزر گیا تھا۔ ہوریش کی بستی کے لوگوں نے دوڑتے گھوڑوں کے ٹاپ سننے جو بستی کی طرف بڑھتے آ رہے تھے۔ یہ کوئی بڑی بستی نہیں تھی۔ بیس پچیس مکانوں کی چھوٹی سی آبادی تھی۔ لوگ گھروں سے نکل کر باہر آ گئے۔ انہوں نے گھوڑوں کو اور سواروں کو بھی پہچان لیا۔ یہ ان کے اپنے فوجی تھے جو گشت پر آتے ہی رہتے اور بستی کے لوگوں کے ساتھ گپ شپ بھی لگایا کرتے تھے۔

ان میں ایک افسر، ایک جوان سال عمید اور کم و بیش بیس سپاہی تھے۔ قریب آ کر انہوں نے بستی کو گھیرے میں لے لیا۔ افسر نے اعلان کیا کہ کوئی مرد یا عورت بھاگنے

کو شش نہ کرے اور تمام لوگ باہر آ جائیں۔

بستی کے لوگوں پر خوف طاری ہو گیا۔ یہ سب قطبی عیسائی تھے اور اپنے بادشاہ رنل کی سرکاری عیسائیت کے سخت خلاف تھے اور یہ لوگ لڑکی کی قربانی میں بھی یقین رکھتے تھے۔ انہیں ڈرنا ہی چاہئے تھے۔

”ہوریش کون ہے؟“ — رومی نے کہا — ”جو کوئی بھی ہے سامنے آ جائے۔“ ہوریش آگے ہو گیا۔ افسر گھوڑے سے اتر آیا اور اس نے اپنے سوار سپاہیوں سے بھی کہا کہ گھوڑوں سے اتر آئیں اور گھوڑے ایک جگہ کھڑے کر کے بستی کے در گرد پھیلے رہیں۔

”کیا گذشتہ رات تم نے اپنی بیٹی کو قربانی کے لئے دریا میں پھینک دیا؟“ — رومی افسر نے پوچھا۔

ہوریش نے تو انکار ہی کرنا تھا کیونکہ یہ پہلے طے ہو چکا تھا کہ یہ ظاہر نہیں ہونے دیا جائے گا کہ یہ خبری ہوریش نے کی ہے۔ رومی افسر نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ اپنے طور پر تفتیش کر رہا ہے، ہوریش سے کہا کہ وہ اپنی بیٹی کو سامنے لائے۔ ”میں ابھی تمہارا جھوٹ ثابت کر دوں گا“ — رومی افسر نے کہا — ”میں جانتا ہوں تمہاری بیٹی ایک ہی بیٹی تھی۔ میں کسی شک پر نہیں آیا، پورے یقین کے ساتھ آیا ہوں۔ اگر تم سچے ہو تو اپنی بیٹی کو سامنے لے آؤ۔ میں تمہیں مہلت بھی دے دیتا ہوں۔“

چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ سولہ سترہ سال عمر کی ایک بڑی ہی خوبصورت لڑکی دوڑتی آئی اور رومی افسر کے سامنے جا کر اس نے کہا کہ میں ہوں ان کی بیٹی۔

”میں گھر میں نہیں تھی“ — لڑکی نے کہا — ”میں لڑکیوں کے ساتھ کسی دوسرے گھر کی چھت پر کھڑی دیکھ رہی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک آدمی دوڑا آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ آپ لوگ میرے باپ پر یہ الزام عائد کر رہے ہیں کہ اس نے مجھے نکلی نذر کر دیا ہے۔ میرا باپ اس لئے پریشان ہو گیا تھا کہ میں گھر میں نہیں تھی۔“

رومی افسر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں طنز تھی جیسے وہ جان گیا ہو کہ اسے یقین تھا کہ یہ سب سچا ہے۔ اس نے ویسے ہی ایک آدمی کی طرف اشارہ کر کے اپنے پاس بلایا اور اس سے پوچھا کہ یہ لڑکی کس کی بیٹی ہے۔

”ہوریش کی!“ — اس آدمی نے نڈر ہو کر جواب دیا۔

رومی افسر نے ایک اور آدمی کو اپنے پاس بلا کر یہی سوال پوچھا۔

”میں حیران ہوں آپ پوچھ کیا رہے ہیں!“ — اس شخص نے جواب دیا۔ ”آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ یہ بیٹی کس کی اور فلاں بچہ کس کا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ ہوریش کی بیٹی ہے اور اس کا نام اپنی ہے۔“

رومی افسر بستی کے تمام لوگوں سے مخاطب ہوا اور یہی سوال پوچھا۔ بستی کی ساری آبادی نے بیک زبان جواب دیا کہ یہ ہوریش کی بیٹی ہے۔ رومی افسر کو معلوم نہیں تھا کہ ان لوگوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایسا کر لیا ہے اور یہ لوگ جان گئے ہیں کہ ہوریش کی بیٹی کی قربانی کی خبر کسی عذار نے فوجیوں تک پہنچادی ہے اور اگر اس افسر نے ثابت کر دیا کہ یہ خبر صحیح ہے تو کوئی بعید نہیں کہ یہ بستی کو ہی آگ لگا دیں۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ہرقل اور اس کے مقرر کئے ہوئے اسقفِ اعظم قیصر کے دلوں میں ان لوگوں کے لئے ذرا سا بھی رحم نہیں تھا جو ان کی سرکاری عیسائیت کے خلاف تھے۔

رومی افسر چکر اگیا۔ اسے شک ہوا کہ ہوریش کسی ذاتی وجہ کی بنا پر اسے بستی والوں کے خلاف استعمال کر رہا ہے۔ اس نے بڑے غصے کے عالم میں ہوریش کو بازو سے پکڑا اور ایک طرف لے گیا۔

”تمہارے دل میں جو بد معاشی ہے وہ فوراً بتا دو“ — رومی افسر نے کہا۔

”نہیں بتاؤ گے تو یہیں سب کے سامنے تمہارا سرا اڑا دیا جائے گا۔“

”سچ بولوں گا تو یہ لوگ میرا سرا اڑا دیں گے۔“ ہوریش نے سرگوشی میں جواب دیا۔

”میں سچ ہی بتاؤں گا لیکن ان لوگوں سے مجھے بچانا آپ کا کام ہے۔“

”تم سچ بولو“ — رومی افسر نے کہا۔

ہوریش نے بتا دیا کہ یہ اس کی بیٹی نہیں اور یہ فلاں شخص کی بیٹی ہے اور اس نے لڑکی کی ماں کا نام بھی بتا دیا۔

یہ بستی دریائے نیل کے کنارے پر آباد تھی۔ وہاں کنارہ خاصا اونچا اور چٹانی تھا۔ وہیں سے دریا مڑتا تھا اور پائت تنگ تھا اس لئے وہاں دریا گہرا بھی تھا اور اس کا جوش و خروش بھی زیادہ تھا۔ لڑکیوں کی قربانی اسی کنارے سے لڑکی کو دھکا دے کر دی جاتی تھی۔ جس لڑکی کی قربانی دی جاتی تھی اسے نیل کی دہن کہا جاتا تھا اور اسے ایک مقدس

آہانی مخلوق سمجھ کر یاد کیا جاتا تھا۔

رومی افسر نے لڑکی کے باپ کو اور اس کی ماں کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ یہ کس کی بیٹی ہے۔ دونوں نے جواب دیا کہ یہ ہوریش کی بیٹی ہے۔ ان لوگوں کے مذہبی جذبے کا یہ عالم تھا کہ لڑکی کی ماں نے رومی افسر کو ایک دو باتیں بڑے غصے میں کہہ ڈالیں اور یہ بھی کہا کہ تم لوگ ہمیں ذلیل و رسوا کرنے کے لئے آ جاتے ہو۔

رومی افسر نے سچ معلوم کرنے کے لئے ایک انوکھی ترکیب سوچ لی۔ اس نے لڑکی کو بازو سے پکڑا اور دریا کے بلند کنارے پر جا کھڑا کیا۔ دو سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ لڑکی کو کنارے سے ذرا پیچھے رکھیں اور اس کے دائیں بائیں کھڑے رہیں۔ وہ خود لوگوں سے مخاطب ہوا۔

”میں اس لڑکی کو دریا میں پھینک رہا ہوں“ — رومی افسر نے کہا۔ ”اگر اس کی ماں اسے بچانا چاہتی ہے تو اسے اپنے ساتھ لے جائے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کی ماں اور لڑکی کے باپ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ میں تمہیں سوچنے کی مہلت دیتا ہوں۔ کوئی جلدی نہیں۔ اچھی طرح سوچ لو۔“

لڑکی دریا کے کنارے کھڑی تھی۔ رومی فوج کے دو سپاہی اس کے قریب کھڑے تھے اور رومی افسر بستی کے لوگوں اور لڑکی کے درمیان بڑے آرام سے ٹہلنے لگا۔ اس نے بڑی اچھی ترکیب سوچی تھی۔ کوئی ماں برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کی اولاد کو اس کی آنکھوں کے سامنے اتنے پر شور دریا میں پھینک دیا جائے۔ ہوریش اور اس کی بیوی کے جذبات سکے ماں باپ والے تو ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ توقع یہی تھی کہ لڑکی کی سگی ماں اپنی بیٹی کو بچانے کے لئے دوڑی آئے گی مگر وہاں جو ہوا اس کی تو کسی کو توقع ہی نہیں تھی۔ ہوا یہ کہ بستی کے ایک پہلو سے ایک گھوڑا سرپٹ دوڑتا نکلا۔ سب نے اُدھر دیکھا۔ گھوڑا سوار رومی فوج کی اس پارٹی کا عہدیدار تھا۔ اس کا رخ لڑکی کی طرف تھا۔ فاصلہ بہت ہی تھوڑا تھا۔

”اپنی ہوشیار!“ — گھوڑا سوار نے پُر جوش آواز میں کہا۔

لڑکی نے اُدھر دیکھا۔ سوار سرپٹ دوڑتے گھوڑے سے لڑکی کی طرف جھکا اور دایاں بازو اس کی طرف پھیلا یا۔ لڑکی نے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ کسی کو کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ دونوں سپاہی جنہیں ان کے افسر نے لڑکی کے کپڑے پر کھڑا کیا تھا، کچھ

سمجھ گئے اور دونوں گھوڑے کے آگے آگے لیکن گھوڑا ان تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے دونوں کو ایسی نکر ماری کہ ایک تو لڑھکتا ہوا دریا میں جا گر اور دوسرا دوسری طرف گرا۔ اس میں اٹھنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔

گھوڑے کی رفتار اور تیز ہو گئی اور جب گھوڑا آگے نکلا تو لڑکی کنارے پر نہیں تھی بلکہ سوار کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی اور اس نے دونوں بازو سوار کی کمر کے گرد لپیٹ لئے تھے۔ فوجیوں کے گھوڑے ایک طرف کھڑے تھے۔ ان کے افسر نے تعاقب کا حکم دیا لیکن تعاقب محض بیکار تھا۔ یہ سب کچھ چند سیکنڈ میں ہو گیا۔

فوجی اپنے گھوڑوں کی طرف دوڑے، گود کر سوار ہوئے اور اپنے عہدیدار کے پیچھے گھوڑے دوڑا دیئے۔ عہدیدار کا گھوڑا بھی فوجی گھوڑا تھا اور وہ خاصی دور نکل گیا تھا۔ تعاقب اس لئے بیکار تھا کہ آگے علاقہ کچھ پہاڑی اور زیادہ تر جنگلاتی تھا۔ عہدیدار کسی کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے گھوڑے کے ٹاپ سنائی دے رہے تھے جو اس کی رفتار کے ساتھ دور ہتے جا رہے تھے۔ سپاہی کچھ دور تک گئے اور ناکام لوٹ آئے۔

○

اس فوجی عہدیدار کا نام بن سامر تھا۔ جواں سال اور بڑا ہی خوب رو آدمی تھا۔ وہ جب گشت پر نکلتا تو اس بستی میں ضرور آتا تھا۔ ایک بار اپنی اور بن سامر کا آمناسامنا ہو گیا۔ جگہ ایسی تھی جہاں اور کوئی نہ تھا۔ بن سامر نے اپنی کارستہ روک لیا۔ اپنی مسکراتے مسکراتے سنجیدہ ہو گئی اور اس کے معصوم اور بھولے بھالے چہرے پر خوف کے آثار آ گئے۔

”تم فوجی ہو ناں!“ — اپنی نے کہا — ”تم سمجھتے ہو کہ جو چاہو کر سکتے ہو۔ ہم لوگوں پر یہی الزام کافی ہے کہ ہم قبیلے ہیں اور بادشاہ کے مذہب کو نہیں مانتے۔ تم مجھے زبردستی اٹھالے جاؤ گے....“

بن سامر پر رومانی موڈ طاری تھا۔ اس نے اپنی کی یہ بات سنی تو اپنی کی طرح اس کے چہرے پر بھی سنجیدگی آ گئی۔ وہ ایک طرف ہو گیا۔ اپنی شاید بن سامر کے چہرے کے بدلے ہوئے تاثر سے متاثر ہو گئی۔ بن سامر نے اسے رستہ دے دیا تھا۔ اسے بھاگ جانا چاہئے تھا لیکن وہ وہیں کھڑی رہی۔

”میں تمہارے نام سے بھی واقف ہوں اپنی!“ — بن سامر نے کہا — ”تمہیں

دور دور سے دیکھتا رہا ہوں۔ میری نیت بد ہوتی تو تمہیں اٹھوا لیتا میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں تمہارے ماں باپ کو حکما اپنی چوکی پر بلوا سکتا تھا۔ تم بھی دوڑی آتیں۔“

بن سامر جذباتی ہوتا چلا گیا اور اپنی پر جیسے سحر طاری ہو گیا تھا۔ وہ بن سامر کی پرسش شخصیت میں تحلیل ہوتی چلی گئی۔ اس پہلی ملاقات کے بعد اپنی کئی بار بن سامر سے ملی۔ بن سامر نے اپنی کو عملاً ”یقین دلا دیا تھا کہ وہ اپنی کی عصمت کا لیرا نہیں محافظ ہے۔“

”میں تمہیں راز کی ایک بات بتانا چاہتا ہوں اپنی!“ — ایک ملاقات میں بن سامر نے اپنی سے کہا — ”اب مجھے تم پر اعتبار آ گیا ہے کہ تم میرے راز کو اپنا ایک بڑا ہی نازک راز سمجھو گی.... میں قبیلے عیسائی ہوں لیکن ظاہر یہ کر رکھا ہے کہ میں شاہ ہرقل اور قیرس کی عیسائیت کا پیروکار ہوں لیکن میں کسی لڑکی کو نیل کی دلہن بنانے کو گناہ سمجھتا ہوں۔ میں قیرس کو اسقف اعظم نہیں مانتا۔ ہمارا اسقف اعظم بنیامین ہے۔ وہ لڑکی کی قربانی کے تحت خلاف ہے۔“

بن سامر اور اپنی عیسائی تھے۔ وہ جب چاہتے شادی کر سکتے تھے لیکن بن سامر نے اپنا اخلاقی فرض سمجھا کہ اپنی کے والدین سے اجازت لے لے۔ ایک روز اس نے اپنی کے والدین کے ساتھ بات کی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموش رہے۔ آخر اپنی کے باپ نے کہا کہ وہ اپنی کو جواب دے گا اور اپنی بن سامر کو بتا دے گی۔

اگلے ہی روز بن سامر گشت کے بہانے آیا اور اپنی باہر جا کر اسے ملی۔

”نہیں بن سامر!“ — اپنی نے بن سامر کو اپنے باپ کا جواب سنایا — ”نہ میرا باپ رضامند ہے نہ ماں۔ وہ کہتے ہیں فوجی قابلِ اعتماد نہیں ہوا کرتے“ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ فوجی سرکاری عیسائیت کے پیروکار ہوتے ہیں۔“

”کیا تم نے انہیں بتایا نہیں؟“ — بن سامر نے پوچھا۔

”بتایا ہے“ — اپنی نے جواب دیا — ”میں نے بتایا ہے کہ بن سامر قبیلے عیسائی ہے اور بنیامین کو اپنا اسقف اعظم مانتا ہے۔ باپ نے کہا کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ کوئی فوجی کسی دوسری عیسائیت کا پیروکار نہیں ہو سکتا۔ باپ نے یہ بھی کہا کہ اب تم بن سامر سے مناجھوڑو۔“

ہے۔ میں تمہارا یہ اتحاد قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ تمہاری بستی کو کوئی نہیں جلائے گا لیکن اس بستی میں سے کسی لڑکی کی قربانی دی گئی تو پھر میرا رویہ وہی ہو گا جو شاہ ہرقل کے حکم کے مطابق ہونا چاہئے۔“

”ہم اپنے بڑے پادری کے حکم کے پابند ہیں“ — ایک آدمی نے کہا۔

رومی افسر نے ان لوگوں سے معلوم کر لیا کہ بڑا پادری کہاں رہتا ہے اور اس کے ساتھ اس قسم کی کارروائیوں میں کون کون ہوتا ہے۔ لوگوں نے رومی افسر کو یہ ساری معلومات دے دیں۔ ہوریش نے ماہی گیروں کے سردار کا نام بھی بتا دیا۔

رومی افسر نے اسی وقت وہاں سے اپنے سپاہیوں کو اکٹھا کیا اور اُس بستی کی طرف گھوڑوں پر سوار ہو کر چلا گیا جس میں بڑا پادری رہتا تھا۔ پادری وہاں مل گیا۔ اس کے تین چار چیلے بھی اسی بستی میں رہتے تھے۔ ان سب کو گرفتار کر لیا گیا۔ اُسی رات رومی افسر اس بستی میں پہنچا جہاں ماہی گیروں کا سردار بایا رہتا تھا۔ اسے بھی گرفتار کر لیا گیا۔

○

دوسرے دن رومی افسر چند ایک گھوڑ سوار سپاہیوں کے ساتھ پھر اس بستی میں جا پہنچا جہاں لڑکی کی قربانی دی گئی تھی۔ اب اس کے ساتھ فوج کا ایک بڑا افسر بھی تھا۔ اس کے علاوہ اس کے ساتھ بڑا پادری، پادری کے تین چار ساتھی اور ماہی گیروں کا بایا بھی تھا۔ یہ سب زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے اور ان کے پیروں میں بیڑیاں تھیں۔ بستی کی ساری آبادی کو باہر نکال لیا گیا۔ زنجیروں میں بندھے ہوئے ملزموں کو دریا کے اونچے چٹائی کنارے پر کھڑا کر دیا گیا۔

”اے نہیں غور سے دیکھو“ — بڑے فوجی افسر نے لوگوں سے کہا اور پوچھا — ”کیا یہی ہیں وہ لوگ جنہوں نے پہلے ایک لڑکی کو یہاں سے دریا میں پھینکا تھا اور پھر ہوریش کی بیٹی کو بھی دریا میں پھینک دیا تھا؟“

”یہی ہیں“ — یہ ہوریش کی آواز تھی۔

”یہی ہیں“ — دو تین اور آوازیں اٹھیں۔

”سب بولو“ — فوجی افسر نے کہا۔

”ہاں، یہی ہیں“ — ساری آبادی بول اٹھی۔

افسر نے سر سے اشارہ کیا۔ سپاہی مجرموں کی طرف دوڑے گئے، ان کی زنجیروں اور

بیڑیاں اتار لیں اور انہیں دریا کے اونچے کنارے پر کھڑا کر دیا۔ دوسرے کئی ایک سپاہیوں کے پاس تیر اور کمانیں تھیں۔ اپنے افسر کے اشارے پر انہوں نے کمانوں میں تیر ڈالے اور دوسرے ہی لمحے یہ تیر مجرموں کے جسموں میں داخل ہو چکے تھے۔ ان میں سے کچھ اس طرح گرے کہ بلند کنارے سے دریا میں جا پڑے اور جو ایک دو کنارے سے ہٹ کر گرے انہیں سپاہیوں نے پاؤں کی ٹھوکروں سے دریا میں پھینک دیا۔

اُس وقت بن سامر اور اپنی وہاں سے بہت دور ریگستان میں جا رہے تھے۔ اپنی بن سامر کے پیچھے گھوڑے پر بیٹھی تھی۔

”مجھے صرف اپنے ماں باپ کا خیال آتا ہے“ — اپنی کہہ رہی تھی — ”رومی فوجی انہیں مار ڈالیں گے۔“

”کچھ تو قربانی دینی پڑتی ہے اپنی!“ — بن سامر نے کہا — ”میرے بھی ماں باپ ہیں اور یہ بھی دیکھو کہ میں نے اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈال دیا ہے۔ میں جب پکڑا جاؤں گا تو مجھے جلاؤ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ ایک تو میں نے فوجی قانون کی خلاف ورزی کی ہے اور فوج کے دو سپاہیوں کو مار آیا ہوں۔ وہ جو دو سپاہی میرے گھوڑے کے آگے آگئے تھے وہ زندہ نہیں رہے ہوں گے۔ اب پیچھے نہ دیکھو، آگے کا خیال کرو۔ میں نہیں قبلی عیسائیوں کے بڑے پادری بنیامین کے پاس لے جا رہا ہوں۔ وہ کوئی راستہ دکھادے گا۔“

بن سامر کو بنیامین کے ٹھکانے کا علم تھا۔ پچھلے باب میں بیان ہو چکا ہے کہ بنیامین شہروں اور بستیوں سے بہت دور دشوار گزار ریگستان میں ایک ایسی جگہ روپوش تھا جس کے ارد گرد ریت اور مٹی کے ٹیلے اور نشیب و فراز تھے۔ بن سامر کو یہ ٹھکانہ اس طرح معلوم تھا کہ وہ بنیامین کی ہی ایک خفیہ تنظیم کا آدمی تھا۔

ہرقل نے قیرس نام کے ایک بڑے پادری کو اپنی بیٹی ہوئی عیسائیت کا استقف اعظم بنادیا اور اسے کلی اختیارات دے دیئے تھے کہ وہ ظلم اور درندگی کے ذریعے سرکاری عیسائیت لوگوں سے منوائے۔ قیرس نے کسی ایسے پادری کو زندہ نہیں رہنے دیا تھا جس نے اس کی اور ہرقل کی عیسائیت قبول نہیں کی تھی۔ انہیں صرف مار ہی نہیں ڈالا تھا بلکہ ایسی اذیتیں دی تھیں کہ وہ مرتے بھی نہیں اور جیتے بھی نہیں تھے۔ مثلاً ”اپنے مخالف کے کپڑے اتار کر اور لٹا کر اس کے جسم پر دھکتے ہوئے انگارے یا جلتی ہوئی

مشعلیں رکھ دی جاتی تھیں اور پھر اسے کہا جاتا تھا کہ وہ ہر قل کی عیسائیت کو قبول کر لے اور اسی عیسائیت کو گرجوں میں رائج کرے۔

یہ تو سرکاری کارروائیاں تھیں جو کھلم کھلا کی جاتی تھیں تاکہ لوگوں کے دلوں پر دہشت طاری ہو جائے لیکن بنیامین نے ایک خفیہ تنظیم بنالی تھی جس میں عیسائیت کے عالم بھی تھے اور بن سامر جیسے دلیر اور نڈر فوجی بھی تھے جو اپنی جان پر کھیل جانے کو ایک کھیل ہی سمجھتے تھے۔ بن سامر اسی تنظیم کا جاناں تھا۔ اسے بنیامین کے ہاں ہی پناہ مل سکتی تھی۔

○

بن سامر اور اپنی کو ایک رات اور راستے میں گذارنی پڑی اور اگلے روز وہ بنیامین کے پاس پہنچ گئے۔

”کیا کر آئے بن سامر!“ — بنیامین نے پوچھا — ”یہ لڑکی کون ہے؟“
”اپنے عقیدے کے لئے تو کچھ نہیں کیا“ — بن سامر نے جواب دیا — ”اپنی ذات اور اپنے جذبات کے لئے بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔“

اس نے بنیامین کو ساری بات سنا دی۔
”کوئی بُرا نہیں کیا“ — بنیامین نے کہا — ”تم نے اپنی محبت اور اس لڑکی کی جان بچانے کے لئے بہت بڑی قربانی دی ہے۔ تمہیں چھپ کر رہنا پڑے گا۔“
”رہوں گا تو میں چھپ کر ہی!“ — بن سامر نے کہا — ”لیکن میں بیکار نہیں بیٹھوں گا۔ میں شاہی عیسائیت کے خلاف کچھ نہ کچھ کرتا رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں۔“

بنیامین نے کچھ عالمانہ سی باتیں شروع کر دیں۔
”قابل احترام استغف!“ — بن سامر نے کہا — ”میرے پاس انتہا علم نہیں کہ آپ کی یہ باتیں سمجھ سکوں۔ مجھے صرف یہ بتائیں کہ صحیح عقیدے کو لوگوں میں پھیلانے کے لئے کسے قتل کرنا ہے اور کوئی اپنا دشمن بتائیں جس سے آپ کو بہت ہی خطرہ ہو اور میں جا کر اسے قتل کر دوں۔“

”ابھی تم خود قتل ہونے سے بچو“ — بنیامین نے کہا — ”تم فوجی قانون کے مطابق جو جرم کر کے آئے ہو اس کی سزا تم جانتے ہی ہو کیا ہے۔ ابھی اپنے آپ کو

رُپوش رکھو۔ کچھ عرصے بعد میں تمہارا حلیہ بدل کر تمہیں اصل مقصد کے لئے استعمال کروں گا۔“

”میں ایک بات سمجھتا ہوں“ — بن سامر نے کہا — ”ہر قل کو عیسائیت کی توہین کی جو سزا ملی ہے اس سے اس نے عبرت حاصل نہیں کی۔ شام کا اتنا بڑا ملک اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے اور اس کی آدھی سے زیادہ فوج مسلمانوں کے ہاتھوں کٹ مری ہے اور اس وقت جو فوج اس کے پاس ہے اس پر عرب کے مسلمانوں کی ایسی دہشت طاری ہے کہ کوئی مذاق میں ہی کہہ دے کہ مسلمان مصر پر بھی حملہ کریں گے تو ہمارے فوجیوں کے رنگ پیلے پڑ جاتے ہیں۔“

”مذہب کی توہین جس نے بھی کی اُسے ایسی ہی سزا ملی“ — بنیامین نے کہا — ”اسلام کی طرح عیسائیت بھی ایسا مذہب ہے جس پر خدا نے کتاب نازل کی ہے۔ ہر قل نے شمشادیت کے نشے میں اس مقدس کتاب کی خلاف ورزی کی ہے۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ مصر بھی ہر قل کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ مذہب کو فرقوں میں بانٹ دینا بہت بڑا گناہ ہے۔“

”کیا مسلمان مصر پر چڑھائی کریں گے؟“ — بن سامر نے پوچھا۔
”اب تک کر چکے ہوتے“ — بنیامین نے کہا — ”لیکن مسلمانوں پر قحط کا ایسا غذاب نازل ہوا ہے کہ سارے عرب میں لوگ بھوک سے مر رہے ہیں۔ مجھے وہاں کی خبریں ملتی رہتی ہیں۔ قحط ختم ہونے تک تو مسلمان فوج کشی کی سوچ بھی نہیں سکتے۔“
”استغف اعظم!“ — بن سامر نے کہا — ”ایک بات دل میں آتی ہے۔ مسلمان جب کبھی مصر پر حملہ کریں گے تو ہمیں ان کے خلاف لڑنا پڑے گا لیکن میں سوچتا ہوں کہ جس طرح مسلمان ہر قل کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں اسی طرح وہ ہمارا بھی دشمن ہے۔ کیا ہمیں ہر قل کی وفاداری کرنی چاہئے؟“

”یہ مسئلہ میرے سامنے آچکا ہے“ — بنیامین نے کہا — ”شام سے تین مسلمان جاسوس میرے پاس آئے تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو عیسائی ظاہر کیا تھا لیکن میں نے ان کی اصلیت جان کر انہیں بتا بھی دیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ مسلمان لشکر مصر پر حملہ آور ہوں تو عیسائی ہر قل کے خلاف حملے سے پہلے یا حملے کے دوران باغی ہو جائیں۔ ان کے غلیفہ اور سالاروں کا مقصد یہ ہے کہ پہلے ہر قل کو مصر سے نکالا جائے، اس کے بعد

مسلمان اور عیسائی آپس کے معاملات طے کر لیں گے.... تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی صورت میں قطبی عیسائی تماشائی بنے رہیں گے لیکن یہ بھی سن لو کہ ابھی یہ میرا آخری فیصلہ نہیں البتہ یہ فیصلہ ضرور ہے کہ قطبی عیسائی ہر قتل کے وفادار نہیں ہوں گے۔“

یہ تو بعد کی باتیں تھیں۔ بن سامر کو کچھ عرصے تک روپوش رہنا تھا۔ ایک لڑکی کو بھگالے جانا ان کے ہاں کوئی جرم نہیں تھا، اصل جرم تو یہ تھا کہ بن سامر نے فوجی قانون توڑا اور دو سپاہیوں کو مار گیا تھا۔

○

سالار عمرو بن عاص نے اولیں اور رابعہ کی شادی کر دی۔ یہ بیت المقدس کی بات ہے۔ عمرو بن عاص اب امیر المومنین حضرت عمرؓ کے پاس مدینہ جانا چاہتے تھے تاکہ ان سے مصر پر حملے کی اجازت لیں مگر ان کی روانگی سے پہلے ہی مدینہ سے پیغام آ گیا کہ جنگ سالی نے ایسا قحط پیدا کر دیا ہے کہ لوگ مرنے لگے۔

اس کے بعد تو کسی کو ہوش ہی نہ رہی کہ قحط زدہ لوگوں کے پیٹ میں روٹی ڈالنے کے علاوہ کچھ اور بھی سوچ سکتے۔ قحط کی تباہ کاریاں نو مہینے پورے جوش و خروش سے جاری رہیں۔ عمرو بن عاص کے ذہن سے تو جیسے مصر نکل ہی گیا تھا۔ قحط کی زد میں تو صرف عرب آیا لیکن قحط زدہ علاقوں کو خوراک مہیا کرنا عراق اور شام کے امراء کی ذمہ داری تھی۔ آخر انہیں یہ خبر پہنچی کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے امیرِ رحمت برسا دیا ہے تو عمرو بن عاص کو خیال آیا کہ وہ تو مصر پر حملے کا ارادہ کئے ہوئے تھے۔

اولیں رابعہ کے ساتھ ابھی بیت المقدس میں ہی تھا۔ اس کے دونوں جاسوس ساتھی بھی جو مصر جا کر بنیامین سے مل آئے تھے ابھی اس کے ساتھ ہی تھے۔ انہیں مختلف علاقوں سے بلایا گیا تھا کیونکہ یہ بہت ہی تجربہ کار اور ذہین جاسوس تھے۔ انہیں اپنے اپنے لشکروں میں واپس چلے جانا چاہئے تھا لیکن عرب کے قحط نے سارا نظام ہی تہہ و بالا کر ڈالا تھا اس لئے یہ تینوں جاسوس مجاہدین بیت المقدس میں ہی پڑے رہے۔

قحط کے بعد جب انتظامی حالات معمول پر آئے تو سپہ سالار ابو عبیدہؓ نے عمرو بن عاص کو پیغام بھیجا کہ تینوں مجاہدین کو ان کی اصل جگہوں پر واپس بھیج دیں۔ اولیں حلب سے آیا تھا اور وہ رہنے والا بھی وہیں کا تھا اس لئے اسے واپس حلب جانے کا حکم مل گیا۔

رابعہ جو قبول اسلام سے پہلے روزی ہوا کرتی تھی مصر سے واپس آتے ہی اولیں کے پیچھے پڑ گئی تھی کہ وہ حلب اپنے ماں باپ سے ملنے کے لئے جانا چاہتی ہے۔ اولیں اسے کہتا تھا کہ وہ اپنے والدین اور دوسرے قریبی عزیزوں سے ملنے کے لئے اتنی بے تابی نہ دکھائے کیونکہ وہ اسے دیکھ کر خوش نہیں ہوں گے اور اس کے قبول اسلام کو اچھی نظر سے نہیں دیکھیں گے۔ اولیں بھی نو مسلم تھا۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی کہ جو ستاویہ حیران ہوتا، یہ تو اس وقت کا ایک معمول تھا۔ غیر مسلم مسلمانوں کے حسن اخلاق سے متاثر ہو کر قبول اسلام کرتے ہی رہتے تھے لیکن اولیں نے اسلام قبول کیا تو نہ جانے کیوں اس کے بھائی، باپ اور دوست اس کے دشمن ہو گئے تھے۔ صرف ایک وجہ سمجھ میں آتی ہے جو یہ ہو سکتی ہے کہ اولیں غیر معمولی طور پر دلیر اور بے خوف تھا اور اس کا جسم تو پھرتا تھا ہی، اس کے دماغ میں ایک خاص قسم کی مستعدی اور دانشمندی تھی۔ اس کے عزیزوں نے یہی سوچا ہو گا کہ اتنا قیمتی اور ایسا جواں سال آدمی ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔

اس نے رابعہ کو یہ صورت حال یاد دلائی تھی اور یہ بھی کہ خود رابعہ نے اسے دھتکار دیا تھا۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ رابعہ جب روزی ہوا کرتی تھی تو اولیں کو جب وہ راہن ہوا کرتا تھا، دل و جان سے چاہتی تھی لیکن راہن جب اولیں بن گیا تو روزی نے اسے واضح الفاظ میں یہ کہہ کر دھتکار دیا تھا کہ وہ اب مسلمان ہو گیا ہے۔ اب وہ رابعہ سے کہتا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ رابعہ کے والدین اور رشتے دار اسے بھی دھتکار دیں گے۔ رابعہ اسلام کے خلاف ہوا کرتی تھی لیکن اولیں اور اس کے دونوں ساتھیوں نے مصر میں اسے جس طرح نیل کی دھن بننے سے بچایا اور پھر ایک پاکیزہ اور مقدس چیز سمجھ کر اپنے پاس رکھا، اس سے وہ اتنی متاثر ہوئی کہ دلی خوشی سے روزی سے رابعہ بن گئی۔ ”میں اپنے والدین سے ضرور ملوں گی“۔ رابعہ اولیں سے کہتی تھی — ”یک تو وہ میرے والدین ہیں اور دوسرے میرا یہ ارادہ بھی ہے کہ انہیں قائل کروں گی کہ وہ بھی اسلام قبول کر لیں۔“

اس نے یہ بات اولیں سے تین چار مرتبہ کہی تھی اور ہر بار اولیں اس کی یہ بات سن کر ہنس پڑا تھا۔ اولیں کی مجبوری تھی کہ اسے حلب واپس جانا پڑا۔ دیے اس نے حلب کو دل سے اتار دیا تھا۔ رابعہ بہت ہی خوش تھی کہ وہ اپنے شہر، اپنے ماں باپ کے پاس جا

ہی ہے۔

مصافحہ کرنے کے لئے دونوں ہاتھ آگے کئے لیکن رابعہ کے باپ نے اپنے ہاتھ پیچھے کر لئے۔ رابعہ کی ماں نے اولیس کو حقارت سے دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ رابعہ کا ایک بڑا بھائی اور اس کی بیوی بھی گھر میں تھی۔ ان دونوں نے بھی اولیس کے ساتھ ایسی ہی حقارت آمیز بے رخی کا مظاہرہ کیا۔

”دیکھ لیا رابعہ!“ — اولیس نے کہا — ”کیا وہی نہیں ہوا جو میں کہتا تھا؟ انہیں بناؤ میں تمہیں کہاں ملا تھا اور کس طرح تمہیں موت کے منہ سے نکالا تھا۔ ان لوگوں میں اتنا بھی اخلاق نہیں کہ اپنے داماد کے ساتھ وہ سلوک کریں جو دامادوں کا حق ہوتا ہے۔“

”ہم نے تمہیں اپنا داماد نہیں بنایا“ — رابعہ کے باپ نے کہا — ”تم خود گمراہ ہوئے تھے اور تم نے ہماری بیٹی کو بھی گمراہ کر دیا ہے۔ ہم اس گھر میں تمہیں اچھے سلوک کا حق نہیں دے سکتے۔“

رابعہ کا چہرہ غصے اور ندامت سے سرخ ہو گیا۔ اولیس نے اسے کہا کہ وہ انہیں بتائے کہ لوگوں نے اسے دھوکے میں کہاں تک پہنچا دیا تھا اور اولیس نے اسے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کس طرح بچا لیا تھا.... رابعہ نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں اپنے گھروالوں سے کہا کہ وہ بیٹھ جائیں اور سنیں کہ اس پر کیا ہوتی تھی اور کس طرح اللہ نے یہ تین فرشتے آسمان سے اتارے تھے۔

سب بیٹھ گئے۔ رابعہ نے اولیس کو اپنے پاس بٹھالیا اور اس پر جو بیٹی تھی وہ سنانی شروع کر دی۔ وہ جوں جوں سنانی جا رہی تھی اس کے گھر کے افراد کے چہرے نارمل حالت پر آتے جا رہے تھے۔ آخر میں اس نے کہا کہ وہ اس قدر مجبور اور بے بس تھی کہ اولیس اور اس کے ساتھی اسے جتنا چاہتے خراب کر سکتے تھے لیکن انہوں نے فرشتوں جیسا سلوک کیا۔

”میں اس اخلاق اور سلوک سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئی ہوں“ — رابعہ نے کہا — ”ورنہ تمہیں یاد ہو گا! میں اولیس کو وہی طور پر چاہتی تھی جب یہ رابن ہوا کرتا تھا لیکن یہ مسلمان ہوا تو میں نے اس سے تعلق توڑ لیا تھا۔ میں کہتی ہوں کہ جتنا اچھا اخلاق مسلمانوں کا ہے اتنا کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ مصر میں جا کر دیکھو۔ عیسائی بادشاہ ہر قل میسائیوں کا خون بہا رہا ہے۔ وہاں تو یہ مسئلہ ہی حل نہیں ہو رہا کہ کچی اور صحیح عیسائیت

حلب پہنچ کر اولیس رابعہ کو اپنے ٹھکانے پر لے گیا۔ پہلے تو وہ غیر شادی شدہ مجاہدین کی طرح لشکر کے ساتھ رہتا تھا لیکن اب بیوی ساتھ ہونے کی وجہ سے اسے لشکر کی طرف سے چھوٹا سا ایک مکان دے دیا گیا۔ اولیس کو اپنے کسی بھی عزیز سے ملنے کا ذرا سا بھی شوق نہیں تھا لیکن رابعہ نے اسے ضد کر کے تیار کر لیا کہ اس کے ماں باپ سے ملنے چلے۔ اولیس اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس شرط پر اس کے ساتھ چل پڑا کہ وہ باہر کھڑا رہے گا اور اگر اس کے والدین پسند کریں گے تو وہ اندر جائے گا۔

والدین کے دروازے پر پہنچ کر اولیس باہر کھڑا رہا اور رابعہ بچوں کی سی شوخی کرتی اندر چلی گئی۔ گھر کے جس فرد نے بھی اسے دیکھا وہ حیران بعد میں ہوا اس سے پہلے خوفزدہ ہوا کہ یہ ان کی روزی نہیں اس کی روح یا بدروح ہے۔ روزی کو تو وہ مرا ہوا سمجھ بیٹھے تھے۔ وہ پاگل پن کی کیفیت میں شہر سے بھاگی تھی۔ ایک سال اور کچھ مہینے گزر گئے تھے۔ اب تو اس کی دایہی کی امید بھی ختم ہو گئی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو؟“ — رابعہ نے اپنے ماں باپ اور دیگر اہل خانہ سے کہا — ”میں زندہ ہوں بلکہ پہلے سے زیادہ زندہ ہوں۔“

”کیا تم واقعی زندہ روزی ہو؟“ — ماں نے بازو پھیلا کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں ماں!“ — رابعہ نے کہا — ”روزی مر گئی ہے میں اب رابعہ ہوں۔ میں مسلمان ہو گئی ہوں۔ میرا خاوند باہر کھڑا ہے۔ میں اسے اندر لاتی ہوں۔“

رابعہ کی ماں کے پھیلے ہوئے بازو نیچے گر پڑے۔ اسے روزی کا قبول اسلام بہت بُرا لگا تھا۔ روزی تو عمر لڑکی تھی۔ اسے ابھی اتنا تجربہ حاصل نہیں ہوا تھا کہ چہرے سے کسی کا ردِ عمل محسوس کر سکتی۔ ویسے بھی وہ جذبات کے غلبے میں آئی ہوئی تھی اور بہت خوش تھی۔ ماں اور دیگر اہل خانہ کا ردِ عمل سمجھنے بغیر وہ باہر کو دوڑی اور اولیس کو بازو سے پکڑ کر اندر لے گئی۔ اولیس اس خیال سے اس کے ساتھ چلا گیا کہ اس کے والدین نے اسے اندر لانے کی اجازت دے دی ہوگی۔

اولیس اندر گیا تو اسے رابعہ کا باپ سامنے کھڑا نظر آیا۔ اولیس نے اس کے ساتھ

کبن سی ہے.... بادشاہ کی یا رعایا کی!“

رابعہ بولتی چلی گئی، اولیس خاموش بیٹھا رہا اور گھر کے افراد چپ چاپ سنتے رہے۔
”میں تو کسی اور ارادے سے آئی تھی“ — رابعہ نے کہا — ”میں کہتی ہوں تم سب اسلام قبول کر لو۔“

”کون سے مسلمانوں کی بات کر رہی ہو؟“ — باپ نے کہا — ”وہ مسلمان کوئی اور تھے جن کے اخلاق سے غیر مسلم متاثر ہو کر مسلمان ہو جاتے تھے۔ اسلام نے شراب کو دیا ہی حرام قرار دیا ہے جیسے خنزیر کو۔ میں جانتا ہوں مسلمان شراب کی بو سے بھی بھاگتے ہیں لیکن یہاں بعض مسلمانوں نے شراب نوشی شروع کر دی ہے اور وہ شراب کو حلال سمجھنے لگے ہیں۔“

”میں نہیں مانتا“ — اولیس نے کہا — ”آپ یہ کہیں کہ میں نے اور آپ کی اس بیٹی نے اسلام قبول کر کے اچھا نہیں کیا۔ مسلمانوں پر جھوٹا الزام عائد نہ کریں۔“
”یہ الزام نہیں“ — رابعہ کے باپ نے کہا — ”میں تمہیں ایسے مسلمان دکھا سکتا ہوں اور دکھاؤں گا۔“

”یہ ان کا ذاتی فعل ہے“ — اولیس نے کہا — ”اسلام نے یا خلیفہ نے یا مسلمانوں نے بحیثیت قوم انہیں شراب پینے کی اجازت نہیں دی نہ ہی اسلام نے شراب کو حلال قرار دے دیا ہے۔“

”یہ تمہیں کچھ وقت گزر جانے کے بعد پتہ چلے گا“ — رابعہ کے باپ نے کہا — ”ان شراب نوش مسلمانوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو رہی۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے مسلمان بھی شراب پینے لگیں گے۔ شراب کا نشہ عقل پر غالب آ جاتا ہے پھر انسان دوسرے گناہوں کی طرف مائل ہونے لگتا ہے۔ اگر اس قوم میں شراب چل نکلی تو اس کا وہ حسن سلوک ختم ہو جائے گا جس سے متاثر ہو کر غیر مسلم اسلام قبول کر لیتے ہیں۔“

اولیس کے ساتھ رابعہ بھی اکتانے لگی کہ اس کا باپ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ٹائپنیدگی اور بیزاری کا اظہار کر رہا ہے۔ اپنے باپ کو وہ جانتی تھی کہ اپنے مذہب کے معاملے میں وہ بڑا ہی سخت ہے بلکہ عیسائیت اس کے دل و دماغ پر جنون کی طرح طاری تھی۔ اس نے بہتر سمجھا کہ اپنے باپ کی اس الزام تراشی کو ہمیں روک دے۔ اس نے

باپ سے کہا کہ وہ آئندہ بھی اولیس کو اپنے ساتھ لانا چاہتی ہے، کیا باپ اس کی اجازت دیتا ہے؟

”نہیں!“ — باپ نے فوراً اپنا فیصلہ سنایا — ”تم دونوں کے لئے میرے گھر کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اگر تم دونوں واپس عیسائیت میں آ جاؤ تو میں تمہارے لئے اپنے دل اور اپنی روح کے بھی دروازے کھول دوں گا۔“

”ہم اب کسی غلط دروازے میں داخل نہیں ہوں گے“ — اولیس نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ رابعہ کو اٹھایا اور بولا — ”چلو رابعہ! یہی اپنی توہین اور بے عزتی برداشت کر سکتا ہوں، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ذرا سی جھوٹی تہمت بھی برداشت نہیں کروں گا۔ میں یہاں کئی اور عیسائیوں کو مسلمان کر لوں گا۔“

”شاید تم ایسا نہیں کر سکو گے“ — رابعہ کا بڑا بھائی جو اس وقت تک خاموش تھا بولا — ”روزی! اسے اسلام کی تبلیغ سے روکنا اور نہ....“

”میں روزی نہیں رابعہ ہوں میرے بھائی!“ — رابعہ نے کہا — ”یہ اپنے مذہب کے لئے جو بہتر سمجھے گا کرے گا، میں اسے نہیں روکوں گی۔“
اولیس اور رابعہ وہاں سے نکل آئے۔ رابعہ کا بھائی دونوں کو دروازے سے نکل جانے تک گھورتا رہا تھا۔



اولیس بہت ہمار مجاہد ہی سہی، بڑا ذہین اور عقل و دانش والا جاسوس ہی سہی، لیکن وہ رابعہ کے بھائی کی نیت اور نظرس نہ بھانپ سکا۔ اس بھائی نے اولیس کو بڑے تحمل سے کہا تھا کہ شاید تم ایسا نہیں کر سکو گے لیکن اس تحمل میں ایک طوفان چھپا ہوا تھا جسے اولیس دیکھ نہ سکا، محسوس بھی نہ کر سکا تھا۔ اس گھر سے نکل کر وہ رابعہ سے کہتا جا رہا تھا کہ وہ پھر کبھی اسے یہاں نہ لائے۔

”نہیں لاؤں گی اولیس!“ — رابعہ نے کہا — ”توقع نہیں تھی کہ میرے ماں باپ مجھے اس طرح دھتکار دیں گے.... ایک خیال رکھنا اولیس! میرا باپ مذہب کا پرستار ہے لیکن میرا یہ بھائی ٹھیک آدمی نہیں۔“

”یہ میرا کیا کاڑ لے گا!“ — اولیس نے کہا — ”اس کے ساتھ میرا کوئی تعلق ہی نہیں نہ اس کے ساتھ کوئی تعلق رکھنا ہے۔“

چار پانچ دن گزر گئے۔ اولیس ان کے پھندے میں نہ آ سکا کیونکہ وہ اپنے فرائض میں مصروف ہو گیا تھا۔ ان دنوں میں جو گزر گئے تھے، ان لوگوں کا یہ ارادہ مکمل طور پر مستحکم ہو گیا کہ اولیس کو قتل کر کے ہی رہیں گے۔

○

آخر ایک روز اولیس اُس شخص کو مل گیا جس کے ذمے یہ کام تھا کہ اولیس کو جھانسنے کے قتل والی جگہ پہنچائے گا۔ انہوں نے قتل کا منصوبہ نہایت اچھا بنایا تھا۔ رابعہ کے بھائی نے اولیس کی اس بات کو سامنے رکھا تھا کہ وہ اسلام کی تبلیغ کرے گا۔ اولیس کو دعوے میں شر سے باہر لے جانے والے آدمی نے اولیس سے کہا کہ دو تین عیسائی مسلمان ہونا چاہتے ہیں لیکن وہ کچھ جانتا اور سمجھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس شخص نے یہ بھی کہا کہ وہ خود بھی مسلمان ہو جائے گا۔

اولیس شام کے بعد اس شخص کے ساتھ اُس طرف چل پڑا جہاں اُسے قتل کرنا تھا اور پھر اس کی لاش غائب کر دی تھی۔ اولیس کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کی ایسی محبت اور عقیدت پیدا ہو گئی تھی کہ اس نے یہ سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ یہ دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔

وہ اس شخص کے ساتھ شر سے باہر نکل گیا۔ اسے یہ بتایا گیا تھا کہ یہ آدمی شر سے باہر ایک جگہ بیٹھے ملیں گے اور وہاں بات ہوگی۔ اس قاتل پارٹی نے ہر کام یوں طے کیا تھا کہ یہ شخص اولیس کو اس جگہ لے جائے گا اور رابعہ کا بھائی اپنے دو دوستوں کے ساتھ وہاں پہلے سے موجود ہو گا اور کوئی بات کئے بغیر فوراً ہی اولیس کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔

اولیس اس شخص کے ساتھ اُس جگہ پہنچا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ اس شخص نے کہا کہ وہ لوگ ابھی آتے ہوں گے۔ دونوں وہاں انتظار میں بیٹھ گئے اور وقت گزرنا چلا گیا۔ آدمی پریشانی کے عالم میں اوھر اوھر دیکھتا رہا۔ آخر اولیس نے کہا کہ وہ اور زیادہ انتظار میں کر سکتا اور اگر یہ لوگ کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو کل میرے پاس آجائیں اور میں انہیں کسی ایسے مجاہد سے ملوادوں گا جو اسلام کے امور اور معاملات کو زیادہ اچھی طرح سمجھتا ہے۔

قاتل پارٹی کا یہ آدمی اکیلے تو کچھ نہیں کر سکتا تھا نہ اسے یہ بتایا گیا تھا کہ پارٹی کا کوئی آدمی نہ آئے تو یہ کام وہ خود ہی کر دے۔ اس شخص نے اولیس کو باتوں میں لگائے

رابعہ نے یہ جو کہا تھا کہ اس کا بھائی ٹھیک آدمی نہیں اس کا اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ ٹھیک نہیں تو کس حد تک بُرا آدمی ہے اور اس میں کیا بُرائی ہے۔ رابعہ کا یہ بھائی مسلمانوں کا جانی دشمن تھا۔ رومی فوج میں عارضی طور پر شامل ہو کر ایک دو مرتبہ مسلمانوں کے خلاف لڑا بھی تھا لیکن یہ محسوس کر کے کہ مسلمانوں کو میدان جنگ میں شکست نہیں دی جاسکتی، وہ فوج سے نکل آیا اور مسلمانوں کے خلاف زمین دوز تحریکی کارروائیوں کا ارادہ کر لیا۔ اس نے تین چار اپنے جیسے دوستوں کو ساتھ ملا لیا تھا لیکن ابھی تک وہ کوئی ایسی تحریکی کارروائی نہیں کر سکا تھا جس سے مسلمانوں کو کوئی نمایاں نقصان پہنچے۔ اس نے تبلیغی مہم بھی شروع کی تھی جو کامیاب نہ ہو سکی۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کو اپنے مذہب عیسائیت کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی شادی سے بہت پہلے نوجوانی کے وقت اسے ایک لڑکی سے محبت تھی اور اس کی شادی اسی لڑکی کے ساتھ ہوئی تھی لیکن جس طرح رابعہ اور شارینا کسی مجاہد سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئی تھیں اسی طرح یہ لڑکی بھی کسی ایسی ہی صورت حال میں ایک عربی مجاہد سے ایسی متاثر ہوئی کہ رابعہ کے بھائی کو ٹھکرا کر اور پھر اسلام قبول کر کے اس مجاہد کی رفیقہ حیات بن گئی تھی۔

اب اس شخص کی اپنی بہن نے اسلام قبول کر کے ایک نو مسلم کے ساتھ شادی کر لی تو اسے اپنی پہلی محبت یاد آگئی اور اس کے ساتھ ہی ایک بڑا ہی خوفناک ارادہ اس کے دل میں پیدا ہو گیا۔ اولیس اور رابعہ کے چلے جانے کے بعد وہ گھر سے نکلا اور اپنے دو تین دوستوں کو اکٹھا کر لیا۔ انہیں اولیس اور رابعہ کی بات سنائی اور کہا کہ اولیس کتنا ہے کہ وہ اسلام کی تبلیغ کرے گا۔

”ہم اسے کس طرح روک سکتے ہیں؟“ — ایک دوست نے پوچھا۔
”قتل!“ — رابعہ کے بھائی نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ ”ہم نے آج تک کوئی ایسی کارروائی نہیں کی جس سے اسلام کا راستہ روکا جاسکتا ہے۔ ہم صرف باتیں کرتے رہے ہیں اور عملاً کچھ بھی نہیں کیا ہے۔“

دوست اولیس کے قتل پر رضامند ہو گئے اور سوچنے لگے کہ قتل کس طرح کیا جائے۔ کچھ دیر اس مسئلے پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا اور انہوں نے ایک طریقہ سوچ لیا۔ یہ بھی طے کر لیا کہ کون آدمی اولیس کو جھانسنے دے کر قتل کی جگہ تک لائے گا۔

و اسے مارنے کی سازش کر چکے تھے لیکن یہ بیماری صرف ان تین دوستوں کے لئے ہی نہیں آئی تھی بلکہ حلب کے پورے شہر میں یہ بیماری پھیل گئی۔ گھر گھر سے جنازے نکلتے گئے۔ طبیبوں نے بتایا کہ یہ طاعون کا مرض ہے۔ یہ ایسا علاج مرض تھا کہ جس پر اس کا حملہ ہوتا وہ ایک دو دنوں میں مرجاتا تھا۔ طبیبوں نے بہت کوشش کی کہ اس مرض کو روکا جائے لیکن مرض پھیلتا چلا گیا اور اس نے پورے ملک شام کو لپیٹ میں لے لیا۔

تاریخ میں اس وبا کے متعلق جو تفصیلات آئی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ابتدا فلسطین کے ایک قصبے عمواس سے ہوئی تھی۔ اُس دور کے لوگوں کو ابھی اتنی سوجھ بوجھ نہیں تھی کہ ایسی بیماریوں میں کیسی احتیاطی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ عام ذہن کے لوگوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ایک شخص کی بیماری دوسرے کو بھی لگ سکتی ہے۔ اسی لاعلمی کا نتیجہ تھا کہ عمواس سے چلنے والی بیماری شام تک پہنچی اور موت ہر گھر کے دروازے پر دستک دینے لگی۔

یہ مرض طاعون تھا لیکن اُس دور کے لوگوں نے اسے عمواس کا مرض کہا تھا۔ بعض مؤرخوں نے بھی اسے یہی نام دیا ہے۔

قطب کے اثرات ابھی باقی تھے کہ اس وبا نے قطب کی تباہ کاریوں کو بھی مات کر دیا۔ یہ وبا بھی 639ء (18 ہجری) میں پھیلی تھی۔ قطب عرب میں پڑا تھا اور طاعون شام میں پھیلی لیکن اس کے دوسرے اثرات عرب تک پہنچے۔ ایوان خلافت ہل کے رہ گیا۔ وبا صرف شریوں میں نہیں بلکہ مجاہدین کے لشکروں میں بھی پھیل گئی تھی۔

اس کی خبر ہر قل تک پہنچ گئی۔ وہ بہت خوش ہوا اور اپنے مشیروں سے کہا کہ مسلمانوں کو شکست دینے کا یہ موقع نہایت اچھا ہے۔ خوشامدی مشیروں نے اس کی تائید کر دی۔ اس کے مقرر کئے ہوئے اسقف اعظم قیروس کو ہر قل کے اس ارادے کا پتہ چلا تو وہ ہر قل کے پاس گیا۔ یہ خطرہ حضرت عمرؓ نے بھی محسوس کیا تھا کہ اس خوفناک صورت حال میں رومی فوج نے حملہ کر دیا تو حملے کو روکا نہیں جاسکے گا۔ آدھا لشکر اس مرض کی زد ہو گیا تھا اور کچھ سالار بھی اس وباء کی زد میں آکر اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔

”شہنشاہ روم!“ — قیروس نے ہر قل سے کہا — ”معلوم ہوا ہے کہ آپ شام پر فوج کشی کرنا چاہتے ہیں اور مشیروں نے آپ کی تائید میں کہا ہے کہ مسلمانوں کو ملک ختم سے نکلنے کا اس سے زیادہ اچھا موقع پھر کبھی نہیں ملے گا۔“

رکھا لیکن وقت اتنا زیادہ گزر گیا تھا کہ خود اس شخص نے محسوس کیا کہ اب انتظار بیکار ہے۔ دونوں وہاں سے واپس آگئے اور اویس اپنے ٹھکانے پر چلا گیا۔

”میرا بھائی بہت ہی بیمار ہو گیا ہے“ — رابعہ نے اویس کو بتایا — ”تھوڑی دیر پہلے ان کے پردوس میں رہنے والی ایک عورت ادھر سے گزری۔ میں تمہارے انتظار میں دروازے میں کھڑی تھی۔ عورت میرے پاس رک گئی اور اس نے بتایا کہ تمہارا بھائی دو تین دنوں سے کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہے کہ کسی سیانے کو پتہ نہیں چلتا کہ بیماری کیا ہے۔ دو تین دنوں میں ہی وہ آخری وقت تک جا پہنچا ہے اور ہو سکتا ہے آج کی رات اس کی زندگی کی آخری رات ہو... مجھے سمجھ نہیں آتی کہ بھائی کو دیکھنے جاؤں یا نہ جاؤں!“

”جانا چاہتی ہو تو میں تمہیں نہیں روکوں گا“ — اویس نے کہا — ”مجھے ساتھ لے جانا چاہو تو میں بھی چلا چلوں گا۔“

رابعہ کو اپنے گھر سے دھتکار کر نکالا گیا تھا لیکن وہ آخر بہن تھی، اس سے رہانہ گیا اور وہ اُسی وقت اویس کو ساتھ لے کر اپنے بھائی کو دیکھنے چلی گئی۔ اسے کسی نے اس گھر میں آنے سے روکا نہیں، شاید اس لئے کہ اس کے بھائی پر نزع کا عالم طاری تھا۔ بھائی کی بیوی اس کی ماں اور باپ رو رہے تھے۔

بھائی نے رابعہ سے پہلے اویس کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ فوراً ہی بھائی کی آنکھیں کھلیں، اس نے ایک ہچکلی اور اس کا چہرہ ایک طرف ڈھلک گیا۔ وہ مرچکا تھا۔ اویس کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس شخص نے اسے قتل کرنے کے لئے پھندہ لگا دیا تھا اور اویس اس پھندے میں چلا بھی گیا تھا لیکن اللہ کا ولی بندہ اللہ کے ارادوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ رابعہ کے آنسو بہنے لگے۔ ماں باپ نے اس کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ ان کا جوان اور شادی شدہ بیٹا مر گیا تھا۔ اویس رابعہ کو وہاں سے لے آیا۔

دوسرے ہی دن پتہ چلا کہ رابعہ کے بھائی کا ایک دوست جو اویس کے قتل کی اس سازش میں شامل تھا، اسی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے۔ تیسرے دن وہ بھی مر گیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کا وہ دوست بھی اسی بیماری سے چل بسا جو اویس کو قتل والی جگہ لے گیا تھا۔



اویس کو اللہ نے قتل سے صاف بچالیا۔ اویس کو معلوم ہی نہیں تھا کہ جو مر گئے ہیں

”ہاں اسقف اعظم!“ — ہرقل نے پُر عزم لہجے میں کہا — ”شام ہی نہیں میں پورے ملک عرب کو اپنی سلطنت میں شامل کر لوں گا۔ ابھی تو وہ قحط سے نہیں سنبھلتے تھے کہ ان پر یہ مصیبت نازل ہو گئی ہے۔“

”اگر مجھے آپ کے نقصان کا احساس نہ ہوتا تو میں بھی آپ کی تائید کرتا۔“ — قیصر نے کہا — ”لیکن آپ میرے بادشاہ ہیں اور محسن ہیں اور سلطنت روم کے ساتھ میری روحانی وابستگی ہے۔ میں آپ کو اُس راستے پر جانے سے روکوں گا جو تباہی کی طرف جاتا ہے۔ اس حقیقت کو نہ بھولیں کہ ہماری آدھی سے زیادہ فوج عربوں کے ہاتھوں ماری جا چکی ہے اور باقی جو بچ کر مصر آئی ہے اس پر ابھی تک عربی مسلمانوں کی دہشت طاری ہے۔ اگر آپ اس فوج کو طاعون سے مردانا چاہتے ہیں تو شام پر حملہ کریں۔ کیا آپ اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے کہ مسلمانوں کے لشکر بھی اس بیماری کی زد میں آگئے ہیں اور یہ دبا ہماری فوج کو بھی نہیں بخشنے گی؟ کل تک مجھے جو خبریں ملی ہیں ان سے پتہ چلا ہے کہ مسلمانوں کے کچھ سالار بھی اس بیماری سے مر چکے ہیں۔“

ہرقل یہ بات سمجھ گیا اور اس نے شام پر حملے کا ارادہ ذہن سے نکال دیا۔

○

امیر المومنین حضرت عمرؓ کو پہلے ہی اطلاع ملنے سے پہلے ہی شام جانے کا ارادہ کر چکے تھے۔ اس دوران دبا کی اطلاعیں پہنچنے لگیں لیکن حضرت عمرؓ کچھ زیادہ پریشان نہ ہوئے بلکہ انہوں نے جانا زیادہ بہتر سمجھا تاکہ وہاں کی صورت حال دیکھ کر دبا کو روکنے کا کچھ بندوبست کیا جائے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے فوری روانگی کا حکم دے دیا اور ان کا قافلہ سوئے شام روانہ ہو گیا۔

نہ جانے کتنے دنوں بعد امیر المومنین کا قافلہ تبوک پہنچا۔ شام کے مختلف علاقوں کے سالاروں کو پہلے اطلاع دے دی گئی تھی کہ امیر المومنین شام کے دورے پر آرہے ہیں۔ ہر سالار نے سوچ لیا کہ امیر المومنین کا شام میں آنا ٹھیک نہیں۔ چنانچہ سپہ سالار ابو عبیدہؓ، سالار یزید بن ابی سفیان اور سالار شریل بن حسنہ تبوک پہنچ گئے اور حضرت عمرؓ کو بتایا کہ وہ اس سے آگے نہ جائیں کیونکہ شام کی زمین اور فضا میں طاعون کے جراثیم اور موت کے سوا کچھ نہیں رہا۔ انہوں نے امیر المومنین کو دبا کی شدت اور تباہ کاری کی تفصیلات بتائیں۔

”یہاں رکے رہنا میرے لئے ممکن نہیں“ — حضرت عمرؓ نے کہا — ”میں یہیں سے واپس مدینہ چلا گیا تو بھی ان کی روحوں کے آگے شرمسار ہوں گا جنہیں اس بیماری نے اللہ کے حضور پہنچا دیا ہے۔ میں اپنی قوم کو اتنی خطرناک انتلا میں چھوڑ کر واپس کس طرح جاسکتا ہوں!“

سالاروں نے انہیں قائل کرنے کی بہت کوشش کی کہ وہ آگے نہ جائیں۔ وہ دلیل یہ دیتے تھے کہ اس خوفناک صورت حال میں اگر امیر المومنین کو کچھ ہو گیا تو ایک اور مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ حضرت عمرؓ پھر بھی نہ مانے اور سب سے مشورہ طلب کرنے لگے۔ ان کے ساتھ سالاروں کے علاوہ کچھ اکابرین بھی تھے۔ ان سب میں اختلاف پیدا ہو گیا۔

”یا امیر المومنین!“ — بعض نے ان الفاظ میں مشورہ دیا — ”چونکہ آپ بنی نوع انسان کی بھلائی اور اللہ کی خوشنودی کی خاطر جارہے ہیں اس لئے آپ کو یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ آگے کیا خطرات ہیں۔“

”نہیں امیر المومنین!“ — دوسرے گروہ نے یہ خیال ظاہر کیا — ”جہاں ہلاکت اور تباہی کے سوا کچھ بھی نہ ہو وہاں کم از کم خلیفہ وقت کو نہیں جانا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے عقل اسی لئے عطا فرمائی ہے کہ جو کام کرو سوچ سمجھ کر کرو۔“

آخر حضرت عمرؓ نے قریش کے اُن صحابہ کرام کو جو اُس وقت اُن کے ساتھ تھے اور جو مکہ میں بھی شریک تھے، اپنے پاس بلایا اور یہ مشورہ ان کے آگے رکھا۔ ان میں حضرت ابن عباسؓ بھی تھے۔ یہ سب اس فیصلے پر متفق ہو گئے کہ امیر المومنین اپنے تمام قافلے سمیت تبوک سے آگے نہیں بلکہ واپس مدینہ جائیں گے۔ حضرت عمرؓ نے اُسی رات حکم دے دیا کہ کل صبح ان کا قافلہ مدینہ کو روانہ ہو گا۔

تقریباً تمام مؤرخوں نے امیر المومنین اور ابو عبیدہؓ کا ایک مشہور مکالمہ لکھا ہے۔ تاریخ میں آیا ہے کہ ابو عبیدہؓ یہ نہیں چاہتے تھے کہ حضرت عمرؓ تبوک سے آگے جائیں جب حضرت عمرؓ نے واپسی کا فیصلہ کر لیا تو ابو عبیدہؓ کی رائے نہ جانے کس طرح متزلزل ہو گئی۔

”ابن الخطاب!“ — ابو عبیدہؓ نے حضرت عمرؓ سے بڑی بے تکلفی سے کہا — ”تفائے الہی سے بھاگتے ہو؟“

چھوڑوں گا اور اللہ کے حکم کا انتظار کروں گا۔

حضرت عمرؓ کو اپنے پیغام کا جواب ملا تو ان پر جذباتیت کا ایسا غلبہ ہوا کہ ان کے آنسو بہ نکلے۔ وہاں جو حضرات بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے کسی نے گھبرا کر پوچھا، یا امیر المومنین ابو عبیدہؓ فوت تو نہیں ہو گئے؟ حضرت عمرؓ نے رقت زدہ آواز میں جواب دیا — ”نہیں.... مگر معلوم ہوتا ہے وہ فوت ہو ہی جائے گا۔“

امیر المومنین نے ابو عبیدہؓ کا خط تمام حاضرین کو پڑھنے کے لئے دیا پھر سوچ سوچ کر ابو عبیدہؓ کے نام ایک اور پیغام لکھا جس میں لکھوایا کہ ابو عبیدہؓ نشیبی علاقے سے نکل کر زابلند اور صحت افزا مقام پر چلے جائیں اور اپنے لشکر کو بھی ساتھ لے جائیں۔ مؤرخوں نے لکھا ہے کہ ابو عبیدہؓ حضرت عمرؓ کے اس حکم یا مشورے پر عمل کرنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ طاعون نے انہیں بھی زد میں لے لیا اور وہ تیسرے دن فوت ہو گئے۔ انہوں نے بیماری کے حملے کے ساتھ ہی معاذ بن جبل کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ وہاں موت کا یہ عالم تھا کہ معاذ بن جبل کے دو جوان بیٹے طاعون کی بھیبت چڑھ چکے تھے اور کچھ دنوں بعد وہ خود بھی اس مرض سے فوت ہو گئے۔ انہوں نے عمرو بن عاص کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔

عمرو بن عاص نے مجاہدین کے لشکروں کو اور شہریوں کو بھی کہا کہ وہ میدانوں سے نکل کر پہاڑوں میں چلے جائیں۔ چنانچہ لوگ گھر کھلے چھوڑ کر پہاڑوں میں چلے گئے اور اس طرح طاعون کا زور ٹوٹنے ٹوٹنے بالکل ہی ختم ہو گیا۔ یہ وبا کئی مہینے انسانی جانوں سے کھیتی رہی اور پچیس ہزار مسلمانوں کی جان لے کر ٹلی۔ جو سالار فوت ہوئے ان میں ابو عبیدہؓ، معاذ بن جبل، یزید بن ابی سفیان، حارث بن ہشام، سہیل بن عمرو اور عتبہ بن اسلم خاص طور پر شامل ہیں۔ حارث بن ہشام کے خاندان کے 70 افراد اور حضرت خالد بن ولید کے خاندان کے 40 افراد اس وبا میں فوت ہو گئے تھے۔

○

موجودہ دور کا مستند تاریخ نویس محمد حسنین پریکل (مصری) کئی ایک مؤرخوں کے ناولوں سے لکھتا ہے کہ یہ وبا ویسے ہی نہیں آگئی تھی بلکہ اللہ نے مسلمانوں کو غلط راستے پر چل نکلنے پر خبردار کیا تھا۔ اس نے ایک روایت یہ لکھی ہے کہ ان علاقوں میں کئی لمبی جنگ ہوئی تھی جو بہت ہی خونریز تھی۔ رومی فوج کی بے انداز لاشیں سارے

حضرت عمرؓ کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور حیرت زدگی کے عالم میں کچھ دیر ابو عبیدہؓ کو نکلتی باندھے دیکھتے رہے۔

”ابن الجراح؟“ — حضرت عمرؓ نے ابو عبیدہؓ سے کہا — ”کاش“ یہ بات کوئی اور کہتا.... ہاں، میں قضائے الہی سے قضائے الہی کی طرف بھاگ رہا ہوں۔“

ابو عبیدہؓ خاموش ہو گئے۔ اُس وقت عبدالرحمن بن عوف وہاں آگئے۔ وہ مختصر محال تھے۔ انہیں پتہ چلا کہ یہاں کیا مسئلہ درپیش ہے تو انہوں نے حتمی فیصلہ سنا دیا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ تم سنو کئی علاقے میں کوئی وبا پھیل گئی ہے تو وہاں مت جاؤ اور اگر تم اس جگہ ہو جہاں وبا پھوٹ پڑے تو وہاں سے بھاگو نہیں کیونکہ تم یہ وبا اپنے ساتھ لے جاؤ گے اور کسی اور جگہ پھیلا دو گے.... چونکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان تھا اس لئے حضرت عمرؓ مطمئن ہو گئے اور تبوک سے واپس مدینہ چلے گئے۔

مدینہ پہنچ کر امیر المومنین اطمینان سے کس طرح رہ سکتے تھے۔ ہر وقت شام کے لوگوں کے متعلق سوچتے کہ انہیں اس وبا سے کس طرح بچایا جاسکتا ہے۔ تاریخ کے مطابق انہیں سب سے زیادہ خیال ابو عبیدہؓ کا تھا۔ ابو عبیدہؓ بڑے قیمتی سپہ سالار تھے۔ حضرت عمرؓ انہیں بچانا چاہتے تھے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہوں نے ابو عبیدہؓ سے کہا تھا کہ وہ ان کے ساتھ مدینہ چلے چلیں لیکن اس عظیم سپہ سالار نے جواب دیا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو موت کے سائے میں چھوڑ کر نہیں جائیں گے اور انہوں نے اپنے وہ الفاظ استعمال کئے جو وہ حضرت عمرؓ سے کہہ چکے تھے — ”میں قضائے الہی سے نہیں بھاگوں گا۔“

مدینہ پہنچ کر حضرت عمرؓ نے سپہ سالار ابو عبیدہؓ کو طاعون سے بچانے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان کے نام ایک پیغام لکھوا کر تیز رفتار قاصد کے ہاتھ بھیجا۔ پیغام یہ تھا کہ میں ایک ضروری مسئلے پر تم سے زبانی گفتگو کرنا چاہتا ہوں اس لئے پیغام ملتے ہی چل پڑو۔

ابو عبیدہؓ نے اس پیغام کا جواب یہ دیا کہ جس مسئلے پر آپ میرے ساتھ صلاح مشورہ کرنا چاہتے ہیں وہ ملتوی ہو سکتا ہے لیکن میں یہاں اسلامی لشکر کا سپہ سالار ہوں اور اس لشکر کو اتنی بڑی مصیبت میں چھوڑ کر کیس نہیں جاسکتا۔ میں اپنے ساتھیوں کو نہیں

علاقے میں پڑی کھٹی سڑتی رہی تھیں۔ انہوں نے جراثیم پیدا کر کے فضا میں پھیلا دیے اور طاعون کی وبا پھوٹ پڑی۔

قدیم مؤرخین اس سبب کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ وبا شام سے نہیں بلکہ فلسطین کے ایک شہر عمواس میں سے اٹھی تھی اور یہ اللہ کا نازل کیا ہوا غضب تھا۔ اس داستان میں پہلے ذکر آیا ہے کہ رابعہ کے باپ نے اولیس اور رابعہ سے کہا تھا شام میں بعض مسلمانوں نے شراب اپنے اوپر حلال کر لی ہے اور وہ کھلم کھلا شراب پیا لگے ہیں۔ اولیس اور رابعہ نے کہا تھا کہ یہ شخص مسلمانوں پر بے بنیاد الزام عائد کر رہا۔ اور یہ اسلام سے نفرت کا اظہار ہے لیکن رابعہ کا باپ الزام تراشی نہیں بلکہ سچی بات کہہ رہا تھا۔

ان مؤرخوں نے لکھا ہے کہ شام اسلامی سلطنت میں شامل ہو گیا تو عرب کے خاندان شام کے مختلف علاقوں میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ وہاں کی عیسائی آبادی مسلمانوں کی وفادار ہو گئی لیکن دل سے انہوں نے مسلمانوں کو قبول نہیں کیا تھا۔ کچھ دانشور عیسائیوں نے اس قسم کی نظریاتی تخریب کاری کی کہ کچھ مسلمانوں کو شراب کی طرز مائل کر لیا۔ صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ کام اپنی حسین اور جوان لڑکیوں کے ذریعہ کیا ہو گا۔

ان مسلمانوں کو دوسرے مسلمانوں نے شراب نوشی سے روکا تو شراب نوش مسلمانوں نے قرآن کے حوالے سے کہا کہ قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں — ”کیا تم چیزوں سے باز رہو گے؟“ — یہ مسلمان کہتے تھے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ شراب کو حلال سمجھیں یا حرام۔ وہ یہ بھی کہتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق کے عہد میں شراب نوش کو سزا نہیں دی گئی تھی۔

محمد حسنین ہیکل کچھ اور حوالوں سے لکھتا ہے کہ جب سپہ سالار ابو عبیدہ کو اطلاع ملی کہ کچھ مسلمانوں نے شراب نوشی شروع کر دی ہے تو انہوں نے اپنے طور پر توثیق کی۔ ان کے آگے بھی وہی دلائل رکھے گئے کہ قرآن میں واضح طور پر شراب کو حرام قرار نہیں دیا گیا۔ ابو عبیدہ نے امیر المومنین حضرت عمرؓ کو یہ سارا مسئلہ لکھ کر بھیجا اور کافیصلہ مانگا۔

حضرت عمرؓ نے اسلامی دستور کے مطابق چند ایک صحابہ کرام کو مشورے کے لئے بلایا اور یہ مسئلہ ان کے آگے رکھا۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ کوئی شخص شراب پیتا ہے تو وہ اپنے ہوش کھو بیٹھتا ہے۔ عقل و ہوش کھو جائے تو وہ شخص وہی تباہی بکاتا ہے۔ جب وہی تباہی بکنے پر آتا ہے تو پھر ہر کسی کو غلط قرار دیتا ہے، اللہ کو بھی، رسولؐ کو بھی اور قرآن کو بھی!

حضرت عمرؓ نے دوسرے صحابہ کرام کے مشورے سن کر جب حضرت علیؓ کی یہ بات سنی تو ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا — ”شراب نوشی کی سزا 80 درہم ہے۔“

حضرت عمرؓ نے ابو عبیدہؓ کو لکھا کہ شراب پینے والوں کو اپنے سامنے حاضر کرو۔ اگر وہ شراب کو حلال کہیں تو انہیں قتل کر دو اور اگر وہ اقرار کریں کہ شراب حرام ہے تو انہیں اسی آئی درہم لگوائے جائیں۔

امیر المومنین کا یہ حکم جب ابو عبیدہؓ تک پہنچا تو انہوں نے تمام شراب نوش مسلمانوں کو ڈھونڈ نکالا اور اپنے پاس بلوایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ شراب کو انہوں نے حلال کہا تو قتل کر دیئے جائیں گے۔ ابو عبیدہؓ نے سب سے پوچھا کہ شراب کے متعلق ان کی کیا رائے ہے۔

”شراب حرام ہے“ — سب کے سب بیک زبان بولے۔
 ”اے اہل اسلام، تم پر اللہ کی طرف سے کوئی نہ کوئی آفت نازل ہوگی۔“
 ابو عبیدہؓ نے کہا — ”میں تم سب کو اسی آئی درہم کی سزا دیتا ہوں۔“
 ان سب کو یہ سزا دی گئی اور اس کے بعد کسی مسلمان نے شراب سونگھنے کی بھی جرأت نہ کی۔

ابو عبیدہؓ کے ان الفاظ سے کچھ تاریخ نویسوں نے تاریخ میں یہ غلط روایت ڈال دی ہے کہ ابو عبیدہؓ نے بدعادی تھی کہ اللہ ان مسلمانوں پر اپنا غضب نازل کرے۔ اس روایت میں یہ کہا گیا ہے کہ طاعون کی وبا ابو عبیدہؓ کی بددعا کا نتیجہ تھی۔ یہ روایت اس لئے بے بنیاد ہے کہ ابو عبیدہؓ بددعا دینے والی شخصیت تھے ہی نہیں اور وہ ایسی بددعا کبھی نہ دیتے جو چند ایک گناہگاروں کے ساتھ ہزار بارے گناہوں پر بھی عذاب نازل کرتی۔ صرف یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ کچھ مسلمانوں نے شراب کو حلال قرار دے لیا تھا اور اللہ نے انہیں اس وبا کی صورت میں شدید جھٹکا دیا تھا کہ اللہ کے راستے پر واپس آ جائیں۔

نے اُس وقت عرب پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا جب وہاں قحط کا دور دورہ تھا لیکن مشیروں نے اسے روک دیا اور جواز یہ پیش کیا کہ قحط صرف عرب میں ہے، شام میں نہیں اور مسلمانوں کے لشکر شام میں ہیں۔ اگر رومی فوج عرب میں داخل ہوگی تو شام سے مسلمان لشکر رومی فوج کو گھیرے میں لے لیں گے اور اس کا انجام بہت بُرا ہوگا۔

جاسوسوں نے بتایا کہ جب شام میں طاعون کی وبا پھیلی اور وہاں موت کا راج قائم ہو گیا تو بھی ہرقل نے شام پر حملے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اگر ہرقل اپنے مشیروں کے مشورے مان لیتا تو وہ فوج کو ساتھ لے کر شام جا دھمکتا لیکن اس کے استغف اعظم قیصر نے اسے یہ مشورہ دیا کہ اس نے شام میں فوج داخل کی تو فوج میں طاعون پھیل جائے گی اور اتنی زیادہ جانیں ضائع ہو جائیں گی کہ سوائے پسپائی یا مسلمانوں کے ہاتھوں کٹ مرنے کے رومی فوج کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ قیصر نے دوسرا خطرہ یہ ظاہر کیا کہ مصر سے اپنی فوج شام چلی گئی تو مصر میں قبلی عیسائی اور دوسرے فرقوں کے عیسائی جو ہرقل کی سرکاری عیسائیت کے خلاف ہیں، بغاوت کر دیں گے اور جو تھوڑی سی فوج مصر میں ہوگی وہ اس بغاوت پر قابو نہیں پاسکے گی۔ اس بغاوت کا یہ انجام بھی ہو سکتا ہے کہ شام ہاتھ نہ آئے اور مصر ہاتھ سے نکل جائے۔

جاسوسوں نے یہ بھی بتایا کہ مقوقس ہرقل اور اطربون کو اس بات پر قائل کر رہا ہے کہ شام میں عیسائی مسلمانوں کے خلاف بغاوت کر دیں اور وہاں اپنے تخریب کار بھیجے جائیں۔ مقوقس کا یہ مشورہ ہرقل اور اطربون کے پیش نظر ہے۔ انہوں نے اس مشورے کو پسند تو کیا ہے لیکن اس پر عمل درآمد کی کوئی بات نہیں کی۔

اُس دور میں شام میں غالب اکثریت آبادی عیسائی قبائل کی تھی اور یہ تمام قبائل جنگجو تھے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ان قبائل نے ایک بار بغاوت کی بھی تھی لیکن اس پر قابو پایا گیا تھا۔ بہر حال شام میں عیسائی بغاوت کرنے کی پوزیشن میں تھے۔

قیصر کو بجا طور پر خطرہ نظر آ رہا تھا کہ مصر میں قبلی عیسائی بغاوت کر دیں گے کیونکہ اسے اپنا وہ ظلم و تشدد اور درندگی یاد تھی جو اس نے مصر کے عیسائیوں پر کی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جب بھی موقع ملا عیسائی اس کے اور ہرقل کے خلاف ہی اٹھیں گے۔

تاریخ کہتی ہے کہ ہرقل حملے کا ارادہ تو کرتا تھا لیکن شش و پنج میں پڑا رہتا تھا۔ اگر

ابھی تک بنیامین کے ہاں بیٹھا ہوا تھا۔ کئی مہینے گزر گئے تھے۔ بنیامین نے بن سامر اپنی کے ساتھ اس کی شادی کر دی تھی۔ وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ ایک تو وہ فوجی تھا اور اس کا ذہن فراغت کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ کٹر قبلی عیسائی تھا بلکہ اس پر عیسائیت ایک جنون بن کر طاری رہتی تھی۔ وہ بنیامین کے خفیہ گروہ کا کارندہ تھا اور بنیامین اسے کوئی کام نہیں دے رہا تھا۔ وہ وجہ یہ بتاتا تھا کہ بن سامر بھگوڑا فوجی ہے اور دو سپاہیوں کو مار کر بھاگا ہے اور اس نے ایک لڑکی بھی اغوا کی ہے۔ پکڑے جانے کی صورت میں اس کے لئے مزائے موت سے کم کوئی سزا نہیں تھی۔ بن سامر فراغت کی اس زندگی سے تنگ آچکا تھا۔

بنیامین نے ہرقل کے محل تک اپنے جاسوس پھیلا رکھے تھے۔ بن سامر بھی دراصل اُس کا جاسوس ہی تھا۔ یہ ذہن میں رکھ لیں کہ اُس وقت ہرقل مصر میں نہیں بلکہ بزنطیہ میں تھا اور مصر پر حکمرانی کے فرائض مقوقس ادا کر رہا تھا۔ مقوقس دراصل ہرقل کا باج گزار تھا۔ عملاً مصر کا بادشاہ ہرقل تھا اور جنگی امور اس کے ایک مشورہ معروف جرنیل اطربون کے ہاتھ میں تھے۔ وہ دور دراصل فوج کا ہی دور تھا۔ شام ہرقل کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور وہ اس کو شش میں تھا کہ شام پر دوبارہ قبضہ ہو جائے۔ اس کی زیادہ تر توجہ فوج کی ضروریات اور دیگر فوجی معلومات پر مرکوز رہتی تھی۔

ایک روز بنیامین کے پاس دو آدمی آئے جو اس کے جاسوس تھے۔ وہ مصر کے دارالحکومت سکندریہ میں رہتے تھے اور کچھ عرصہ بزنطیہ میں گزار کر آئے تھے۔ بنیامین نے ان سے پوچھا کہ وہ کیا خبر لائے ہیں۔ جاسوس نے بتایا کہ ہرقل کے دماغ پر شام سوار رہتا ہے اور وہ جلدی سے جلدی شام پر فوج کشی کرنے کے منصوبے بناتا رہتا ہے۔ اس

وہ اُس وقت شام پر چڑھائی کر دیتا جب طاعون مسلمانوں کو چاٹ رہی تھی تو مسلمانوں کے لئے مشکل پیدا ہو جاتی۔ مسلمانوں کے لشکر طاعون کی نذر ہو رہے تھے اور چیدہ چیدہ سپہ سالار بھی فوت ہوتے جا رہے تھے۔ یہ تو اس کے استغفارِ اعظمِ فیروز نے اسے خبردار کر دیا تھا کہ شام میں فوج داخل کی تو وہ اپنی فوج میں بھی پھیل جائے گی۔

○

اُس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ اور ان کے مشیرانِ کرام شدید پریشانی کے عالم میں تھے۔ ایسے خوفناک قحط کے بعد وہاں دو ایسی چوٹیں تھیں جو بڑے بڑے جابر بادشاہوں کے کھٹنے ٹیک دیا کرتی ہیں۔ ایرانِ خلافت جنگ جیسی صورتِ حال کے ساتھ بننے کے لئے تیار نہیں تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ رومی چڑھائی کر دیتے تو مسلمان کھٹنے ٹیک دیتے۔ اس سے پہلے اُمتِ مسلمہ کے سامنے ایک مثال موجود تھی۔ یہ کوئی ماضی بعید کی بات نہیں تھی بلکہ چند ہی سال پہلے کا ایک حادثہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تو خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک لشکر بھیج کر ایک محاذ کھول دیا۔ حضرت عمرؓ نے اور ایک دو اور صحابہ کرام نے ان کی اس کارروائی پر حیرت اور پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اُمت پر اس قدر شدید چوٹ پڑی ہے جس سے پوری اُمت غم میں ڈوب گئی ہے، اس صورتِ حال میں نیا محاذ کھولنا دانشمندی نہیں۔ ابوبکر صدیقؓ نے کہا کہ ہم اگر غم میں ڈوبے رہ گئے تو کفار یہ تاثر لیں گے کہ اب مسلمان اٹھنے کے قابل نہیں رہے۔ اس کے فوراً بعد ہوا بھی یہی۔ ارتداد کا ایسا فتنہ اٹھا جس نے ایک خطرناک اور طویل جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ کئی رسول اٹھے اور مجاہدینِ اسلام نے دین کے ان دشمنوں کو ان کے خون میں ڈبو کر ثابت کر دیا کہ اللہ کا یہ دین ہمیشہ زندہ و پابندہ رہنے کے لئے آیا ہے اور مسلمان اس کی آن اور شان پر ہر صورتِ حال میں جانیں قربان کرتے رہیں گے۔

ایمان مضبوط ہو، دل میں اللہ کے دین کی محبت اور اللہ کی خوشنودی ہو تو اللہ ایسے معجزے کر کے دکھا دیتا ہے کہ بندے حیرت زدہ ہو کے رہ جاتے ہیں۔ یہاں کسریٰ ایران کے خلاف جنگ کا ایک واقعہ یاد آتا ہے جس کا بیان بے محل نہ ہو گا۔ کسریٰ ایران کی طاقتور فوجیں اپنے علاقے مسلمانوں کو دیتیں پسپا ہوتی جا رہی تھیں اور یہ اس جنگ کا

آخری اور عروج کا دور تھا۔ اُس وقت کسریٰ ایران یزدگرد تھا۔ اُس کی فوجیں خوزستان میں قدم جمانے کی کوشش کر رہی تھیں اور کسریٰ کے بڑے بڑے نامور جرنیل مجاہدینِ اسلام کے سیلاب کو روکنے کے لئے سردھڑکی بازی لگائے ہوئے تھے۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے تاریخ ساز سپہ سالار ابو موسیٰؓ اشعری کو اس محاذ پر بھیج دیا۔

یہاں ہم خوزستان کے سارے محاذ اور معرکے بیان نہیں کریں گے۔ یہ آپ ہماری کتاب - "حجاز کی آندھی" - میں پڑھیں۔ کسریٰ ایران کا ایک بڑا ہی تجربہ کار اور زبردست جرنیل ہرمزان تھا جو ایران کے شاہی خاندان کا فرد تھا۔ اسے قوت و اقتدار کا سردار کہا جاتا تھا۔ اس نے کسریٰ ایران یزدگرد کے آگے یہ شرط رکھی کہ اسے خوزستان کا مرکزی شہر اہواز اور فارس کا کچھ حصہ اس کی حکومت میں دے دیا جائے تو وہ مسلمانوں کے سیلاب کو نہ صرف روک دے گا بلکہ اسے یہیں سے پیچھے دھکیل دینے میں پوری پوری مدد کرے گا۔ یزدگرد نے اُسی وقت فرمان جاری کر دیا کہ یہ دو علاقے ہرمزان کو عطا کر دیئے گئے ہیں۔

ہرمزان نے کسریٰ سے جتنی فوج مانگی اتنی ہی دے دی گئی۔ یہ فوج نفری کے لحاظ سے اور اسلحہ کے لحاظ سے بھی اُس وقت کی بڑی ہی طاقتور فوج تھی۔ ہرمزان فوراً اس فوج کے ساتھ کوچ کر گیا اور ایران کے ایک بہت بڑے شہر تستر میں جا پہنچا۔ یہ ایرانی فوجوں کی بہت بڑی جھڑپ تھی اور وہاں شاہی محلات بھی تھے۔

ہرمزان نے اس شہر کی بیرونی دیوار اور قلعے مزید مستحکم کرنے کے لئے مرمت کروائی اور کچھ اضافے بھی کئے۔ شہر کے ارد گرد خندق بھی کھدوا دی۔ اس نے یہ کام شب و روز کی محنت سے بہت جلدی مکمل کر لیا پھر اس نے شہر کے ارد گرد کے علاقے کے سرکردہ افراد کو بلایا اور انہیں مسلمانوں کے خلاف خوب بھڑکایا اور کہا کہ مسلمان جس علاقے کو فتح کرتے ہیں وہاں کی لڑکیوں کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ اس طرح اس نے ان لوگوں کے خون کو گرما کر کہا کہ لوگوں کو لڑنے کے لئے تیار کریں اور انہیں شہر کے اندر لے آئیں۔

علامہ شبلی نعمانی اور محمد حسنین پیکل مختلف مؤرخوں کے حوالوں سے لکھتے ہیں کہ چند دنوں میں ہی لوگوں کا ایک جم غفیر شہر میں آ گیا۔ ہرمزان نے ان سے خطاب کیا اور انہیں باتیں کیں کہ ہر فرد آگ بگولہ ہو گیا۔ لڑنے والے لوگ ابھی تک چلے آ رہے

تھے۔ یہ ہنگامہ خیز سلسلہ مسلمانوں سے چھپانہ رہ سکا اور اس کی اطلاع سپہ سالار ابو موسیٰؓ کو ملی۔ انہوں نے فوراً ایک تیز رفتار قاصد حضرت عمرؓ کی طرف اس پیغام کے ساتھ مدینہ بھیجا کہ صورت حال ایسی پیدا ہو گئی ہے کہ مکہ کی شدید اور بہت جلدی ضرورت ہے۔ حضرت عمرؓ نے عبداللہؓ بن مسعود کو جو اُس وقت کوفہ میں تھے، پیغام بھیجا کہ اپنی آدمی فوج لے کر ابو موسیٰؓ کے پاس پہنچ جائیں دوسرا پیغام جریر بن جحلی کو بھیجا کہ وہ اپنا آدھا لشکر لے کر ابو موسیٰؓ کی مدد کو پہنچے۔

یہ دونوں لشکر پہنچتے تک ہرمزان اپنا قلعہ اور شہر کا دفاع تیار کر چکا تھا۔ مکہ بروقت ابو موسیٰؓ تک پہنچ گئی تھی۔



ہرمزان کے پاس بہت بڑی فوج تھی جس کے بل بوتے پر اس نے شہر میں محصور ہو کر لڑنا بہتر نہ سمجھا۔ اس کی بجائے باہر نکل کر حملہ کیا۔

ابو موسیٰؓ نے دائیں پہلو پر برادر بن مالک کو رکھا اور بائیں پہلو پر براء بن عارب انصاری کو رکھا۔ یہ دونوں سالار دلیری اور شجاعت میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ دونوں فوجوں میں گھسان کارن پڑا۔ یہ ایک خونریز معرکہ تھا۔ مجاہدین اسلام کی تعداد دشمن کی نسبت نصف تھی لیکن انہوں نے ہرمزان کی حملہ آور فوج کو پیچھے دھکیل دیا۔

آخر ہرمزان کی فوج کچھ توکت مری اور باقی شہر کے کٹے دروازوں میں داخل ہونے لگی۔ مسلمان تعاقب میں تھے۔ ہرمزان کی دلیری کا یہ عالم کہ جرنیل ہوتے ہوئے وہ سپاہیوں کی طرح لڑ رہا تھا۔ اسے سب سے پہلے قلعے میں چلے جانا چاہئے تھا لیکن وہ قلعے کے دروازے پر کھڑا رہا۔

سالار برادر بن مالک دروازے تک پہنچ گئے اور ان کا سامنا ہرمزان سے ہوا۔ دونوں میں تیغ زنی ہوئی۔ آخر ہرمزان نے برادر کو شہید کر دیا۔

اس کے بعد اپنے ایک اور سالار مخزماؓ بن ثور آگے بڑھے اور ہرمزان نے ان کا راستہ روک لیا۔ یہ سالار نامی گرامی شہ سوار اور تیغ زن تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ہرمزان نے برادر کو قتل کر دیا ہے۔ وہ انتقام لینے کو آگے بڑھے اور ہرمزان پر چھپے لیکن ہرمزان نے تیغ زنی کے وہ مظاہرے کئے کہ مخزماؓ بن ثور کو چکرا دیا۔ اسلام کے یہ شہ سوار سالار تیغ زنی میں کم نہ تھے لیکن ہرمزان نے انہیں بھی شہید کر دیا۔

ہرمزان اپنی باقی ماندہ فوج کو قلعے کے اندر لے جانے میں کامیاب ہو گیا اور شہر کے دروازے پھر بند ہو گئے۔ تاریخ کے مطابق پیچھے یعنی شہر کے باہر ایرانی فوج کی ایک ہزار سے زائد لاشیں پڑی تھیں اور چھ سو ایرانی فوجیوں کو پکڑ لیا گیا تھا۔

اس کے بعد ہرمزان نے باہر آکر لڑائی نہ لڑی اور قلعہ بند ہو کر لڑتا رہا۔ دن پر دن گزرتے جا رہے تھے اور پھر مہینے گزرنے لگے۔ ہرمزان نے شہر کا دفاع ناقابلِ تسخیر بنا دیا تھا۔

ایک روز مجاہدین اس محصور شہر کے ایک ایرانی شہری کو پکڑ لائے۔ وہ ضد کر رہا تھا کہ اسے مجاہدین اپنے سپہ سالار سے ملوا دیں۔ آخر اسے ابو موسیٰؓ کے پاس لے گئے۔ اس ایرانی نے بتایا کہ وہ ایک ایسے راستے سے باہر نکلا ہے جس کا عام شہریوں کو علم نہیں۔ اس نے کہا کہ وہ ابو موسیٰؓ کو شہر میں داخل ہونے کے لئے یہ راستہ بتا سکتا ہے اور اس کے عوض وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کے خاندان کے ایک سو افراد کی جان بخشی کی جائے اور اس کے خاندان کی کسی لڑکی کو اپنے قبضے میں نہ لیا جائے۔

سپہ سالار ابو موسیٰؓ نے اسے کہا کہ مسلمانوں کا کردار ہی یہی ہے کہ وہ کسی لڑکی کو اپنے قبضے میں نہیں لیا کرتے اور جو عورتیں مسلمانوں کے پاس آتی ہیں وہ ایک اور صورت حال ہوتی ہے پھر ابو موسیٰؓ نے اس کے ساتھ وعدہ کیا کہ کامیابی کی صورت میں نہ صرف اس کے خاندان کے ایک سو افراد اپنی حفاظت میں لے لیں گے بلکہ اس کے اپنے کنبے کی کفالت بھی اپنے ذمے لے لیں گے۔

اس آدمی نے کہا کہ پہلے اس کے ساتھ اپنا ایک آدمی بھیجا جائے جسے وہ شہر سے واقف کرادے گا۔ ابو موسیٰؓ نے ایک بڑے ہی دلیر اور عقلمند مجاہد اسرس بن عوف ثیبانی کو اس کے ساتھ کر دیا۔

اس ایرانی نے کہا کہ اسرس کو نوکروں یعنی غلاموں والا لباس پہنایا جائے تاکہ شہر میں کوئی اسے پہچان نہ سکے کہ یہ مسلمان ہے۔ اسے فوراً وہ لباس پہنایا گیا اور حلیہ تبدیل کر دیا گیا۔ ایرانی اسرس کو اسی رات اپنے ساتھ لے گیا۔

اس علاقے میں دریا کی کئی شاخیں نکلتی تھیں جنہیں نہریں کہا جاتا تھا۔ جب تستر کا یہ قلعہ تعمیر ہوا تھا تو اُس وقت کے بادشاہ نے ایسے تعمیر کروایا کہ ایک نہر اس کے بالکل قریب سے گزرتی تھی۔ اس نہر سے ایک شاخ نکال کر اس طرح شہر کے نیچے سے

بڑی بلند آواز سے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔

ابو موسیٰؓ اسی اشارے کے منتظر تھے۔ انہوں نے شہر پر بلر بولنے کا حکم دیا۔ لشکر سیلاب کی طرح دروازوں پر ٹوٹ پڑا اور اندر داخل ہو گیا۔ ایرانی تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان پر یہ آفت نازل ہو سکتی ہے۔ وہ سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ ان کا قتل عام شروع ہو گیا۔

یورپی مؤرخ بطور لکھتا ہے کہ ہرمزان اور اس کے سرداروں نے فوجیوں اور دیگر لوگوں کو یہ بتایا تھا کہ مسلمان جس شہر کو فتح کرتے ہیں وہاں کی لڑکیوں کے ساتھ بہت بُرا سلوک کر کے اپنے ساتھ ہی لے جاتے ہیں۔ بطور کہتا ہے کہ ایرانیوں نے جب دیکھا کہ مسلمان شہر میں داخل ہو گئے ہیں تو کئی ایک لوگوں نے اپنی جوان بیٹیوں کو قتل کر کے نہر میں پھینکنا شروع کر دیا۔ مجاہدین کو جلدی پتہ چل گیا۔ انہوں نے لڑکیوں کا یہ قتل عام فوراً روک دیا۔

اُس وقت ہرمزان اپنے محل میں تھا۔ وہ وہاں سے بھاگا اور ایک بُرج میں جا پنچا۔ بطور نے لکھا ہے کہ ہرمزان نے اپنے ماتحت جرنیلوں اور مشیروں سے کہا — ”معلوم ہوتا ہے عربوں کو کسی نے نہروالا خفیہ راستہ بتا دیا ہے اور یہ ہمارا کوئی اپنا ہی آدمی ہو سکتا ہے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عربوں کا ستارہ عروج پر ہے اور ہمارا ستارہ ڈوب چکا ہے۔“

یہ واقعہ تاریخ کے دامن میں ڈالنے والے مؤرخوں نے لکھا ہے کہ شہروں میں تو قیامت پھا ہو گئی۔ انہیں یہ تو معلوم ہی نہ تھا کہ دروازے کس طرح کھلے ہیں۔ شہروں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ ہرمزان لوگوں کو یہ یقین دلاتا رہا ہے کہ یہ شہر اور اس کا قلعہ ناقابلِ تسخیر ہے لیکن ہرمزان نے خود ہی دروازے کھلوا دیئے ہیں شہروں کا ردِ عمل یہ تھا کہ انہوں نے ہرمزان اور اپنی فوج کے خلاف باتیں شروع کر دیں اور کہا کہ وہ ہرمزان کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کریں گے۔

کسی نے اسی ردِ عمل کے تحت مجاہدین اسلام کو بتا دیا کہ ہرمزان فلاں بُرج میں موجود ہے۔ مجاہدین وہاں سے اسے گرفتار کرنے کو گئے تو ہرمزان سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کمان اور کندھے کے ساتھ ترکش بندھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک تیر کمان میں ڈال رکھا تھا۔ رات گزر گئی تھی اور اب دن روشن ہو چکا تھا۔ ہرمزان کو لکار کر کہا

”نذاری گئی تھی کہ کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ کے نیچے سے ایک نہر گزرتی ہے۔ یہ نہر ایک سرنگ میں سے نذاری گئی تھی۔ قریب سے دیکھنے والوں کو یہی پتہ چلتا تھا کہ یہ نہر زمین کے نیچے شہر کے اندر جاتی ہے۔ شہر کے اندر اس میں سے چشمے نکالے گئے تھے۔“

○

اسرں اس ایرانی شہری کی رہنمائی میں کچھ دور سے نہر میں اترا اور ایرانی اسے شہر کے اندر لے گیا۔ جہاں سے ابھرنا تھا وہاں سے دونوں باہر آئے۔ ایرانی اس مجاہد کو اپنے گھر لے گیا، کپڑے خشک کرائے اور پھر اس کا حلیہ غلاموں جیسا بنایا۔ اس کے سر پر کمبل ڈالا اور کہا کہ وہ اس کے پیچھے پیچھے شہر میں گھومے پھرے۔

ایرانی نے اسرں کو دن کے وقت شبہی محل دکھایا اور دوسری تمام اہم جگہیں دکھائیں، دروازوں کے اندر پہرے کا انتظام تھا وہ دکھایا اور پھر اسے دیوار پر بھی لے گیا جہاں بُرجوں میں ایرانی فوجی موجود تھے۔ پھر اسے ساری دیوار پر گھمایا پھر آیا۔ اسرں نے فوجی اہمیت کی تمام جگہیں دیکھ لیں اور واپس اس ایرانی کے گھر آگیا۔

تاریخ میں آیا ہے کہ یہ ایرانی عقل و ہوش والا آدمی لگتا تھا۔ اس نے اسرں سے کہا کہ صرف دو سو آدمی یہ شہر لے سکتے ہیں۔ اسرں کا اندازہ بھی یہی تھا۔

رات کے وقت اسرں جس راستے سے آیا تھا اسی راستے سے باہر چلا گیا اور اپنے سپہ سالار ابو موسیٰؓ کو بتایا کہ وہ کیا دیکھ آیا ہے اور یہ بھی کہا کہ صرف دو سو بہت ہی دلیر اور پھر تیلے مجاہدین دے دیئے جائیں تو وہ اس اتنے بڑے شہر کو فتح کر سکتا ہے۔ سپہ سالار ابو موسیٰؓ نے دو سو مجاہدین منتخب کئے اور انہیں اسرں کے حوالے کر دیا۔ اسرں نے انہیں اچھی طرح سمجھ دیا کہ شہر میں کس طرح داخل ہونا ہے اور اندر جا کر کیا کرنا ہے۔ اگلی رات مجاہدین کا یہ جیش اسرں کی قیادت میں چل پڑا اور اسرں انہیں اُسی راستے سے اندر لے گیا جس راستے سے وہ خود گیا تھا۔

ان دو سو مجاہدین نے دروازے کے اندر جتنے پہرہ دار موجود تھے قتل کر ڈالے اور پھر اوپر بُرجوں میں چلے گئے۔ وہ ایسی احتیاط سے گئے تھے کہ کسی کو پتہ ہی نہیں چل سکا کہ شہر کے اندر پہرے دار مارے جا رہے ہیں۔ بُرجوں کے اندر ہی مجاہدین نے بکھر کر بہت سے ایرانی فوجیوں کو مار ڈالا پھر ان مجاہدین نے جو پہرہ داروں کو مارنے کے بعد دروازوں پر موجود رہے تھے، دروازے کھول دیئے۔ ایک بُرج پر ایک مجاہد جا چڑھا اور

گیا کہ وہ اپنے آپ کو مجاہدین کے حوالے کر دے۔

”میری ترکش میں ایک سوتیر ہیں“ — تاریخ میں اس کے یہ الفاظ آئے ہیں جو اس نے مجاہدین سے کہے تھے — ”جب تک میرے پاس ایک تیر بھی باقی رہے گا تم مجھ تک نہیں پہنچ سکو گے“ یہ بھی سوچ لو کہ میرا کوئی تیر کبھی خطا نہیں گیا۔ اپنے ایک سو آدمی مجھ سے مروا کر مجھے گرفتار کرو گے تو تمہیں کوئی خوشی تو نہیں ہوگی!“

سپہ سالار ابو موسیٰؓ کو اطلاع دے دی گئی۔ وہ بھی آگے انہوں نے بھی اسے کہا کہ وہ کمان اور ترکش پھینک دے۔

”میں جانتا ہوں کہ لڑتے ہوئے پکڑا گیا تو تم مجھے قتل کر دو گے“ — ہرمزان نے کہا — ”میرے سامنے ایک راستہ ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ صلح کر لوں اور اپنا آپ تمہارے حوالے کر دوں لیکن میں کچھ اور چاہتا ہوں۔“

”تم کچھ اور چاہنے کے حق سے محروم ہو چکے ہو“ — ابو موسیٰؓ نے کہا — ”یہ شراب ہمارا ہے لیکن یہ دکھانے کے لئے کہ مسلمان کا کردار کیا ہے، میں تم سے پوچھتا ہوں کیا چاہتے ہو؟“

”مجھے اپنے خلیفہ عمرؓ تک پہنچا دو“ — ہرمزان نے کہا — ”وہ میرے ساتھ جو بھی سلوک چاہیں کریں۔ مرنے سے پہلے میں تمہارے خلیفہ سے ملنا چاہتا ہوں۔“

امیر المومنین حضرت عمرؓ کے احکام کچھ ایسے تھے جن کی خلاف ورزی کی جرات کوئی بڑے سے بڑا سپہ سالار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان میں ایک حکم یہ تھا کہ دشمن کا کوئی آدمی امیر المومنین سے ملنے کی خواہش کرے تو اس کی خواہش پوری کی جائے۔ ہرمزان تو بہت بڑی شخصیت تھا اور وہ قوت اور اقتدار کا سردار تھا۔ سپہ سالار ابو موسیٰؓ نے اسے کہا کہ اس کی یہ خواہش فوراً پوری کی جائے گی۔ ہرمزان کو غالباً یہ معلوم تھا کہ مسلمان اپنی زبان کے پکے ہوتے ہیں اور وعدہ پورا کرتے ہیں۔ اس نے ابو موسیٰؓ کی بات سنتے ہی اپنی کمان اور ترکش ابو موسیٰؓ کے آگے پھینک دی۔ جنگی قاعدے اور قانون کے مطابق ابو موسیٰؓ کے حکم سے ہرمزان کے ہاتھ رسی سے پیٹھ پیچھے باندھ دیئے گئے۔ وہ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ تھا آخر جنگی قیدی تھا۔

ابو موسیٰؓ نے اپنے لشکر کے دو ذمہ دار افراد انسؓ بن مالک اور احنفؓ بن قیس کو یہ فرض سونپا کہ وہ ہرمزان کو اسی طرح قیدی کی حیثیت سے مدینہ امیر المومنین کے

پاس لے جائیں۔ ہرمزان کی یہ خواہش بھی منظور کر لی گئی کہ وہ اپنی شاہی پوشاک پہن کر دیگر ساز و سامان بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔

اس شہر سے جو مال غنیمت حاصل ہوا تھا اس میں سے بیت المال کا حصہ الگ کر کے انسؓ اور احنفؓ کے حوالے کر دیا گیا کہ یہ بھی مدینہ اپنے ساتھ لیتے جائیں۔ اس طرح ان کے ساتھ اونٹوں کا اچھا خاصا قافلہ تیار ہو گیا۔ اونٹوں پر مال غنیمت اور ہرمزان کا ساز و سامان تھا۔



یہ قافلہ جب مدینہ کے قریب پہنچا تو ہرمزان نے قافلہ رکوا لیا اور اس نے اپنا جو طیبہ بدلا اس کی تفصیل تاریخ میں ان الفاظ میں آتی ہے:

”ہرمزان نے زر کار پوشاک زیب بدن کی، موتیوں اور جواہر سے مرصع تاج جو آذین کے لقب سے مشہور تھا، سر پر رکھا اور خالص سونے کا عصا شاہی جس میں موتی اور یاقوت جڑے ہوئے تھے ہاتھ میں لیا کہ حضرت عمرؓ اور اسلامی دار الخلافہ کے باشندے وہ شان و شوکت دیکھیں جو امراء عجم کا شعار ہے۔“

یہ قافلہ مدینہ میں داخل ہوا تو لوگ حیرت و استعجاب سے ہرمزان کو دیکھنے لگے۔ اس کی پوشاک اور زیب و زینت مدینہ کے لوگوں کے لئے بالکل ہی نئی چیز تھی۔ اسے حضرت عمرؓ کے گھر کی طرف لے جا رہے تھے تو تماشائیوں میں سے کسی نے کہا کہ حضرت عمرؓ اس وقت مسجد میں ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا کہ کوفہ سے کوئی وفد آیا تھا جو امیر المومنین سے مسجد میں ملاقات کر کے چلا گیا ہے لیکن امیر المومنین ابھی مسجد میں ہی ہیں۔

انسؓ اور احنفؓ ہرمزان کو مسجد میں لے گئے لیکن مسجد بالکل خالی تھی۔ تاریخ میں آیا ہے کہ تین چار لڑکوں نے ایک طرف اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ حضرت عمرؓ مسجد کے ایک کونے میں سوئے ہوئے ہیں۔ ہوا یوں تھا کہ کوفہ کا وفد چلا گیا تو حضرت عمرؓ نے جو جھنڈ پن رکھا تھا وہی تہہ کر کے مسجد کے ایک کونے میں جا کر سر کے نیچے رکھ اور سو گئے۔

ہرمزان کے جوتے باہر اتروا لئے گئے اور اسے مسجد کے اندر لے گئے دیکھا کہ حضرت عمرؓ بڑی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ انسؓ اور احنفؓ ہرمزان کو ساتھ لے

بادشاہوں جیسا آدمی ان کے ساتھ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے انسؓ اور اسفؓ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”یہ ایرانی فوج کا بہت بڑا سپہ سالار ہے۔“ انسؓ بن مالک نے حضرت عمرؓ کو بتایا۔
 ”شاهی خاندان کا فرد ہے۔“

امیر المومنین کو بتایا گیا کہ اسے کس طرح پکڑا گیا ہے۔ پھر یہ بتایا کہ یہ امیر المومنین سے ملنے کی خواہش رکھتا تھا۔

”میں جہنم کی آگ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔“ حضرت عمرؓ نے ہرمزان کے طعنان کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو اسلام کے مقابلے میں ذلیل و خوار کیا ہے۔“ حضرت عمرؓ مسجد میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہوئے۔ ”مسلمانو! اللہ کے دین کو مضبوطی سے پکڑ لو اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ہدایت پر عمل کرو۔ دنیا کی ان دلقبریوں میں نہ آؤ جس طرح ایران کا یہ شخص آیا ہوا ہے۔ یاد رکھو دنیا کے جاہ و مال میں سوائے دھوکے کے کچھ بھی نہیں۔“

”یا امیر المومنین!“ اسفؓ بن قیس نے کہا۔ ”اس کی بات سن لیں، یہ آپ کی ملاقات کا خواہشمند تھا۔“

”نہیں!“ حضرت عمرؓ نے کہا۔ ”جب تک اس کے بدن پر اس لباس کا ایک دھاکہ بھی باقی ہے میں اس کے ساتھ کوئی بات نہیں کروں گا۔ اسے پہلے وہ لباس پہناؤ جو ہم اور تم جیسے لوگ پہنتے ہیں۔“

حجرہؓ نے اسے بتایا کہ امیر المومنین نے کیا حکم دیا ہے اور اسے فوری طور پر حکم کی تعمیل کرنی پڑے گی۔ اسے کھڑا کر دیا گیا اور دو آدمیوں نے اس کی شانہ پوشاک اتار لی اور صرف زیر جامہ رہنے دیا۔ ایک آدمی دوڑا گیا اور اسے پہنانے کے لئے موٹے اور بڑے ہی معمولی کپڑے کا لباس لے آیا جو ہرمزان کو پہنادیا گیا۔

”ہرمزان!“ حضرت عمرؓ نے اسے کہا۔ ”کیا تجھے حق اور باطل کا فرق معلوم ہوا ہے یا نہیں؟ کیا تو نے حکم الہی اپنی آنکھوں میں دیکھ لیا اور پھر اس حکم عدولی کا نتیجہ نہیں دیکھا؟“

”اے عمر!“ ہرمزان نے بڑی جرأت سے کہا۔ ”جاہلیت کے زمانے میں

الگ بیٹھ گئے تاکہ حضرت عمرؓ کی آنکھ نہ کھلے۔

مشہور تاریخ نویس علامہ تہریزی اور ابن کثیر نے اس ملاقات کی تفصیلات لکھی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مسجد میں کچھ اور لوگ بھی آنے لگے اور بیٹھے چلے گئے۔ آخر مسجد میں اتنے لوگ آ بیٹھے کہ کسی اور کے کھڑا ہونے کی بھی گنجائش نہ رہی۔ اس طرح خاموشی برقرار نہ رکھی جاسکی اور حضرت عمرؓ کی آنکھ کھل گئی۔

چونکہ حضرت عمرؓ اور ہرمزان کے مابین گفتگو ہوتی تھی اس لئے ایک ترجمان موجود تھا۔ یہ ترجمان مشہور صحابی حضرت حجرہؓ بن شعبہ تھے۔ ہرمزان کو بتادیا گیا تھا کہ وہ جو بات کرنا چاہے حضرت حجرہؓ کے ساتھ کرے اور یہ اس کی بات عربی زبان میں امیر المومنین تک پہنچائیں گے۔ ابھی امیر المومنین حضرت عمرؓ سوئے ہوئے تھے تو ہرمزان کچھ حیران سا ہوا تھا کہ ان کا خلیفہ کہاں ہے اور نہ جانے کب آئے۔

”تمہارا خلیفہ عمرؓ کہاں ہے؟“ ہرمزان نے حجرہؓ بن شعبہ سے پوچھا۔

”وہ تمہارے سامنے سوئے ہوئے ہیں۔“ حجرہؓ نے فارسی زبان میں جواب دیا۔

ہرمزان کے چہرے پر حیرت کا بڑا گہرا تاثر آ گیا اور اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ کچھ دیر بعد سر اٹھایا۔ حضرت عمرؓ کی طرف دیکھا پھر حجرہؓ بن شعبہ کی طرف دیکھنے لگا۔

”یقین نہیں آتا یہ تمہارا خلیفہ ہے۔“ ہرمزان نے کہا۔ ”میں نے کوئی دربان نہیں دیکھا اور کوئی محافظ پیادہ یا سوار دستہ مسجد کے باہر نظر نہیں آیا۔ یہاں تو پورا محافظ دستہ ہونا چاہئے تھا۔“

”ہمارے خلیفہ کا محافظ اللہ ہے۔“ حجرہؓ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”ہمارے ہاں

دربان اور محافظ اس طرح نہیں ہوتے کہ خلیفہ جہاں جائیں وہ ان کے ساتھ ساتھ رہیں۔“

اس ایرانی جرنیل ہرمزان نے وہ الفاظ کہے جو آج تک تاریخ کے دامن میں موجود ہیں۔ اس نے کہا۔ ”اس شخص کو پیغمبر ہونا چاہئے تھا اور اگر یہ پیغمبر نہیں تو اس کے اعمال و افعال پیغمبروں جیسے ہی ہیں۔“

مسجد لوگوں سے بھر گئی تھی جنہیں خاموش نہ رکھا جاسکا اور ہرمزان نے بھی باتیں شروع کر دیں تھیں جن سے حضرت عمرؓ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ انسؓ اور اسفؓ کو دیکھ کر بڑی تیزی سے اٹھے۔ وہ ایران کے محاذ کی پوزیشن معلوم کرنا چاہتے تھے لیکن ایک

تو اس کے ہاتھ کاٹنے لگے۔

”اے عمرؓ!“ — ہرمزان نے کہا — ”مجھے ڈر ہے کہ میں جو نئی پانی پی چکوں گا مجھے قتل کر دیا جائے گا۔“

”یہ ڈر دل سے نکال دے۔“ — حضرت عمرؓ نے کہا — ”جب تک تُو پانی پی نہ لے گا تجھے قتل نہیں کیا جائے گا۔“

ہرمزان نے حضرت عمرؓ کی یہ بات سن کر پانی پیئے بغیر پیالہ ایک طرف رکھ دیا۔ اس کے بعد امیر المومنین اور ہرمزان میں جو گفتگو ہوئی اس میں ترشی اور سخت کلامی پیدا ہو گئی۔ اس حد تک کہ اسفؓ بن قیس اور انسؓ بن مالک کو دخل اندازی کرنی پڑی۔

”میں تجھے قتل کروں گا۔“ — حضرت عمرؓ نے کہا۔

”اے عمرؓ!“ — ہرمزان نے کہا — ”تُو مجھے قتل نہیں کر سکتا کیونکہ ابھی ابھی تُو مجھے زندہ رہنے کا حق دے چکا ہے۔“

”تُو جھوٹ بول رہا ہے۔“ — حضرت عمرؓ نے غصیل آواز میں کہا — ”میں تجھے جینے کا حق نہیں دے سکتا۔“

حضرت عمرؓ کا غصہ و غضب دیکھ کر انسؓ بن مالک کو پھر دخل اندازی کرنی پڑی۔ انہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ ہرمزان ان سے دھوکے میں جان کی امان پا چکا ہے۔

”تُو کیا کہہ رہا ہے انسؓ!“ — حضرت عمرؓ نے سٹپٹا کر پوچھا — ”میں ایسے شخص کو کس طرح جان کی امان دے سکتا ہوں جس نے ہمارے اچھے اچھے سالار قتل کر ڈالے ہیں.... میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ شخص کس دھوکے سے مجھ سے جان بخشی کروا چکا ہے۔“

”یا امیر المومنین!“ — انسؓ نے کہا — ”اس نے کہا تھا کہ جو نئی میں پانی پی لوں گا آپ مجھے قتل کر دیں گے۔ آپ نے کہا تھا کہ یہ جب تک پانی نہیں پی لے گا اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس نے پانی الگ رکھ دیا۔ اب یہ شخص پانی پیئے گا ہی نہیں۔“

”اے امیر ان کے فریب کار سپہ سالار!“ — حضرت عمرؓ نے ہرمزان پر غضبناک نگاہ ڈال کر کہا — ”تُو نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ خدا کی قسم میں اس لئے دھوکہ کھا گیا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ مسلمان اگلے ہوئے الفاظ نگلا نہیں کرتا۔“

بھی ہم اور تم ٹکرائے تھے اور ہم تم پر غالب آگئے تھے۔ ایسا صرف اس لئے ہوا کہ اللہ نہ تمہاری طرف تھا نہ ہماری طرف لیکن اب اللہ تمہارے ساتھ ہو گیا ہے اور تم ہم پر غالب آگئے ہو۔“

حضرت عمرؓ نے اس موقع پر محسوس کیا کہ حجرہ بن شعبہ ترجمانی ٹھیک طرح نہیں کر رہے۔ تاریخ میں آیا ہے کہ حجرہ فارسی زبان میں مہارت نہیں رکھتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت زبیرؓ بن ثابت کو بلوایا۔ وہ فارسی بڑی اچھی سمجھتے اور روانی سے بولتے تھے۔

”تُو ایک بات نہیں سمجھ سکا اے ایرانی سپہ سالار!“ — حضرت عمرؓ نے کہا۔ ”تم اُس جاہلیت کے زمانے میں ہم پر صرف اس لئے غالب آئے تھے کہ تیرے ہاں اتحاد تھا اور ہم پر اگندہ خیال اور بکھرے ہوئے لوگ تھے۔ اب سوچ کہ تیری قوم کو ہم جو شکست پر شکست دیئے چلے جا رہے ہیں اس کا سبب کیا ہے۔“

حضرت عمرؓ کے بولنے کے انداز میں غصہ صاف نظر آ رہا تھا جیسے اس شخص سے انہیں شدید نفرت ہو۔ وہ تو ہونی ہی تھی۔ اس شخص کی فوج نے ہزاروں مجاہدین اسلام کو شہید کیا تھا اور اب شکست کھا کر آیا تو بڑی شان سے شاہی لباس پہن کر آیا۔ ہرمزان تجربہ کار اور انسان شناس آدمی تھا۔ وہ حضرت عمرؓ کے مزاج کو دیکھ کر ان کا ارادہ سمجھ گیا۔

”اے عمرؓ!“ — ہرمزان نے کہا — ”میں جانتا ہوں تم مجھے قتل کر دو گے۔“

”موت سے نہ ڈرو۔“ — حضرت عمرؓ نے کہا — ”مجھے معلوم نہیں میں کیا کروں گا اور اللہ مجھ سے کیا کروائے گا۔“

ہرمزان نے پانی مانگا اور کہا کہ وہ پیاس سے مر رہا ہے۔ امیر المومنین کے حکم سے اس کے لئے پانی لایا گیا لیکن پانی لانے والے نے غالباً یہ سوچا کہ امیر المومنین نے اس کی شاہانہ پوشاک اترا کر موٹے کپڑے کا لباس پہنا دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے ذلیل و خوار کرنا ہے چنانچہ یہ شخص ہرمزان کے لئے ایک گھٹیا سے پیالے میں پانی لایا۔

”اے مسلمانوں کے خلیفہ!“ — ہرمزان نے کہا — ”اگر میں پیاس سے مر بھی جاؤں تو بھی اس پیالے میں پانی نہیں پیوں گا۔“

حضرت عمرؓ کے حکم سے بڑے ہی اچھے پیالے میں پانی لایا گیا۔ ہرمزان پانی پیئے گا

رہتے دیکھا تھا۔ ایک جفینہ اور دوسرا یہ مردود قاتل ابو لولو فیروز تھا۔ مجھے دیکھ کر یہ
 ہل چوٹ پڑے۔ جب تیزی سے ادھر ادھر چلے گئے تو یہ خنجر گر پڑا جو ابو لولو نے اٹھا
 اور چلے گئے۔

عبدالرحمنؓ بن ابی بکرؓ کی یہ بات سن کر معمرؓ صحابہ حضرت عبدالرحمنؓ بن عوفؓ
 نے اپنی رائے دی جس سے یہ ثابت ہوا کہ ہرمزان اور جفینہ حضرت عمرؓ کے قتل میں
 ریک تھے۔ عید اللہ بن عمرؓ نے جب ان صحابہ کرام کی باتیں اور ان کی رائے سنی تو
 ہوں نے تلوار اٹھائی اور غیض و غضب میں گھر سے نکل گئے۔ پہلے ہرمزان کے گھر
 پہنچے اور اسے باہر بلا کر کہا کہ میرے ساتھ آؤ میرا گھوڑا دیکھو۔ ہرمزان ان کے آگے
 گئے چلا تو عید اللہ بن عمرؓ نے ایک ہی وار سے ہرمزان کا کام تمام کر دیا۔ ہرمزان گرا
 روہیں مر گیا۔

وہاں سے جفینہ کے ہاں پہنچے اور اسے بلا کر قتل کر دیا۔ پھر حضرت عمرؓ کے قاتل ابو
 لولو کے ہاں گئے جہاں اس کی ایک چھوٹی بیٹی موجود تھی انہوں نے اس لڑکی کو بھی قتل کر
 دیا اور پھر وہ بیجان اور جنون کے عالم میں تلوار لہراتے باہر نکلے اور بڑی بلند آواز سے
 بکتے گئے کہ میں کسی ایرانی اور غیر مسلم غلام کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اگر ان پر قابو نہ
 آجاتا تو وہ اپنے عظیم باپ کے خون کا بدلہ نہ جانے کتنے ہی آدمیوں کو قتل کر کے چکاتے۔

○

بات ہو رہی تھی کہ اس صورت حال میں جو طاعون کی وبا نے پیدا کر دی تھی،
 ہرمزان حضرت عمرؓ اس پریشانی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ رومیوں یا ایرانیوں نے حملہ
 کر دیا تو بہت بڑی مشکل پیدا ہو جائے گی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ یہ مسلمان
 لڑکی تاب ہی نہ لا سکتے اور شام سے پسپا ہو آتے۔

ابھی حضرت عمرؓ کو یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ کھلے حملے کی بجائے زمین دوز حملہ بھی
 ممکن ہے اور ہر قتل کے ہاں اس منصوبے پر ہی غور کیا جا رہا ہے کہ شام میں عیسائی
 ہادی مسلمانوں کے خلاف بغاوت کر دے۔

بنی امیہ کے ہاں کچھ اور عیسائی بھی آکر ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان میں بعض بنی امیہ
 نے خفیہ گروہ کے آدمی تھے اور ایک دو بنی سامری طرح بھگوڑے یا مفروز تھے۔ ان
 ما دو بنی سامری کے بڑے گہرے اور رازدان قسم کے دوست بن گئے تھے۔ یہ دونوں

”اے خلیفہ المسلمین!“ — ہرمزان مسکرایا اور دایاں ہاتھ حضرت عمرؓ کی طرف
 بڑھا دیا — ”میں اسلام قبول کرتا ہوں۔ میں بھی مقہور ہوں۔“

اس طرح ایران کے ایک بہت بڑے جرنیل نے جو شاہی خاندان کا فرد بھی تھا،
 اسلام قبول کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے حضرت عمرؓ سے اجازت چاہی کہ وہ باقی عمر
 مدینہ میں گزارنا چاہتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اسے اجازت دے دی اور دو ہزار درہم
 سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ دو مہینوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہرمزان نے حضرت عمرؓ
 سے کہا تھا کہ اس نے یہ دھوکا اس لئے دیا تھا کہ لوگ خصوصاً ایرانی یہ نہ کہہ سکیں کہ
 اس نے تلوار اور جان کے ڈر سے اسلام قبول کیا ہے۔ یہ بھی تاریخ میں آیا ہے کہ
 حضرت عمرؓ جنگی امور میں ہرمزان سے مشورے لیا کرتے تھے۔ تاریخ میں یہ پتہ نہیں
 چلتا کہ وہ مدینہ میں کیا کام کرتا رہا تھا۔ صرف ایک جملہ لکھا ہے کہ اس نے اسلام کی
 خاطر بہترین خدمات سر انجام دیں۔ بہر حال اس کا اپنا انجام بہت بُرا ہوا۔

ہم چونکہ فتح مصر کی طرف بڑھ رہے ہیں اور یہی ہمارا موضوع ہے لیکن بات
 ہرمزان اور حضرت عمرؓ کی چل نکلی ہے تو موزوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ پورا واقعہ بیان
 کر دیا جائے۔

امیر المومنین حضرت عمرؓ کو 26 ذوالحجہ 23 ہجری بروز بدھ مسجد میں ایک قاتل نے
 شہید کر دیا تھا۔ قاتل کا نام ابو لولو فیروز تھا اور وہ جرہ بن شعبہ کا نصرانی غلام تھا۔ وہ
 جب پکڑا گیا تو اس نے اسی خنجر سے خودکشی کر لی۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ وہ ایرانی
 تھا اور جنگِ نہاد میں جنگی قیدی بنایا گیا تھا۔

حضرت عمرؓ کے بیٹے یہ معلوم کرتے پھر رہے تھے کہ حضرت عمرؓ کو کیا اس شخص
 نے کسی ذاتی عناد کی بنا پر شہید کیا ہے یا اس کے پیچھے کوئی سازش ہے۔ قاتل کا خنجر اپنے
 قبضے میں لے لیا گیا تھا۔ یہ عام قسم کے خنجروں جیسا نہیں تھا بلکہ اس کا دست درمیان میں
 تھا اور یہ ایک کی بجائے دو خنجر تھے۔ ایک پھل ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف۔
 تاریخ کی روایت ہے کہ حضرت عبدالرحمنؓ بن ابی بکرؓ نے یہ خنجر دیکھا تو وہ سوچ
 میں پڑ گئے۔

”خدا کی قسم“ میں نے یہ خنجر پہلے دیکھا ہے۔“ عبدالرحمنؓ بن ابی بکرؓ نے کہا اور
 ذرا چونک کر بولے — ”میں نے ہرمزان کو دو آدمیوں کے ساتھ کھڑے کھڑے پھر

دوست بن سامر کی طرح مذہب کے معاملے میں جنونی تھے۔ دونوں بن سامر کی ہی طرح رومیوں اور مسلمانوں کے سخت خلاف تھے۔

بنیامین کے پاس جو دو جاسوس بڑی لمبی رپورٹ لائے تھے ان میں سے ایک بن سامر کے ایک دوست کا گھرا رازدار دوست تھا۔ اس جاسوس نے اپنے دوست کو رازداری سے بتادیا کہ وہ کیا خبریں لائے ہیں۔

”تو کیا شام کے عیسائی مسلمانوں کے خلاف بغاوت کریں گے؟“ — بن سامر کے دوست نے پوچھا۔

”نہیں!“ — جاسوس نے جواب دیا — ”بنیامین بغاوت کے حق میں نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس سے پہلے شام کے عیسائی بغاوت کر کے بُری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔ ادھر ہرقل کا اسقف اعظم قیصر بھی بغاوت کے حق میں نہیں۔“

”کیا ہرقل شام پر حملہ نہیں کرے گا؟“ — بن سامر کے دوست نے پوچھا۔

”نہیں!“ — جاسوس نے جواب دیا — ”ہرقل شش و پنج میں پڑا ہوا ہے۔“

”یہ لوگ مسلمانوں کو سنبھلنے کی مہلت دے رہے ہیں“ — بن سامر کے دوست نے طنز سے لہجے میں کہا — ”حملہ کرنے کا یہی وقت موزوں ہے۔ یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو مسلمان پھر طاقت پکڑ لیں گے اور مصری فوج کا وہی حال کر کے پسپا کر دیں گے انہوں نے پہلے کیا تھا۔“

بن سامر اور اس کے یہ دونوں دوست عقل سے کم اور جذبات سے مغلوب ہو کر زیادہ سوچا کرتے تھے۔

”بنیامین کی رائے کچھ اور بھی ہے“ — جاسوس دوست نے کہا — ”وہ کہتا ہے کہ شام میں بغاوت نہیں ہونی چاہئے تاکہ مسلمان وبا کے اثرات سے نکل کر تیار ہو جائیں اور مصر پر حملہ کر کے رومی فوج کو یہاں سے بھگا دیں۔“

”ایسا نہیں ہو گا“ — بن سامر کے دوست نے جذباتی اور غصیلی آواز میں کہا — ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ شام پر بھی مسلمانوں کی حکمرانی ہے اور مصر پر بھی ان کی حکمرانی قائم ہو جائے گی۔ نہیں، نہیں، ہم شام میں بغاوت کرائیں گے۔“

تینوں نے اپنا ایک منصوبہ تیار کرنا شروع کر دیا۔ وہ کہتے تھے کہ شام میں بغاوت کرانے کے لئے یہاں سے کچھ آدمی بھیجے جائیں گے جو وہاں خفیہ طریقے سے لوگوں کو

مسلمانوں کے خلاف بھڑکائیں گے۔ ان تینوں کا خیال تھا کہ یہ کام وہ بھی تو کر سکتے ہیں۔ تینوں نے ایک دوسرے کو یقین دلادیا کہ یہ زمین دوز تخریب کاری وہ کر سکتے ہیں اور عیسائیت کی رُو سے یہ ان کا فرض ہے کہ یہ کارروائی کریں۔ ان کی عقل پر مذہبی جنون اور کٹر پٹن غالب آگیا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ بنیامین کو بتائے بغیر یہاں سے نکل جائیں اور شام جا پہنچیں۔

اپنی اب بن سامر کی بیوی تھی۔ وہ بھی ان دوستوں کی ملاقاتوں میں شریک ہوتی اور ان کی باتیں سنتی رہتی تھی۔ لہٰذا تو جوان اور بہت ہی حسین لڑکی تھی اور اس میں خاص قسم کا پھر تیل اپن اور زندہ مزاجی تھی۔ بن سامر کے ان دونوں دوستوں کے ساتھ وہ پوری طرح بے تکلف ہو گئی تھی۔ وہ بن سامر اور اس کے ان دوستوں کی ہم خیال تھی۔

بنیامین کے ہاں گھوڑے موجود رہتے تھے۔ ایک رات ان تینوں نے چار گھوڑے تیار کئے اور چپکے سے وہاں سے چل دیئے۔ بنیامین کے ہاں کوئی سپرہ دار یا سنتری سپرہ پر ہوتا نہیں تھا کہ انہیں دیکھ لیتا۔ وہ دشوار گزار ریگزار تھا۔ ایک گھوڑے پر اپنی سوار تھی۔ ریت پر چلتے ہوئے گھوڑوں کی آہٹ تو سنائی ہی نہیں دیتی تھی۔



صبح تک وہ بہت دور تک پہنچ گئے۔ صبح بنیامین نے چاروں کو غیر حاضر دیکھا اور اصطبل کے چار گھوڑے کم دیکھے تو اس نے اتنا ہی کہا کہ خدا انہیں اپنی امان میں رکھے۔ اگر وہ سکندر یہ چلے جاتے تو وہاں سے انہیں بحری جہاز مل جاتا جو انہیں اظفکیہ پہنچا دیتا لیکن احتیاط لازم تھی۔ یہ احتیاط بن سامر کے لئے تھی کیونکہ وہ فوج کا بھگوڑا اور مفرور قاتل تھا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ سفر کے دوران کہیں دیکھا اور پہچانا نہ جائے۔ وہ آبادیوں اور فوجی چوکیوں سے دور دور ویرانے میں چلے جا رہے تھے۔ بن سامر نے ڈاڑھی خاصی بڑھالی تھی اور ایسا لباس پہن لیا تھا جسے وہ کوئی راہب یا مذہبی پیشوا ہو۔ بن سامر چونکہ فوج میں عہدے دار رہ چکا تھا اس لئے وہ مصر میں فوج کے ساتھ بہت سے علاقوں میں گھوما پھرا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مصر کے مشرقی ساحل پر بحیرہ احمر اور خلیج سویز پر باقاعدہ بندر گاہیں ہیں لیکن وہاں اسے دیکھا جاسکتا ہے کیونکہ وہاں فوج کی موجودگی کا خطرہ تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ بعض جگہوں سے جہاز مل جاتے ہیں جو

بقاعدہ بندرگاہوں پر لنگر انداز نہیں ہوتے۔

تین دنوں کی مسافت کے بعد وہ بحیرہ احمر کے شمالی ساحل پر جہاں سے خلیج سوز شروع ہوتی ہے، ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں چھوٹے بادبانی جہاز مل سکتے تھے۔ وہ گھوڑے بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ جہاز میں گھوڑے لے جائے جاسکتے تھے۔ اس جگہ پہنچے تو انہیں پتہ چلا کہ تین چار دنوں تک ایک جہاز تیار ہو جائے گا۔ چوتھے پانچویں روز جہاز تیار ہو گیا۔ ان تینوں دوستوں کے پاس اتنی رقم موجود تھی جو عرب کے ساحل تک پہنچانے کے لئے کافی تھی۔ جہاز بھی اتنا بڑا تھا کہ گھوڑے بھی اس میں آگئے۔

○

اگر جہاز کو اس ساحل سے بالکل سیدھ میں عرب کے ساحل تک جانا ہوتا تو یہ فاصلہ ایک سو میل سے کچھ ہی زیادہ بنتا تھا لیکن جہاز عرب کے ساحل پر ایک دور کی بندرگاہ تک جا رہا تھا اور یہ فاصلہ ساڑھے تین سو میل بنتا تھا۔ اس طرح منزل تک پہنچنے کے لئے کئی دن درکار تھے۔

جہاز نے لنگر اٹھایا اور بادبان کھول دیئے۔ کچھ ہی دیر بعد بن سامر نے اپنے دوستوں کو مشورہ دیا کہ جہاز کے مسافروں کے ساتھ میل ملاقات شروع کر دیا جائے اور ان میں اگر عیسائی ہیں تو انہیں اپنے مشن کے لئے تیار کیا جائے۔ اس پروگرام کے تحت انہوں نے اسی روز مسافروں سے ملنا شروع کر دیا۔ دو دنوں میں انہیں پتہ چل گیا کہ کتنے مسافر عیسائی اور کتنے مسلمان ہیں۔

بن سامر کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ جہاز انہیں عرب کی کسی بندگاہ پر اتارے گا اور وہاں سے شام کا سفر بڑا ہی لمبا ہو گا اور یہ سارا علاقہ ریگستانی ہے۔ اس نے عیسائیت کے نام پر اتنا لمبا سفر اور اس کی اذیتیں اور صعوبتیں ذہنی طور پر قبول کر لی تھیں اور دوستوں کو بھی بتا دیا تھا کہ سفر کتنا لمبا اور کیسا ہو گا۔ ان کے پاس گھوڑے تھے اس لئے وہ کچھ زیادہ پریشان نہ ہوئے۔

انہوں نے عیسائیوں میں سے چار پانچ سرکردہ سردار قسم کے افراد منتخب کر لئے اور ان کے قریب ہو گئے۔ اتفاق سے ان میں ایک شام کے کسی عیسائی قبیلے کا سردار تھا۔ تینوں نے ان عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف ابھارنا شروع کر دیا۔ ان مسافروں کے

ساتھ بحث مباحثہ بھی ہوتا تھا اور آخر یہ عیسائی مسافر قائل ہو گئے۔

بن سامر اور اس کے دوست ان عیسائیوں سے یہ کہہ رہے تھے کہ وہ بھی اپنے طور پر شام جائیں اور عیسائی قبائل کو بغاوت پر آمادہ کریں۔ انہیں ایک اور عیسائی ملا جو اذیتز عمری کی ادا کل عمر میں تھا۔ بن سامر اور اس کے دوستوں نے خاص طور پر محسوس کیا کہ یہ شخص دانشمند لگتا ہے اور جب بولتا ہے تو اس کے انداز میں ایک تاثر ہوتا ہے جو دوسروں کو متاثر کر دیتا ہے۔ ایک روز ان تینوں نے اسے گھیر لیا اور پوچھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ اس نے شام کے کسی شہر کا نام لیا کہ وہ وہاں کا رہنے والا ہے۔

ان تینوں نے اسے پاس بٹھا کر تبلیغ شروع کر دی اور پھر کہا کہ شام میں عیسائی بغاوت کر دیں تو کم از کم اس ملک پر عیسائیت کی حکمرانی ہو سکتی ہے۔ اس عیسائی نے ان کی تائید کی اور پوچھا کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے اور وہ کیا کرنے آئے ہیں۔ بن سامر نے اسے بتا دیا کہ وہ اسی مشن پر آئے ہیں اور وہاں خفیہ طور پر یہ کام کریں گے۔

اس شخص نے ان سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ ہرقل اور مقوقس اور بنیامین اس سلسلے میں کیا کر رہے ہیں۔ بن سامر نے اسے وہ ساری بات سنا دی جو جاسوس بنیامین کو سنا چکے تھے اور بن سامر کو ایک دوست کے ذریعے یہ ساری رپورٹ ملی تھی۔ اس نے ان سے اور بھی بہت سی باتیں پوچھ لیں جن میں ایک یہ تھی کہ رومی فوج کس حالت میں ہے اور اس کے جرنیل کیا کرتے ہیں۔ بن سامر خود فوجی تھا اور اس نے بنیامین کے ہاں جا کر بھی بہت سی باتیں سنی تھیں اس لئے وہ سب کچھ اس شخص کو بتا دیا۔

ایک رات بن سامر جہاز کے عرشے پر گیا۔ رات چاندنی تھی۔ عرشے پر ٹھٹھے ٹھٹھے یہی شخص نظر آیا۔ اسے شک ہوا یہ وہ آدمی نہیں لیکن وہ بالکل ذہی آدمی تھا۔ بن سامر نے سوچا کہ اس کی شکل و صورت سے ملتی جلتی شکل صورت کے دو آدمی بھی تو ہو سکتے ہیں لیکن اسے کچھ شک سا ہوا۔ اس نے قریب ہو کر اس شخص کو دیکھا۔ بن سامر کو شک اس لئے ہوا تھا کہ وہ آدمی نماز پڑھ رہا تھا۔ بن سامر کو اس نے بتایا تھا کہ وہ عیسائی ہے۔ وہ عشاء کی نماز پڑھ رہا تھا اور دو مسافر اس کے قریب ہی نماز پڑھ رہے تھے۔

”تم تو کہتے تھے کہ مسلمان نہیں ہو“۔ بن سامر نے اس سے پوچھا۔ ”لیکن تم تو نماز پڑھ رہے ہو“۔

”میں درویش آدمی ہوں“ — اس نے کہا — ”خدا کی عبادت فرض ہے، ضروری نہیں کہ ایک ہی طرح سے عبادت کی جائے۔ میں مسلمانوں والی نماز نہیں پڑھ رہا، میں اس طریقے سے خدا کو یاد کر رہا ہوں۔“

بن سامر کی تسلی نہ ہوئی۔ اس نے سوال وجواب کا سلسلہ شروع کر دیا اور وہ آدمی اسے ٹالتا رہا۔ آخر بن سامر وہاں سے اٹھا اور اپنے ساتھیوں کے پاس گیا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ شخص عیسائی نہیں مسلمان ہے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا اور رائے یہ دی کہ اس قسم کے آدمی عموماً جاسوس ہوا کرتے ہیں اور یہ شخص مسلمانوں کا جاسوس ہی معلوم ہوتا ہے۔

اگلے ہی روز انہوں نے مسافروں سے تہدیت کروائی کہ یہ شخص مسلمان ہے اور عربی ہے۔ یہ تو کوئی تباہی نہیں سکتا تھا کہ یہ جاسوس ہے۔

حقیقت یہ تھی کہ یہ آدمی مسلمان تھا اور جاسوسی کے لئے ہی مصر بھیجا گیا تھا۔ اُس رات عرشے پر جو دو آدمی اس کے قریب نماز پڑھ رہے تھے وہ اس کے ساتھی تھے۔ تفصیلات لکھنے والے تاریخ نویسوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان تینوں کو کس نے مصر بھیجا تھا۔

بن سامر کو زیادہ غصہ اس لئے آ رہا تھا کہ اس مسلمان نے اس سے بہت سی ایسی باتیں پوچھ لی تھیں جو وہ کسی کو جتنا نہیں چاہتا تھا۔ ان باتوں سے ہی بن سامر کو یقین ہو گیا کہ یہ شخص جاسوس ہی ہو سکتا ہے۔

بن سامر نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ اس مسلمان مسافر نے اسے کس طرح دھوکہ دیا ہے۔ اس کے دوست بھی جذباتی اور جنونی تھے، عقل سے تو سوچتے ہی نہیں تھے، انہوں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ رات کے وقت موقعہ دیکھ کر اس مسلمان کے ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ کر سمندر میں پھینک دیا جائے۔

بن سامر نے کہا کہ اسے قتل کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو آج رات ہی ہو جائے۔ ”میرے ساتھ اس کی بڑی اچھی بات چیت ہے۔“ بن سامر نے کہا — ”میں اسے کہوں گا کہ چلو عرشے پر چل کے بیٹھتے ہیں تو وہ فوراً چل پڑے گا۔ اسے ایسی جگہ کھڑا کریں گے جہاں کوئی اور دیکھنے والا نہیں ہو گا۔ یہ کام رات کو کریں گے۔ ہم اسے سمندر میں دھکیل دیں گے۔ کوئی دیکھ بھی نہیں سکے گا اور جہاز آگے ہی آگے چلتا جائے

۴۰

بن سامر اسی شام اس مسلمان جاسوس سے ملا اور بڑی بے تکلفی سے دوستانہ بات کا اظہار کیا۔ اسے کہا کہ آج رات وہ اس کے پاس بہت دیر بیٹھنا چاہتا ہے۔ مسلمان نے اس سے پوچھا کہ کوئی خاص بات ہے یا دیے ہی اوپر جا بیٹھنے کو جی چاہتا ہے! ”میں نے بہت سوچا ہے۔“ بن سامر نے کہا — میں آخر مان گیا ہوں کہ تم درویش ہو اور خدا کو راضی رکھنے کا تم نے اپنا ہی طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ تم عالم اور دانشور معلوم ہوتے ہو۔ مجھے اپنا شاگرد سمجھ لو اور آج رات یہ راستہ مجھے بھی سمجھا دو اور دکھاؤ۔ میں دراصل پریشان حال آدمی ہوں۔ شاید خدا مجھ سے بہت ناراض ہے۔ میں تمہیں اپنی زندگی کی داستان سنانا چاہتا ہوں۔“

”جس وقت کو گے اوپر چلے چلیں گے۔“ مسلمان نے کہا۔ ”کو گے تو ساری رات تمہارے ساتھ اوپر بیٹھا رہوں گا۔“

بن سامر نے اس مسلمان کو وہ وقت بتایا جس وقت مسافر اپنی اپنی جگہوں پر سو جایا کرتے تھے۔ مسلمان نے یہ وقت قبول کر لیا اور کہا کہ وہ اس وقت اوپر آ جائے گا۔ بن سامر دوڑا گیا اور اپنے دوستوں کو بتایا کہ آج رات شکار خود ان کے جال میں آ جائے گا۔ اس کے دوست بہت خوش ہوئے اور اس مسلمان کو سمندر میں پھینکنے کے لئے تیار ہو گئے۔

○

اُس رات تک جہاز تقریباً آدھا سفر طے کر چکا تھا۔ مسلمان جاسوس مقررہ وقت پر اُٹھ کر چلا گیا۔ فوراً ہی بعد بن سامر اس کے پاس پہنچا۔ مسافر نیچے سو گئے تھے۔ عرشے پر ایک تو بن سامر تھا اور دوسرا مسلمان جاسوس اور دو تین اور آدمی الگ جگہ کے ساتھ کھڑے چاندنی رات میں سمندر کا نظارہ کر رہے تھے۔ ایک طرف افق پر بجلی چمک رہی تھی اور صاف پتہ چلتا تھا کہ گھٹا اوپر اٹھتی آرہی ہے۔ ہوا بالکل ساکن ہو گئی تھی اور بادیاں جو ہوا سے بھرے رہتے تھے عام کپڑوں کی طرح پھوٹا رہے تھے جس کے زیر اثر جہاز کی رفتار نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔

بن سامر مسلمان تک پہنچا اور دونوں جگہ پکڑ کر چاندنی میں چمکتے سمندر کو دیکھنے لگے اور پھر انہوں نے بڑی تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی گھٹاؤں کو دیکھا اور دیکھتے ہی

دیکھتے گھٹاؤں نے چاند کو اپنے عقب میں لے لیا۔ بن سامر کے دونوں دوست عرشے پر آگئے۔ وہ آہستہ آہستہ بن سامر اور مسلمان کی طرف بڑھ رہے تھے۔

بن سامر نے وقت کا بڑا اچھا انتخاب کیا تھا۔ گھٹاؤں نے اس کے ساتھ یہ تعاون کیا کہ چاند کو چھپا کر رات کو تاریک کر دیا۔ اب ان تینوں کے لئے مسلمان کو اٹھا کر سمندر میں پھینکا آسان ہو گیا تھا اور دیکھنے والا کوئی بھی نہ تھا۔

بن سامر کے دوست قریب پہنچے تو اچانک ہوا چل پڑی۔ سب نے محسوس کیا کہ ہوا معمول سے زیادہ ٹھنڈی ہے۔ اب چند لمحوں میں ہی ان تینوں نے اپنا شکار مار لیا تھا۔

”او بھائیو!“ انہیں کچھ دور سے لکار سنائی دی۔ ”فور آئیچے چلے جاؤ طوفان آ رہا ہے۔ سمندر میں جاگرو گے.... جلدی چلو یہاں سے، نیچے بھاگ جاؤ۔“

ان سب نے ادھر دیکھا، جہاز کے دو تین ملاح دوڑتے آ رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے انہیں وہاں سے چلے جانے کو کہا تھا۔ وہ وہاں سے بڑے اور آہستہ آہستہ چل پڑے۔ انہوں نے دیکھا کہ ملاحوں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ شاید تمام ہی ملاح اوپر آگئے تھے اور بادبانوں کے رستے کھینچنے لگے تھے۔

فور آئی ہوا اور تیز ہو گئی اور اس نے طوفانی رفتار پکڑ لی۔ پھر ایسی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی کہ اوپر ٹھہرنا محال ہو گیا۔ جہاز کاغذ کی ناؤ کی طرح ڈولنے لگا اور پھر اس طرح جیسے کوئی زبردست طاقت جہاز کو اوپر اٹھا اٹھا کر سمندر کی سطح پر بٹخ رہی ہو۔

مسافر جاگ اٹھے۔ وہ تو ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔ مسافر، مسلمان جاسوس اور بن سامر کے دوستوں کو پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کہاں ہیں اور دوسرے کہاں ہیں۔ سمندر کی طوفانی موجیں اوپر اٹھ اٹھ کر جہاز میں گر رہی تھیں۔

بادبان لپیٹ دیئے گئے تھے لیکن جلدی میں اچھی طرح لپیٹے نہ جاسکے اور اتنی تیز طوفانی آندھی میں پھڑپھڑانے لگے۔ اب جہاز بڑے ہی زبردست طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ کسی کو کسی کا خیال نہ رہا۔ ماؤں نے بچوں کو سینوں سے لگا لیا لیکن جب جہاز اوپر اٹھایا دائیں اور بائیں کو ڈولتا تو ماؤں کے لئے بچوں کو سینے سے چپکائے رکھنا ممکن نہ رہا۔ مائیں پکڑتی تھیں اور بچے بازوؤں سے گر پڑتے تھے۔ جہاز کے اندر بھی یوں لگتا تھا جیسے مسافر سمندر میں ہوں۔ جہاز میں پانی بھرتا جا رہا تھا۔

مسافر چیخ چلا رہے تھے لیکن طوفان کی چیخیں اور زلزلے اس چیخ و پکار سے کئی گنا زیادہ بلند اور جگر پاش تھے۔ جہاز اپنے جہاز رانوں کی گرفت سے نکل گیا تھا اور اب یہ طوفان باد و باران کے رحم و کرم پر تھا۔ اس قسم کی آوازیں سنائی دینے لگیں جیسے کسی کا کوئی عزیز سمندر میں جا پڑا ہو۔ مسافر ایک ایک دو دو کر کے سمندر میں ڈوب رہے تھے۔

طوفان نے جہاز کو ساحل کے قریب کر دیا۔ جہاز کے اندر اتنا زیادہ پانی آ گیا تھا کہ اب کسی بھی لمحے اسے ڈوب جانا تھا۔

لمحے طوفان کی تیز و تند رفتار کے ساتھ گزرتے جا رہے تھے اور جہاز ایک طرف سے ڈوبنے لگا۔ اس کے تین چار تختے نکل گئے اور ادھر سے سمندر کی موجیں جہاز میں آئیں تو جہاز اس پہلو پر ہو گیا۔ مسافر جو ابھی تک اس امید پر جہاز میں ہی رہے کہ طوفان گزر جائے گا، سمندر میں کود گئے۔ کچھ ہی وقت بعد جہاز ڈوب گیا۔



صبح طلوع ہوئی تو آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے منڈلا رہے تھے اور ان میں ایک گونا معصومیت تھی۔ سمندر پر سکون تھا جیسے رات کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس سمندر نے نہ جانے کتنے مسافروں اور ان کے بچوں کو اور بچوں کی ماؤں کو اپنے پیٹ میں ڈال کر ہضم کر لیا تھا۔

ساحل پر کچھ دور دور تک چند آدمی نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے بڑے تھے جیسے بے ہوش ہو گئے ہوں اور کچھ قدم کھینچتے جا رہے تھے۔ یہ وہ خوش قسمت تھے جو تیر کر ساحل پر پہنچ گئے تھے۔ وہ تیرنا جانتے تھے اور طوفان نے ان پر یہ کرم کیا تھا کہ جہاز کو ساحل کے تھوڑا قریب کر دیا تھا مگر جہاز جہاں تک گیا تھا وہ بھی سمندر بہت ہی گہرا اور موجیں طوفانی تھیں۔ کوئی قسمت والا تیراک ہی نکل سکتا تھا۔

دن کا پچھلا پہر تھا۔ تین آدمی آہستہ آہستہ ساحل سے خاصی دور اکٹھے چلے جا رہے تھے۔ وہ عربی معلوم ہوتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ آبادی تک پہنچ جائیں گے۔ اس علاقے کی آبادیوں اور بستیوں سے واقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ جدہ اور مدینہ کے درمیانی علاقے میں جا رہے ہیں۔

صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ تینوں سمندر میں سے نکل کر آئے ہیں۔ اڑھائی تین میل

تھی۔ چونکہ مسعود بن سہیل اور اس کے ساتھ ہمدردی اور دلچسپی سے اس کے پاس بیٹھ گئے تھے اور اس کی بات سننا چاہتے تھے اس لئے اس نے انہیں اصل واقعہ سنا دیا۔ اس نے یوں سنایا کہ جب جہاز ڈوبنے لگا تو وہ اور اس کے دو ساتھی سمندر میں کود گئے۔ بن سامر کو سب سے زیادہ خیال اپنی کا تھا۔ اس نے یہاں تک سوچ لیا تھا کہ اپنی ڈوب گئی تو وہ بھی اس کے ساتھ ڈوب مرے گا۔

وہ سمندر میں کود کر اپنی کو پکارتے لگا۔ اپنی بھی کود گئی تھی لیکن وہ سمندر میں اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ ادھر ادھر اپنی کو ڈھونڈنے کے لئے تیرنے لگا۔ جلد ہی اسے نظر آ گیا کہ اس کے ایک ساتھی نے اپنی کو اپنی پیٹھ پر ڈال لیا تھا اور ساحل کی طرف تیر رہا تھا۔ وہاں تو طوفان کی چیخیں اور زلزلے تھے اور پھیرے ہوئے سمندر کی اٹھتی مگر قی طوفانی موجیں تھیں۔ بن سامر نے اپنے دوست کی یہ آواز سن لی کہ اپنی کی فکر نہ کرو، اسے میں باہر نکال لوں گا۔

بن سامر مطمئن ہو گیا اور ساحل تک پہنچنے کے لئے سمندر سے لڑے جھکڑنے لگا۔ وہ فوجی ہونے کی وجہ سے بڑا اچھا تیراک تھا اور اس کے ساتھی بھی تیراکی میں مہارت رکھتے تھے۔

ساحل سے کچھ دور ہی تھے۔ سمندر کی موجوں نے ان تینوں کی بہت مدد کی۔ وہ اس طرح کہ موجیں ساحل کی طرف جاری تھیں اور ساحل سے ٹکرا کر واپس آتی تھیں۔ اس طرح ان موجوں نے انہیں ساحل پر لے جا کر پھینک دیا لیکن ان کی جسمانی حالت اس قدر بُری ہو چکی تھی جیسے وہ اپنے پاؤں پر کھڑے بھی نہیں ہو سکیں گے۔ جوان آدمی تھے، کچھ وقت بعد ان کے جسم نارمل حالت میں آنے لگے اور وہ اُس منزل کی طرف چلنے کے قابل ہو گئے جن کا انہیں ابھی پتہ ہی نہ تھا۔ ایک دو مسافر ان ہی کی طرح سمندر سے نکل آئے تھے۔ انہوں نے بن سامر کو بتایا کہ یہ عرب کا ساحل ہے اور شام بہت دور ہے۔

وہ چل پڑے اور رات آگئی۔ انہوں نے خاصا فاصلہ طے کر لیا تھا لیکن دُور دُور تک آبادی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ رات کو وہ ایک جگہ لیٹ گئے۔ اپنی بن سامر کی بیوی تھی اس لئے یہ دونوں اپنے ساتھیوں سے ذرا الگ ہٹ کر اٹھٹے لیٹے۔ تھکن نے ان کے جسم تو ڈوبیے تھے۔ لیٹتے ہی سو گئے۔

گئے تو انہیں ایک آدمی یوں بیٹھا نظر آیا کہ اس نے سر اپنے گھٹنوں پر رکھا ہوا تھا جیسے بیٹھے بیٹھے سو گیا ہو یا کسی تکلیف میں ہو۔ یہ تینوں اس کے قریب پہنچے تو اس نے سر اٹھایا۔ اس نے ان تینوں کو باری باری دیکھا اور ایک کو پہچان لیا۔ یہ وہی مسلمان جاسوس تھا جسے بن سامر اور اس کے ساتھی سمندر میں پھینک دینے کے لئے عرشے پر گئے تھے لیکن طوفان نے ان کے ارادے کی تکمیل نہ ہونے دی۔

مسلمان جاسوس نے اسے پہچان لیا۔ وہ بن سامر تھا۔ اس مسلمان کے ساتھ وہ جوان سال آدمی تھے جو اس کے ساتھی تھے اور جاسوسی کے مشن پر اس کے ساتھ گئے تھے۔

”تم خوش قسمت ہو بن سامر!“ — مسلمان جاسوس نے کہا — ”اس طوفانی سمندر سے زندہ نکلنا خوش قسمتی نہیں تو اور کیا ہے تمہارے ساتھ ایک بڑی خوبصورت لڑکی بھی تھی۔ کیا وہ ڈوب گئی ہے؟“

”نہیں میرے دوست!“ — بن سامر نے جواب دیا — ”وہ میری بیوی تھی۔ سمندر میں تو نہیں ڈوبی اس ریگستان میں ڈوب گئی ہے۔“

”میں سمجھ گیا بن سامر!“ — مسلمان نے کہا — ”وہ سمندر سے تو نکل آئی تھی اور یہاں آ کر مر گئی ہے اور تم نے اسے دفن کر دیا ہے کہاں دفن کیا ہے؟“

”تم کچھ بھی نہیں سمجھ میرے بھائی!“ — بن سامر نے کہا — ”میں تمہیں کیا بتاؤں مجھ پر کیا گزری ہے!“

”بن سامر!“ — مسلمان نے کہا — ”اب میں تمہیں اپنے متعلق صحیح بات بتاتا ہوں۔ میں عیسائی نہیں مسلمان ہوں اور میرا نام مسعود بن سہیل سکی ہے۔ تم اب میرے ملک میں ہو۔ میں اور میرے یہ دوست تمہیں یہاں تنہا چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔“ — مسعود بن سہیل اور اس کے دونوں ساتھی بن سامر کے پاس بیٹھ گئے۔ مسعود نے کہا — ”اب بتاؤ کیا کہنا چاہتے ہو اور تم پر کیا جاتی ہے۔“

بن سامر کو یہ خیال ضرور آیا ہو گا کہ وہ اس شخص کو قتل کرنے جہاز کے عرشے پر لے گئے تھے۔ مسعود کو تو ان کے اس ارادے کا علم ہی نہیں تھا لیکن بن سامر محسوس کرنے لگا کہ ان مسلمانوں سے اسے کسی اچھے سلوک کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ یہ اثرات تھے اُس عداوت کے جو اس نے اپنے ذہن میں مسلمانوں کے خلاف بٹھا رکھی تھی۔

دوست بن سامر پر ٹوٹ پڑے اور اس پر گھونسلوں اور لالتوں کی بوچھاڑ کر دی۔
 بن سامر نے دونوں کا مقابلہ کیا لیکن وہ بھی اسی جیسے جو اس سال اور طاقتور تھے۔
 اپنی کم سن لڑکی تھی، وہ بن سامر کی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ وہ الگ کھڑی دیکھتی رہی۔ ان
 دونوں میں سے کسی کے پاس ہتھیار ہوتا تو وہ بن سامر کو قتل ہی کر دیتے۔
 انہوں نے بن سامر پر قابو پایا اور اسے اس قدر زود کو ب کیا کہ وہ بے ہوش ہو
 گیا۔ بے ہوشی کی حالت میں بھی اس کے پہلوؤں میں ٹھنڈا مارتے رہے تاکہ یہ اٹھنے
 کے قابل نہ رہے۔

بن سامر ہوش میں آیا تو اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی ہڈیاں کئی جگہوں
 سے ٹوٹ گئی ہیں۔ سر پکڑا رہا تھا۔ وہ اٹھا تو پاؤں پر کھڑا رہنا محال نظر آیا۔ سورج طلوع
 ہو چکا تھا۔ اس نے ہر طرف دیکھا۔ اس کے سامنے ریگستان پھیلا ہوا تھا اور اپنی کانام و
 نشان نہ تھا۔ وہ جان گیا کہ اس کے دوست اس کی بیوی کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ وہ
 وہیں کھڑا سوچتا رہا کہ کیا کرے اور کدھر جائے۔ اس نے چلنے کی کوشش کی تو چند قدم
 چل کر ہی بیٹھ گیا۔ اسے آرام کی ضرورت تھی۔ اس نے گھٹنوں پر سر رکھ کر اس تلخ
 حقیقت کو ذہنی طور پر قبول کرنے کی کوشش شروع کر دی کہ اس کے دوست اسے
 دھوکہ دے گئے ہیں اور اب اپنی اسے نہیں مل سکے گی۔

اسے مسعود بن سہیل مکی اور اس کے ساتھیوں نے ان تلخ سوچوں سے بیدار کیا۔
 ”مسعود بھائی!“ — بن سامر نے کہا — ”مجھے تم سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے
 کہ میری مدد کرو گے۔ تم نے کہا تھا کہ میں تمہارے ملک میں ہوں اور تم مجھے اکیلا
 نہیں چھوڑو گے۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ تم میری ہر طرح مدد کرو گے؟.... نہیں کرو گے
 تم جانتے ہو میں عیسائی ہوں۔ تم آخر میری مدد کیوں کرو گے!“

”میں مسلمان ہوں بن سامرا“ — مسعود بن سہیل نے کہا — ”میں اسلام کے
 حکام کا پابند ہوں۔ تمہارا مذہب جو کچھ بھی ہے، تم ایک انسان ہو اور مصیبت میں
 گرفتار ہو۔ اسلام مجھ پر فرض عائد کرتا ہے کہ میں تمہاری مدد کروں۔ یہ بھی ذہن میں
 رکھو کہ اسلام کا یہ بھی حکم ہے کہ جو تمہاری زبان سے نکل گیا ہے وہ بھی عملاً پورا کرو۔
 بلں اور میرے یہ دوست تمہاری مدد کریں گے دراصل تمہاری بیوی اس قدر
 نوز صورت اور دلکش ہے کہ اس کا جسم حاصل کرنے کے لئے کوئی پارا بھی پار سائی

آدھی رات سے کچھ پہلے بن سامر کو کچھ شور اور کچھ ہنچل سنائی دی تو وہ جاگ
 اٹھا۔ رات چاندنی تھی اس لئے بڑی اچھی طرح کچھ دور تک نظر آ جاتا تھا۔ بن سامر نے
 دیکھا کہ اپنی اس کے پہلو سے غائب ہے اور ذرا ہی پرے اس کے دونوں ساتھی ایڑ
 کے ساتھ دست درازی کر رہے تھے۔ دست درازی بھی ایسی کہ اس کے جس دوست
 نے اپنی کو اپنی پیٹھ پر ڈال کر طوفانی سمندر سے نکالا تھا، اس نے اپنی کو نیچے گرا رکھا تھا
 اور اسے برہنہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کا دوسرا دوست اپنی کے دونوں ہاتھ
 پکڑے ہوئے تھا۔

بن سامر دوڑتا ہوا وہاں تک پہنچا۔ پہلے ایک دوست کے منہ پر گھونسا مار کر پرے
 گرایا پھر دوسرے کو بڑی زور سے لات ماری اور اپنی کو بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا۔ اس کا
 تو دماغ ماؤف ہو گیا تھا کہ یہ اس کے دوست ہیں جو اس کی عزت پر مجرمانہ حملہ کر رہے
 ہیں۔ یہ تو مذہبی جنونی تھے، آخر انہیں ہو کیا گیا ہے!

”دور کھڑے رہو بن سامرا“ — اس کے ایک دوست نے کہا — ”اسے میں
 سمندر سے نکال کر لایا تھا اور اس دوست نے میری مدد کی تھی۔ اس لڑکی پر ہمارا اتنا ہی
 حق ہے جتنا تمہارا ہے۔“

”تم تو اسے سمندر میں ڈوب مرنے کے لئے چھوڑ آئے تھے“ — دوسرے
 دوست نے کہا — ”اب تمہارا اس پر کوئی حق نہیں۔“

بن سامر نے اپنی کو اپنے پیچھے کر لیا اور ان دونوں سے کہا کہ وہ تو مذہب پرست
 آدمی ہیں، یہ حرکت شیطانوں والی ہے۔ اس نے انہیں یاد دلایا کہ وہ کس مقصد کی خاطر
 یہاں آئے ہیں۔ اس کے دوستوں پر اس کی کوئی بات اثر نہیں کر رہی تھی۔ وہ
 دھمکیوں پر اتر آئے تھے۔ آخر ایک دوست نے کہا کہ وہ اپنی کو صرف آج رات کے
 لئے ان کے حوالے کر دے۔ بن سامر کو یہ صورت قبول نہیں تھی اور ہونی بھی نہیں
 چاہئے تھی۔ وہ آخر اس کی بیوی تھی۔

”تم دونوں پر شیطان غالب آ گیا ہے“ — بن سامر نے کہا — ”میں شیطان کا دماغ
 درست کرنے کا طریقہ جانتا ہوں۔“

بن سامر ان کی طرف بڑھا تو وہ دونوں اس پر ٹوٹ پڑے۔ تینوں کے پاس کوئی
 ہتھیار نہیں تھا ورنہ وہ لوہمان ہو جاتے اور ان میں سے کوئی قتل بھی ہو سکتا تھا۔ دونوں

سے دستبردار ہو سکتا ہے۔“

طرح ایک دوسرے سے الگ الگ تھے کہ بھول بھلیاں سی بن گئی تھیں۔ وہاں کوئی باقاعدہ راستہ تو تھا ہی نہیں۔ وہ بن سامر کے دوستوں کے نقوش پا پر جا رہے تھے۔ انہیں دیکھتے دیکھتے کافی دور نکل گئے۔

انہیں پیاس محسوس ہونے لگی لیکن انہوں نے قوت برداشت سے کام لیا۔ باتیں کرتے کرتے وہ چلے گئے اور نقوش پا کی رہنمائی میں چھوٹے بڑے ٹیلوں کی بھول بھلیوں میں سے بھی گزر گئے۔

آگے ایک وسیع نشیب آگیا جس کے چاروں طرف کنارے اونچی دیواروں جیسے تھے۔ اس میں بھی چھوٹے بڑے ٹیلے تھے۔ سامنے گھائی نظر آ رہی تھی لیکن وہ بھی دیوار جیسی ہی تھی۔ یہ چاروں چلتے گئے اور جب اس کے سامنے والے کنارے پر پہنچے تو ایک دوسرے کو سارا دیتے اوپر چلے گئے۔ سب سے پہلے مسعود کا ایک ساتھی آگے آگے اوپر پہنچا تھا۔

”اللہ نے کرم کر دیا ہے“۔ اس ساتھی نے بلند آواز سے کہا۔ ”اوپر آؤ اور دیکھو، جنت ہماری منتظر ہے۔“

سب اوپر گئے تو انہیں بھی کھجور کے درختوں کے جھنڈ نظر آئے جو کم و بیش دو میل دور تھے۔ وہ یقیناً نخلستان تھا۔ انہوں نے تھکن کے باوجود رفتار تیز کر دی۔ سورج مغرب کی طرف چلا گیا تھا۔

نخلستان نے ان کے جسموں میں تازگی پیدا کر دی۔ قریب پہنچے تو دیکھا کہ نخلستان کے ارد گرد اونچا بند سا بنا ہوا تھا۔ قدرتی بند تھا جو خاصی دور تک چلا گیا تھا اور نیم دائرے یا دائرے کی شکل میں تھا۔ عرب کے لوگ نخلستانوں سے اور ان کی قدرتی شکل و صورت سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ جب بند کے قریب پہنچے تو نسوانی چیخیں سنائی دیں۔

وہ سب دوڑ کر بند پر چڑھنے لگے تو بند پر اپنی نمودار ہوئی اور نیچے اترنے لگی لیکن پیچھے سے دو آدمیوں نے اوپر آکر اس کے بازو پکڑ لئے۔ یہ دونوں بن سامر کے دوست تھے۔

”یہی ہیں“۔ بن سامر نے کہا۔

مسعود بن سہیل کی اور اس کے دو ساتھی دوڑ کر بند پر جا چڑھے اور اپنی کو

بن سامر اٹھا۔ اس کے دوست بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے پہلے وہاں زمین دیکھی۔ وہاں لڑائی کے نشانات صاف نظر آ رہے تھے۔ مسعود نے ایک طرف دیکھا اور اکیلا ہی اُس طرف چل پڑا۔ بن سامر کے دونوں دوستوں اور اپنی کے نقوش پا صاف نظر آ رہے تھے۔ مسعود تجربہ کار جاسوس تھا۔ اس نے دیکھا کہ بعض جگہوں پر قدموں کے نشان ایسے ہیں جیسے اپنی کو زبردستی یا گھسٹ کر ساتھ لے جا رہے ہوں۔

کچھ دور جا کر مسعود واپس آیا اور اپنے دوستوں کو بتایا کہ وہ کیا دیکھ آیا ہے۔ صحرا میں نقوش پا کو چھپایا نہیں جاسکتا اور یہ تعاقب کرنے والوں کی بڑی ہی واضح اور قابل اعتماد رہنمائی کیا کرتے ہیں۔

”وہ دور نہیں گئے ہوں گے“۔ مسعود کے ایک ساتھی نے کہا۔ ”دور جاسکیں گے بھی نہیں..... یہ بتاؤ بن سامر! کیا ان کے پاس پینے کو پانی ہے؟“

”نہیں!“۔ بن سامر نے جواب دیا۔ ”ان کے پاس پانی کہاں سے آسکتا تھا!.... ہم تو سمندر سے نکل کر آئے تھے۔“

”اٹھو اور چلنے کی کوشش کرو!“۔ مسعود نے بن سامر سے کہا۔ ”ہماری منزل کہیں اور ہے لیکن ہم پہلے کوشش کریں گے کہ تمہاری بیوی تمہیں واپس مل جائے۔“

بن سامر اٹھا اور ان کے ساتھ چل پڑا۔ اس سے ٹھیک طرح چلا نہیں جا رہا تھا۔ مسعود اور اس کے ایک ساتھی نے بن سامر کے دائیں اور بائیں ہو کر اس کے جسم کا کچھ بوجھ اپنے بازوؤں پر لے لیا اور اس طرح وہ کچھ دور تک چلا گیا۔ سورج اوپر آیا تو اس کی تپش نے اس کے جسم میں جان ڈال دی اور وہ بغیر سارے کے چلنے لگا۔ وہ پرانا فوجی تھا۔ اس کا جسم مشقت برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے دو چار مرتبہ زخمی حالت میں بھی پیدل سفر کیا تھا۔ بہر حال وہ ان تینوں مسلمانوں کے ساتھ چلا گیا۔

بن سامر کے دوستوں کے اور اپنی کے نقوش پا بڑے صاف تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے چلتے گئے اور خاصی دور تک جا پہنچے۔ وہاں سے زمین کچھ سخت ہو گئی اور آگے کا علاقہ ایسا جو کہیں نشیب میں چلا جاتا تھا اور کہیں اوپر کو آ جاتا تھا اور اوپر ٹیلے تھے جو اس

ابھی کچی تھیں۔۔۔ مسعود اور اس کے دونوں ساتھی ایک ایک درخت پر چڑھ گئے اور کھجوروں کے ٹکے توڑ توڑ کر نیچے پھینکنے لگے پھر وہ نیچے اترے، کھجوروں سے ریت صاف کرنے کے لئے کچھ دیر پانی میں ڈالیں اور پھر کھانے لگے تو کچی کھجوریں بھی کھا گئے۔ بھوک نے انہیں بے حال کر رکھا تھا۔

○

سورج غروب ہو چلا تھا۔ انہوں نے رات وہیں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ بھوک، پیاس اور اتنا زیادہ چلنے سے ان کے جسم ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ سورج غروب ہو گیا تو مسعود بن سہیل کے ایک ساتھی نے اذان دی پھر مسعود کی امامت میں دونوں ساتھیوں نے نماز مغرب ادا کی۔ بن سامر اور اپنی انہیں دیکھتے رہے۔ عشاء کے وقت پھر ان میں سے ایک نے اذان دی اور مسعود نے باجماعت نماز پڑھائی اور اس کے بعد یہ تینوں اکٹھے ہی لیٹ گئے۔

بن سامر اور اپنی بھی ان کے قریب لیٹے تو مسعود نے بن سامر سے کہا کہ وہ میاں بوی ہیں اس لئے وہ ان سے دور جا کر سوئیں۔ وہ دونوں اٹھ کر ان سے کچھ دور چلے گئے۔

اپنی اس قدر ڈری ہوئی تھی کہ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت بن سامر پر بھی طاری تھی۔

”کیا ان تینوں پر تمہیں اعتماد ہے؟“ — اپنی نے بن سامر سے پوچھا۔

”میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا“ — بن سامر نے جواب دیا۔ ”مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میرے پاس اُس وقت کوئی ہتھیار نہیں تھا جب میں سمندر میں کودا تھا۔ میں نہتہ ہوں۔ اگر ایسا وقت آن پڑا تو ان سے خنجر چھیننے کی کوشش کروں گا۔“

”سو نہ جانا بن سامر!“ — اپنی نے بڑے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

بن سامر پر نیند کا غلبہ ہوا جا رہا تھا لیکن وہ اس کوشش میں تھا کہ وہ نیند پر غالب آجائے۔ اسے احساس تھا کہ اپنی تو عمر بھی ہے اور بے حد حسین بھی۔ اگر اس کے اپنے ائمہ مذہب بھائی نے اپنی کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا تو یہ تو مسلمان ہیں۔ ان پر بھروسہ کیا ہی نہیں جاسکتا۔

وہ دونوں اپنے آپ پر جبر کر کے جاگتے رہے۔ تینوں مسلمان گہری نیند سوئے

بازوؤں سے پکڑ کر اپنی طرف کر لیا۔ وہ دونوں بڑے غصے سے بولے کہ یہ لڑکی ان کی اپنی ہے اور اسے ان سے کوئی نہیں چھڑا سکتا۔ بن سامر ابھی بند چڑھ رہا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ اس کی بیوی ہے۔

مسعود اور اس کے ساتھیوں نے خنجر نکال لئے۔ بن سامر کے دوست خالی ہاتھ تھے۔ ان تینوں مسلمانوں نے ان دونوں سے کہا کہ وہ ہمیں بیٹھ جائیں اور اگر ذرا سی بھی حرکت کی تو انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ وہ بیٹھ گئے۔ مسعود نے اپنی کو سامنے کھڑا کر دیا۔

”اے لڑکی!“ — مسعود نے اپنی سے کہا۔ ”ہمیں بتانا انہوں نے تیرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔“

اپنی نے انہیں بتایا کہ گزشتہ رات یہ دونوں اسے گھسیٹ کر پرے لے گئے اور دست درازی کی تھی۔ پھر ان کی وہ حرکت سنائی جو وہ بن سامر سے سن چکے تھے۔ آخر میں اس نے بتایا کہ یہاں لاکر یہ دونوں اس کی آبروریزی کرتے رہے ہیں۔

مسعود بن سہیل نے اپنے دوستوں کی طرف دیکھا۔ ایک نے کہا کہ اس جرم کی سزا موت سے کم نہیں ہو سکتی۔ یہ سنتے ہی بن سامر کے دونوں ساتھیوں نے منت سماجت شروع کر دی لیکن تینوں مسلمانوں نے پہلے ایک کو پکڑ کر زمین پر پیٹھ کے بل کر لیا اور پھر اس کی ٹانگیں اور بازو جکڑ لئے۔ مسعود نے اپنا خنجر اپنی کو دے کر کہا کہ اس کے دل کے مقام پر پوری طاقت سے خنجر مارے پھر اس کا پیٹ چاک کر دے۔

اپنی اس قدر غصے میں تھی کہ اس نے خنجر لے کر اس آدمی کو اسی طرح خنجر مارے جس طرح مسعود نے بتایا تھا۔ پھر انہوں نے دوسرے آدمی کو گر لیا۔ اسے بھی اپنی کے ہاتھوں سے قتل کروایا۔ اپنی تو غصے میں جیسے پاگل ہو گئی تھی۔ وہ اپنا کام کر چکی تھی لیکن اس نے ان دونوں کو باری باری بڑی تیزی سے سینوں اور پیٹ میں خنجر مارنے شروع کر دیئے پھر ان کی آنکھوں میں خنجر مارے۔ اگر اسے پکڑ نہ لیتے تو وہ خنجر مارتی ہی چلی جاتی۔ وہ بن سامر کے ساتھ لپٹ گئی اور بہت روئی۔

اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے دیکھا وہاں تو پانی ہی پانی تھا۔ وہ سب دوڑتے بند سے اترے اور پانی پینے لگے۔ وہاں کھجور کے بہت سے درخت تھے۔ اوپر دیکھا تو درختوں کو پھل لگا ہوا تھا۔ کچھ کھجوریں گہرا بادی رنگ اختیار کر گئی تھیں۔ زیادہ تر

رہے۔ رات آدمی گزری ہوگی کہ نیند نے بن سامر اور اپنی کو دو بچ لیا اور وہ گہری نیند سو گئے۔

اچانک ایسی آوازیں بلند ہوئیں جیسے چند آدمی آپس میں لڑ رہے ہوں اور چیخ چلا بھی رہے ہوں۔ بن سامر اور اپنی گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ سب سے پہلے انہوں نے مسعود بن سہیل اور اس کے ساتھیوں کو دیکھا۔ وہ اتنی گہری نیند سوئے تھے کہ جاگے ہی نہیں۔ بن سامر کی خوف زدہ نظریں نخلستان کے بند پر گئیں تو چاندنی میں اسے صحرائی لو مڑیاں نظر آئیں جو اس کے دوستوں کی لاشوں پر لڑ پڑی تھیں اور ان لاشوں کو کھارہی تھیں۔ دونوں پھر لیٹ گئے اور سو گئے۔

اب انہیں اذان کی آواز سنائی دی اور وہ جاگ اٹھے۔ انہوں نے دیکھا کہ مسعود کا ایک ساتھی بند پر کھڑا اذان دے رہا ہے اور اس کے ساتھی پانی کے قریب بیٹھے وضو کر رہے تھے۔

”سو جاؤ اپنی!“ — بن سامر نے کہا — ”یہ تینوں نماز پڑھیں گے۔“
دونوں لیٹ گئے اور پھر گہری نیند میں چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ مسعود نے بن سامر کو جگایا اور کہا کہ چلنے کا وقت ہو گیا ہے اور اگر وہ ان کے ساتھ چلنا چاہتا ہے تو آجائے۔

”میں اکیلا تو کہیں نہیں جاؤں گا“ — بن سامر نے کہا — ”تمہاری منزل تک تمہارا ساتھ دوں گا پھر آگے جاؤں گا۔“

”تمہیں کہاں جانا ہے؟“ — مسعود نے پوچھا۔

بن سامر نے فوری جواب نہ دیا۔ اپنی کی طرف دیکھا پھر سر جھکا لیا اور پھر مسعود کی طرف دیکھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے مسعود کے سوال کا صحیح جواب معلوم ہی نہیں۔

مسعود نے اپنا سوال دہرایا تو بن سامر نے سر جھکا لیا۔

”کیا تمہیں اپنی منزل کا کچھ پتہ نہیں؟“ — مسعود کے ایک ساتھی نے پوچھا۔

”نہیں!“ — بن سامر نے جواب دیا — ”منزل کا پتہ نہیں اور اپنے مقصد کے متعلق کوئی شک نہیں۔“

”ہم تمہیں مجبور نہیں کرتے“ — مسعود نے کہا — ”اگر چاہو تو اپنا مقصد ہی بتا دو۔ معلوم ہوتا ہے تم اس علاقے سے واقف نہیں۔ اگر تمہیں ہمارے ساتھ کی

ضرورت ہے تو ہم تمہیں اپنے ساتھ رکھیں گے۔ اگر نہیں تو ہم تمہیں یہیں سے الوداع کہہ دیں گے۔“

”میں تمہارے سلوک سے اس قدر متاثر ہوا ہوں کہ چاہتا ہوں اپنا مقصد تمہارے سامنے رکھ دوں۔ میں بڑا ہی پکا عیسائی ہوں۔ عیسائیت اور کسی کی عیسائی کے خلاف میں ذرا سی بات بھی برداشت نہیں کر سکتا لیکن میرے ان دو دوستوں نے میرے عقیدے کو متزلزل کر ڈالا ہے۔ یہ دونوں بھی بڑے پکے عیسائی تھے۔ ہمارے لوگوں میں دو قوموں کی نفرت بھڑی ہوئی تھی۔ ایک رومی دوسرے مسلمان۔ میں قبلی عیسائی ہوں اور ہمارا پیشوا بنیامین ہے۔“

”تم شاید بھول گئے ہو“ — مسعود نے کہا — ”جہاز میں تم مجھے عیسائی سمجھ کر اپنا یہ مقصد بتا چکے ہو۔ مجھے یاد آ گیا کہ تم شام جا رہے تھے لیکن طوفان نے تمہیں منزل سے بہت دور یہاں لا پھینکا ہے۔ تم شام کے عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے جا رہے تھے۔“

”ہاں!“ — بن سامر نے کہا — ”میں اسی مقصد کے لئے جا رہا تھا لیکن اب نہیں جاؤں گا۔“

”کیوں؟“ — مسعود نے پوچھا — ”اب کیوں نہیں جاؤ گے؟ اگر تمہیں یہ خطرہ نظر آ رہا ہے کہ ہم تمہیں قتل کر دیں گے تو میں تمہیں اس خطرے سے آزاد کرتا ہوں۔ اپنی بیوی کو ساتھ لو اور چلے جاؤ۔ ہم مدینہ جا رہے تھے کہ طوفان نے جہاز کو ہماری بندرگاہ تک نہ پہنچنے دیا اور یہاں لے آیا۔ ہمارے ساتھ مدینہ چلو اور وہاں سے میں تمہیں شام کے راستے پر ڈال دوں گا۔ پہلے دیکھوں گا کہ تمہیں ہماری مدد کی ضرورت ہے یا نہیں۔“

وہاں سے مدینہ بہت دور تھا۔ مسعود اور اس کے ساتھی جاسوس تھے اور انہیں ایسی تربیت دی گئی تھی کہ رات کو ستاروں اور دن کو سورج کو دیکھ کر اپنی منزل کی سمت معلوم کر لیتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ صحرا کے بھیدی تھے۔

بن سامر دراصل بدولی چھاگنی تھی جس سے اس کے ارادے اور مذہب کے دلوں بھی متاثر ہوئے تھے۔ مسعود اور اس کے ساتھی غالباً اس کی یہ جذباتی کیفیت کچھ گئے تھے اسی لئے انہوں نے اس کا ان کے ساتھ چلنے پر اعتراض نہ کیا۔ اپنا ارادہ تو

”پھر سوچ لو“۔ مسعود نے کہا۔ ”تم پر کوئی جبر نہیں۔ اگر تم قبول اسلام نہیں کرو گے تو بھی میں تمہیں اُس ٹھکانے تک پہنچا دوں گا جہاں تم جانا چاہو گے۔“

”مسعود بھائی!“۔ بن سامر نے کہا۔ ”دراصل میں تم تینوں کے کردار سے متاثر ہوا ہوں۔ میں نے سنا تھا کہ عرب کے لوگ جاہلیت میں پڑے ہوئے تھے۔ اسلام نے آکر عربوں کو ذلت اور پستیوں سے نکال کر انسانیت کے اونچے مقام تک پہنچایا جو میں نے عملاً دیکھ لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اپنی اکیلی تمہارے ساتھ ہوتی تو بھی تم اس کے ساتھ وہ سلوک نہ کرتے جو میرے ہم مذہب دوستوں نے کیا ہے۔“

مسعود اور اس کے دونوں ساتھی بن سامر اور اپنی کو اپنے سالار کے پاس لے گئے اور اسے ان دونوں کے متعلق ساری بات اور پھر بن سامر کی خواہش بتائی۔ اُس دور میں سالار امامت کے فرائض بھی سرانجام دیا کرتے تھے۔ سالار نے بن سامر اور اپنی کو حلقہٴ بگوش اسلام کر لیا اور اسے مسعود کے ہی حوالے کر دیا کہ وہ اسے اسلام سے واقفیت کراوے۔

بن سامر نے مصر اور رومی فوج اور قبطی عیسائیوں کے رویے اور ارادوں کی جو باتیں سنائی تھیں وہ مسعود نے اس سالار کو سنائیں۔ یہ بڑی قیمتی باتیں تھیں جو ظاہر ہے امیر المومنین حضرت عمرؓ تک پہنچائی گئی ہوں گی۔

○

امیر المومنین حضرت عمرؓ کے پاس جاسوسی کا بڑا ہی عقلمند اور قابل اعتماد نظام موجود تھا۔ ایسا کہنا غلط ہو گا کہ بن سامر اتفاق سے اپنے جاسوسوں کو نہ ملتا اور وہ اپنے عیسائی دوستوں سے بد دل نہ ہوتا تو اس کے سینے سے کوئی راز نہ ہی نکلتا اور حضرت عمرؓ کو پتہ ہی نہ چل سکتا کہ مصر کے حالات کیا ہیں اور ہر قل کے ارادے کیا۔ مسعود اور اس کے دو ساتھی مصر جاسوسی کے لئے ہی تو گئے تھے۔ اس سے پہلے بھی جاسوسوں کو وہاں بھیجا گیا تھا اور سپہ سالار عمروؓ بن عاص نے اپنے طور پر مصر جاسوس بھیجے تھے کیونکہ مصر کی فتح ان کے دل و دماغ پر ہر وقت غالب رہتی تھی اور انہیں پوری امید تھی کہ ایک نہ ایک دن امیر المومنین انہیں مصر پر فوج کشی کی اجازت دے ہی دیں گے۔

طاعون کی وبا ختم ہو چکی تھی۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ وبا مجاہدین کے لشکر کے ایک خاصے حصے کو کھا گئی تھی۔ لشکر کی نفری پوری کی جا رہی تھی لیکن عمروؓ بن عاص

بتای چکا تھا۔ مسعود نے اسے اپنے ساتھ لے لیا۔

سفر کی اگلی رات آئی تو یہ بھی آسمان تلے بسر کرنی پڑی۔ بن سامر اپنی کے ساتھ ان تینوں سے الگ لیٹ کر سویا۔ وہ رات بھی دونوں نے ڈرتے ڈرتے گزاری۔ انہیں شاید ابھی یقین نہیں آیا تھا کہ کوئی اتنے اونچے کردار کا شخص بھی ہو سکتا ہے جو ایسی خوبصورت اور دلنشین لڑکی کو نظر انداز کر دے۔ بن سامر کی مجبوری تو یہی تھی کہ وہ تنہا تھا اور اس کے ہمسفر تین آدمی تھے۔ اس کا خوف بجا تھا لیکن وہ رات بھی خیریت سے گزر گئی۔

اس کے بعد جو رات آئی وہ ایک آبادی کے قریب گزری۔ وہاں سے انہیں کھانے پینے کا سامان مل گیا جس سے ان کا باقی سفر آسان ہو گیا۔

اس کے بعد دو اور راتیں آئیں اور وہ بھی کھلے آسمان تلے گزریں۔ بن سامر کے دل سے اب خوف نکل گیا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ تینوں اپنی کے ساتھ ذرا سی بھی دلچسپی نہیں رکھتے۔ وہ ہر نماز باجماعت پڑھتے اور مسعود بن سہیل کی امامت کرتا تھا۔

مسعود کو زیادہ دلچسپی بن سامر کے ساتھ تھی۔ مسعود اسے کرید تارہتا اور اس کے سینے میں چھپی ہوئی باتیں نکلوانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ بن سامر اب مصر، مصر کے قبطی عیسائیوں اور رومی فوج کے متعلق اس طرح باتیں کرنے لگا تھا جیسے وہ مسلمان ہو اور چاہتا ہو کہ مصر پر مسلمان فوج کشی کریں۔ اس نے مسعود کو ایک روز صاف الفاظ میں بتایا کہ رومی فوج میں اب وہ تاب و طاقت نہیں رہی جو کبھی ہوا کرتی تھی۔ شام کی طویل جنگ اور شکستوں اور پسپائیوں نے اس فوج کا دم خم توڑ دیا تھا۔ بن سامر نے یہ بھی بتایا کہ اس سے مسلمان اس خوش فہمی میں مبتلا نہ رہیں کہ یہ فوج فوراً ہتھیار ڈال دے گی۔ اس کے جرنیل اس فوج کو ایک بار پھر پہلے والی رومی فوج بنا رہے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی خوبیاں اور اپنی فوج کی خامیاں دیکھ لی تھیں۔

آخر وہ مدینہ پہنچ گئے۔ بن سامر کے دل میں اب کوئی ایسی بات نہیں رہ گئی تھی جو اس نے ان تین مجاہدین سے چھپائی ہو۔ مدینہ پہنچے تو مسعود نے اس سے پوچھا کہ اب وہ کہاں جائے گا۔

”میں بھی نہیں!“۔ بن سامر نے جواب دیا۔ ”میں اپنی منزل پر پہنچ گیا ہوں۔“

میرا یہاں اس ارادے سے آیا ہوں کہ مجھے اور اپنی کو اسلام میں داخل کر لیں۔“

بیتاب ہوئے جارہے تھے۔ وقت بڑی تیزی سے گزرنا جارہا تھا۔ امیرالمومنین کے ساتھ انہوں نے قحط سے پہلے تفصیلی گفتگو کی تھی اور ان پر واضح کیا تھا کہ مصر کو سلطنت اسلامیہ میں شامل کرنا کیوں ضروری ہے۔ اب وبا ختم ہو گئی تو عمرو بن عاص نے حضرت عمروؓ کی طرف پیغام بھیجا جس میں اجازت چاہی کہ وہ مصر کی طرف پیش قدمی کریں۔

انہوں نے حضرت عمروؓ کو لکھا کہ مصر سے جو اطلاعات مل رہی ہیں ان سے یہ خطرہ نظر آ رہا ہے کہ ہم نے مزید وقت ضائع کیا تو ہرقل شام پر فوج کشی کر دے گا یا تازہ اطلاعات کے مطابق شام کے عیسائی قبائل کو بغاوت پر اکسایا جائے گا۔ اگر بغاوت ہو گئی اور مجاہدین کے لشکر بغاوت ختم کرنے میں مصروف ہو گئے تو ہرقل یقیناً حملہ کرے گا اور اس کا انجام شکست ہی ہو سکتا ہے۔

تفصیل سے بیان ہو چکا ہے کہ حضرت عمروؓ مصر حملے کے حق میں تھے لیکن وہ اپنے مصاحبوں اور صحابہ کرام سے صلاح مشورہ کے بغیر کوئی کام نہیں کیا کرتے تھے۔ صحابہ اور دوسرے مصائب میں کچھ تو اس کے حق میں تھے اور زیادہ تر اس کے خلاف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مصر پر فوج کشی ملتوی ہوتی رہی اور قحط نے پھر وبائے آن لیا۔

اب عمرو بن عاص نے پھر یہی مسئلہ چھیڑ دیا تو حضرت عمروؓ نے پہلے سے زیادہ سنجیدگی سے اس پر غور کیا۔ انہیں بھی مصر کے تازہ حالات، ہرقل کے ارادے اور قبلی عیسائیوں کے رویے کی مکمل اور تفصیلی اطلاعات مل چکی تھیں۔ عمرو بن عاص نے جو دلیل پیش کی اور جس خطرے کا اظہار کیا تھا یہ پہلے ہی حضرت عمروؓ کو پریشان کئے ہوئے تھا۔ آخر انہوں نے عمرو بن عاص کو جواب دیا۔ پیغام لے جانے والے قاصد کا نام شریک بن عبدہ تھا۔ اُس وقت عمرو بن عاص تیساریہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ قاصد وہاں پہنچا اور پیغام دیا۔ اس میں حضرت عمروؓ نے لکھا تھا کہ طاعون نے ہمارے لشکروں کی تعداد کم کر دی ہے۔ فلسطینی مسلمانوں سے کہو کہ وہ تمہارے لشکر میں شامل ہو جائیں اور مصر کی طرف پیش قدمی کریں..... اُس دور میں لشکر اسی طرح رضا کارانہ طور پر تیار کئے جاتے تھے۔ حضرت عمروؓ نے آگے چل کر لشکریوں کو باقاعدہ فوجی بنادیا اور ان کی تنخواہیں مقرر کر دی تھیں۔

عمرو بن عاص اسی حکم کے منتظر تھے۔ انہوں نے محاصرہ معاویہؓ بن ابی سفیان کے

سپرد کیا اور بیت المقدس جا پہنچے۔ وہ مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے جلدی جلدی میں کچھ لشکر اکٹھا کر لیا اور کچھ نفری پہلے لشکر سے لے لی اور کوچ کر گئے۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ عمرو بن عاص کے ساتھ جو لشکر تھا اس کی تعداد ساڑھے تین ہزار تھی اور بعض نے تعداد چار ہزار لکھی ہے۔ اس لشکر میں گھوڑ سوار دستے زیادہ تھے۔

لشکر کی تیاری سے پہلے ہی عمرو بن عاص نے حضرت عمروؓ کے قاصد کو جوابی پیغام دے دیا تھا جس میں لکھا تھا کہ وہ فلسطین اور شام سے کمک نہیں لینا چاہتے تاکہ یہ علاقے کمزور نہ ہو جائیں۔ ان کے لئے کمک مدینہ سے بھیجی جائے جو انہیں مصر کے راستے میں ملے۔ انہیں پوری امید تھی کہ مدینہ سے انہیں اچھی خاصی کمک مل جائے گی۔ وہ جانتے تھے کہ جو لشکر وہ ساتھ لے جا رہے ہیں یہ دیاہ غیر میں جا کر لڑنے کے لئے کافی نہیں۔

عمرو بن عاص نے کوچ میں جلد بازی اس لئے کی تھی کہ انہیں یہ خبر مل گئی تھی کہ مدینہ میں اور ایوان خلاف میں جو حضرات مصر پر فوج کشی کے خلاف تھے وہ پہلے سے زیادہ سرگرم ہو گئے ہیں اور حضرت عمروؓ کا گھیراؤ کر کے انہیں قائل کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں کہ وہ اپنا حکم واپس لے لیں۔ ان میں سرفہرست حضرت عثمانؓ بن عفان تھے۔ وہ کوئی معمولی حیثیت اور عام سی عقل و دانش کے فرد نہیں تھے۔ ان کا ایک مقام تھا جسے حضرت عمروؓ بڑے ہی احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ عمرو بن عاص کو یہ خدشہ نظر آیا کہ ایسا نہ ہو کہ امیرالمومنین ان سے متاثر ہو کر مصر پر فوج کشی ملتوی کر دیں۔

تاریخ میں یہ واضح نہیں کہ عمرو بن عاص کو مدینہ کی یہ خبر کس نے دی تھی۔ غالب خیال یہ ہے کہ یہ خبر دینے والا حضرت عمروؓ کا قاصد شریک بن عبدہ ہی ہے۔ مدینہ سے وہی آیا تھا اور اسے بہتر معلوم تھا کہ ایوان خلاف میں کیا ہو رہا ہے۔

معروف مؤرخ ابن عبدالحکم نے چند ایک مؤرخوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ عمرو بن عاص کا یہ اندیشہ غلط نہیں تھا۔ انہیں جو خبر ملی تھی وہ صحیح تھی۔ حضرت عثمان بن عفان کو پتہ چلا تو دوڑے دوڑے حضرت عمروؓ کے ہاں پہنچے اور ان سے تصدیق کرائی کہ انہوں نے واقعی یہ حکم عمرو بن عاص کو دے دیا ہے۔

کے اور جس قدر تیز جاسکتا ہے جائے اور پیغام عمروؓ بن عاصؓ تک پہنچا دے۔



جس وقت قاصد عمروؓ بن عاصؓ تک پہنچا، وہ رنچ کے مقام پر تھے۔ انہوں نے قادی بڑی ست رفتار سے کی تھی اور وہ سمندر کے کنارے کنارے جا رہے تھے۔ راست رفتاری کی وجہ یہ تھی کہ عمروؓ بن عاصؓ مدینہ کی کمک کے منتظر تھے جو انہیں ن تھا کہ آجائے گی۔ کمک کے آجانے کے بعد وہ پیش قدمی کی رفتار تیز کرنا چاہتے تھے۔

یہاں تاریخ میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ جب قاصد عمروؓ بن عاصؓ تک پہنچا اس نے بتایا کہ امیر المومنین کا پیغام لایا ہے تو عمروؓ بن عاصؓ نے پیغام لے کر تیار ہوا۔ اس کی بجائے وہ چلتے گئے اور قاصد سے مدینہ کی باتیں اور خبریں پوچھتے رہے۔ خروہ رنچ سے بہت آگے نکل گئے اور ایک گاؤں آگیا۔ عمروؓ بن عاصؓ نے گاؤں میں سے پوچھا کہ یہ کس ملک کا گاؤں ہے۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ مصر کا گاؤں ہے۔ عمروؓ بن عاصؓ نے اب پیغام کھول کر پڑھا۔ اپنے ماتحت سالاروں کو بلا کر یہ پیغام سنایا اور کہا کہ امیر المومنین نے یہ حکم دیا ہے کہ مصر میں داخل ہو چکے ہو تو پیش قدمی جاری کرو۔ تم سب دیکھ رہے ہو کہ ہم مصر میں داخل ہو چکے ہیں لہذا پیش قدمی جاری رہے۔

انہوں نے قاصد کو پیغام کا جواب لکھ کر دیا کہ ان کا لشکر مصر کی سرحد سے آگے نہ آگیا ہے اس لئے کمک فوراً بھیجی جائے۔ انہوں نے قاصد کو ہی گواہ بنا لیا کہ لشکر مصر اس سرحد میں داخل ہو چکا تھا۔

عمروؓ بن عاصؓ نے اپنے ماتحت سالاروں سے کہا کہ جب انہوں نے دیکھا کہ کمک بجائے قاصد آیا ہے تو وہ سمجھ گئے کہ یہ داپسی کا حکم آیا ہے۔ انہیں حضرت عمروؓ بن عاصؓ کی طرف سے ان کے احکام کا اندازہ تھا۔ کسی طرح انہوں نے محسوس کر لیا کہ حضرت عمروؓ بن عاصؓ نے ان کے ایک حکم دے کر اس کی منسوخی کا حکم بھی بھیج دیں انہوں نے ضرور لکھا کہ مصر میں داخل ہو گئے ہو تو پھر پیچھے نہ آنا آگے ہی بڑھنا۔ عمروؓ بن عاصؓ کا یہ نسخہ نکلا۔

اس سے آگے ان کے سامنے مصر کا ایک مشہور مقام عریش تھا۔ یہ درمیانہ درجے

”خدا کی قسم امیر المومنین! تو ایسی غلطی کرنے والا آدمی تو نہ تھا۔“ حضرت عثمانؓ نے کہا۔ ”تیرا حکم غلط ہے اور جسے تو نے حکم بھیجا ہے وہ آدمی بھی ٹھیک نہیں۔“

حضرت عمروؓ نے چونکہ کہ حضرت عثمانؓ کو ایسی نظروں سے دیکھا جن میں حیرت تھی اور یہ سوال بھی کہ عمروؓ بن عاصؓ جیسے سپہ سالار کو کہہ رہے ہیں کہ ٹھیک آدمی نہیں۔

”خدا کی قسم عمروؓ!“ حضرت عثمانؓ نے کہا۔ ”عمروؓ بن عاصؓ سے میری کوئی عداوت نہیں۔ وہ نڈر اور بے دھڑک خطرے مول لینے والا سالار ہے۔ خالدؓ بن ولید کی طرح وہ اپنے آپ کو اور پورے لشکر کو بھی خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ یہ تو ایک وجہ ہے کہ اسے اجازت نہیں دینی چاہئے تھی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عمروؓ دولت مند خاندان کا فرد ہے۔ اس میں اقتدار کی طلب موجود ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ مصر کے حالات کا صحیح اندازہ نہیں کیا گیا اور وہ جو لشکر لے کر گیا ہے وہ کافی نہیں۔ اس لشکر میں وہ مجاہدین بھی ہیں جنہوں نے فتح پہ فتح حاصل کر کے رومیوں کو شام سے بے دخل کیا ہے۔ اب تو نے اور عمروؓ بن عاصؓ نے ان فاتحین کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔“

حضرت عمروؓ ایسی شش و پنج میں پڑ گئے جو ان کی فطرت کے مطابق نہیں تھی۔ وہ تو بڑے ہی صاف ذہن سے فیصلہ کیا کرتے تھے لیکن انہیں یہ سوچ پریشان کرنے لگی کہ حضرت عثمانؓ جیسی شخصیت کی رائے نہ مانی تو یہ ناراض ہو جائیں گے۔ حضرت عثمانؓ کے علاوہ ان ہی کی حیثیت کے چند حضرات اور بھی تھے جو مصر پر فوج کشی کو ایک خطرہ سمجھ رہے تھے۔ حضرت عمروؓ پریشان ہو گئے۔ ایسی صورت حال پہلی بار پیدا ہوئی تھی کہ ان کی شدید مخالفت ہوئی اور انہیں یہ احساس بھی ہوا کہ انہوں نے ان تمام حضرات سے آخری بار صلاح مشورہ کے بغیر یہ حکم بھیج دیا تھا۔

حضرت عمروؓ نے بڑی گہری غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ عمروؓ بن عاصؓ کو واپس بلا لیا جائے۔ انہوں نے (تاریخ کے مطابق) پیغام میں یہ الفاظ لکھے۔ ”اگر تجھے میرا یہ خط مصر کی سرحد پار کرنے سے پہلے مل جائے تو وہیں سے واپس بیت المقدس چلے جاؤ اور اگر تم مصر کی سرحد میں داخل ہو چکے ہو تو پیش قدمی جاری رکھو میں تمہارے لئے کمک بھیج دوں گا۔“

حضرت عمروؓ نے یہ پیغام اپنے قاصد شریک بن عبدہ کو دیا اور کہا کہ وہ کم سے کم

کا شہر تھا۔ عمرو بن عاص نے اس شہر کو محاصرے میں لینا چاہا لیکن وہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں رومی فوج کا ایک سپاہی بھی نہیں تھا۔ مجاہدین نے شہر میں داخل ہو کر اس پر قبضہ کر لیا۔

اس سے آگے 70 میل دور مصر کا اتنا ہی بڑا ایک اور شہر فرما تھا۔ عمرو بن عاص بہت ہی خوش تھے کہ انہوں نے رومیوں کو بے خبری میں آن لیا ہے اور وہ اگلا شہر بھی اسی طرح فتح کر لیں گے۔ انہوں نے ایسی پریشانی کا اظہار کیا ہی نہیں کہ ملک ابھی نہیں پہنچی لیکن یہ عمرو بن عاص کی خوش فہمی تھی۔ ان کا لشکر جو نئی مصر کی سرحد میں داخل ہوا تھا مصر میں متوقس اور جرنیل اطربون کو اطلاع مل گئی تھی۔

مصر کے حکمران متوقس نے یہ بہتر سمجھا کہ مسلمانوں کے لشکر کو اور آگے آنے دیا جائے۔ اس نے اطربون سے مشورہ کیا کہ عریش سے فرما تک 70 میل لمبا چوڑا صحرا ہے مسلمانوں کو صحرائیں شکست نہیں دی جاسکتی۔ انہیں آگے آنے دیا جائے۔

اطربون نے متوقس کا مشورہ قبول کر لیا اور بڑی تیزی سے یہ کارروائی کی کہ عریش سے اپنی تمام فوج نکال کر 70 میل پیچھے فرما کے شہر میں اکٹھی کر لی اور اس شہر کا دفاع اور زیادہ مستحکم کرنا شروع کر دیا۔

عمرو بن عاص اس خوش فہمی میں ناکافی لشکر کے ساتھ بڑھے چلے جا رہے تھے کہ اگلے شہر میں بھی مزاحمت نہیں ملے گی اور وہ امیر المومنین کے مخالفین کو غلط ثابت کر دیں گے مگر انہیں بتانے والا کوئی نہ تھا کہ رومیوں نے ان کے لئے پھندہ تیار کر رکھا ہے۔

بن عاص کا لشکر مصر کے شہر فرما کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ انہوں نے مصر کا عمرو بن عاص ایک شہر عریش بغیر مزاحمت لے لیا تھا۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تو تھے کہ اگلا شہر فرما بھی اسی طرح آسانی سے لے لیں گے لیکن وہ بہت ہی محتاط ہو کر پیش قدمی کر رہے تھے۔ احتیاط تو لازمی شرط تھی جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کے ساتھ لشکر تھا ہی کیا۔ تین ساڑھے تین ہزار نفری ان کے ساتھ تھی۔ پیش قدمی کی رفتار ذرا کم اس امید پر رکھی کہ مدینہ سے ملک پہنچ جائے پھر یہ وجہ تھی کہ عمرو بن عاص جیسے ہوش مند اور تجربہ کار سالار یہ عنصر تو نظر انداز کر ہی نہیں سکتے تھے کہ رومی فوج مقابلے میں آئے گی ہی نہیں۔

وہ سب صحرائی علاقہ تھا۔ مجاہدین اسلام کا لشکر اونٹوں کی طرح بڑے آرام سے اور اطمینان سے چلا جا رہا تھا جیسے اس کے نیچے ہموار اور بڑی پکی زمین ہو۔ رومی حکمران متوقس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ صحرائیں مسلمانوں کو شکست دینا کوئی آسان کام نہیں۔

پہلا بڑاؤ کیا گیا۔ مدینہ سے ملک تو نہ آئی، حلب سے حدید بن مومن خوزج اپنی بیوی شارینا کے ساتھ آن پہنچا اور سپہ سالار عمرو بن عاص سے ملا۔

اگلے روز مدینہ سے ایک اور تجربہ کار جاسوس مسعود بن سہیل مکی پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ فہد بن سامر تھا اور اس کی بیوی اپنی بھی اس کے ساتھ تھی۔ پچھلے باب میں بیان ہو چکا ہے کہ بن سامر اور اپنی نے اسلام قبول کیا تھا تو بن سامر کا نام فہد بن سامر رکھا گیا تھا لیکن اپنی نے اپنا نام اپنی ہی پسند کیا تھا۔

مسعود بن سہیل مکی کو مدینہ سے امیر المومنین نے بھیجا تھا۔ وہ مصر سے اچھی طرح واقف تھا اور جاسوسی کے لئے وہاں کچھ عرصہ گزار آیا تھا۔ فہد بن سامر مدینہ میں ہی تھا

اور وہ رضا کارانہ مسعود کے ساتھ چلا گیا تھا۔ اسے کسی سے حکم لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اپنی پیچھے اکیلی نہیں رہ سکتی تھی اس لئے وہ بھی اس کے ساتھ چلی گئی۔ فہد بن سامر کو قبول اسلام کے بعد مدینہ میں رکھا گیا اور اس کا کچھ وظیفہ مقرر کر دیا گیا تھا لیکن ابھی اسے کوئی کام نہیں دیا جا رہا تھا کیونکہ ابھی دیکھنا تھا کہ وہ قابل اعتماد بھی ہے یا نہیں۔ وہ فراغت سے بہت ہی پریشان تھا اور اس نے کئی بار کہا تھا کہ وہ رومیوں کے خلاف میدان جنگ میں جانا چاہتا ہے اور اگر اسے جاسوسی اور تخریب کاری کا کام دیا جائے تو وہ کامیابی سے کر سکتا ہے۔ مصر سے تو وہ بہت ہی اچھی طرح واقف تھا اور جس علاقے میں سپہ سالار عمروؓ بن عاص جا رہے تھے، اس سے تو وہ پوری طرح واقف تھا۔ اس نے مسعود کو جاتے دیکھا اور کسی کو بتائے بغیر اپنی کو ساتھ لیا اور مسعود کے ساتھ چل پڑا۔ وہاں گھوڑوں کی اور دیگر ساز و سامان کی کمی نہیں تھی۔ اُس نے دو گھوڑے لے لئے اور اس طرح مسعود، فہد اور اپنی مدینہ سے رخصت ہو گئے۔ انہوں نے کم سے کم پڑاؤ کئے اور سپہ سالار عمروؓ بن عاص کے پاس جا پہنچے۔

کسی بھی مؤرخ نے یہ نہیں لکھا کہ مسعود اور فہد مدینہ سے عمروؓ بن عاص کے پاس گئے تھے تو کیا وہ کوئی ایسی خبر یا اطلاع لے کر گئے تھے یا نہیں کہ مدینہ سے ملک آ رہی ہے یا نہیں۔ تاریخ کی تحریروں سے اور قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ فرما تک پہنچے تک مدینہ سے ملک نہیں آئی تھی اور اگر نہیں آئی تھی تو اس کی کوئی وجہ تاریخ میں نہیں ملتی۔

سپہ سالار عمروؓ بن عاص ایک امیر تاجر خاندان کے فرد تھے۔ قبول اسلام سے پہلے وہ اکثر تجارت کے سلسلے میں مصر جاتے رہتے تھے اور یہ واقعہ تو پہلے بیان ہو چکا ہے کہ انہوں نے ایک یہودی شمس کی جان بچائی تھی اور وہ عمروؓ بن عاص کو مصر کے دار الحکومت سکندریہ لے گیا تھا۔ سکندریہ کی شان و شوکت، جاہ و جلال اور شاہانہ رونقیں دیکھ کر عمروؓ بن عاص ایسے متاثر ہوئے تھے کہ مصران کے ذہن میں نقش ہو کے رہ گیا تھا۔ وہ مصر سے اور خصوصاً شمالی مصر سے تو کئی واقفیت رکھتے تھے۔ مصر کے لوگوں کو بھی وہ جانتے تھے۔ پھر انہوں نے اسلام قبول کیا اور شام اور فلسطین میں فتنہ حرب و ضرب اور سپہ سالاری کا نیا ریکارڈ قائم کیا اور پھر امیر المومنین حضرت عمرؓ کو قائل کرنے لگے کہ مصر ہر قیمت پر سلطنت اسلامیہ میں شامل ہونا چاہئے اور مصر پر فوج

کشی کی قیادت انہیں دی جائے۔ آخر انہیں اجازت مل گئی۔ وہ مصر سے واقف تو تھے لیکن پھر بھی انہیں جاسوسوں کی ضرورت تھی۔ مصر پر فوج کشی سے پہلے وہ اپنے طور پر مصر جاسوس بھیجتے رہتے تھے اور انہوں نے قبلی عیسائیوں کے استغفار اعظم بنیامین کے ساتھ بھی اپنے جاسوسوں کے ذریعے رابطہ قائم کر لیا تھا۔

اب مسعود اور حدید جیسے جاسوس جو بڑے ہی دلیر چھاپہ بار اور تخریب کار بھی تھے، ان تک پہنچ گئے تو انہیں جاسوسی کا مسئلہ خوش اسلوبی سے حل ہوتا نظر آنے لگا۔ عمروؓ بن عاص ان دونوں کی ذہانت اور کارکردگی سے پوری طرح آشنا تھے، فہد بن سامر ان کے لئے بالکل ہی نیا آدمی تھا۔ مسعود نے انہیں فہد کے متعلق بتایا اور فہد نے اپنے جذبات کا اظہار کیا تو عمروؓ بن عاص مطمئن ہو گئے۔ فہد دعویٰ کرتا تھا کہ جتنی کامیاب جاسوسی اور تخریب کاری وہ کر سکتا ہے اتنا کوئی عربی جاسوس نہیں کر سکتا۔

○

سپہ سالار عمروؓ بن عاص نے اپنے ماتحت سالاروں کو پاس بٹھا کر ان تینوں جاسوسوں کو صورت حال تفصیل سے بتائی۔ انہوں نے کہا کہ فرما تک اُن کے جاسوس ہو آئے ہیں اور انہوں نے بتایا ہے کہ فرما میں رومی فوج کی تعداد ہمارے لشکر سے دو گنی ہے۔ عمروؓ بن عاص نے مزید وضاحت یا تصدیق کے لئے مسعود بن سہیلؓ کی کو فرما بھیج دیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ دو جاسوس بنیامین کے پاس بھی چلے گئے ہیں اور بنیامین سے یہ بات کریں گے کہ قبلی عیسائی مسلمانوں کے خلاف نہ لڑیں اور درپردہ مسلمانوں کے ساتھ تعاون کریں۔

”تم دیکھ رہے ہو“ — عمروؓ بن عاص نے کہا — ”میرے ساتھ لشکر کتنا تھوڑا ہے۔ محاصرے کے لئے میرے پاس سلمان بھی پورا نہیں۔ پھر بھی میں اتنا ہی لشکر لے کر اتنی دور آ گیا ہوں اور ملک ابھی پختی نہیں۔ میں نے اپنے لئے یہ مشکل پیدا کر لی ہے کہ خود ہی امیر المومنین سے فوج کشی کی اجازت مانگی تھی اور انہیں قائل کر لیا تھا۔ میں ہر قیمت پر کامیاب ہونا چاہتا ہوں۔“

”ہمیں کامیاب ہونا ہے“ — ایک سالار نے کہا — ”اگر ہم ناکام رہے تو صرف ہمیں شرمندگی کا سامنا نہیں ہو گا بلکہ امیر المومنین اپنے اُن مصاحبوں کے سامنے شرمسار ہوں گے جو ابھی تک انہیں روک رہے ہیں کہ مصر پر ابھی فوج کشی نہ کریں

ورنہ نقصان اٹھائیں گے۔“

”مصر کی فتح اور شکست میرے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔“ عمرو بن عاص نے کہا۔ ”اگر میں ناکام ہو گیا تو پھر میں زندہ مدینہ میں داخل نہیں ہوں گا۔ زندہ وہاں چلا گیا تو مصر حملے کے مخالفین کا سامنا نہیں کر سکوں گا جن میں بزرگ صحابی عثمان بن عفان بھی شامل ہیں۔ وہ کہیں گے کہ ہم نے تمہیں روکا نہیں تھا کہ ایسا نہ کرو! تم سب دیکھ رہے ہو کہ ہم اتنی دور نکل آئے ہیں کہ ہمارے پاس رسد کا کوئی انتظام نہیں۔ میں اللہ کے نام پر آیا ہوں اور اس یقین کے ساتھ آیا ہوں کہ اللہ مدد کرے گا“ شرط یہ ہے کہ ارادہ مضبوط اور نیک ہو۔ ہمارے لئے کوئی نہ کوئی راستہ کھل جائے گا۔“

”کیا آپ نے کوئی راستہ سوچا ہے؟“ - فہد بن سامر نے پوچھا۔

”ہاں، سوچا ہے۔“ عمرو بن عاص نے کہا۔ ”اور یہ راستہ تم اور حدید کھول سکتے ہو سب سے پہلے ہمیں رسد چاہئے اناج اور مویشی یہ ہم اس طرح حاصل کر سکتے ہیں کہ لشکر میں سے کچھ نفری اُس علاقے میں بھیجی جائے جہاں اناج کے ذخیرے موجود ہیں۔ یہ نفری ٹولیوں میں بٹ کر ہر اُس گاؤں پر حملہ کرے جہاں اناج اور مویشی موجود ہیں۔ صرف اناج اور مویشی لائے جائیں لیکن اس طرح میرے لشکر کی نفری کم ہو جائے گی۔“

”پھر وعاکریں کمک آجائے۔“ - ایک سالار نے کہا۔ ”کمک کا انتظار کر لیا جائے۔“

”میں انتظار نہ کروں تو بہتر ہے۔“ عمرو بن عاص نے کہا۔ ”اب جبکہ ہمارے دشمن کو پتہ چل چکا ہے کہ ہم اس کے ملک میں داخل ہو کر ایک شہر لے بھی چکے ہیں تو وہ کیل کانٹے سے لیس ہو کر ہمارے مقابلے میں آئے گا۔ ہمارا انتظار دشمن کو تیاری کا بہت وقت دے دے گا۔ میں ایک اور ذریعہ پیدا کر سکتا ہوں۔“

معروف یورپی تاریخ نویس بٹلر نے یہ ذریعہ تفصیل سے لکھا ہے اور مسلمان تاریخ دانوں نے بھی اسے اچھی طرح واضح کیا ہے۔ ذریعہ یہ تھا کہ جہاں یہ صحرا ختم ہونا شروع ہوتا تھا وہاں سے سبزہ زار کا آغاز ہوتا تھا۔ اس درمیانی علاقے میں آبادیوں سے دُور دُور بدو قبائل رہتے تھے جو کسی حد تک خانہ بدوش تھے۔ وہ ظاہری طور پر عیسائی

تھے لیکن عیسائیت میں انہوں نے کچھ اپنے عقائد اور توہمات شامل کر رکھے تھے۔ ان کی اپنی ایک معاشرت تھی اور ان کے متعلق کوئی شک و شبہ نہ تھا کہ وہ خونخوار قسم کے جنگجو تھے اور فن حرب و ضرب کو بھی سمجھتے تھے۔ سپہ سالار عمرو بن عاص نے یوں سوچا تھا کہ یہ بدو قبائل ہاتھ میں آجائیں تو انہیں ساتھ ملا کر اناج اور مویشیوں کی فراہمی کا کام ان کے سپرد کیا جائے تو وہ خوش اسلوبی سے کر لیں گے۔ مویشیوں سے مراد بھیڑ، بکری، گائے اور اونٹ تھا۔ انہیں ذبح کر کے لشکر کو کھانا تھا۔

سپہ سالار عمرو بن عاص نے جو بنی ان بدو قبائل کا ذکر کیا، فہد بن سامر جو کم پڑا اور ایک ہاتھ اٹھا کر سپہ سالار کو چپ کر دیا۔ لگتا تھا کہ اسے کوئی بات یاد آگئی ہے۔

”سپہ سالار!۔“ - فہد بن سامر نے کہا۔ ”آپ نے ٹھیک کہا ہے کہ ارادہ نیک ہو اور اس میں خوشنودی اللہ کی ہو تو کوئی نہ کوئی راستہ نکل آتا ہے۔ میں رومی فوج میں ان علاقوں میں رہا ہوں اور ان لوگوں کے رسم و رواج اور مذہبی عقائد سے واقف ہوں۔ پانچ چھ دنوں بعد چاند کی تیسری تاریخ ہوگی۔ اس موسم میں سال میں ایک بار چاند کی تیسری تاریخ کی رات یہ لوگ ایک تقریب منایا کرتے ہیں۔ میں اور حدید اُس رات وہاں جائیں گے۔“



مقوقس اور رومیوں کا مشہور و معروف جرنیل اطربون سکندر یہ میں تھا۔ انہیں ان کے جاسوس روز بروز کی اطلاعات پہنچا رہے تھے۔ جاسوسوں نے انہیں بتا دیا تھا کہ مسلمانوں کی نفری بہت تھوڑی ہے اور کمک کا دُور دُور تک نام و نشان نہیں۔

مقوقس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے لشکر کو تھوڑی سی لڑائی میں ہی ختم کر دے گا اور یہ لشکر لڑائی سے پہلے ہی بھوک سے مر جائے گا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ہو سکتا ہے مسلمان لڑنے کی بجائے ہتھیار ڈال دیں اور کہیں کہ ہمیں کھانے کے لئے کچھ دے دو۔

اس کے جاسوسوں نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ رسد بہت کم ہے جو فرما پہنچنے تک پوری نہیں ہوگی۔ مقوقس نے یہ اطلاع ملتے ہی اُن دیہاتی علاقوں میں جہاں سے کھانے کے لئے اناج اور مویشیوں کی فراہمی ہوتی تھی، اپنی فوج اس حکم کے ساتھ بھیج دی تھی کہ ہر گاؤں میں فوج موجود رہے اور مسلمان اگر اناج کی ٹوٹ مار کے

لئے آئیں تو انہیں وہیں ختم کر دیں۔ اس طرح متوقس اور اطربوں نے مسلمانوں کو بھوکا مارنے کا پورا پورا انتظام کر لیا تھا۔

متوقس نے ایک حکم تو پہلے ہی دے دیا تھا جس کے تحت عریش سے ساری رومی فوج نکل آئی تھی اور فرما چلی گئی تھی۔ متوقس نے یہ اہتمام اس خیال سے کیا تھا کہ مسلمان اور آگے چلے آئیں اور راستہ اتنا لمبا ہو جائے کہ ان تک کمک اور رسد بروقت پہنچ ہی نہ سکے۔

سپہ سالار عمرو بن عاص کے لئے بڑی ہی خطرناک اور روح کش صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ انہوں نے مدینہ کو ایک قاصد اس پیغام کے ساتھ بھیج دیا تھا کہ کمک جس قدر جلدی ہو سکے بھیج دی جائے اور وہ کمک کا انتظار نہیں کریں گے۔

مسعود بن سہیل کی شتریانوں کے بھیج میں فرما چلا گیا تھا اور واپس بھی آگیا تھا۔ وہ اونٹ پر گیا تھا۔ صحرائی علاقے میں اونٹ کی رفتار بہت ہی تیز تھی۔ وہ سپہ سالار کے لئے یہ خبر لایا کہ متوقس اور اطربوں خود فرما میں نہیں آئیں گے اور انہوں نے اپنی فوج کو یہ حکم بھیجا ہے کہ محاصرے میں نہیں رہنا ہے بلکہ بار بار باہر نکل کر مسلمانوں پر حملے کرنا تاکہ ان کا جانی نقصان ہوتا رہے۔ متوقس نے کہا تھا کہ مسلمانوں کا جو بھی جانی نقصان ہو گا اسے وہ پورا نہیں کر سکیں گے۔

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرما شہر کے متعلق کچھ بات ہو جائے۔ فرما مصر کا ایک مشہور شہر تھا۔ فرعونوں کے زمانے میں اس کا نام پلوز تھا۔ زمانے گزرتے گئے اور مصر قبطیوں کے زیر تسلط آگیا تو پلوز کا نام پر مومن رکھ دیا گیا۔ پھر آگے چل کر کسی دور میں اس کا نام فرما رکھ دیا گیا۔

جس علاقے میں فراواتہ تھا وہاں دریائے نیل جا کر سات شاخوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ ایک شاخ کا نام جسے اُس وقت نہر کہا جاتا تھا، پلوزی تھا۔ اسی لئے اس شہر کا نام پلوز رکھا گیا تھا۔ اسی طرح ہر شاخ کا ایک نام تھا۔ ان شاخوں کی تشریح ضروری معلوم نہیں ہوتی، ضروری بات ذہن میں رکھنے والی یہ ہے کہ یہ تمام علاقہ سرسبز اور زرخیز تھا اور یہ بحیرہ روم کے تقریباً کنارے پر تھا۔ آج بھی یہ علاقہ سرسبز و شاداب ہے اور وہاں پھلوں کے بے اندازہ باغات ہیں اور اسی وجہ سے یہ علاقہ اُس وقت بھی گنجان آباد تھا اور آسودہ حال بھی تھا۔ لوگوں کے مکانوں کے ارد گرد باغیچے بنے ہوئے تھے جو لوگوں کو مختلف

پھل دیتے تھے اور یہاں کے انگور تو بہت ہی مشہور تھے۔ چونکہ یہاں انگور افراط سے ہوتے تھے اس لئے یہاں شراب بھی بنتی تھی۔

فرما کا شہر ایک پہاڑی پر آباد کیا گیا تھا اور اس کی حفاظت اور دفاع کا انتظام صرف یہ نہیں تھا کہ ایک طرف قلعہ اور سارے شہر کے ارد گرد ایک مضبوط دیوار ہوتی۔ دیوار تو تھی لیکن شہر کو متعدد قلعہ بندیوں سے محفوظ کیا گیا تھا۔ اس طرح اس شہر کی تسخیر تقریباً ناممکن بنا دی گئی تھی۔ ایک تو قلعہ بندیاں زیادہ تھیں اور دوسرے یہ پہاڑی پر آباد تھا۔ یہ محاصرہ کرنے والوں کے لئے بڑی زبردست مشکل پیدا کر دی گئی تھی۔



مصری بدو اپنے علاقے میں دُور دُور تک پھیل ہوئے تھے۔ فرما سے دور اور عام راستوں سے ہٹ کر ایک علاقہ تھا جو ریگستانی بھی تھا اور اس میں کہیں کہیں سبزہ بھی تھا۔ وہاں صحرا ختم ہونے لگتا تھا اور سرسبز و شاداب علاقہ شروع ہوتا تھا۔ اس علاقے میں ایک جگہ ایسی تھی جو وسیع نشیب تھا۔ اس کے ارد گرد جو کنارے تھے وہ اونچے بند کی شکل میں تھے۔ برسات کے دنوں میں اس نشیبی جگہ پانی جمع ہو جاتا تھا اور دو تین مہینوں بعد پانی خشک ہو جاتا اور پیچھے ہری بھری گھاس چھوڑ جاتا تھا۔ اس میں چند ایک درخت بھی تھے اور کہیں کہیں زمین ذرا سی اُبھری ہوئی اور اونچے نیچے ٹیلے بھی تھے لیکن بہت کم۔

اس جگہ کو بدوؤں نے بہت خوبصورت بنا رکھا تھا اور اسے وہ اپنا ایک طرح کا مقدس نشیب سمجھتے تھے۔ یہ ساری باتیں فند بن سامر سے معلوم ہوئی تھیں۔ اس کے قریب ہی کہیں بدوؤں کے مذہبی پیشوا اور ایک دو سردار رہتے تھے۔

رات کا وقت تھا اور چاند کی تیسری تاریخ تھی۔ کم و بیش تین ہزار بدو دائرے میں اس جگہ بیٹھے ہوئے تھے اور درمیان میں بہت سی جگہ خالی چھوڑی ہوئی تھی۔ اس خالی جگہ کے وسط میں ایک قوتی ہیکل نیل ایک کھوٹا گاڑ کر رے سے باندھا ہوا تھا۔ اس کے خیمہ سینک مختلف رنگوں سے سجائے گئے تھے۔ اس پر سبز رنگ کا کپڑا ڈالا گیا تھا جس میں چمک سی تھی۔ ہوا سے یہ کپڑا ہلتا تھا تو مشعلوں کے شعلوں کی روشنی میں اس کپڑے پر چمک کی لہریں اٹھتی اور ہلتی نظر آتی تھیں۔ ہیکل کے کھروں پر کوئی چمک دار چیز نہ لگی تھی۔ ہیکل کے گلے میں صحرائی پھولوں کے ہار پڑے ہوئے تھے۔

بیس بائیس جوان اور جوان سال لڑکیاں جو ایک ہی جیسے لباس میں ملبوس تھیں بیل کے ارد گرد دائرے میں رقص کر رہی تھیں۔ وہ ملبوس تو تھیں لیکن پوری طرح مستور نہیں تھیں۔ ڈھول، دف اور دو شہنائیاں بج رہی تھیں۔ لڑکیوں کا یہ رقص اچھل کود جیسا نہیں تھا اور غیر منظم بھی نہیں تھا۔ ہر ادا اور ہر حرکت ایک ہی جیسی تھی، کوئی لڑکی دوسریوں سے الگ تھلک ذرا سی بھی حرکت نہیں کرتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ لڑکیاں ایک زنجیر سے بندھی ہیں اور زنجیر کسی غیر مرئی قوت کے ہاتھ میں ہے۔ نہ رقص بے ہنگم تھا نہ سازوں کا نغل غمازہ تھا۔ سزا ایک خوابناک سی دھن الاپ رہے تھے اور رقص وجد آفریں تھا۔ صحرا کی خشک رات مخمور ہوئی جارہی تھی۔ تین ہزار بدوؤں پر سکوت طاری تھا جیسے وہ محو خواب ہوں۔

بیل کے ارد گرد چند ایک چکر پورے کر کے ایک لڑکی رقص کی اداؤں کے ساتھ بیل کھاتی لہرائی دائرے سے نکل کر بیل کے سامنے چلی گئی اور بیل کا منہ چوم کر پھر لڑکیوں کے دائرے میں چلی گئی۔ اس کے پیچھے آنے والی لڑکی نے بھی ایسے ہی کیا اور تمام لڑکیوں نے ایسے ہی بیل کا منہ چوما۔ دائرہ ایک قطار بن گیا اور لڑکیاں ایک دوسرے کے پیچھے وہاں سے چلی گئیں۔

جو جگہ رقص کے لئے خالی چھوڑی گئی تھی، اس کے ارد گرد پانچ بڑی مشعلیں جل رہی تھیں۔ تیسری کا چاند واپس افق میں چلا گیا تھا اور رات تاریک ہو گئی تھی۔ آخری لڑکی تاریکی میں گم ہو گئی تو سازوں کی سُر تال تیز قدم ہو گئی اور شہنائیوں کی دھن اس تیز تھاپ کے مطابق بدل گئی۔ یہ فوجی اور جنگی سی دھن تھی جو خون کو گرماتی تھی۔ ایک طرف سے ایک ہی جیسے لباس میں ملبوس کم و بیش بیس بدو تاریکی سے ایک قطار میں مشعلوں کی روشنی میں آئے اور لڑکیوں کی طرح بیل کے ارد گرد دائرے میں رقص کرنے لگے۔ وہ دائرے میں ناچتے اور چلتے جاتے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کی کوئی ذرا سی بھی جنبش دوسروں سے مختلف نہیں تھی۔

یہ مردانہ ناچ تھا جسے جنگی کہا جائے تو زیادہ صحیح ہو گا۔ ناچنے والوں کے ایک ہاتھ میں برہنہ تلوار اور دوسرے ہاتھ میں ڈھال تھی۔ ان کے ہاتھوں میں تلواریں چربیوں کی طرح اتنی تیز گھوم رہی تھیں کہ ایک ایک تلوار کئی کئی تلواریں لگتی تھیں۔ ڈھول اور دف لی تھاپ تیز ہوتی گئی اور ناچ میں جوش و خروش بڑھتا گیا۔ تماشاویں کا جھوم

سُر تال پر قوالوں کی طرح تالیاں بجا رہا تھا۔ اس ناچ نے ایسا تاثر پیدا کر دیا کہ دیکھنے والوں کے جسم بیٹھے بیٹھے تھرکتے لگے تھے۔

خون کو گرما دینے والا یہ ناچ محض دکھاوے کا جنگی نہیں تھا۔ یہ لوگ تھے ہی جنگجو اور یہ ناچ ان کے جنگی کلچر کی ترجمانی کرتا تھا۔ یہ بدو قبائل سرکشی کی حد تک آزاد خیال تھے۔ ہر قتل نے کسی وقت انہیں اپنی فوج میں لینا چاہا تھا لیکن ان کے سرداروں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ البتہ سرداروں نے ہر قتل سے یہ وعدہ کیا تھا کہ انہوں نے کبھی محسوس کیا کہ اس کی فوج کو بدوؤں کی مدد کی ضرورت ہے تو بدو پہنچ جائیں گے لیکن وہ مصر سے باہر جا کر نہیں لڑیں گے۔



ناچنے والے ان بدوؤں میں دو کی تلواریں دوسری تلواروں سے مختلف تھیں۔ ان دونوں کی تلواریں چوڑی اور دو زنی تھیں۔ یہ دونوں بدو ناچتے ناچتے دائرے سے نکل آئے۔ ایک بیل کی گردن کے ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف کھڑا ہو گیا۔ باقی بدو محو رقص رہے۔ ادھر سے ناچنے والی دو لڑکیاں دوڑی آئیں۔ دونوں نے بیل کا ایک خاصا بڑا تھال اٹھا کر کھا تھا۔

چوڑی تلوار والے بدو نے تلوار بلند کی اور پوری طاقت سے تلوار بیل کی گردن پر سر کے قریب ماری اور آدھی گردن کاٹ دی۔ اس کے فوراً بعد دوسری طرف کھڑے بدو نے بیل کی آدھی کٹی گردن پر بڑی ہی زوردار تلوار مار کر سر صاف الگ کر دیا۔ دو لڑکیوں نے تھال ادھر ادھر سے پکڑ کر کھا تھا۔ بیل کا سر اس پر گرا۔

بیل ایک پہلو کو گر رہا تھا۔ ناچنے والے دو آدمی دوڑے آئے۔ انہوں نے مٹی کی ایک چوڑی پرات اٹھا رکھی تھی۔ اس کے کنارے باشت بھرا نچے تھے۔ بیل گرا تو انہوں نے یہ پرات بیل کی کٹی ہوئی گردن کے نیچے رکھ دی اور گردن کو مضبوطی سے پکڑ لیا کیونکہ بیل تڑپ رہا تھا۔ وہ اس کوشش میں تھے کہ خون کا ایک بھی قطرہ ضائع نہ ہو۔ ناچتے ہوئے بدوؤں کا ناچ بند ہو گیا اور سب نے تڑپتے ہوئے بیل کو قابو میں لیا۔

بیل کا خون ایک تبرک تھا جسے انہوں نے پانی سے بھرے ہوئے مشکوں میں ملانا اور بدوؤں نے بچوں، بوڑھوں، مرلیضوں اور عورتوں کو پلانے کے لئے پیالے بھر بھر کر

اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اس خون نلے پانی سے لاعلاج امراض کے مریض صحت یاب ہو جاتے ہیں اور دودھ دینے والے مویشیوں کو ایک ایک گھونٹ پلا دو تو زیادہ دودھ دینے لگتے ہیں اور مویشی اُن چگادڑوں سے محفوظ رہتے ہیں جو راتوں کو ان کا خون پیتے اور انہیں مار ڈالتے ہیں۔ یہ پانی گھر میں رکھا ہوا ہو تو گھر میں بدروح نہیں آتی اور گھروالے ناری مخلوق سے بچے رہتے ہیں۔

جس وقت نیل گردن کٹ جانے سے گرنے لگا تھا تو تمام بدو اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ہاتھ آسمان کی طرف کر کے فلک شگاف نعرے لگائے تھے۔ نیل گرا اور اس کا خون چوڑے برتن میں گرنے لگا تو ان کا مذہبی پیشوا اٹھا اور نیل کی طرف چلا۔ لوگ خاموش ہو گئے۔

”مقدس نیل کا خون مبارک ہو“۔ کچھ دور سے کسی کی آواز آئی۔ ”تمہاری قربانی قبول ہو گئی ہے۔ خدا کی آواز سنو جو سورج کو گرمی اور چاند ستاروں کو روشنی دیتا ہے۔“

مذہبی پیشوا جہاں تھا وہیں رک گیا اور اُس طرف دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ اس کے پاس بدوؤں کے جو تین چار سردار بیٹھے ہوئے تھے، وہ اب اُس کے پیچھے کھڑے تھے۔ وہ بھی اُدھر دیکھنے لگے۔ بدوؤں کا یہ سارا اجتماع بھی اُدھر ہی دیکھ رہا تھا۔ جدھر سے یہ آواز آئی تھی اُدھر اس نشیبی جگہ کا کنارہ قریب ہی تھا۔ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے اس لئے زمین میں گڑھے ہوئے لمبے ڈنڈوں والی مشعلوں کی روشنی اُس کنارے تک نہیں پہنچتی تھی۔ مذہبی پیشوا نے اُس طرف کھڑے لوگوں کو بیٹھ جانے یا آگے سے ہٹ جانے کو کہا۔

لوگ روشنی کے آگے سے ہٹے تو ڈھلانی کنارے پر ایک آدمی کھڑا نظر آنے لگا جس کا چہرہ ٹھیک طرح پہچانا نہیں جاتا تھا کیونکہ وہاں تک مشعلوں کی روشنی مدھم ہو جاتی تھی۔ وہ ایک سفید ہیولہ سا لگتا تھا۔ دو ڈنڈے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ایک اس کے دائیں اور دوسرا بائیں طرف کنارے میں گرھا ہوا تھا۔ دونوں کے اوپر والے سروں پر اتنے کپڑے لپٹے ہوئے تھے کہ ان کی چوڑائی ایک ایک بالشت ہو گئی تھی۔ یہ مشعلیں تھیں جو ابھی جلائی نہیں گئی تھیں۔

اس آدمی کے سر پر گہری تھی اور اس پر رومال ڈالا ہوا تھا جو اس کے شانوں پر بھی

پھیلا ہوا تھا۔ شانے سے چُخ شروع ہوتا تھا جو اس کے ٹخنوں تک چلا گیا تھا۔ سر پر پڑا رومال بھی سفید اور چنچہ بھی آسمان پر چمکتے ستاروں جیسا سفید تھا۔ اس نے دونوں بازو آگے اور ذرا دائیں اور بائیں پھیلا رکھے تھے۔

کوئی قریب جا کے دیکھتا تو اسے پتہ چلتا کہ وہ ان ہی جیسا اللہ کا بندہ تھا۔ اُس کی داڑھی کالی، گھنی اور لمبی تھی۔ وہاں کسی میں، ان کے مذہبی پیشوا میں بھی اتنی جرات نہیں تھی کہ قریب جا کر دیکھتا یہ ہے کون۔ یہ تو ہم پرست لوگ تھے۔ ذہنوں میں وسعت نہیں تھی۔ سچوں میں گمراہی نہیں تھی۔ زمین کی جو چیز عجوبہ اور ان کی سمجھ سے بالا ہوتی وہ ان کی نگاہ میں عالم بالا کی مخلوق میں سے ہوتی تھی۔ یہ آدمی ان کے لئے کوئی روحانی یا آسمانی چیز تھی۔ اسے وہ بدروح یا جن بھوت نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ اس کا لباس سفید براق تھا۔ ان کے عقیدے کے مطابق انسانوں کو نقصان پہنچانے والی چیزیں سیاہ لباس میں ملبوس یا بے لباس ہوتی ہیں۔ سب دور کھڑے دیکھتے رہے اور سنانا ایسا جیسے وہاں کوئی ذی روح تھا ہی نہیں۔

”مت ڈرو“۔ کنارے پر کھڑے آدمی نے بلند آواز سے کہا۔ ”تم جیسا انسان ہوں۔ خدا نے بھیجا ہے۔ خدا کا پیغام لایا ہوں، تمہارے لئے روشنی لایا ہوں۔“

پہلے اس کے دائیں طرف والی مشعل اپنے آپ ہی جل اٹھی پھر بائیں طرف والی مشعل جلی۔ یہ مشعلیں اس آدمی نے نہیں جلائی تھیں نہ انہیں کوئی اور آدمی جلاتا نظر آیا تھا۔ یہ سفید پوش سیاہ ریش کھڑا رہا تھا۔ مشعلیں جلانے کے لئے کوئی اور آدمی اوپر نہیں آیا تھا۔ بلاشبہ مشعلیں اپنے آپ جلی تھیں۔ یہ ایسا مظاہرہ تھا کہ بدوؤں کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ ان کے سرداروں اور مذہبی پیشوا پر بھی کچھ ایسا ہی اثر ہوا۔

”خدا کا پیغام خدا کے بھیجے ہوئے ایلچی سے سنو“۔ چنچے میں ملبوس آدمی نے کہا۔ وہ اس قدر آہستہ آہستہ کنارے سے نشیب کی طرف اترنے لگا جیسے اس کا پاؤں اٹھ نہ رہا ہو اور وہ نیچے کو سرک رہا ہو۔ اس کے دائیں اور بائیں جلتی مشعلوں کا رقص اس آدمی کو اور ہی زیادہ پُر اسرار بنا رہا تھا۔ وہ نہایت ہی آہستہ آہستہ نیچے کو سرکنے لگا اور جہاں وہ کھڑا تھا وہاں ایک نوجوان لڑکی کا سراپا ابھرنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے لڑکی اس آدمی کے وجود میں سے ابھر رہی ہو۔

یہ لڑکی اس زمین کی مخلوق معلوم ہوتی ہی نہیں تھی۔ چہرہ ایسا حسین اور ایسا

میں نہیں آئیں۔

فد بن سامر نے سپہ سالار عمرو بن عاص کو بتایا تھا کہ کچھ دنوں بعد مصری بدو اپنی ایک تقریب منعقد کریں گے جو وہ اس ماہ ہر سال چاند کی تیسری رات منعقد کیا کرتے ہیں۔ نئے چاند کے طلوع کو ابھی کچھ دن باقی تھے۔ فد بن سامر، مسعود بن سہیل کی اور حدید بن مومن خزر ج نے سرجوڑے اور اس مسئلے پر غور کرنے لگے کہ ان بدوؤں کو باتوں سے قائل کرنا کہ ہمارے ساتھ ہو جائیں ممکن نہیں پھر کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ مسعود اور حدید عرب کے بدوؤں کو تو جانتے تھے لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ مصری بدو بہت ہی مختلف ہیں اور ان کی خصلت کچھ اپنی سی ہی ہے۔ یہ انہیں فد نے بتایا تھا۔ ہر قل نے انہیں قتل عام کی اور پھر مصر سے نکال دینے کی بھی دھمکیاں دی تھیں کہ وہ رومی فوج میں شامل ہو جائیں۔ بدو کسی بھی دھمکی سے نہیں ڈرے تھے۔ پھر ہر قل نے انہیں طرح طرح کے لالچ دیئے تھے لیکن بدوئس سے مس نہ ہوئے۔ ہر قل جیسا جابر اور فرعون ذہنیت کا بادشاہ چپ ہو گیا تھا۔ جانتا تھا کہ فوج سے انہیں تہ تیغ کرنے کی کوشش کی تو صحرا میں فوج کے لئے مصیبت کھڑی کر دیں گے۔

اب عمرو بن عاص کو ان بدوؤں کی ضرورت محسوس ہوئی تو فد بن سامر نے انہیں بتایا کہ یہ لوگ باتوں سے بھی نہیں مائیں گے اور لالچوں سے بھی نہیں، کوئی اور ہی ڈھنگ سوچنا پڑے گا۔ فد ان بدوؤں کی معاشرت، ان کے مذہب اور عقیدوں سے واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ بنیادی طور پر یہ توہم پرست ہیں اور ان میں صرف یکی ایک کمزوری ہے جسے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

فد مصری تھا۔ مسعود اور حدید ریگزار عرب کی پیداوار تھے۔ انہوں نے ایک نانک سوچ لیا۔ یوں تو شارینا بھی حسین تھی لیکن جو تازگی اور مصوویت اپنی میں تھی وہ شارینا کے چہرے پر نہیں تھی۔ اپنی کی عمر ابھی سترہ سال ہوئی تھی۔ چنانچہ آسمان سے خدا کا پیغام لانے والی حور کا کام اپنی کو دیا گیا۔

مسعود اور حدید جاسوس تھے اس لئے انہوں نے مختلف لباس اور بہروپ اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس نانک کے لئے ایک ایسا تیر انداز منتخب کر لیا جس کا تیر کبھی خطا نہیں گیا تھا۔ کمان کو پورا کھینچ کر تیر چھوڑا جائے تو نشانے پر لگ ہی جاتا ہے لیکن کمان کو تھوڑا سا کھینچ کر قریب کے نشانے پر پھینکا جائے تو مشکل سے ہی

مسموم جو ان بدوؤں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔ چہرے کا رنگ سپیدی اور لطیف سی سرخی کی آمیزش تھا۔ کھلے ہوئے ریشمی بال شانوں اور سینے پر بکھرے ہوئے اور بازو ننگے تھے۔ گردن لمبوتری اور جسم ایک ہی کپڑے میں مستور تھا۔

”تمہاری قربانی قبول ہو گئی ہے“۔ لڑکی نے بازو پھیلا کر کہا۔ ”خبردار رہو۔ خون کا طوفان آرہا ہے۔ تمہارے دودھ والے جانوروں کو اڑا اور ہالے جائے گا۔ تم سے بہت سے اڑ جائیں گے۔ خدا تمہیں بچالے گا لیکن خدا کے حکم کی تعمیل کرنا۔ کل تمہارے پاس تین آدمی آئیں گے۔ ان کی نشانی یہ ہوگی کہ اونٹوں پر آئیں گے۔ خدا نے انہیں اشارہ دے دیا ہے۔ وہ جو کہیں اسے خدا کا پیغام سمجھنا نہ نیکل کا خون ضائع جائے گا اور تمہاری تباہی کو کوئی نہیں روک سکے گا.... تم تک خدا کا پیغام پہنچ گیا ہے۔ میں آسمان کو واپس خدا کے پاس جا رہی ہوں۔“

چنے والا آدمی جو لڑکی کے آگے ڈھلان پر کھڑا تھا آہستہ آہستہ اُلٹے قدم اوپر جانے لگا۔ لڑکی اس کے پیچھے یا اس کے وجود میں گم ہوتی گئی اور آدمی کنارے پر دو مشطوں کے درمیان جا رہا۔

”یہ مشطیں ساری رات یہاں جلتی رہیں گی“۔ اس آدمی نے کہا۔ ”یہ خدا کی روشنی ہے۔ کل صبح یہ اکھاڑ کر اپنے پاس رکھ لینا۔ یہ صرف قربانی کی رات جلایا کرنا۔ ہم جا رہے ہیں۔ صبح تک ادھر کوئی نہ آئے۔ کوئی آیا تو اس پر آسمانی بجلی گرے گی۔“ وہ پیچھے ہٹا اور اُلٹے قدم پچھلی ڈھلان اس طرح اتر گیا جیسے غائب ہو گیا ہو۔ مشطیں وہیں جلتی رہیں۔ بدوؤں کے ہجوم پر شٹاٹا طاری رہا۔

”مت ڈرو“۔ مذہبی پیشوا نے سکوت توڑا۔ ”یہ خدائی اشارہ ہے۔ خوش قسمت ہے وہ قوم جسے ایسے مقدس اشارے ملتے ہیں۔ جشن مناؤ۔ کل جو آدمی آئیں گے ان سے خدا کی کچھ اور باتیں معلوم ہوں گی۔“

○

یہ سب کیا تھا!.... کیا اس میں کچھ حقیقت بھی تھی؟.... کچھ بھی نہیں۔ یہ عربوں کی ذہانت اور دماغی صلاحیت کا کمال تھا۔ یہ حقیقت متعجب ذہن کے یورپی مبصرین اور مفکرین نے بھی تسلیم کی اور اس کی مثالیں پیش کی ہیں کہ عرب کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ایسی تخلیقی صلاحیتیں عطا کی ہیں جو دنیا کے کسی دوسرے خطے کے لوگوں کے حصے

نشانے پر لگتا ہے۔ یہ کام کوئی بڑا ہی ماہر تیر انداز کر سکتا تھا۔ ایسا ایک تیر انداز مل گیا۔ چونکہ یہ ٹانگ چاند کی تیسری رات کھیلنا تھا اور تیسری رات کو چار پانچ ہی دن رہ گئے تھے اس لئے انہوں نے بڑی تیزی سے ریہرسل کر لی اور اگلے روز فہد کی رہنمائی میں یہ پارٹی روانہ ہو گئی۔ چونکہ علاقہ صحرائی تھا اس لئے گھوڑوں کی بجائے وہ اونٹوں پر گئے۔ دو دنوں کی مسافت تھی۔ فہد انہیں ایسے علاقے میں لے گیا جو دشوار گزار تھا۔ ادھر سے کوئی نہیں گزرتا تھا اور چھپنے کے لئے وہ جگہ اچھی تھی اور اس نشیبی جگہ کے قریب بھی تھی جہاں بدوؤں کا اجتماع تھا۔

چاند کی تیسری رات کو سب اس جگہ پہنچ گئے جہاں بدو تقریب کے لئے اکٹھے ہو چکے تھے۔ انہیں وہاں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دیکھنے والے تقریب میں مگن ہو گئے تھے اور دوسری وجہ یہ کہ وہ جگہ نشیبی تھی اور اس کے کنارے اونچے تھے۔ چھپنے والی جگہ سے تقریب والی جگہ تک وہ بیدل گئے تھے۔ اگر وہ اونٹوں پر جاتے تو اونٹ خاموشی توڑ سکتے تھے۔ تیسری کا چاند اوپر آکر واپس چلا گیا تھا اس لئے رات تاریک ہو گئی تھی۔

پہلے مسعود بن سمیل کی دونوں مشطیں اٹھائے اس طرح کنارے کے اوپر گیا کہ کھڑا ہونے کی بجائے صرف سر اوپر کر کے بدوؤں کے اجتماع کو دیکھا۔ اسے اطمینان ہو گیا کہ کوئی بھی اس طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب لڑکیوں کا رقص شروع ہوا تھا۔ مسعود نے دونوں مشطوں کے ڈنڈے بڑے آرام سے کنارے پر گاڑ دیئے۔ مشطوں کے کپڑے تیل میں بھگو لئے گئے تھے۔ مسعود سفید چٹے میں بلبوس تھا۔ اس کے سر پر پگڑی اور پگڑی کے اوپر سفید رومال تھا۔ فہد نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس وقت مشطوں کے درمیان کھڑا ہو کر بولے گا جب تیل کی گردن کٹ چکی ہوگی۔ فہد نے کبھی یہ تقریب دیکھی تھی اس لئے وہ صحیح راہنمائی کر رہا تھا۔

سب نے باری باری اوپر آکر بدوؤں کا تماشا دیکھا۔ ان کے ساتھ اپنی بھی تھی اور تیر انداز بھی۔ اپنی اس حملے میں تھی جو پہلے بیان ہو چکا ہے۔ لڑکیوں کے رقص کے بعد مردوں کا ناچ شروع ہوا اور جب دو بدو تیل کی گردن کاٹنے کے لئے اس کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے تو اس وقت فہد نے مسعود سے کہا کہ وہ دونوں مشطوں کے درمیان کھڑا ہو جائے اور وہ الفاظ کے جو پہلے طے ہو چکے تھے اور اس کی مشق بھی کی گئی تھی۔ مسعود جب کنارے پر کھڑا ہو گیا تو اپنی اس کی پیٹھ کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

وہ کسی کو نظر نہیں آ سکتی تھی۔ مسعود نے اپنا رول بڑی کامیابی سے پورا کیا اور مشطیں اپنے آپ جل اٹھیں۔ مشطیں دراصل تیر انداز نے جلائی تھیں۔ وہ اس طرح کہ اس کے پاس فلیٹے والے تیر تھے۔ کنارے کی اوٹ میں اس نے دو تیروں کو باری باری آگ لگائی اور کمان کو کھینچا اور تھوڑی سی کمان کھینچ کر تیر اس طرح چھوڑے کہ وہ مشعل کے جلنے والے سرے پر لگے اور مشطیں جل اٹھیں۔ یہ اس تیر انداز کا کمال تھا۔

اس کے بعد مسعود کنارے کی اندرونی ڈھلان پر آہستہ آہستہ اترنے لگا تو اپنی کھڑی رہی۔ وہ یوں نظر آتی تھی جیسے اس کے وجود میں سے ابھر رہی ہو۔ یہ مشطوں کی تھمرتی ہوئی آگ اور نظر کا قریب تھا۔ اصل بات تو یہ تھی کہ بدو تو ہم پرست تھے اور توہم پرستی کی یہی لعنت ہوتی ہے کہ انسان حقیقت کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔

پھر مسعود اٹے قدم کنارے پر چلا گیا اور اپنی جو اس کی اوٹ میں چھپ گئی تھی مسعود کی پیٹھ کے ساتھ لگی ہوئی باہر والے کنارے سے سرکتی چلی گئی۔ مسعود بھی اس کے ساتھ گیا۔ اس طرح ان سب نے بدوؤں کی توہم پرستی، پسماندگی اور سادگی کو نہایت چابک دستی سے استعمال کیا اور ان سب پر اور مذہبی پیشوا پر بھی ایسا پراسرار تاثر پیدا کر دیا کہ انہیں شک تک نہ ہوا کہ یہ سب ایک قریب تھا جس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ مذہبی پیشوا اور سرداروں نے بھی مان لیا کہ یہ آسانی مخلوق تھی۔

جاسوسوں کی یہ جماعت صحرا میں اسی جگہ چلی گئی جہاں یہ سب پہلے چھپے رہے تھے۔ تیر انداز سے کہا گیا کہ وہ اپنی اور شارینا کو واپس پڑاؤ میں لے جائے۔ انہیں اسی وقت روانہ کر دیا گیا۔ مسعود نے اپنا رات والا لباس بدل لیا تھا اور اس نے، فہد اور حدید نے جنگی لباس پہن لیا تھا۔



اگلے روز بدوؤں کا مذہبی پیشوا اور چار پانچ سردار اس نشیبی جگہ کے اوپر کھڑے بیتابی سے ہر طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ تین شترسواروں کے منتظر تھے۔ گزشتہ رات آسانی خور نے کہا تھا کہ تین آدمی ان کے پاس اونٹوں پر سوار آئیں گے۔ بہت سے بدو زور زور کھڑے ان ہی تین شترسواروں کی راہ دیکھ رہے تھے۔

آخر تین شترسوار دور سے آتے نظر آئے جن کا رخ ادھر ہی تھا۔ کئی ایک بیتاب کی آوازیں سنائی دیں۔ ”وہ آرہے ہیں.... تین ہی ہیں.... وہ آگئے.... وہی ہوں

گے۔“ بدوآن شترسواروں کو بھی آسانی مخلوق ہی سمجھ رہے تھے۔

وہ شترسوار مسعود، حدید اور ند تھے۔ دیکھ لیا کہ بدوآن کے انتظار میں کھڑے ہیں، انہوں نے اونٹ دوڑا دیئے اور دیکھتے ہی دیکھتے بدوؤں کے پاس پہنچ گئے۔ وہ اونٹوں کو بٹھا کر نہ اترے بلکہ کھڑے اونٹوں سے کود آئے۔ پیشوا اور بدوؤں کے سرداران کے استقبال کے لئے تیزی سے آگے بڑھے۔ استقبال پر تپاک تھا۔

”ہم تمہارے ہی منتظر تھے۔“ پیشوا نے کہا۔ ”ہمیں یقین ہے کہ تم وہی ہو جس کا خدائی پیغام ہمیں گزشتہ رات ایک حور کی زبانی ملا ہے۔ کیا انہوں نے ہی تمہیں ہمارے پاس بھیجا ہے؟ انہوں نے تمہاری نشانی بتائی تھی کہ تم اونٹوں پر سوار ہو گے۔“ ہم نہیں جانتے تمہیں کیا پیغام ملا ہے۔“ مسعود نے کہا۔ ”ہمیں ہمارے

سپہ سالار نے بھیجا ہے۔ اسے خواب میں خدا کی طرف سے یہ اشارہ ملا تھا کہ اس صحرا میں ایک مخلوق رہتی ہے جس کا کوئی پُرساں حال نہیں۔ جاؤ اور اس مخلوق کو اپنے ساتھ ملا لو اور اس کے نیک و بد اور نفع نقصان کی ذمہ داری اپنے سر لے لو.... سپہ سالار نے خواب میں تمہاری جو نشانیاں دیکھی تھیں وہ ہمیں بتائیں اور ہم تمہارے پاس آ گئے ہیں۔ یہ جگہ بالکل ویسی ہی ہے جیسی سپہ سالار نے خواب میں دیکھی تھی اور تمہاری صورتیں بھی ویسی ہی ہیں۔“

ایک بوڑھے سردار نے ان تینوں کو تفصیل سے سنایا کہ گزشتہ رات انہوں نے کیا دیکھا ہے اور کس طرح ان تک خدا کا پیغام پہنچا ہے۔

”ہمیں کچھ پتہ نہیں گزشتہ رات تم نے کیا دیکھا ہے۔“ مسعود نے کہا۔ ”ہم یہ جانتے ہیں کہ ہمارے سپہ سالار کو خدائی پیغام ملا ہے تو وہ تمہیں بھی ملا ہو گا۔ کیوں نہ ہم کہیں بیٹھ کر بات کریں۔“

قریب ہی مذہبی پیشوا کا خیمہ تھا جو چمڑے سے بنایا گیا تھا اور اتنا کشادہ تھا کہ کئی آدمی اس میں بیٹھ سکتے تھے۔ پیشوا ان تینوں کو اور سرداروں کو اپنے خیمے میں لے گیا اور بٹھالیا۔ اس نے ان تین مسلمانوں سے پوچھا کہ ان کا سپہ سالار کہاں ہے۔

مسعود نے انہیں بتایا کہ ان کا سپہ سالار کہاں ہے اور اس کا لشکر عریش کا شہر فتح کر چکا ہے اور اب لشکر آگے بڑھ رہا ہے لیکن ابھی پڑاؤ میں خیمہ زن ہے۔

”کیا تم لوگ مسلمان ہو؟“ ایک سردار نے پوچھا۔

”ہاں!“ مسعود نے جواب دیا۔ ”ہم مسلمان ہیں.... پہلے یہ بتاؤ کہ مسلمانوں کے متعلق تمہارا خیال ہے۔“

بدوؤں کے بوڑھے سردار نے جو جواب دیا وہ تاریخ میں محفوظ ہے۔ مشہور تاریخ نویس ابن عبدالحکم نے لکھا ہے کہ بوڑھے سردار نے کہا۔ ”حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں نہ جانے کیا طاقت ہے کہ تھوڑی سی تعداد میں وہ بڑے سے بڑے لشکر کو میدان سے بھگا دیتے ہیں اور جس طرف بھی رخ کریں کامیابی ان ہی کے حصے میں آتی ہے۔“

”اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔“ مسعود نے کہا۔ ”یہ خدائی طاقت ہے جو صرف انہیں ہی عطا ہوتی ہے جن کے دلوں میں انسانوں کی محبت ہو اور وہ کمزوروں پر ہاتھ نہ اٹھائیں اور وہ دوسروں کے مذہب اور عقیدوں میں دخل نہ دیں اور کسی کمزور اور نادار کو اپنا محتاج اور غلام نہ بنائیں۔“

مذہبی پیشوا غالباً خدائی طاقت کی مزید تشریح اور وضاحت چاہتا تھا۔ مسعود ہی زیادہ تر بول رہا تھا کیونکہ وہ تین افراد کی جماعت کا امیر تھا۔ اس کے ساتھی اسلامی اصول کی پابندی کر رہے تھے کہ دو آدمی سفر پر نکلیں تو ایک کو امیر تسلیم کیا جائے۔ مسعود اپنے دونوں ساتھیوں ند اور حدید کی نمائندگی کر رہا تھا۔ اس نے عرب کے خط کا ذکر کیا اور بدوؤں کو بتایا کہ ہزار ہا لوگ بھوکے مرنے پر آ گئے تھے اور کچھ مر بھی گئے تھے لیکن امیر المؤمنین نے کس طرح انتظامات کئے اور لوگوں کو فاقہ کشی سے بچالیا۔ پھر مسعود نے طاعون کا ذکر کیا اور کہا کہ پچیس ہزار جانیں تلف ہو گئیں اور مسلمانوں کی آدمی فوج طاعون کی نظر ہو گئی۔

”تم اس پر غور کرو۔“ مسعود نے یہ ساری تفصیلات سنا کر کہا۔ ”اگر طاعون کے دوران ہر قتل شام پر حملہ کر دیتا تو وہ مسلمانوں کی بچی ہوئی آدمی فوج کو شکست دے کر شام واپس لے سکتا تھا لیکن یہ خدائی طاقت تھی کہ ہر قتل کو حملے کی جرات ہی نہ ہوئی۔ ہمارے سپہ سالاروں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ وہ اس خوفناک بیماری سے بچنے کے لئے مدینہ کو بھاگ جائیں۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ رہے اور بیمار بھی ہوئے اور فوت بھی ہو گئے۔“

مسعود دراصل انہیں یہ بات ذہن نشین کرا رہا تھا کہ مسلمانوں کے ہاں مساوات

ہے اور بنی نوع انسان کی محبت۔ چونکہ یہ اوصاف خدا کو عزیز ہیں اس لئے خدا نے مسلمانوں کو وہ طاقت دی ہے جسے ہم خدائی طاقت کہتے ہیں۔ اسی طاقت سے مسلمانوں نے قحط کو شکست دی اور پھر طاعون کی وبا کو شکست دی اور ہمت نہ ہاری اور آج مسلمان مصر میں داخل ہو گئے ہیں اور عریش جیسا شہر لے چکے ہیں۔

”ہی اتنی سی بات بتادو“ — ”مذہبی پیشوائے پوچھا“ — ”تم ہمارے لئے کیا پیغام لائے ہو اور ہمیں کیا کرنا چاہئے“۔

”تمہارے لئے پیغام بڑا صاف اور فائدے مند ہے“ — مسعود نے کہا — ”اپنے تمام قبیلوں کے اُن آدمیوں کو جو لڑنے کے قابل ہیں ہمارے سپہ سالار کے پاس بھیج دو اور اس کی سپہ سالاری کو قبول کر لو.... ہمیں معلوم ہے کہ شہنشاہ ہرقل نے بھی کسی وقت تمہیں یہی بات کہی تھی کہ اپنے قبیلوں کے جوانوں کو رومی فوج میں شامل کر دو اور تم لوگوں نے انکار کر دیا تھا“۔

”تم نے ٹھیک سنا تھا“ — مذہبی پیشوائے کہا — ”لیکن تمہاری باتیں سن کر اور اس سے پہلے بھی ہم نے مسلمانوں کے جو متعلق سنا تھا، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تم میں اور ہرقل میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ ہرقل کا کیا اعتبار جس نے اپنا مذہب ہی اپنی بادشاہی کے ماتحت لے لیا ہے اور اس کا حلیہ ہی بگاڑ دیا ہے۔ اس کے بنائے ہوئے مذہب کو جو نہیں مانا اسے اس نے قتل کر دیا۔ اس نے ہمیں دھمکیاں دے کر فوج میں ہمارے نوجوانوں کو شامل ہونے کو کہا تھا۔ تم کوئی دھمکی لے کر نہیں آئے اس لئے ہم تمہاری بات سنیں گے اور پھر ہم تمہیں مایوس نہیں جانے دیں گے“۔

اختصار کے ساتھ یہ بات بیان کی جائے تو یہ معاملہ یوں آگے بڑھا کہ ان بدوؤں کے ساتھ استدلال کے زور پر بات کی جاتی اور بحث و مباحثہ ہوتا تو یہ بدو کبھی قائل نہ ہوتے۔ وہ گزشتہ رات کے اس پیغام سے متاثر تھے جو وہ سمجھتے تھے کہ واقعی خدا کی طرف سے آیا ہے۔ انہوں نے کوئی بحث اور تکرار نہ کی، کچھ ضروری باتیں پوچھیں اور فیصلہ سنا دیا کہ وہ اپنے جوانوں کو فوری طور پر مسلمان سپہ سالار کی اطاعت میں دے دیں گے۔

مسعود نے انہیں بتایا کہ ان کے جوانوں کو اتنا مال غنیمت ملے گا کہ تمام قبیلے لالامال ہو جائیں گے۔ انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ مسلمانوں کے ہاں ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ فوج میں

اونچے رتبوں اور اعلیٰ عہدوں والے مال غنیمت میں سے زیادہ حصہ وصول کرتے ہوں اور سپاہیوں کو برائے نام کچھ دے دیا جاتا ہو۔ مسعود نے انہیں یہ بھی کہا کہ انہیں اگر خدا کی طرف سے براہ راست کوئی پیغام مل جائے تو وہ اس کی خلاف ورزی کی جرأت نہ کریں ورنہ ان کے مویشی ہلاک ہو جائیں گے اور ان کے بچے پراسرار امراض کا شکار ہو کر مرجائیں گے تا آنکہ ان کی نسل ختم ہو جائے گی۔

کچھ ضروری امور طے کر کے مسعود، ہند اور حدید وہاں سے رخصت ہو آئے۔



یہ تینوں بڑی لمبی مسافت طے کر کے واپس پراؤ میں پہنچے اور سپہ سالار عمرو بن عاص کو بڑی مسرت سے یہ خوشخبری سنائی کہ بدوان کے لشکر میں شامل ہونے کے لئے آ رہے ہیں۔

عمرو بن عاص جو پریشانی کے عالم میں تھے، یہ خوشخبری سن کر کھل اٹھے اور انہوں نے ان تینوں کو خراج تحسین پیش کیا کہ وہ بہت بڑا کارنامہ کر آئے ہیں لیکن ان جاسوسوں نے جب انہیں یہ بتایا کہ انہوں نے بدوؤں کو کس طرح راضی کیا ہے تو عمرو بن عاص کا کھلا ہوا چہرہ یلغخت سنجیدہ ہو گیا اور ان کے ہوشوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

”جنگ میں دشمن کو دھوکے دیئے جاتے ہیں“ — عمرو بن عاص نے کہا — ”لیکن یہ دھوکے میدان جنگ میں دشمن کی فوج کو دیئے جاتے ہیں۔ اسے جنگی چال کہا جاتا ہے لیکن لوگوں کو دھوکہ دینا قابل تحسین نہیں۔ ایک تو تم نے مجھے پریشانی سے نجات دلادی ہے اور اس کے ساتھ ہی میرے کندھوں پر ایسا بوجھ ڈال دیا ہے جس سے معلوم نہیں میں نجات حاصل کر بھی سکوں گا یا نہیں“۔

”ہمیں بتائیں قابل احترام سپہ سالار“ — حدید نے کہا — ”ہم آپ کو اس بوجھ سے بھی نجات دلادیں گے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم پھر بدوؤں کے پاس جائیں اور انہیں کہیں کہ وہ ہمارے لشکر میں نہ آئیں۔ یہ بتائیں کہ ہم نے اگر اسلامی اصول توڑا ہے تو اس کا ازالہ کس طرح ہو گا“۔

”یہ بات میں اپنے سالاروں اور ان کے ماتحت عہدیداروں کو بتاؤں گا“ — عمرو بن عاص نے کہا — ”ان بدوؤں کو اگر دھوکہ دے کر لائے ہو تو ان کے حقوق کا بھی

خیال رکھنا پڑے گا۔ ان کے مذہب اور دیگر عقیدوں میں ذرا سی بھی دخل اندازی نہ کرنا اور انہیں جاہل اور پسماندہ بھی نہ سمجھنا۔ یہ میں دیکھوں گا کہ مال غنیمت میں سے انہیں پورا پورا حصہ ملے۔ اگر یہ لوگ سرکش ہیں تو ہمیں ان کی سرکشی کا بھی احترام کرنا ہوگا۔ اس سرکشی کو وہ اپنا قوی وقار سمجھتے ہیں۔ ان کے وقار کا تحفظ کرنا ہوگا۔

سپہ سالار عمرو بن عاص نے اپنے سالاروں کو بلایا اور انہیں بدوؤں کے متعلق یہ ساری باتیں بتائیں اور حکم جاری کیا کہ ان بدوؤں کو اپنے مجاہدین سے زیادہ احترام دیا جائے۔ عمرو بن عاص نے یہ بھی کہا کہ اسلام اسی وجہ سے توہم پرستی کے خلاف ہے کہ توہم پرست کو بڑی آسانی سے دھوکہ دیا جاسکتا ہے۔ ایک اللہ کا واحد لاشریک کا تصور توہم پرستی کو ختم کر دیتا ہے۔ عمرو بن عاص نے یہ بھی کہا کہ ہم ان پسماندہ اور توہم پرست بدوؤں کو اسلام میں لانے کی کوشش کریں گے لیکن ابھی نہیں۔

”کوشش کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔“ ایک سالار نے کہا۔ ”انہیں جب احترام ملے گا، اہمیت ملے گی اور جب یہ ہمارا حسن سلوک دیکھیں گے تو خود ہی اسلام میں آجائیں گے۔“

عمرو بن عاص نے سالاروں کے ساتھ جلالہ خیالات کر کے طے کر لیا کہ ان بدوؤں کو کس طرح استعمال کیا جائے گا۔

○

تاریخ میں یہ واضح نہیں کہ بدوؤں کا لشکر اسی دن سپہ سالار عمرو بن عاص کے پاس پہنچ گیا تھا یا کتنے عرصے بعد پہنچا تھا۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ بدوؤں کا لشکر عمرو بن عاص کے پاس پہنچ گیا تھا۔ بعض مؤرخوں نے اس کی تعداد دو ہزار اور بعض نے تقریباً تین ہزار لکھی ہے۔

اگر یہ تعداد دس بارہ ہزار بھی ہوتی تو عمرو بن عاص جیسے بیدار مغز سپہ سالار خوش نہ ہوتے۔ اسلامی لشکر کے سپہ سالاروں میں یہی بنیادی خوبی تھی کہ وہ جہوم میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اصول یہ رہا ہے کہ تعداد تھوڑی ہو لیکن اس میں جذبہ اور تنظیم ہو انہوں نے یہ تجربے کر کے دیکھے تھے، ساری دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈالا تھا اور آج تک تاریخ ان کی کامیابیوں کی داستانیں بنا رہی ہے۔

جہوم کی مثالیں بھی اُس وقت موجود تھیں۔ کسریٰ ایران کے لشکر کی تعداد ہر محاذ پر

ایک لاکھ بیس ہزار رہی تھی لیکن صرف چالیس ہزار مجاہدین اسلام نے اس لشکر کو ہر محاذ پر شکست دی اور کسریٰ کی شہنشاہیت کا نام و نشان نہ رہنے دیا۔ شام میں ہرقل کے لشکر کی تعداد ہر جگہ ایک لاکھ اور اس سے کچھ زیادہ رہی ہے لیکن پانچ پانچ دس دس ہزار مجاہدین اسلام نے انہیں شام جیسے وسیع و عریض ملک سے بے دخل کر کے مصر کی طرف دھکیل دیا۔ ہرقل کی آدمی سے زیادہ فوج مجاہدین کی تلواروں اور برہمیوں سے کٹ گئی اور رومیوں کی لاشیں مجاہدین کے گھوڑوں کے قدموں تلے روندی گئی تھیں۔ عمرو بن عاص بدوؤں کے لشکر کو دیکھ کر یقیناً خوش تو ہوئے ہوں گے لیکن انہوں نے سب سے پہلے یہ دیکھا کہ ان لوگوں میں صلاحیت کتنی اور ڈسپلن کتنا ہے۔ کیسے ایسا تو نہیں کہ یہ فطرتاً سرکش ہوں اور میدان جنگ میں اپنے کمانداروں کے ہاتھوں سے نکل کر اپنی ہی لڑائی شروع کریں۔

عمرو بن عاص کی سب سے زیادہ ضرورت رسد کی تھی۔ یہ ضرورت انہیں کچھ پریشان کر رہی تھی۔ مخبروں اور جاسوسوں نے انہیں بتا دیا تھا کہ ہر گاؤں میں رومی فوج پہنچ گئی ہے اور اس فوج کا مقصد صرف یہ ہے کہ یہ دیہاتی مسلمانوں کو اناج وغیرہ نہ دے سکیں۔ عمرو بن عاص کے لئے فائدے مند نہ تھا کہ وہ اپنے لشکر کی کچھ نفری دیہات میں بھیج دیتے کہ اناج اکٹھا کریں۔ وہاں تو لڑائی کا امکان بھی تھا اور لشکر میں اتنی نفری نہیں تھی کہ جو لڑتی بھی اور اناج بھی لاتی۔

سپہ سالار عمرو بن عاص نے اپنے سالاروں سے صلاح مشورہ کیا تو یہ طے پایا کہ اس مقصد کے لئے بدوؤں کو استعمال کیا جائے۔ بدوؤں کے وہ سردار بھی ساتھ آئے تھے جو ابھی لڑنے کی عمر میں تھے۔ عمرو بن عاص نے بدوؤں کو متعدد جیشوں میں تقسیم کر کے ہر جیش کا ایک کماندار انہی میں سے مقرر کر دیا اور اس کماندار پر اپنے لشکر کا ایک عہدے دار لگا دیا۔

عمرو بن عاص نے بدوؤں کے سرداروں کو اپنے پاس بٹھا کر کچھ ہدایت دیں اور بتایا کہ پیش قدمی کرتے ہوئے لشکر کے لئے رسد کتنی ضروری ہوتی ہے۔ اگر اناج اور خوراک کی دیگر اشیاء کی کمی ہو جائے تو لشکر لڑنے کے قابل نہیں رہتا اور دشمن اس کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ ایسی اور بھی کچھ باتیں کر کے عمرو بن عاص نے بدو سرداروں کو بتایا کہ رسد اکٹھی کرنا ان کا کام ہے۔ رسد میں اناج شامل تھا اور وہ

مشکلات میں کمی شروع ہو گئی۔

رات آدمی گزر گئی تھی جب سنتریوں نے لشکر کو جگا دیا۔ ہڑونگ ہوا ہو گئی۔ رات کی خاموشی میں ایسی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جیسے دشمن کی فوج گھوڑے سرپٹ دوڑاتی حملے کے لئے آ رہی ہو۔ مجاہدین بڑی تیزی سے مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔ عمرو بن عاص نے اپنے لشکر کو مقابلے کی ترتیب میں کر دیا۔ حملے کا خطرہ تو ہر لمحے موجود تھا۔ وہ دشمن کا ملک تھا۔ دشمن کوئی بھی چال چل سکتا تھا۔

گھوڑوں کا یہ طوفان قریب آیا تو کچھ ایسا شور اور ایسے نعرے سنائی دیئے جو رومی فوج کے نہیں ہو سکتے تھے۔ سپہ سالار نے شعلیں جلانے کا حکم دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بے شمار شعلیں جل اٹھیں اور جب آنے والے گھوڑے قریب آئے تو پتہ چلا کہ وہ ہڈیوں کے دو جیش ہیں۔

ہڈیوں کے تمام جیشوں کو ہٹا دیا گیا تھا کہ وہ جب واپس آئیں تو لشکر انہیں کسی اگلے پڑاؤ میں ملے گا۔ چنانچہ یہ دو جیش پچھلے پڑاؤ کی طرف جانے کی بجائے آگے آ گئے تھے۔

ان جیشوں کے کئی ایک ہڈیوں کے ساتھ نہیں تھے۔ وہ پیچھے رسد کے ساتھ آ رہے تھے جو انہوں نے دیہات کے ایک علاقے سے اکٹھی کر لی تھی۔ وہ رسد جب آگے آئی تو مجاہدین اسلام نے مسرت کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ بے شمار گائیں تھیں، بھیڑیں اور بکریاں تھیں، اونٹ اور بیل بھی تھے۔ اناج کی بوریاں ان ہی بیلوں اور اونٹوں پر لدی ہوئی تھیں۔ کچھ گاڑیاں بھی تھیں جو گائیں کھینچتی آ رہی تھیں۔

یہ صرف چار یا پانچ گاؤں تھے جن پر ہڈیوں نے شب خون مارا تو رومی فوجی بیدار ہو گئے لیکن انہیں مقابلے کی تیاری کا موقع ہی نہ ملا۔ ہڈیوں نے ان سب کو کاٹ کر پھینک دیا اور پھر دیہاتیوں سے کہا کہ وہ خود ہی اناج اور اپنے مویشی باہر ایک جگہ اکٹھے کر دیں اور انہیں کوئی تکلیف نہیں دی جائے گی۔ دیہاتیوں میں مزاحمت کی کہاں جرات تھی، انہوں نے اناج اور مویشی ہڈیوں کے حوالے کر دیئے۔ ہڈیوں نے انہیں پہلے ہی یقین دلادیا تھا کہ ان کے گھروں کو لوٹا نہیں جائے گا اور کسی عورت پر بڑی نظر نہیں رکھی جائے گی نہ عورت پر ہاتھ اٹھایا جائے گا۔

ہر جیش کے ساتھ ایک ایک مسلمان کماندار تھا۔ سپہ سالار عمرو بن عاص کے حکم

مویشی جو مسلمانوں کے کھانے کے لئے حلال تھے۔

یہ اتفاق کی بات تھی یا شاید یہ کام ہڈیوں کی فطرت کے عین مطابق تھا، ان کے سرداروں نے یہ ذمہ داری بڑی خوشی سے قبول کر لی اور عمرو بن عاص کو یقین دلایا کہ وہ مجاہدین کے لشکر کو رسد کی کمی محسوس نہیں ہونے دیں گے۔

”لیکن ایک بات دماغ میں بٹھالو“ — عمرو بن عاص نے کہا — ”اناج اور مویشی لانے کا مطلب یہ ہے کہ صرف اناج اور مویشی لائے جائیں۔ کوئی اور لوٹ مار نہیں ہو گی اور کسی عورت کی طرف غلط نظر سے دیکھا بھی نہیں جائے گا۔ ہم یہ چھوٹے چھوٹے گاؤں نہیں بلکہ بڑے بڑے شہر فتح کرنے نکلے ہیں۔ اصل خزانے ان شہروں سے ملیں گے جن میں سے تمہیں پورا پورا حصہ ملے گا.... یہ بھی سوچ لو کہ ہر گاؤں میں رومی فوجی موجود ہیں جو تمہارا مقابلہ کریں گے۔ کسی رومی فوجی کو زندہ نہیں چھوڑنا اور گاؤں کے کسی آدمی پر ہاتھ نہیں اٹھانا“۔

ان ہڈیوں سے ایک فائدہ یہ بھی ملا کہ وہ ہر گاؤں سے واقف تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ زیادہ اناج کون کون سے گاؤں سے مل سکتا ہے۔ جن ہڈیوں کے پاس گھوڑے نہیں تھے انہیں گھوڑے دیئے گئے اور بعض کو اونٹ دے دیئے گئے۔ ان کے تمام جیش دیہاتی علاقوں کی طرف کوچ کر گئے۔

○

عمرو بن عاص کا رسد والا مسئلہ حل تو نہیں ہوا تھا لیکن اس کا انتظام ہو گیا تھا اور امید بندھ گئی تھی کہ لشکر بھوکا نہیں رہے گا۔ انہوں نے کوچ کا حکم دے دیا۔ وہ جانتے تھے کہ پیش قدمی میں جتنی تاخیر ہو رہی ہے اتنی ہی دشمن کو تیاری کی مہلت مل رہی ہے لیکن وہاں احتیاط لازمی تھی کہ لشکر میں کوئی کمزوری اور کمی نہ رہ جائے۔ پیش قدمی کی رفتار ابھی ست ہی رکھی گئی کیونکہ رسد کی صورت حال ابھی مبہم تھی۔

دن بھر کے سفر کے بعد رات عارضی پڑاؤ کیا گیا۔ فجر کی نماز کے فوراً بعد لشکر پھر کوچ کر گیا۔ صحرا ختم ہوتا جا رہا تھا اور کہیں کہیں سبزہ اور درخت نظر آنے لگے تھے۔ وہ دن بھی گزر گیا اور لشکر ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں صحرا کے آثار ختم ہو گئے تھے اور اس جگہ ہریالی زیادہ تھی۔ تھوڑی ہی دور ایک چشمہ مل گیا جہاں سے مجاہدین نے پانی کے مشکیزے بھر لئے اور گھوڑوں اور اونٹوں کو بھی پانی پلا دیا گیا۔ اس طرح

کے مطابق ان تمام دیہاتیوں سے جن سے اناج اور مویشی لئے گئے تھے، کہا گیا کہ یہ اناج وغیرہ بدو اپنے لئے نہیں لے جا رہے بلکہ یہ مسلمانوں کے لشکر کے لئے ہے۔ کمانداروں نے ان لوگوں پر واضح کر دیا کہ مسلمان مصر کو فتح کرنے کے لئے آئے ہیں اور اگر انہوں نے مصر فتح کر لیا تو ان لوگوں کو اس اناج اور ان کے مویشیوں کا پورا صلہ دیا جائے گا اور اگر انہوں نے رومی فوج کی مدد کی اور مسلمانوں کے خلاف لڑائی میں شامل ہوئے تو پھر انہیں دشمن سمجھ کر ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو دشمن مفتوح دشمن کے ساتھ کیا کرتا ہے۔

فرما اب زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا۔ عمرو بن عاص کا رسد کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ بدوؤں کے دوسرے جیش بھی مویشی اور اناج لاتے رہے اور اس قدر رسد اکٹھی ہو گئی جو ایک عرصہ تک کافی تھی۔ بدوؤں نے ایک اور مسئلہ بھی حل کر دیا۔ وہ یہ تھا کہ انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ قابل اعتماد لوگ ہیں اور ان کی صحیح رہنمائی کی جائے تو وہ ہر اچھی بری صورت حال میں قابل اعتماد رہیں گے۔

سپہ سالار عمرو بن عاص نے اس پڑاؤ سے کوچ کیا اور ایک پڑاؤ اور کیا۔ عریش سے فرما تک کا فاصلہ صرف ستر میل تھا۔ اس سفر میں اتنے زیادہ پڑاؤ کرنے کی ضرورت نہیں تھی، مجاہدین کے لشکر تو بڑی تیز پیش قدمی کیا کرتے تھے لیکن عمرو بن عاص دانستہ زیادہ پڑاؤ کر رہے تھے۔ اب ان کا آخری پڑاؤ تھا اور یہاں سے سیدھا فرما پہنچنا اور اس تاریخی شہر کو محاصرے میں لینا تھا۔

اس آخری پڑاؤ میں انہوں نے لشکر کی تنظیم نو کی اور سالاروں کو ترتیب و تنظیم اچھی طرح ذہن نشین کرادی۔ بدوؤں کے تمام جیش واپس آ گئے تھے۔

عمرو بن عاص نے سالاروں سے صلح مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ بدوؤں کے یہ جیش توڑ دیئے جائیں اور بدوؤں کو لشکر میں شامل کر دیا جائے۔ مطلب یہ تھا کہ بدوؤں کے الگ و ستے نہ بنیں کیونکہ وہ بہر حال غیر مسلم تھے اور کسی بھی وقت رومی عیسائیوں کے زیر اثر آ سکتے تھے۔ اس خطرے کو اسی طرح ختم کیا جاسکتا تھا کہ بدوؤں کو سارے لشکر میں بکھیر دیا جائے.... ایسا ہی کر دیا گیا۔

ایسی ضرورت کم ہی محسوس ہوتی تھی کہ لڑائی سے پہلے مجاہدین اسلام کو گرمائے اور بھڑکانے کے لئے جو شبیلی تقریر کی جائے لیکن کبھی ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی

تھی کہ مجاہدین کو بتانا ضروری سمجھا جاتا تھا کہ وہ جو جنگی مہم سر کرنے جا رہے ہیں وہ کوئی سہل مہم نہیں اور دشمن زیادہ طاقتور ہے اور مقابلے کے لئے تیار بھی ہے اور نہ جانے اس نے اور کیا کچھ دفاعی انتظامات کر رکھے ہیں۔

سپہ سالار عمرو بن عاص نے ضروری سمجھا کہ لشکر کو خبردار کر دیں کہ وہ کس خطرے میں جا رہے ہیں۔ انہوں نے تمام لشکر کو جس میں بدو بھی شامل تھے ایک جگہ اکٹھا کیا اور اس لشکر سے خطاب کیا۔ تاریخ میں ان کا مکمل خطاب نہیں ملتا، مؤرخوں نے کچھ اہم اقتباسات لکھے ہیں۔

ابلیفیر بلترنے لکھا ہے کہ عمرو بن عاص نے اپنے لشکر سے کہا:

”ہم مصر کو جانے والے اُس راستے پر جا رہے ہیں جو ایک قدیم ترین راستہ ہے۔ ہمارے پیغمبر دنیائے عرب سے اسی راستے سے مصر آئے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پورا خاندان اسی راستے مصر پہنچا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی راستے سے فرعون کے جادو گروں کے منہ پھیر کر اور ان کے دانت کھنکھنے کر کے مصر سے دنیائے عرب کو گئے تھے۔ یہی دریا ئے نیل تھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو راستہ دے دیا تھا اور جب ان کے تعاقب میں آنے والا فرعون رخمیس دوم نیل میں اترا تو نیل نے راستہ بند کر دیا اور فرعون ڈوب مرا تھا۔ یہ ایک مقدس راستہ ہے۔ یہ ہمارے پیغمبروں کا راستہ ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ ہم کوئی ملک فتح کرنے آئے ہیں۔ یہ ہماری اپنی سرزمین ہے۔ اس ملک میں صرف اللہ کی حکمرانی چلے گی اور یہ حکمرانی تم قائم کرو گے، انشاء اللہ....“

”اس راستے کے تقدس کا اندازہ اس سے کرو کہ مصر اور افریقہ سے حج کو جانے والے مسلمان اسی راستے سے جاتے ہیں۔ یہ راستہ مسلمانوں کے لئے ہی نہیں عیسائیوں کے لئے بھی مقدس ہے۔ عیسائی اسی راستے سے بیت المقدس جاتے اور آتے ہیں۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا راستہ ہے لیکن مصر میں ایک بادشاہ نے عیسائیت کا چہرہ مسخ کر ڈالا ہے اور اس نے اپنی عیسائیت بنادی ہے اور یہ عیسائیت لوگوں سے منوانے کے لئے اس نے نچی عیسائیت کے ماننے والے ہزار ہالوگوں کو قتل کیا ہے۔ ہم ان عیسائیوں کو ہر قتل کی عیسائیت، بربریت اور ظلم و تشدد سے نجات دلانے آئے

کہ اللہ ہمارے ساتھ تھا۔ اللہ اب بھی ہمارے ساتھ ہے۔ اللہ کا فرمان ہے کہ جس نے میری اور میرے رسولؐ کی اطاعت کی اور میرے راستے پر جہاد کیا اسے ہم نے تھوڑی تعداد میں بھی اور تمام کمزوریوں کے ہوتے ہوئے بھی دشمن پر غالب کیا ہے۔ دشمن کو خوف زدہ کرو، اس سے خوفزدہ ہونا نہیں۔ اگر ہم نے یہ صرف ایک شہر فرمالے لیا تو یوں سمجھیں کہ دشمن پر ایک بار پھر غلبہ پالیا اور اس کے نتیجے میں مصر اسلامی سلطنت میں آجائے گا۔“



عمروؓ بن عاص نے عریش پر قبضہ کرتے ہی دو جاسوسوں کو بنیامین کے ساتھ بات کرنے کے لئے بھیج دیا تھا۔ پچھلے ایک باب میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے کہ بنیامین آبادیوں سے بہت دور ایک دشوار گزار صحرائی علاقے میں چھپا ہوا تھا اور وہیں اس نے گرجا تعمیر کر لیا تھا۔ پہلے دو جاسوس اس کے ساتھ بات چیت کر آئے تھے۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب مصر پر فوج کشی کی صرف باتیں ہو رہی تھیں اور امیر المومنین نے ابھی عمروؓ بن عاص کو مصر پر حملے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اب عمروؓ بن عاص نے ضروری سمجھا کہ بنیامین کے ساتھ آخری اور حتمی بات ہو جائے۔

وہ دونوں جاسوس بنیامین سے مل کر واپس آ گئے تھے۔ عمروؓ بن عاص نے بنیامین کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ رومی فوج میں مصر کے جو قبیلے عیسائی ہیں وہ لڑیں نہیں اور اپنی فوج کو دھوکہ دیں۔ دوسری بات یہ کہ دوسرے قبیلے عیسائی فوج کے ساتھ کسی بھی قسم کا تعاون نہ کریں اور ہو سکے تو ہرقل کی حکومت کے خلاف بغاوت کر دیں۔

بنیامین دور اندیش آدمی تھا اور غیر معمولی ذہانت کا حامل بھی تھا۔ اس نے ان دو مجاہدین کو زبانی پیغام دیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ لوگوں کو بغاوت پر بالکل نہیں اکسائے گا۔ اس نے وجہ یہ بتائی کہ ابھی کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ فتح ہرقل کی ہوگی یا عمروؓ بن عاص کی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان شکست کھا جائیں اور ادھر عیسائیوں نے بغاوت کر رکھی ہو تو ہرقل کسی ایک بھی قبیلے عیسائی کو زندہ نہیں چھوڑے گا اور ان کے بچوں تک کو قتل کروا دے گا۔ بنیامین نے یہ بھی کہا تھا کہ لوگوں کو اکسانے کی ضرورت ہی نہیں۔ لوگ اُس ظلم و تشدد کو اور درندگی کو کبھی نہیں بھولیں گے جو ہرقل کے حکم سے ان کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ اپنے بیٹوں کو فوج میں نہیں جانے دیں گے اور اگر ہرقل نے

سپہ سالار عمروؓ بن عاص نے عیسائیت کا ذکر غالباً اس لئے ضروری سمجھا تھا کہ ان کے ساتھ بدوؤں کا جو لشکر تھا، بے شک تو ہم پرست ہی سہی لیکن بنیادی طور پر وہ عیسائی تھے۔ ان کے خون کو گرمانا اور رومیوں کے خلاف بھڑکانا ضروری تھا۔ حقیقت یہ بھی ہے کہ جب عمروؓ بن عاص امیر المومنین حضرت عمروؓ کو مصر پر فوج کشی پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے تو انہوں نے امیر المومنین سے خاص طور پر عیسائیوں پر ہرقل کے ظلم و تشدد کا اور قتل و غارت کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ عیسائی چونکہ اہل کتاب ہیں اور اہل کتاب پر کوئی بادشاہ یا کوئی قوم ظلم کر رہی ہو اور ان کا کوئی مددگار اور پڑسانہ حال نہ ہو تو مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ انہیں درندہ صفت بادشاہ سے نجات دلائیں۔

عمروؓ بن عاص بڑے ہی دانشمند سپہ سالار تھے۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ صحیح عیسائیت کا استقباط عظیم بنیامین اگر میدان جنگ میں عملی طور پر مددگار اور معاون نہ ہوا تو درپور ضرور معاونت کرے گا۔

اس کے بعد عمروؓ بن عاص نے لشکر کو فرما کا محل وقوع بتایا اور یہ بھی کہ یہ قلعہ بند شہر میدان میں نہیں بلکہ ایک چٹانی قسم کی پہاڑی پر آباد ہے اور اس کے ارد گرد صرف شہر نہ ہی نہیں بلکہ ایک بڑے قلعے کے علاوہ شہر کے ارد گرد چھوٹی چھوٹی قلعہ بندیاں ہیں۔ یہ بھی بتایا کہ فرما میں جو رومی فوج ہے اس کی تعداد اپنے لشکر سے تین یا چار گنا زیادہ ہے۔ یہ بھی بتایا کہ اپنے پاس محاصرہ کرنے کا پورا سامان بھی نہیں۔ اس خطرے سے بھی لشکر کو آگاہ کیا کہ رومی محاصرے کے عقب سے بھی حملہ کر سکتے ہیں۔ مشہور مسلمان تاریخ نویسوں مقررزی اور ابن عبدالحکم نے لکھا ہے کہ یہ ساری باتیں سنا کر عمروؓ بن عاص نے لشکر سے یوں خطاب کیا:

”مجاہدین اسلام! یہ نہ سوچنا کہ ہم تعداد میں بہت تھوڑے ہیں اور ہمارے پاس ساز و سامان کی بھی کمی ہے۔ کیا ہم ہر محاذ پر تھوڑے نہیں رہے؟ کیا تم نے شام میں ان ہی رومیوں کے ایک ایک لاکھ لشکر کو اتنی ہی تھوڑی تعداد میں ہوتے ہوئے شکستوں پر شکستیں نہیں دیں؟ کیا تم نے انہی رومیوں کو شام میں کاٹا اور وہاں سے بھگایا نہیں؟ ان پر ابھی تک تمہاری دہشت طاری ہے۔ ہم ہر محاذ پر صرف اس لئے فتح یاب ہوئے ہیں

جبری طور پر قبلی عیسائیوں کے بیٹوں کو فوج میں بھرتی کرنے کا حکم دیا تو تمام جوان سال قبلی گھروں سے نکل کر صحراؤں میں جا چھپیں گے۔

بنیامین نے یہ بھی کہا تھا کہ جو قبلی عیسائی فوج میں ہیں انہیں بھی کچھ کنا غیر ضروری ہے۔ وہ رومیوں کے خلاف اس قدر جلتے بیٹھے ہیں کہ وہ جانیں قربان کر دینے والی لڑائی لڑیں گے ہی نہیں۔ بات مختصر کی جائے تو بنیامین نے جو جواب بھیجا تھا اس کا لب لباب یہ تھا کہ قبلیوں کا رویہ مسلمانوں کے حق میں ہونہ ہو، ہر قل اور اس کی فوج کے بالکل ہی خلاف ہو گا اور اسے خاصا نقصان اٹھانا پڑے گا۔

اس جواب سے سپہ سالار عمرو بن عاص مطمئن ہو گئے۔

دو یورپی مؤرخوں نے تاریخ کے چھوٹے چھوٹے واقعات ذرا تفصیل سے لکھے ہیں۔ انہوں نے سکندریہ کی ایک مینٹنگ کا ذکر کیا ہے جس میں ایک متوقس تھا، دوسرا جرنیل اطربون اور تیسرا سرکاری عیسائیت کا اسقف اعظم قیرس تھا۔ متوقس نے کہا کہ اس نے فرما کا دفاع اتنا مضبوط کر دیا ہے اور ایسے احکام بھیج دیئے ہیں کہ مسلمان اسے فتح نہیں کر سکیں گے لیکن متوقس قبلی عیسائیوں کے متعلق پریشان تھا۔

”اسقف اعظم!“ — متوقس نے قیرس سے پوچھا — ”کیا آپ عیسائیوں میں وہ جذبہ پیدا کر سکتے ہیں جو مسلمانوں میں ہے؟“

”نہیں!“ — قیرس نے دو ٹوک جواب دیا — ”کیا تم نہیں جانتے کہ قبلی عیسائی مجھے ہر قل کا قصائی کہتے ہیں؟ میرے ہاتھوں ان عیسائیوں کا جو خون بہایا گیا ہے وہ خون مجھے عیسائی بخش تو نہیں دیں گے۔ قاتل کو مقتول کے لواحقین سے رحم کی توقع رکھنی ہی نہیں چاہئے۔ میں ان لوگوں کا سامنا کرنے کے بھی قابل نہیں۔“

ان نیتوں کے درمیان کچھ دیر تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ متوقس اور اطربون قیرس کو بار بار کہتے تھے کہ وہ مختلف شہروں میں جائے اور لوگوں کو گرجوں میں بلا کر مسلمانوں کے خلاف بھڑکائے لیکن قیرس مان نہیں رہا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اسے لوگوں نے نہیں بلکہ شہنشاہ ہر قل نے اسقف اعظم بنایا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ لوگ اسے سرکاری جلاؤ کی حیثیت سے پہچانتے ہیں مگر اسے مذہبی پیشوا نہیں سمجھتے۔

آخر یہ طے پایا کہ متوقس اگلے روز لوگوں کو اور فوج کو بھی گھوڑ دوڑ کے میدان میں اکٹھا کر کے خطاب کرے۔ اگر یہ خطاب لوگوں نے قبول کر لیا تو متوقس بڑے بڑے

شہروں میں جا کر خطاب کرے گا۔

”میں خطاب کی ضرورت تو نہیں سمجھتا تھا“ — اطربون نے کہا — ”میں نے فوج کو جس طرح تیار کیا ہے اس سے امید ہے کہ فوج ٹھیک طرح لڑے گی لیکن میں مسلمانوں کو بھی جانتا ہوں کہ وہ کس بے جگری سے لڑتے ہیں۔ ہماری فوج کا جانی نقصان زیادہ ہو گا۔ شام میں ہمیں اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ نفری کی کمی پوری کرنے کے لئے ہمیں مزید جوانوں کی ضرورت ہو گی۔ اس کا ایک طریقہ ہے کہ بڑا ہی جوشیلا اور جذباتی خطاب کر کے لوگوں کو فوج میں آنے پر اکسایا جائے۔“

○

سکندریہ شہر اور ارد گرد کے دیہاتی علاقے میں جہاں جہاں تک سوار ہر کارے پہنچ سکتے تھے یہ اعلان کروایا گیا کہ کل فلاں وقت فرمانروائے مصر متوقس خطاب کرے گا اور کچھ نہایت ضروری باتیں بھی بتائے گا۔۔۔۔۔ دیہات کے لوگ جوق در جوق پہنچنے لگے۔ متوقس کا خطاب کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے اس نے ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔ دیہات کے لوگوں کو ابھی تو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ مسلمانوں کا لشکر مصر میں داخل ہو چکا ہے اور اس نے شہر عریش لے بھی لیا ہے اور بڑی ہی شدید جنگ تیزی سے بڑھی آ رہی ہے۔

شہر کی قلیل بڑی ہی تیزی سے ہو جایا کرتی تھی۔ گھوڑ دوڑ کے میدان میں ایک چوترا بنا دیا گیا اور مقررہ وقت سے پہلے فوج وہاں آگئی اور لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہوتا جا رہا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اتنے وسیع و عریض میدان میں کھڑا ہونے کی جگہ بھی نہ رہی۔

متوقس شہر کی تیزی میں شاہانہ انداز سے اس میدان میں آیا اور چوترا پر جا کھڑا ہوا۔ محافظ دستے کے گھوڑ سوار اس کے آگے، دائیں بائیں اور پیچھے ایک ترتیب سے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت ضرورت یہ تھی اور حالات کا تقاضا بھی یہی تھا کہ متوقس شاہانہ طور طریقہ اختیار نہ کرتا اور مسلمانوں کی طرح ایک عام آدمی کی حیثیت سے آتا اور چوترا پر کھڑا ہو کر یہ تاثر دیتا کہ وہ انہی میں سے ہے لیکن شہنشاہیت کا نشہ ایسا تھا جو ایک لمحے کے لئے بھی نہیں اترتا تھا۔ متوقس نے فوج پر اور پھر دور دور تک پھیلے ہوئے ہجوم پر نگاہ ڈالی تو شہنشاہیت کا نشہ اور بھی تیز ہو گیا ہو گا۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ

شہنشاہ تو ہر قل ہی تھا لیکن مقوقس کو اس نے مصر کا باج گزار فرمانروا بنا رکھا تھا۔ مقوقس لوگوں پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ ہر قل سے کم حیثیت والا ہے۔

”بہادر رومیو اور غیرت مند مصریو!“ — مقوقس نے بھیچروں کا پورا زور لگا کر کہا — ”مسلمان اب تمہارے گھر میں آن پہنچے ہیں۔ وہ اس خوش فہمی میں آئے ہیں کہ تمہیں یہاں بھی شکست دے لیں گے۔ انہوں نے شرعی شہر پر قبضہ کر لیا ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ انہوں نے یہ شہر لڑ کر نہیں لیا بلکہ ہم نے وہاں سے اپنی فوج پہلے ہی نکال لی تھی تاکہ مسلمان یہ شہر لے لیں۔ یہ ہم نے سوچ سمجھ کر چال چلی ہے کہ مسلمان اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر آگے آئیں اور ہم انہیں پھندے میں پھنسا لیں اور ان میں سے کوئی ایک بھی واپس نہ جاسکے۔ وہ اب شہر فرما کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ موت انہیں بڑی تیزی سے ہمارے پھندے میں لا رہی ہے۔“

اس کے بعد اس نے اسلام کے خلاف اور مسلمانوں کے خلاف خوب زہر افگنا اور عیسائی فوج کو دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور فوج کہا کہ یہ کہہ کر دنیا میں صرف ایک مذہب کی حکمرانی ہوگی اور وہ مذہب عیسائیت ہوگا۔

”لیکن یہ اس صورت میں ممکن ہو گا کہ تم عیسائیت کا تحفظ کرو“ — مقوقس نے کہا — ”آج ملک اور مذہب قربانی مانگ رہے ہیں۔ اگر تم نے شام کی طرح مصر بھی مسلمانوں کو دے دیا تو عیسائیت کا خاتمہ ہو جائے گا اور یہاں مسلمانوں کی حکمرانی ہوگی۔ وہ بزدل اور بے وقار تھے جو شام جیسا بڑا ملک مسلمانوں کے ناپاک قدموں میں پھینک کر بھاگ آئے۔ مصری اتنے بزدل نہیں ہو سکتے۔ میں جانتا ہوں تمہاری تلواریں مسلمانوں کے خون کی پیاسی ہیں۔ مسلمان آرہے ہیں، اپنی تلواروں کی پیاس بجھاؤ“ شام کی شکست کا انتقام دل کھول کر لو۔“

مقوقس کی تقریر جو شبلی ہوتی چلی گئی اور پھر اس نے جذباتی رنگ اختیار کر لیا لیکن مقوقس نے یہ دیکھا کہ تقریر سننے والے جوش و خروش کا ذرا سا بھی اظہار نہیں کر رہے تھے۔ ایسی تقریر اور ایسے خطاب کے دوران لوگ نعرے لگایا کرتے تھے لیکن وہاں سننے والے ہجوم پر خاموشی طاری تھی۔

مقوقس نے آخر میں یہ کہا کہ شام میں ہمارا شہنشاہ ہر قل اس غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے اور انہیں بڑی آسانی سے شکست دی جاسکے گی

لیکن نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا۔ مقوقس نے اس کی وجوہات بیان کیں اور اس فوج کے خلاف باتیں کیں جس نے شام میں شکست کھائی تھی اور کہا کہ وہ نئی فوج تیار کرنا چاہتا ہے جس کے لئے جذبے والے اور مضبوط دل والے جوانوں کی ضرورت ہے۔ اس نے اور زیادہ جو شبلی، اشتعال انگیز اور جذباتی باتیں کر کے جوانوں کو اکسانے کی کوشش کی کہ وہ فوراً فوج میں شامل ہو جائیں۔

مقوقس غالباً انسانی فطرت کا یہ پہلو نظر انداز کر رہا تھا کہ انسانوں پر جبراً حکومت کی جاسکتی ہے لیکن ان سے جبراً کوئی قربانی نہیں لی جاسکتی۔ مقوقس نے دیکھا کہ اس کی اس اشتعال انگیز دعوت کے جواب میں بھی ہجوم خاموش رہا۔ جرنیل اطربون بھی وہیں تھا۔ اس نے مقوقس کو اشارہ کیا کہ وہ تقریر روک دے۔ مقوقس نے یہ اشارہ سمجھتے ہوئے بھی اپنی زبان کا جادو جاری رکھا اور ایک بار پھر عیسائیت کا نام لیا۔

”صرف ایک بات بتا دیں“ — ہجوم میں سے ایک بڑی ہی بلند آواز اٹھی — ”آپ کون سی عیسائیت کی بات کر رہے ہیں شاہ ہر قل اور قیصر کی عیسائیت کی یا اسقف اعظم بنیامین کی عیسائیت کی؟“

مقوقس پر خاموشی طاری ہو گئی جیسے وہ اس سوال پر بوکھلا گیا ہو۔ وہ آخر شاہی خاندان کا فرد تھا، اسے غصہ آگیا لیکن غصے کا اظہار نہ کیا۔ اطربون نے اسے کہا کہ قبیلوں کا رویہ خطرناک معلوم ہوتا ہے۔

”دیکھو یہ آدمی کون ہے“ — مقوقس نے حکم کے لیے میں کہا — ”اس کے اس سوال سے میری کم، تمہاری اور شاہ ہر قل کی زیادہ توہین ہوئی ہے۔ اس شخص کو گرفتار کر کے سزا دی جائے۔“

”نہیں!“ — اطربون نے کہا — ”چاہتا میں بھی یہی ہوں کہ اس شخص کو عبرتناک سزا دی جائے لیکن صورت حال کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنا رویہ نرم رکھیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم سخت رویہ اختیار کریں تو قبیلے سرکش اور باغی ہو جائیں۔“

مقوقس اور اطربون وہاں سے غصے اور شرمندگی کے عالم میں چلے گئے۔ مقوقس نے فوری طور پر دو کام کئے۔ ایک یہ کہ ایک قاصد ہر قل کی طرف اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ مسلمان فرما کے قریب پہنچنے والے ہیں اور قبیلے عیسائیوں کا رویہ مخالفانہ لگتا۔ مقوقس نے ہر قل سے یہ درخواست کی تھی کہ اسے بتایا جائے کہ کیا کرے۔

دستے باہر بھیج کر ان پر حملے کریں اور واپس قلعے میں آجایا کریں۔

ایک دو مؤرخوں نے لکھا ہے کہ محاصرہ ایک مہینہ رہا۔ بعض نے محاصرے کی مدت دو مہینے لکھی ہے۔ محاصرے کا صحیح عرصہ کہیں بھی نہیں لکھا، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ محاصرہ زیادہ لمبا نہیں ہوا تھا کیونکہ قلعے کی فوج نے باہر نکل نکل کر مسلمانوں پر حملے شروع کر دیئے تھے۔ مسلمانوں کی مجبوری یہ تھی کہ پہاڑی کے اوپر ان کے لئے لڑنے کی جگہ اتنی تھوڑی تھی کہ سالار کوئی پینترا نہیں بدل سکتے تھے نہ کوئی چال چلنے کی پوزیشن میں تھے۔ ان پر جب اندر سے حملہ آتا تھا تو وہ پیچھے ہٹتے اور پہاڑی کی ڈھلان انہیں قدم بھانے نہیں دیتی تھی۔ وہ مجبوراً پہاڑی سے اتر آتے تھے۔ رومی فوجی نیچے نہیں آتے تھے، وہ اوپر سے ہی واپس بڑی تیزی سے قلعے کے اندر چلے جاتے اور دروازے بند ہو جاتے تھے۔

پہ سالار عمرو بن عاص کو اس قسم کی لڑائیاں لڑنے کا خاص تجربہ تھا۔ انہوں نے اس تجربے کے مطابق ایک پلان بنایا اور اپنے لشکر کا کچھ حصہ اس پلان میں شامل کیا اور اس حصے کے سالار کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ اب اندر سے حملہ آئے تو اسے کیا کرنا ہے۔

ایک روز قلعے کے ایک طرف کے دو دروازے کھلے اور رومی فوج ڈکے ہوئے سیلاب کی طرح بڑی ہی تیزی اور شدت سے باہر نکلی اور اس طرف کے مجاہدین پر ہلے بول دیا۔ جس سالار کو عمرو بن عاص نے اپنا پلان دیا تھا، وہ شہر کے ایک پہلو میں تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے حرکت کی اور اپنے دستے ساتھ لے کر دیوار کے ساتھ ساتھ آیا تھا تاکہ دروازوں پر قبضہ کر لیا جائے لیکن رومی زیادہ تیز نکلے۔ انہوں نے دیکھ لیا اور فوراً واپس ہوئے لیکن مسلمانوں نے پھر بھی انہیں روک لیا۔ اب جو رومی فوج حملے کے لئے نکلی تھی اس کی تعداد پہلے حملوں سے خاصی زیادہ تھی۔

اب چونکہ مسلمان پہاڑی سے اترنے کی بجائے دیوار کے ساتھ تھے اس لئے انہوں نے جم کر مقابلہ کیا لیکن ان کی تعداد رومیوں کی نسبت بہت ہی کم تھی۔ بڑا ہی خونریز معرکہ لڑا گیا۔ بہت سے مجاہدین شہید ہو گئے۔ رومی بھی بے شمار مارے گئے لیکن تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ مجاہدین پر غالب آ گئے اور دروازوں میں داخل ہو کر اندر چلے گئے اور دروازے بند ہو گئے۔

موقوف نے دو سر کام یہ کیا کہ بڑی ہی تیزی سے اُن فوجی دستوں کو فرا روانہ کر دیا جن میں رومی عیسائی اکثریت میں تھے اور قبلی عیسائی بہت ہی کم یا نہ ہونے کے برابر تھے۔ ان دستوں کو حکم دیا گیا کہ انتہائی تیزی سے فرما پنچیں اور وہاں جو دستے موجود ہیں ان میں قبلی دستے بھی ہیں۔ ان سب کو واپس سکندریہ بھیج دیا جائے۔ موقوف کو یہ خطرہ صاف نظر آنے لگا تھا کہ فرما میں قبلی عیسائیوں کی تعداد زیادہ ہوئی تو وہ اتنا اہم اور قلعہ بند شہر مسلمانوں کو دے دیں گے۔

ہرقل بزنطیہ میں تھا۔ بزنطیہ بہت دور تھا، قاصد کو جانے اور آنے میں کئی دن درکار تھے۔ اذھر پہ سالار عمرو بن عاص کا لشکر فرما کے قریب پہنچ گیا تھا۔

○

مجاہدین اسلام کے لشکر کو ہدف تک پہنچنے میں کچھ دن اور لگ گئے۔ اس دوران سکندریہ سے موقوف کی بھیجی رومی فوج کے دستے فرما پہنچ گئے اور قبلی عیسائیوں کے دستے وہاں سے نکال دیئے گئے۔ اس طرح فرما کا دفاع مزید مستحکم ہو گیا تھا۔

مجاہدین نے فرما کو محاصرے میں لے تو لیا لیکن شہر پہاڑی پر ہونے کی وجہ سے شہر کے ارد گرد جگہ بہت تنگ تھی۔ اس کا مسلمانوں کو یہ نقصان ہو رہا تھا کہ شہر کی دیواروں اور قلعوں سے جو تیر آتے تھے وہ مسلمانوں کو زو میں آسانی سے لے لیتے تھے۔ یہ پہاڑی بجائے خود اس شہر کا ایک قدرتی دفاعی انتظام تھا۔

مجاہدین نے اپنی روایتی شجاعت اور بے جگری کا یہ مظاہرہ کئی بار کیا کہ دوڑ کر دروازوں تک پہنچے اور دروازے توڑنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ دروازے بہت مضبوط تھے اور اوپر سے تیروں کی بوچھاڑیں آتی تھیں۔ کئی مجاہدین دروازوں پر شہید اور شدید زخمی ہو گئے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس لشکر کے پاس محاصرے کا پورا سامان نہیں تھا۔ بنیقین نہیں تھیں، کندیں بھیجنے والے رستے نہیں تھے اور رتوں والی میڑھیاں بھی نہیں تھیں۔ قلعہ سر کرنے میں تو مسلمان خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ کندیں پھینک کر بھی دیواروں پر چڑھ جلیا کرتے اور جانیں قربان کر دیا کرتے تھے لیکن ان کے پاس ایسا کوئی سامان تھا ہی نہیں۔

موقوف نے پہلے ہی اپنے دفاعی دستوں کو حکم دے رکھا تھا کہ مسلمانوں کی نفرتی تھوڑی ہے اور اسے بھگانے اور مارنے کا یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ ایک ایک دروازہ

پھر پہاڑی چڑھنے لگے اور انہوں نے رومیوں کو جو کاٹنا شروع کیا تو ان کے زخمی اور ان کی لاشیں لڑھکتی ہوئی نیچے ہی نیچے جانے لگیں۔

یہ چال شہر کے صرف ایک طرف ہی نہ چلی گئی بلکہ ایک اور پہلو پر یہی صورت حال پیدا ہوئی تو مجاہدین نے وہاں بھی رومیوں کے عقب میں جا کر ان پر ہلہ بولا اور کچھ مجاہدین قلعے کے اندر چلے گئے۔

رومی اس صورت حال کے لئے بالکل ہی تیار نہ تھے۔ وہ تو پہلی کامیابیوں کو ذہن میں رکھے ہوئے اب بھی کامیابی کی ہی توقع لئے ہوئے تھے۔ اندر گئے ہوئے مجاہدین کو لڑائی تو لڑنی پڑی لیکن انہوں نے باقی دروازے بھی کھول دیئے۔ رومیوں کی زیادہ تر نفری شہر سے باہر مجاہدین کی تلواروں سے کٹ رہی تھی۔

جانی نقصان تو مجاہدین کا بھی ہو رہا تھا لیکن ہر مجاہد اس لڑائی کو اپنی ذاتی لڑائی سمجھ کر لڑ رہا تھا۔ مرنے والوں میں زیادہ تعداد بدوؤں کی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ایسی جنگ کبھی نہیں لڑی تھی پھر بھی انہوں نے رومیوں کو بہت ہی جانی نقصان پہنچایا۔

شہر اس حالت میں فتح ہو گیا کہ شہر کے اندر اور باہر اس قدر خون تھا جیسے خون کا مینہ برس گیا ہو۔ چھوٹی چھوٹی قلعہ بندیوں، برجیاں اور برج اتنے زیادہ تھے کہ بھول بھلیاں سی بنی ہوئی تھیں اور شک تھا کہ رومی جرنیل اور ماتحت افسران کہیں چھپے ہوئے ہیں۔ سپہ سالار عمرو بن عاص نے شہروں کو حکم دیا کہ تمام قلعہ بندیاں گرا دیں۔ کچھ مجاہدین کو ان کے ساتھ لگا دیا۔ شک صحیح نکلا، رومی جرنیل ایک برج کے کونے میں دہکا بیٹھا مل گیا اسے گرفتار کر لیا گیا۔

فرما کی فتح مکمل ہو گئی اور مال غنیمت اکٹھا کیا جانے لگا۔۔۔۔۔ تاریخ نویس بلز اور دو اور یورپی تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ تاریخ ہمیشہ حیران رہے گی کہ اتنے تھوڑے مسلمانوں نے اتنا مضبوط قلعہ آخر کس طرح فتح کر لیا تھا۔

مجاہدین کے لشکر کی نفری اور کم ہو گئی۔ شہر کا دفاعی انتظام ایسا مستحکم تھا کہ شہر کے باہر جو درخت تھے وہ سب کاٹ دیئے گئے تھے تاکہ محاصرہ کرنے والے درختوں پر چڑھ کر دیوار پر تیر اندازی نہ کر سکیں۔ عمرو بن عاص اور ان کے سالاروں کے لئے وہ صورت حال پیدا ہو گئی تھی جس میں بڑے بڑے نامور جرنیل بھی مایوس ہو جایا کرتے ہیں لیکن سپہ سالار عمرو بن عاص نے سالاروں سے کہا کہ مایوسی جیسا گناہ نہ کرنا، انشاء اللہ فتح ہماری ہوگی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہم یہیں ہار گئے تو ایوان خلافت میں ہماری کوئی حیثیت نہیں رہ جائے گی۔۔۔۔۔ عمرو بن عاص نے اپنے سالاروں کو ایک اور پلان دیا اور کہا کہ اس پلان میں یہ امکان موجود ہے کہ ہمارا آدھا لشکر یہیں ختم ہو جائے لیکن فتح یقینی ہوگی۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ عجیب بات ہے کہ اتنے اہم شہر کے دفاعی دستوں کی کمان لینے کے لئے نہ مقتوقس فرمایا نہ اطربوں۔ تاریخ میں اس جرنیل کا نام نہیں ملتا جو اس شہر کا کمانڈر تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، مقتوقس کے احکام کے مطابق چل رہا تھا۔ یہ احکام اور پلان اسے محاصرے سے پہلے ہی ذہن نشین کر دیئے گئے تھے۔

اس پلان کے مطابق اس نے زیادہ دستوں سے حملہ کر دیا تھا۔ اب پلان کے فیصلہ کن حصے پر عمل کرنا تھا۔ رومی جرنیل نے آدمی سے زیادہ فوج حملے کے لئے مختلف دروازوں سے باہر نکل دی۔ یہ دستے پہلی کامیابیوں سے بہت خوش تھے اور انہیں اب بھی کامیابی یقینی نظر آ رہی تھی۔ ان کی نفری بھی اب بہت زیادہ تھی اس لئے وہ کچھ زیادہ ہی دلیر ہو گئے تھے۔

اس کثیر نفری نے محاصرے پر حملہ کیا تو عمرو بن عاص نے اپنے سالاروں کو جو پلان دیا تھا، اس کے مطابق مجاہدین لڑنے کی بجائے پہاڑی سے اس طرح اترنے لگے جیسے ڈر کر بھاگ نکلے ہوں۔ رومی پہلی کامیابیوں کے نشے سے سرشار ان کے پیچھے آئے۔ عمرو بن عاص نے اس مقصد کے لئے کچھ دستے ریزرو میں رکھے تھے۔

جو نئی رومی پہاڑی کی ڈھلان پر آئے، مجاہدین کے ریزرو دستے تیزی سے حرکت کر کے ان کے عقب میں یعنی شہر کی دیوار اور رومیوں کے درمیان پہنچ گئے اور رومیوں پر ہلہ بول دیا۔ ایک دستہ یا غالباً کچھ نفری کھلے دروازوں میں سے قلعے کے اندر چلی گئی۔ اس طرف کے رومی پھندے میں آ گئے۔ پہاڑی سے اتر جانے والے مجاہدین

ہی من گھڑت باتوں کی تردید کرتے نظر آتے ہیں۔ اتنی سی بات درست ہے کہ بنیامین نے قبلی عیسائیوں کو یہ ہدایت پہنچادی تھی کہ وہ جانوں کی بازی لگا کر نہ لڑیں لیکن رومیوں کو یہ پتہ نہ چلنے دیں کہ وہ دل و جان سے اس لڑائی میں شامل نہیں۔ تاریخ میں یہ اعداد و شمار بھی ملتے ہیں کہ رومی فوج میں قبلی عیسائیوں کی تعداد بہت ہی تھوڑی تھی جو اگر باغی ہو بھی جاتی تو اس سے رومیوں کو جنگی لحاظ سے کوئی نقصان نہ ہوتا۔

باقی رہی بات ہرقل کے اسقف اعظم قیرس کی 'تواس کی حقیقت یہ ہے کہ قیرس کا سپہ سالار عمرو بن عاص کے ساتھ کوئی رابطہ ہوا ہی نہیں تھا نہ ہی عمرو بن عاص کو یہ توقع تھی کہ وہ قیرس کو بھی اپنا ہمنوا اور مددگار بنا سکیں گے۔ قیرس اور ہرقل کے درمیان کوئی اور اختلاف ہو سکتا تھا لیکن تاریخ گواہ ہے کہ جہاں تک مصر کے دفاع کا تعلق تھا ہرقل اور قیرس ایک محاذ پر متحد اور متفق تھے۔

یہ صحیح ہے کہ بدو مسلمانوں کے ساتھ مل گئے تھے اور انہیں جس دانشمندی سے استعمال کیا گیا تھا، وہ پچھلے باب میں بیان ہو چکا ہے لیکن جہاں تک لڑائی کا تعلق تھا، بدوؤں کو ٹھیک طرح لڑایا نہیں جاسکا تھا کیونکہ وہ جنگجو ہی سہی، ایک منظم لشکر اور منظم فوج میں جا کر لڑنے کا تجربہ نہیں رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بدوؤں کا جانی نقصان زیادہ ہوا تھا۔

○

یہ بھی صحیح ہے کہ رومی فوج میں زیادہ تعداد ان فوجیوں کی تھی جو شام سے شکست کھا کر بھاگے اور زخمی بھی ہوئے تھے۔ ان پر مسلمانوں کی جو دہشت طاری تھی وہ ابھی تک موجود تھی۔ مقوقس نے نئی فوج تیار کی تھی لیکن پرانے فوجیوں نے نئی فوج کے ذہن میں یہ حقیقت ڈال دی تھی کہ 'مسلمان کس طرح بے جگری سے لڑتے ہیں، جانیں قربان کر دیتے ہیں، پیچھے نہیں ہٹتے۔ پرانے فوجیوں نے نئے فوجیوں کو یہ بھی بتایا تھا کہ مسلمانوں کے لشکر کا ہر فرد لڑائی کو ذاتی لڑائی سمجھ کر لڑتا ہے۔

اس دہشت کے علاوہ رومی فوج مسلمانوں کے حسن سلوک سے بھی متاثر تھی۔ خصوصاً غیر فوجی عیسائی تو مسلمانوں کے کردار اور حسن سلوک سے بہت ہی متاثر تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مسلمان ظالموں کی طرح لڑتے ہیں لیکن فتح کے بعد مفتوحہ لوگوں کے لئے رحمت کے فرشتے بن جاتے ہیں۔ ان کا یہ کتنا غیر مسلم مؤرخوں کی لکھی ہوئی تاریخوں

کی فتح کو غیر مسلم مؤرخوں نے حیرت انگیز کہا ہے لیکن اہل دین و ایمان کے فرما لئے اس میں حیرت والی کوئی بات نہیں تھی۔ تاریخ اسلام ایسی معجزہ نما فتوحات سے بھری پڑی ہے۔ سالاروں کے دلوں میں ایسا کوئی لالچ نہیں تھا کہ رومی جرنیلوں کے محلات میں سے زر و جواہرات کے خزانے ملیں گے اور دیگر مال غنیمت کا بھی کوئی شمار نہیں ہو گا نہ ہی مجاہدین کے دلوں میں کوئی ایسی خواہش تھی۔ وہ اللہ کے نام پر اس فوج کشی کو جہاد فی سبیل اللہ جان کر گئے تھے۔ ان کے عزائم ذاتی نہیں، دینی اور ملی تھے۔

اس سے بڑھ کر اور معجزہ کیا ہو سکتا تھا کہ ایران اور روم جیسی بڑی جنگی طاقتوں کو جنہیں تاریخ نے ناقابل تسخیر کہا ہے، کچل اور مسل کر الگ پھینک دیا گیا تھا اور وہاں آج بھی اسلام کا پرچم بڑے فخر اور شان و شوکت سے لہراتا ہے۔ چونکہ فرما کی فتح غیر مسلم مؤرخوں کے لئے حیرت ناک تھی اس لئے انہوں نے اس کے کچھ اسباب گھڑ لئے اور تاریخ کے دامن میں ڈال دیئے تھے۔ مثلاً ایک یہ کہ اتنے تھوڑے سے مسلمان اتنی بڑی اور طاقتور فوج سے فرما کا قلعہ بند شہر نہیں لے سکتے تھے، وہ اس لئے فاتح کہلائے کہ بنیامین کے حکم سے قبلی عیسائی جو رومی فوج میں تھے، لڑے ہی نہیں تھے اور ان میں سے کچھ اپنی ہی فوج کے دشمن ہو گئے اور قتل و غارت کی۔ دوسرا جواز یہ پیش کیا گیا کہ ہرقل کی سرکاری عیسائیت کا اسقف اعظم قیرس درپردہ ہرقل کے خلاف ہو گیا تھا اور اس نے بھی مسلمان سپہ سالار کے ساتھ ساز باز کر لی تھی۔ پھر یہ کہ تمام مصری بدو مسلمانوں کے ساتھ مل گئے تھے۔

ان غیر مسلم مؤرخوں کی لکھی ہوئی تاریخیں آگے چل کر پڑھی جائیں تو یہ خود اپنی

میں بھی ملتا ہے کہ مسلمان صرف جسموں کو ہی تہ تیغ نہیں کرتے تھے بلکہ دلوں کو فتح لیتے اور مفتوحہ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ وجہ یہ کہ وہ خنثوں اور عورتوں اور کمزوروں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے نہ لوٹ مار کرتے نہ یہ کہ عورتوں پر ٹوٹ پڑتے۔ یہ کتنا صحیح نہیں کہ رومیوں میں قوی جذبہ اور وقار نہیں تھا۔ سب کچھ تھا لیکن انہیں مارا تو شہنشاہیت نے مارا۔ یہاں ایک رومی لڑکی کا واقعہ سامنے آتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رومیوں میں قوی جذبہ اور وقار کس قدر زیادہ موجود تھا۔ اس لڑکی کا نام نوشیا تھا اور وہ اس جرنیل کی بیٹی تھی جو فرما کی دفاعی رومی فوج کا کمانڈر تھا۔ تاریخ میں اس جرنیل کا نام نہیں ملتا۔ اس جرنیل کی اس بیٹی نے تاریخ کا وہ باب لکھ ڈالا تھا جو صرف اُن تاریخ نویسوں کے ہاں ملتا ہے جنہوں نے کچھ پس منظر کے واقعات تفصیل سے لکھے ہیں۔

اس جرنیل کا تعلق ہرقل کے شاہی خاندان کے ساتھ تھا۔ نوشیا کی عمر اُس وقت بائیس تیس سال تھی اور ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ فوج کا ہی ایک جوان سال رومی عہدے دار تھا جس کے ساتھ نوشیا کی منگنی ہو چکی تھی۔ یہ عہدے دار بھی شاہی خاندان کا فرو تھا۔ یہ سب لوگ نوشیا کو نوشی کہتے تھے۔

ہم اس داستان کو کچھ دن پیچھے اُس وقت پر لے جا رہے ہیں جب مسلمان فرما کے قلعے میں داخل ہو رہے تھے۔ قلعے کے باہر بھی اور اب قلعے کے اندر بھی خونریز جنگ لڑی جا رہی تھی۔ یہ فرما کا فیصلہ کن معرکہ تھا۔ نوشی کا جرنیل باپ اس وقت دیوار پر کھڑا یہ خونریز معرکہ دیکھ رہا تھا اور وہ یقیناً محسوس کر رہا ہو گا کہ مسلمان فرما فتح کر چکے ہیں اور اس کی فوج ہاری ہوئی لڑائی لڑ رہی ہے۔ لڑائی کی صورت حال یہ تھی کہ رومی اب قلعے کے دفاع کے لئے نہیں بلکہ اپنی اپنی جان کے دفاع کے لئے لڑ رہے تھے۔ وہ بُری طرح کٹ رہے تھے۔

جرنیل نے دیوار سے پہلے تو باہر دیکھا پھر اندر کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا ایک ماتحت اس کے پاس آن کھڑا ہوا اور جرنیل سے کہا کہ بہتر یہ ہے کہ مسلمانوں کو اندر آنے دیا جائے اور اپنی فوج باہر رہے اور پھر مسلمانوں پر حملہ کر کے انہیں ختم کر دیا جائے۔ وہ کہتا تھا کہ مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے اور ان پر قابو پانا ایسا مشکل نہیں جسے ہم ناممکن کہیں۔

”میں شام سے آیا ہوں“۔ رومی جرنیل نے ہاری ہوئی سی مسکراہٹ سے کہا۔

”میں نے ان مسلمانوں کو لڑتے دیکھا ہے اور لڑا بھی ہوں۔ تم انہیں کم تعداد والے کہہ رہے ہو۔ یہی کم تعداد ان کی اصل طاقت ہے۔ کیا تم اس صورت حال میں اپنی فوج کو اپنے حکم کا پابند کر سکتے ہو؟ کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ ہمارے فوجی جانیں بچانے کے لئے لڑ رہے ہیں لیکن بھاگنے کے راستے بھی دیکھ رہے ہیں.... بدودغاری کر گئے ہیں۔“

”تو پھر ہمارے لئے کیا حکم ہے؟“۔ ماتحت عہدے دار نے پوچھا۔

”میری طرف سے تمہیں اجازت ہے“۔ جرنیل نے کہا۔ ”لڑنا چاہتے ہو تو لڑو بھاگنا ہے تو بھاگ جاؤ۔“

”مجھے ایسا بزدل بھی تو نہ سمجھیں“۔ ماتحت نے کہا۔ ”آپ نے کہہ دیا ہے کہ بھاگو تو کیا میں بھاگ اٹھوں گا؟ آخر دم تک آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔“

اس ماتحت نے شر کے اندر کا منظر دیکھا تو وہیں کھڑے کھڑے اپنے قریبی سپاہیوں کو لٹاکر کہا کہ مسلمان اندر آ گئے ہیں اور یہیں سے منہ اندر کی طرف کر لو اور مسلمانوں کو تیروں کا نشانہ بناؤ.... جس رومی سپاہی نے بھی یہ حکم سنا وہ گھوم کر شر کے اندر مسلمانوں پر تیر برسانے لگا۔

شر میں بھگدڑ چلی تھی۔ لوگ گھروں سے نکل نکل کر بھاگ رہے تھے اور فوجی لڑ رہے تھے اور کچھ شہریوں میں مل کر بھاگ رہے تھے۔ مسلمان اعلان کر رہے تھے کہ کوئی شہری گھر چھوڑ کر نہ بھاگے، گھروں میں رہو، کوئی مسلمان کسی گھر میں داخل نہیں ہو گا نہ لوٹ مار ہو گی نہ کسی عورت پر ہاتھ اٹھایا جائے گا۔

”یہ بد بخت مسلمان ہمارے لوگوں کو دھوکا دے رہے ہیں“۔ ماتحت نے جرنیل سے کہا۔ ”یہ جانتے ہیں کہ بھاگنے والے لوگ سونا چاندی اور رقیں اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ ان کی نظر ان ہی چیزوں پر ہے۔“

”دھوکا نہیں دے رہے“۔ جرنیل نے کہا۔ ”یہی ان مسلمانوں میں خوبی ہے۔ مفتوحہ شہر میں کسی گھر میں داخل نہیں ہوتے، کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ یہی خوبی ہماری فوج میں بھی ہوتی تو نہ یہ شام سے بھاگتی نہ آج اتنا مضبوط قلعہ بند شہر ان کے حوالے کر دیتی۔ ہمارے فوجی تو اپنے ہی لوگوں کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار

شروع کر دیتے ہیں۔“

اتنے میں مجاہدین دیوار پر آگئے اور ان تیر اندازوں پر لوٹ پڑے جو نیچے شہر کے اندر مجاہدین پر تیر چلا رہے تھے۔ جرنیل ایک طرف کو بھاگ اٹھا۔ اس کا لباس اس کی بڑی واضح پہچان تھی کہ یہ شخص جرنیل ہے۔ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ زندہ دیوار سے اتر جائے گا اور اگر زندہ اتر بھی گیا تو مسلمانوں کے قیدی کی حیثیت سے اترے گا لیکن دیوار پر جو اس کے سپاہیوں میں ہڑبونگ اور افراق فری پیدا ہو گئی تھی اس سے اس نے یہ فائدہ اٹھایا کہ جھکا جھکا چلتا دیوار سے اتر ہی گیا۔

نیچے بھی وہی خونریزی کا اور بھاگ دوڑ کا عالم تھا۔ جرنیل کو اپنا آپ پہچانا مشکل نظر آ رہا تھا لیکن اس کی خوش قسمتی یہ تھی کہ قریب ہی ایک گلی تھی جس میں وہ چلا گیا اور پہلے ہی مکان کے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے بڑی زور سے دستک دی لیکن دروازہ نہ کھلا۔ گھر والوں کو یہ خوف آیا ہو گا کہ یہ مسلمان ہیں جو اندر آ کر ان کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو فاتحین مفتوحہ لوگوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ جرنیل نے اپنا نام لے کر کہا دروازہ فوراً کھولو۔ دروازہ ذرا سا کھلا جس میں سے جرنیل کو ایک آنکھ نظر آئی۔ جرنیل نے دروازے کو زور سے دھکیلا اور اندر چلا گیا۔ وہ ایک آدمی تھا جس نے ایک کاوڑ سا کھول کر باہر جھانکا تھا۔ دروازہ فوراً بند ہو گیا۔ اس آدمی نے اپنے جرنیل کو پہچان لیا اور پوچھا کہ لڑائی کی صورت حال کیا ہے۔

جرنیل نے صورت حال بتانے کی بجائے ہانپتے کانپتے لہجے میں کہا کہ اسے فوراً اپنے کپڑے دے دیں۔ وہ آدمی جرنیل کے اس انداز سے ہی سمجھ گیا ہو گا کہ لڑائی کی صورت حال کیا ہے۔ صورت حال اچھی ہوتی تو یہ جرنیل اس طرح گھبراہٹ اور خوف زدگی کی حالت میں ایک عام گھر میں نہ جاگھستا پھر بھی وہ آدمی کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

”سنا نہیں تم نے؟“۔ جرنیل نے حکم اور رعب کے لہجے میں کہا۔ ”مجھے اپنے کپڑے اور چنچہ دے دو..... مجھے پہچانتے نہیں تم؟ تمہارا جرنیل ہوں۔“

”پہچانتا ہوں۔“۔ اس آدمی نے طنزیہ سے لہجے میں کہا۔ ”لیکن ایک غریب آدمی کے کپڑے پن کر آپ کو کون پہچانے گا؟“

وہ آخر جرنیل تھا اور شاہی خاندان کا فرد تھا اور جلدی میں بھی تھا اس لئے اس نے اس شخص کی طنزیہ کلامی کا جواب زبان سے دینے کی بجائے تلوار نکالی اور اپنا حکم

ڈھرایا۔ کمرے سے ایک عورت نکل آئی۔ شاید اس شخص کی بیوی تھی۔ اسے کہنے لگی کہ یہ جو مانگتا ہے اسے فوراً دے دو۔

جرنیل نے اس شخص کے دیئے ہوئے کپڑے اپنے پہنے ہوئے لباس پر ہی چڑھا لئے۔ ایک غریبانہ سا چنچہ بھی پہنا جو اس کے کندھوں سے ٹخنوں تک لمبا تھا۔ میلی اور خستہ حالت ایک چادر تھی جو اس نے اپنے سر پر لپیٹ لی اور کچھ لٹکالی۔ اب وہ جرنیل نہیں بلکہ ایک غریب آدمی تھا۔ باہر نکلتے ہوئے وہ صحن سے گزرا تو ایک میڑھی میڑھی لاٹھی سی بڑی نظر آئی۔ اس نے لاٹھی اٹھالی اور ذرا سا کبڑا ہو کر اور لاٹھی ٹیک کر چلنے لگا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر رکا اور مڑ کر دیکھا۔

”اتنا مت ڈرو۔“۔ اس نے گھر کے اس آدمی اور اس کی بیوی سے کہا۔ ”دروازہ کھلا رہا تو بھی کوئی خطرہ نہیں۔ مسلمان گھروں میں داخل نہیں ہوتے اور وہ لوٹ مار نہیں کرتے۔“

”تم جاؤ۔“۔ اس شخص نے کہا۔ ”اب ہم جانیں مسلمان جانیں۔ میں تمہاری جرنیلی سے نہیں تمہاری تلوار سے ڈر گیا تھا۔ اگر تمہیں ہماری بیٹیوں کا خیال نہیں تو اپنی ہی بیٹی کا خیال کیا ہوتا اور لڑتے ہوئے مرنے جاتے.... جاؤ اب تمہیں کوئی نہیں پہچان سکے گا۔“

اگر اسے بھاگنے کی جلدی نہ ہوتی تو وہ غریب سے ایک آدمی کی یہ گستاخی معاف نہ کرتا اور اس کا سراپا کے بدن سے جدا کر دیتا لیکن اس نے اس آدمی کو قہر اور غضب کی نگاہوں سے دیکھا اور باہر نکل گیا۔



رومی فوج کا یہ جرنیل لاٹھی ٹیکتا ذرا جھکا ہوا آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ شہر کی گلیوں میں اسے اپنی فوج کے سپاہی بھاگتے دوڑتے جانیں بچاتے نظر آ رہے تھے۔ مسلمان بھی ان کے قریب سے گزرے اور اس نے ان کی خون آلود تلواریں دیکھیں۔ چار پانچ مرتبہ ایسے ہوا کہ وہ گلی کا موڑ مڑ رہا تھا کہ گھروں سے بھاگنے والے آدمی اس سے ٹکرائے اور بھاگ گئے۔

اسے دو تین مسلمان نظر آئے جو بڑی ہی بلند آواز سے اعلان کرتے پھر رہے تھے کہ لوگ گھروں کے اندر رہیں، بھاگیں نہیں، کسی گھر میں کوئی لوٹ مار کے لئے داخل

نہیں ہو گا۔ ایک مسلمان کتنا پھر رہا تھا کہ باہر نہ نکلنا، بڑی زبردست لڑائی ہو رہی ہے، گھوڑوں تلے آکر مارے جاؤ گے.... پھر بھی شہریوں میں افراطی پناہ تھی اور کچھ لوگوں نے دروازے اندر سے بند کر لئے تھے۔

جرنیل بہت جلدی میں تھا لیکن ڈر سے تیز نہیں چلتا تھا کہ پہچانا جائے گا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اسے بوڑھا اور کمزور یا بیمار سمجھ کر نظر انداز کر دیں گے۔ اس کا گھر شہر سے الگ تھلک تھا۔ وہ گھر نہیں ایک محل تھا۔ وہاں تک پہنچنے میں خاصا وقت گزر گیا۔ اسے یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ اس کے گھر والے بروقت نکل نہ گئے تو پکڑے جائیں گے۔ زیادہ خیال بیٹی کا تھا جو نوجوان اور غیر شادی شدہ تھی۔ وہ بہت ہی زیادہ خوبصورت بھی تھی۔

وہ گھر کے قریب پہنچا تو اسے ایسے آثار نظر آنے لگے جیسے محل کے کمین بھاگ گئے ہوں۔ مسلمان گھوڑ سوار محل کے احاطے میں داخل ہو رہے تھے۔ کچھ محل کے اندر چلے گئے تھے۔ وہ احاطے کے باہر والے گیٹ پر جا رہا تھا اور اس محل کو حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگا جس میں وہ شاہی خاندان کا جرنیل تھا لیکن اب اس محل کے در و دیوار جیسے اس کے دشمن ہو گئے تھے۔ ایک مسلمان محل میں سے نکلا اور بلند آواز سے کہا کہ سب بھاگ گئے ہیں، محل بالکل خالی ہے۔ جرنیل وہیں کھڑا رہا۔ اسے یہ اطمینان ہو گیا کہ اس کے گھر کے تمام افراد نکل گئے ہیں۔

وہ وہیں کھڑا اپنے محل کو دیکھتا رہا۔ تصور میں لایا جاسکتا ہے کہ اس کے سینے پر کیسے کیسے سانپ اور کیسے کیسے زہریلے ناگ لوٹے ہوں گے۔ وہ اس شہر کا حاکم اور جرنیل نہیں بلکہ بادشاہ تھا۔ یہاں کے لوگوں کی قسمت اس اکیلے شخص کے ہاتھ میں تھی اور وہ ان کا روزی و رسا بنا ہوا تھا۔ اس محل میں اس نے جو عیش و عشرت کی تھی وہ بھی اسے یاد آئی ہوگی۔ محل کے سامنے بڑا ہی خوبصورت باغ تھا۔ اس باغ میں اور اس محل میں اس نے معصوم نوجوانیاں اور ان کی عصمتیں پامال کی تھیں۔ آج اسے اپنی بیٹی کا غم کھا رہا تھا کہ وہ اپنے خاندان کے ساتھ یہاں سے نکل گئی تھی یا کسی فاتح کے ہاتھ چڑھ گئی ہے۔

”سپہ سالار آرہے ہیں“۔ اسے اپنے پیچھے ایک آواز سنائی دی۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ لشکر مجاہدین کے فاتح سپہ سالار عمرو بن عاص آرہے

تھے۔ ان کے پیچھے چند ایک گھوڑ سوار محافظ تھے۔ اس رومی جرنیل نے ایک بار پھر محل کی طرف دیکھا۔ یہاں تو اس کے محافظوں کا ایک دستہ چاک و چوبند اور ہر دم تیار موجود رہا کرتا تھا لیکن اب ان کا نام و نشان نہ تھا۔

اس نے وہاں سے کھسک جانے کی یا بھاگ نکلنے کی سوچی ہی نہیں۔ عمرو بن عاص اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ جرنیل نے اپنا آپ چھپائے رکھنے کے لئے یوں کیا کہ عمرو بن عاص کا گھوڑا اس کے قریب آیا تو اس نے جھک کر اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ سپہ سالار اور ان کے محافظ ان کے قریب سے گزر گئے اور محل میں جا داخل ہوئے۔

”یہاں کھڑے کیا سوچ رہے ہو“۔ رومی جرنیل کے کانوں میں ہلکی سی آواز پڑی۔

اس نے چونک کر ادھر دیکھا۔ ایک بوڑھی عورت اس کے پاس کھڑی تھی۔ وہ اس بڑھیا کو نہیں جانتا تھا۔ اس کے کسی ملازم کی ماں تھی جس نے اسے اس غریبانہ بہروپ میں بھی پہچان لیا تھا۔ اس نے جرنیل کو بتایا کہ اس کے گھر کے تمام افراد اُسی وقت نکل گئے تھے جس وقت انہیں یہ اطلاع ملی تھی کہ مسلمان کھلے دروازوں سے شہر میں داخل ہو رہے ہیں۔ شہر کے دو دروازے خاص طور پر چھوٹے بنوائے گئے تھے اور یہ بہت ہی مضبوط تھے۔ ان دونوں دروازوں کی چابیاں شاہی محافظ دستے کے کمانڈر کے پاس رہتی تھیں۔ یہ دروازے فوج کے اندر یا باہر آنے جانے کے لئے استعمال نہیں ہوتے تھے۔ یہ کبھی بھی نہیں کھلے تھے۔ یہ دروازے شاہی خاندان کے لئے مخصوص تھے لیکن انہیں بند اور مقفل ہی رکھا جاتا تھا۔ ان کا استعمال ہی تھا جو اب کیا گیا یعنی یہ شاہی خاندان کے فرار کے لئے مخصوص تھے۔ بڑھیا نے جرنیل کو بتایا کہ جب مسلمان شہر میں داخل ہو رہے تھے اُس وقت ان دونوں میں سے ایک دروازہ کھلوا دیا گیا اور تمام افراد اس سے نکل گئے۔ اس طرف کوئی لڑائی نہیں تھی۔

”اور میری بیٹی؟“

”وہ بھی ساتھ ہی گئی ہے“۔ بڑھیا نے جواب دیا۔ ”آپ کی بیٹی کا منگیتر آگیا تھا۔ وہی سب کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ آپ بھی چلے جائیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ پہچانے جائیں پھر مسلمان آپ کو گرفتار کر لیں گے۔“

”وہ اپنے ساتھ گھوڑوں پر کچھ سامان لے کر گئے ہیں؟“

”کچھ بھی نہیں!“ — بڑھیا نے جواب دیا — ”اتنی سلت ہی نہیں تھی کہ قیمتی چیزیں اکٹھی کر سکتے۔“

جرنیل نے اب جو محل کی طرف دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے ایک تیر اس کے دل میں اتر گیا ہو۔ اُسے معلوم تھا کہ اس محل میں زرد جواہرات کا کتنا خزانہ موجود تھا۔

”آپ بہت مغوم نظر آتے ہیں“ — بڑھیا نے کہا — ”آپ کی جان سلامت ہے“ خاندان کا ہر فرد زندہ نکل گیا ہے۔ آپ بھی چلے جائیں اور تیار ہو کر واپس آئیں، اس شہر پر حملہ کریں اور یہ شہر آپ کا ہی ہو گا۔“

جرنیل کے ہونٹوں پر اداس سی مسکراہٹ آگئی۔ اسے بڑھیا کی یہ بات اچھی لگی لیکن وہ جانتا تھا کہ مسلمانوں سے وہ شہر واپس لینا عموماً ممکن نہیں ہوتا جو وہ فتح کر لیتے ہیں.... وہ وہاں سے ہٹا اور محل پر الوداعی نگاہیں ڈالتا چلا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا خاندان کہاں گیا ہے۔ کم و بیش تیس میل دور ایک اور بڑا شہر تھا جس کا اُس دور میں نام بلیس ہوا کرتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے خاندان کے افراد کس راستے سے گئے ہوں گے۔ وہ اس چھوٹے سے دروازے سے نکلا جو شاہی خاندان کے فرار کے لئے مخصوص تھا۔ اس طرف سے کوئی حملہ آور نہیں آسکتا تھا کیونکہ دیوار کے ساتھ ہی پہاڑی کی ڈھلان تھی جس پر بڑا ہی تنگ راستہ تھا۔ یہ راستہ اتنا ہی تھا کہ ایک آدمی یا ایک گھوڑا اس راستے سے چڑھ یا اتر سکتا تھا۔ اس طرف کوئی لڑائی نہیں تھی، بالکل خاموشی تھی۔ وہ نیچے چلا گیا۔ زخمی ہو ہو کر گرنے والے رومی گھوڑ سواروں کے گھوڑے بھاگتے دوڑتے دور دور تک پھیل گئے تھے۔ جرنیل نے دیکھا کہ تین چار گھوڑے اس پہاڑی سے نیچے چلے گئے تھے جس پہاڑی پر فرما کا شہر آباد تھا۔ اس نے ایک گھوڑا پکڑا، اس پر سوار ہوا اور ایڑ لگا دی۔

یہ تمام علاقہ سرسبز تھا اور جنگل کہیں کہیں گھنا بھی تھا اور چھوٹی بڑی پہاڑیاں بھی تھیں۔ وہاں جا کر انسان اور گھوڑے گم ہو جاتے تھے۔

○

اس رومی جرنیل نے خاصی دور جا کر گھوڑا روکا اور جو غریبانہ کپڑے اس نے اپنے جنگی لباس پر پہنے تھے وہ اتار کر پھینک دیئے اور آگے کو چل پڑا۔ اب اسے پکڑے جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اگر علاقہ میدانی ہوتا تو وہ بہت دور نکل گیا ہوتا لیکن پہاڑی

علاقے میں اسے دائیں بائیں بہت مڑنا پڑتا تھا اس لئے وقت زیادہ گزر رہا تھا اور فاصلہ کم ملے ہو رہا تھا۔ اتنے میں سورج غروب ہو گیا۔

پیچھے فرما میں اس کے محل سے تمام مال غنیمت برآمد کر کے اکٹھا کر لیا گیا تھا۔ وہ تو زور جواہرات کا ایک خزانہ تھا۔ دیگر ساز و سامان اور کپڑے وغیرہ بھی بیش قیمت تھے۔ مجاہدین نے بھاگ دوڑ کر شہریوں میں امن و امان قائم کر دیا۔ بدوؤں پر خاص طور پر نظر رکھی گئی تھی کہ وہ کسی شہری کے گھر میں داخل نہ ہوں۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ وہ کوئی اشیاء ہوتی ہیں جنہیں مال غنیمت میں شمار کیا جاتا ہے اور یہ اشیاء کہاں کہاں ہوتی ہیں۔

رومی جرنیل سورج غروب ہونے کے بعد بھی رکا نہیں۔ اس نے گھوڑے کی رفتار خاصی تیز رکھی تھی اور اسے امید تھی کہ اپنے خاندان کو راستے میں ہی جلے گا.... اور اس نے انہیں راستے میں ہی جالیا۔ وہ جگہ بڑی خوبصورت اور خوش نما تھی جہاں اس کا خاندان کچھ دیر کے لئے رک گیا تھا۔ وہ سب لوگ گھوڑوں پر گئے تھے۔ وہ جگہ فرما سے دس گیارہ میل دور تھی۔ گھوڑوں کے ہنسنے سے ان لوگوں کی نشاندہی ہوئی تھی۔ جرنیل اپنے خاندان سے جا ملا اور اس نے سب سے پہلے اپنی نو جوان بیٹی کے متعلق پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔

”پاکل ہو گئی ہے“ — جرنیل کی بیوی نے کہا — ”پاکل پن میں کہیں غائب ہو گئی ہے۔“

جرنیل پہلے تو سُن ہو کر رہ گیا اور خاندان کے ہر فرد پر سناٹا طاری ہو گیا۔ یک لخت جرنیل نے گرج کر کہا کہ اسے صحیح بات بتائی جائے پھر اس نے اپنی بیٹی کے منگیتر کے متعلق پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ جرنیل کو بڑھیا نے بتایا تھا کہ نوشی کا منگیتر آگیا تھا اور وہ سب کو ساتھ لے گیا ہے۔

نوشی کے متعلق یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ اپنے شاہی وقار کے متعلق بہت ہی جذباتی اور حساس تھی۔ جرنیل کی بیٹی ایک بیٹی جو انہیں تھی، دو بیٹے اس سے ابھی چھوٹے تھے۔ جرنیل نے اپنی اس بیٹی نوشی کو جنگی تربیت دینے کے لئے ایک استاد مقرر کر رکھا تھا جس نے اس لڑکی کو شہسوار بنادیا تھا پھر اسے تیغ زنی، برجھی بازی اور تیر اندازی کی ایسی تربیت دی تھی کہ وہ تجربہ کار فوجی کی طرح دشمن کے مقابلے میں اتر سکتی تھی۔ نوشی تھی تو نو جوان اور بڑی ہی خوبصورت لڑکی لیکن اس نے اپنے آپ میں

مردانہ صفات پیدا کر لی تھیں اور اس کی فطرت جنگجو مردوں جیسی ہو گئی تھی۔ اپنے باپ سے اکثر کما کرتی تھی کہ وہ اپنی زندگی میں ملک شام کو رومی سلطنت میں شامل کر لے گی۔

اس کا جو استاد تھا، اس نے نوشی کے دل میں مسلمانوں کے خلاف ایسی نفرت بھر دی تھی کہ وہ مسلمانوں کا نام سنتے ہی اس نفرت کا اظہار کرنے لگتی تھی۔ اس کے اس جرنیل باپ کے دو غلے پن کا یہ حال تھا کہ ایک طرف تو مسلمانوں کے حسن اخلاق کی تعریفیں کیا کرتا تھا لیکن اپنی اولاد کے دلوں میں اس نے مسلمانوں کا تاثر کچھ ایسا پیدا کر دیا تھا جیسے اس سے زیادہ کوئی اور حقیر اور قابل نفرت قوم ہو ہی نہیں سکتی۔ مسلمانوں نے رومیوں سے شام چھین کر انہیں مصر کی طرف بھگا دیا تو نوشی کی جذباتی حالت ایسی ہو گئی جیسے وہ ہر اس مسلمان کو قتل کر دے گی جو اس کے سامنے آئے گا۔ اب مسلمانوں نے اسے پورے خاندان سمیت فرما سے بھی بھاگ جانے پر مجبور کر دیا اور وہ اپنا محل اور زر جو اہرات کا انبار وہیں چھوڑ کر بھاگ نکلی۔

جرنیل کو بتایا گیا کہ فرما سے نکلنے ہی نوشی بگڑ گئی تھی۔ کہتی تھی کہ یہ تھوڑے سے مسلمان کبھی فرما فتح نہیں کر سکتے تھے، یہ کامیابی انہیں صرف اس لئے حاصل ہوئی ہے کہ بدو ان کے ساتھ مل گئے تھے۔ یہ بات اسے فرما پر حملے سے پہلے ہی معلوم ہو گئی تھی لیکن اس نے اس طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ اب اس کے منگیتر نے بتایا کہ بدو مسلمانوں کے ساتھ نہ ہوتے تو ان مسلمانوں میں سے کوئی ایک بھی زندہ واپس نہ جاسکتا تھا۔

نوشی کی ماں نے جرنیل کو جو بات سنائی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ محل کا ایک ادھیڑ عمر ملازم مصری بدو تھا اور عیسائی تھا۔ نوشی کو یہ بدو اتنا اچھا لگتا تھا کہ اسے اس نے اپنا خاص معتمد ملازم بنا لیا تھا۔ اس بدو ملازم کا ایک جوان بیٹا بدوؤں کے اس لشکر میں چلا گیا تھا جو مسلمانوں سے جاملہ تھا۔ اس بیٹے نے اپنے باپ کو تفصیل سے بتایا تھا کہ بدو کس طرح مسلمانوں کے پاس گئے تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ آسمان سے فرشتے اترے تھے اور انہوں نے خدا کا پیغام دیا تھا۔

بیٹے کا تو یہ حال کہ وہ مسلمانوں سے جاملہ لیکن باپ کنٹر عیسائی تھا اور مسلمانوں کا ویسا ہی دشمن جیسی نوشی تھی۔ یہ ایک ہم خیالی بھی تھی جس کی وجہ سے یہ ملازم نوشی کو

اچھا لگتا تھا۔

اب مسلمانوں نے فرما بھی فتح کر لیا تو اس ملازم نے نوشی کو بتایا کہ بدو اپنی قوم اور مذہب سے غداری نہ کرتے تو مسلمان اتنا مضبوط قلعہ بند شہر کبھی فتح نہ کر سکتے۔ نوشی تو جل اٹھی اور اس ملازم نے جلتی پرتیل چھڑکا۔

یہ خاندان جب فرما سے نکلا تو نوشی نے اس بدو ملازم سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ چلے۔ اس ملازم کو بھی نوشی سے کچھ ایسا پیار ہو گیا تھا کہ وہ ساتھ چل پڑا اور اب نوشی کے ساتھ وہ بھی لاپتہ ہو گیا تھا۔

رومی جرنیل نے جب اپنی بیوی کی زبانی یہ بات سنی تو اس نے فوراً کہا کہ یہ بدو بھی غداری کر گیا ہے۔ جرنیل کا مطلب یہ تھا کہ وہ نوشی کو درغلا کر اپنے ساتھ لے گیا ہے اور مسلمانوں کے پاس جا کر لڑکی سالار کے حوالے کر دے گا اور اس کے عوض مال غنیمت وصول کر لے گا۔

جرنیل کا یہ شک محض ایک وہم تھا۔ اصل بات جو بعد میں معلوم ہوئی وہ یوں تھی کہ لڑکی نے فرما سے نکلنے ہی کنا شروع کر دیا تھا کہ وہ ان بدوؤں کے ہاں جائے گی جو ابھی مسلمانوں کے ساتھ نہیں ملے اور ان کے سرداروں سے کہے گی کہ وہ کسی طرح غدار بدوؤں کو واپس لائیں۔ یہ مہم کوئی آسان مہم نہیں تھی۔ نوشی شاید اپنے آپ کو شاہی خاندان کی لڑکی اور بدوؤں کو اپنی رعایا سمجھ کر حکم چلانا چاہتی تھی لیکن بعد میں یہ راز کھلا کہ اس بدو ملازم نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ ایک ایسے بدو کے پاس لے جائے گا جس کے ہاتھ میں غیبی طاقت ہے اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ وہ شخص کوئی جادو چلانے کا علم رکھتا تھا اور لوگ اس سے غیب کا اور آنے والے وقت کا حال پوچھنے جاتے تھے اور وہ پراسرار پیاریوں کا علاج بھی کرتا تھا۔

بدو ملازم نے نوشی کو یقین دلایا تھا کہ یہ شخص جسے سب جادوگر کہتے ہیں، اگر حکم دے دے یا بدوؤں کو ڈر دے تو کوئی اور بدو مسلمانوں کے لشکر میں شامل نہیں ہو گا اور جو شامل ہو چکے ہیں وہ واپس آجائیں گے۔

نوشی کی ماں نے جرنیل کو بتایا کہ نوشی کی جذباتی حالت بہت ہی بُری ہو گئی تھی اور وہ فرما سے کچھ دور آکر گھوڑا روک لیتی اور کہتی کہ وہ جارہی ہے۔ اسے زبردستی آگے لے جاتے تھے۔ وہ علاقہ ایسا تھا کہ چٹانوں اور ٹکریوں کی وجہ سے ہر چند قدم بعد واپس

رہا کو مضبوط بنائے گا۔

○

بدو ملازم دیانت دار تھا یا بد دیانت؟ یہ ایک الگ بات ہے، اسے یہ معلوم تھا کہ بدوؤں کا علاقہ کون سا ہے اور جس کے پاس وہ نوشی کو لے جا رہا ہے وہ کہاں رہتا ہے۔ یہ بدو نہایت اچھا رہنما تھا کیونکہ وہ خود بدو تھا اور اپنے علاقے سے پوری طرح واقف تھا۔

بدوؤں کا علاقہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک تو وہ علاقہ تھا جہاں کے بدو مسلمانوں کے ساتھ جا ملے تھے اور ایک علاقہ فرما سے ذرا آگے اور الگ ہٹ کر تھا جو زیادہ سرسبز اور شاداب تھا۔ یہاں بھی بدو رہتے تھے۔

اس سرسبز و شاداب علاقے کے بدو صحرائی بدوؤں سے یعنی اُن بدوؤں سے جو مسلمانوں کے پاس چلے گئے تھے، کچھ مختلف تھے۔ تھے تو یہ بھی تو ہم پرست لیکن ان کے عقائد دوسروں سے مختلف تھے۔ یہ بھی عیسائی تھے لیکن انہیں ایک اور ہی فرقے کے عیسائی کہا جاسکتا ہے۔

اصل خطرے والی بات یہ تھی کہ بدو ملازم کوئی دانشمند اور دور اندیش آدمی نہیں تھا۔ وہ نوشی کی وفاداری کی وجہ سے اس کا ساتھ دے رہا تھا، اسے مسلمانوں کے خلاف کہانیاں سنا سکتا تھا لیکن کوئی دانشمند نہ مشورہ دینے کے قابل نہیں تھا۔ نوشی پر تو جذبات ہی غالب تھے اور وہ اگر پوری طرح پاگل نہیں ہو گئی تھی تو نیم پاگل ضرور ہو گئی تھی۔ عمر بھی تو جوانی کی تھی جب جذبات ہی ذہن پر غالب آتے ہیں۔

سورج اوپر آگیا تو نوشی اپنے ملازم کی راہنمائی میں بدوؤں کے علاقے میں داخل ہو گئی۔

انہیں اپنے پیچھے دوڑتے گھوڑے کے ٹاپ سنائی دیے۔ دونوں نے پیچھے دیکھا۔ ایک گھوڑا سوار ان کی طرف گھوڑا دوڑاتا آ رہا تھا۔ وہاں جنگل تو گھٹا تھا لیکن کوئی ایسی ٹیکری یا چٹان یا کوئی اوٹ نہیں تھی کہ وہ چھپ جاتے۔ اس سوار نے انہیں دیکھ بھی لیا تھا اس لئے وہ چلتے گئے اور نوشی نے ملازم سے کہا کہ یہ جو کوئی بھی ہے اسے نہیں جانا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور اگر خطرہ ہو تو اس سوار کو دونوں مل کر قتل کر دیں گے۔ ان دونوں کے پاس تلواریں بھی تھیں اور خنجر بھی۔

یا بائیں مڑنا پڑتا تھا اور جگہ اتنی تنگ تھی کہ گھوڑے ایک دوسرے کے پیچھے قطار کی صورت میں ہی چلائے جاسکتے تھے۔ نوشی کی کوشش یہ تھی کہ وہ سب سے آخر میں رہے۔

خاصی دور آکر ایسی جگہ آگئی کہ پیچھے والے کو اپنے آگے جانے والے گھوڑے کی بھی خبر نہیں رہتی تھی۔ یہ قافلہ اصل راستے سے ہٹ کر دشوار گزار راستے سے جا رہا تھا تاکہ مسلمان تعاقب میں آئیں تو انہیں کچھ نہ ملے۔

ایک جگہ ذرا کشادہ آئی تو دیکھا نوشی اس قافلے کے ساتھ نہیں تھی اور بدو ملازم بھی نہیں تھا۔

نوشی کے منگیتر نے کہا کہ وہ اس کے پیچھے جا رہا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کا انتظار نہ کیا جائے، سب چلتے چلیں کیونکہ ہو سکتا ہے نوشی اسے نہ ملے اور وہ اسے ڈھونڈ کر ساتھ لے ہی آئے گا۔ اس طرح جرنیل کا خاندان بلیس کی طرف بڑھتا گیا اور منگیتر نوشی کے پیچھے چلا گیا۔

جرنیل غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کہنے لگا کہ وہ بھی اس کے پیچھے جاتا ہے لیکن بیوی نے اسے پکڑ کر بٹھالیا اور کہا کہ اتنا وقت گزر چکا ہے اب اس کے پیچھے جانا محض حماقت ہے۔

”مجھے اس کے پیچھے نہیں جانا چاہیے“۔ جرنیل نے کہا۔ ”مجھے فوراً“ بلیس پہنچنا ہے ورنہ وہاں فوج میں یہ مشہور ہو جائے گا کہ میں شکست کھا کر کہیں اور فرار ہو گیا ہوں۔ اپنی بیٹی کے متعلق یہ پریشانی ہے کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھ چڑھ جائے گی اور کوئی عربی بلاؤ اسے اپنی بیوی یا داشتہ بنا لے گا۔ یہ ڈر بھی ہے کہ یہ مصری بدو ہی لڑکی کو اپنے قبضے میں رکھ لے گا۔“

”میں غلط نہیں کہہ رہی“۔ جرنیل کی بیوی نے کہا۔ ”لڑکی پاگل ہو چکی ہے۔ وہ ابھی گئی تو اس کا دماغ ٹھکانے نہیں آئے گا۔ میں اسے بتاتی رہتی تھی کہ عقل پر جذبات کو غالب کرنے والے تباہی کی طرف ہی جایا کرتے ہیں لیکن میں نے دیکھا کہ لڑکی جذبات کے رنگ میں سوچتی تھی اور عقل استعمال نہیں کرتی تھی۔ ہم نے بھی کبھی خیال نہ کیا کہ اس کا یہ ملازم بھی اور استاد بھی اسے بڑی گھٹیا اور جذباتی کہانیاں سناتے رہتے تھے اور ہم یہ سمجھتے رہے کہ لڑکی میں قومی وقار اور جنگی جذبہ ہے جو سلطنت

میرے باپ نے مقوقس اور اطربوں کو اطلاع بھیج دی تھی کہ تین چار ہزار بدو مسلمانوں کے ساتھ مل گئے ہیں اور یہ بدو دیہات میں جا کر اناج اکٹھا کر کے مسلمانوں کو دے رہے ہیں لیکن کسی نے نہ سوچا کہ اس کا کوئی تدارک کیا جائے۔ اب یہ کام میں کروں گی۔“

”سلطنت روم فرما پر ختم نہیں ہو جاتی نوشی!“ — منگیتر نے کہا — ”یہ آخری قلعہ ہے جو مسلمانوں نے فتح کر لیا ہے۔ اس سے آگے ان کے لئے موت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہمارے جاسوس انہیں بہت قریب سے دیکھ رہے ہیں۔ مسلمانوں کو کوئی کمک نہیں مل رہی۔ فرما میں ان کا جانی نقصان اچھا خاصا ہوا ہے اور بدو زیادہ مارے گئے ہیں۔ ان کی طاقت کم ہوتی جا رہی ہے۔ ان کی کمک کے لئے راستہ اور لمبا ہو گیا ہے۔ ہم نے انتظام کر لیا ہے کہ ان کی کمک آئی تو اسے راستے میں ہی روک کر ختم نہ کیا جاسکا تو اسے اتنا کمزور ضرور کر دیں گے کہ بیکار ہو کر رہ جائے گی۔“

”تم اگر جرنیل ہوتے تو شاید میں تمہاری یہ بات مان لیتی۔“ نوشی نے کہا۔ ”تم چھوٹے سے عمدے دار ہو۔ سنی سانی باتیں کرتے ہو لیکن بالائی سطح پر مجھے کوئی ایسی سرگرمی نظر نہیں آ رہی۔ میں ان مصری بدوؤں کو مسلمانوں سے الگ کرنا چاہتی ہوں۔ نہ ہوئے تو ابھی ہزاروں بدو موجود ہیں جو نہ ہمارے ساتھ ہیں اور نہ ہی مسلمانوں کے ساتھ۔ میں انہیں اپنے ساتھ ملانا چاہتی ہوں۔ ان کی ایک الگ فوج تیار کروں گی اور پھر میں مسلمانوں کا راستہ روکوں گی۔ یہ میرا عزم ہے اور اس پر میں تمہاری محبت کو بڑی آسانی سے قریان کر سکتی ہوں۔“

اُس دور کی تاریخ کا ذرا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو اس رومی لڑکی کا یہ عزم عجیب نہیں لگتا۔ اُس دور میں کئی ایسے جنگی واقعات ملتے ہیں جن میں فوج کی قیادت کسی عورت نے کی اور بڑے بڑے لشکروں کے منہ موڑ دیئے تھے۔ رومیوں میں فوجی جذبہ موجود تھا اور وہ بلا شک و شبہ جنگجو بھی تھے۔ ان میں سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ ان کی قیادت پر شہنشاہیت غالب تھی جس نے اپنی فوج کو یہ تاثر دے رکھا تھا کہ وہ بادشاہ اور جرنیلوں کی غلام ہے یا یہ کہ تنخواہ دار ملازم ہے۔ اس فوج میں جہاد نام کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا تھا لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ یہ فوج لڑتی ہی نہیں تھی۔ رومی تو فطرتاً جنگجو تھے اور ان کے پیچھے شجاعت اور جنگجوئی کی بڑی لمبی تاریخ تھی۔

گھوڑ سوار قریب آگیا۔ نوشی کو اس کی پکار سنائی دی۔
”نوشی!“ — گھوڑ سوار نے پکارا — ”رک جاؤ، میں تمہارے پیچھے آیا ہوں۔“
نوشی نے گھوڑا روک لیا اور پیچھے دیکھا۔ اس کا منگیتر آ رہا تھا۔
”کہاں جا رہی ہو نوشی؟“ — منگیتر نے پوچھا۔

”ہرقل کی غیرت کو جگانے کے لئے“ — نوشی نے جواب دیا — ”اگر اس کی غیرت نہ جاگی تو روم کے وقار کو ہمیشہ کے لئے دفن کر آؤں گی۔“
منگیتر جس کے نام کا کچھ علم نہیں، نوشی کی اتنی سی بات سے سمجھ گیا کہ یہ لڑکی دماغی طور پر ٹھیک نہیں رہی۔ اس نے اپنا گھوڑا نوشی کے گھوڑے کے آگے کر کے اس گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور بولا کہ میرے ساتھ واپس چلو۔

”میرے راستے کی رکاوٹ نہ بنو۔“ نوشی نے تلوار نکال کر کہا — ”میں تم سے بھی توقع رکھتی ہوں کہ میرا ساتھ دو گے، ساتھ کی بجائے تم رکاوٹ بن رہے ہو۔ میں تمہیں مسلمانوں سے بدتر دشمن سمجھوں گی.... میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔“
”میں تمہیں اپنی محبت کا واسطہ دیتا ہوں۔“ منگیتر نے کہا — ”تم پر زبردستی نہیں کروں گا۔ میں بھی رومی ہوں، مرنے نہیں گیا....“

”میرے دل میں تمہارے سوا اور کوئی نہیں۔“ نوشی نے کہا۔ ”لیکن میں اس دل سے سلطنت روم کی محبت نہیں نکال سکتی۔ میری پہلی محبت روم ہے۔ اس کے بعد تم ہو۔ اگر تم میرا ساتھ دیتے ہو تو میرے ساتھ آؤ۔ اگر نہیں تو تم میرے ہاتھ سے مارے جاؤ گے۔“

”مجھے آخر مرنا ہی ہے۔“ منگیتر نے کہا۔ ”لیکن میں روم کی آن پر کسی مسلمان کے ہاتھوں مرنا زیادہ پسند کروں گا.... میں جانتا ہوں تم بدوؤں کے سرداروں سے ملنے جا رہی ہوں لیکن یہ کام ایک عورت کا نہیں، یہ جرنیلوں کی سطح کا معاملہ ہے۔ یہ بدو تمہیں کم سن لڑکی سمجھ کر ٹال دیں گے۔“

”کون سے مردوں کی بات کر رہے ہو؟“ — نوشی نے طنزیہ سے لہجے میں کہا۔
”ہرقل کی؟.... مقوقس کی؟.... اسی اطربوں کی جو اپنے آپ کو دنیا کا سب سے زیادہ بہادر اور دانشمند جرنیل سمجھتا ہے؟.... کہاں ہیں وہ سب؟ سب اپنی اپنی جگہوں پر آرام سے بیٹھے عیش و عشرت میں پڑے ہیں اور میرے باپ کو آگے کر رکھا ہے۔“

یہاں بات عورت کی ہو رہی ہے۔ عورت نے متعدد جنگوں کی قیادت کی ہے اور کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ یہ دیکھتے ہوئے نوشی کی بات عجیب نہیں لگتی لیکن اس میں کمزوری یہ تھی کہ نوجوانی کی عمر میں تھی اور اس کی سوچوں پر جذباتیت غالب تھی۔ دوسری کمزوری یہ کہ وہ غیر معمولی طور پر خوبصورت اور بڑی ہی دلکش لڑکی تھی اور بددوں پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ اس کے جذبے سے متاثر ہوں گے یا اس کے حُسن سے حُسن سے متاثر ہونے میں بہت بڑا خطرہ چھپا ہوا تھا۔



منگیترنے دیکھ لیا کہ نوشی کو زبردستی پیچھے نہیں لے جایا جاسکتا اور وہ کوئی استدلال قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہی۔ منگیترا سے تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو آمادہ کر ہی نہیں سکتا تھا کہ اتنی حسین اور نوجوان لڑکی کو بددوں کے پاس جانے دے۔ اس نے اس ادھیڑ عمر بددو ملازم سے پوچھا کہ وہ اسے کہاں لے جا رہا ہے جو ملازم نوشی کے ساتھ جا رہا تھا۔

”مجھ پر کوئی الزام نہیں آنا چاہئے“۔ ملازم نے ڈرے سسمے ہوئے غلامانہ لہجے میں کہا۔ ”شترادی کے ساتھ آپ نے خود بات کر کے دیکھ لیا ہے۔ انہوں نے آپ کی بات ماننے کی بجائے تلوار نکال لی ہے۔ خود ہی سوچیں کہ میں ان کے ساتھ آنے سے کس طرح انکار کر سکتا تھا۔“

منگیترنے ملازم کو ڈانٹ کر کہا کہ وہ اس کے اس سوال کا جواب دے کہ وہ نوشی کو کہاں لے جا رہا ہے۔

”ہامون کے پاس!“۔ ملازم نے جواب دیا۔

”کون ہے ہامون؟“۔ منگیترنے پوچھا۔

”اسے سب جادوگر کہتے ہیں“۔ ملازم بددو نے جواب دیا۔ ”وہ جادوگر ہے یا نہیں“ میں یہ جانتا ہوں کہ اس کے پاس غیب کا کوئی علم ہے جس سے وہ ہر اس سوال کا جواب دے دیتا ہے جس کا جواب کہیں سے بھی نہیں مل سکتا خواہ یہ سوال آنے والے وقت کے متعلق ہی ہو۔ اس کی اس غیبی طاقت کی وجہ سے تمام بددو اس کی ہر بات مانتے ہیں۔ ہمارے صرف مذہبی پیشوا ہیں جو ہامون کو اچھا نہیں سمجھتے۔ کچھ سردار ایسے ہیں جو ہامون کی بات مانتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو مذہبی پیشواؤں کا ساتھ دیتے ہیں۔ میں

انہیں ہامون کے پاس لے جا رہا ہوں۔ یہ اچھا ہے کہ آپ بھی آگئے ہیں۔ آپ ساتھ چلیں اور خود ہامون کے ساتھ بات کریں۔“

”ہامون کیا کرے گا؟“۔ منگیترنے پوچھا۔

”میں یہ بات شترادی کو پہلے ہی بتا چکا ہوں“۔ ملازم نے جواب دیا۔ ”سب سے پہلے تو وہ دیکھے گا کہ شترادی کا مطلب پورا ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر یہ بات بننے والی نہ ہوئی تو وہ صاف بتا دے گا کہ شترادی ہمیں سے واپس چلی جائے۔“

”مجھے امید ہے وہ بات بنا دے گا“۔ نوشی نے کہا۔ ”اور اگر اس کے پاس واقعی جادو ہے تو وہ میرا مطلب پورا کر دے گا“

منگیترنے اس ادھیڑ عمر بددو ملازم سے کچھ اور سوال و جواب کئے تو اسے ملازم کی باتیں کچھ کچھ کچھ سی لگیں اور محسوس کیا کہ یہ شخص تو ہم پرست ہے اور نوشی کو اس جادوگر کے پاس نہیں جانا چاہئے۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی شعبہ باز ہو۔ بددوں میں کچھ ایسے آدمی موجود تھے جو دراصل شعبہ باز تھے اور لوگ انہیں خدا کے ایلچی سمجھتے تھے۔ منگیترنے نوشی کو ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے قومی جذبے کو یوں رسوا نہ کرے اور واپس چلی جائے۔ نوشی اس کے ہاتھ آہی نہیں رہی تھی۔

منگیترنے ایک بار پھر نوشی کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور اسے پیچھے کو موڑنے لگا۔ نوشی گھوڑے سے کود گئی اور تلوار لہرا کر منگیترا کو لٹکایا کہ وہ گھوڑے سے اتر آئے۔ منگیترا گھوڑے سے تواتر آیا لیکن تلوار نہ نکالی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ تلوار نکال کر نوشی کے مقابلے میں آجاتا۔ وہ نوشی کے قریب گیا تو نوشی نے تلوار دائیں بائیں ہوا میں بڑی زور سے مار کر اس کی نوک منگیترا کے سینے پر رکھ دی۔

”تلوار نکالو“۔ نوشی نے کہا۔ ”مجھ سے دور رہو“

”یہ تلوار میرے سینے میں اتار دو“۔ منگیترنے کہا۔ ”پھر جہاں جی چاہے چلی جانا۔ جب تک میں زندہ ہوں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔“

بددو ملازم ان کے درمیان آگیا۔ نوشی اسے ڈانٹنے اور دھماکنے لگی کہ وہ درمیان سے ہٹ جائے لیکن وہ ہٹ نہیں رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ نوشی پر ایسی کیفیت طاری ہے کہ اپنے منگیترا کے سینے میں تلوار اتار ہی دے گی۔ نوشی منگیترا کو مقابلے کے لئے لٹکایا رہی تھی لیکن منگیترا تلوار نیام سے نکال ہی نہیں رہا تھا۔ ملازم نے ایک طرف ہو کر

نوشی کے تلوار والے ہاتھ کی کلائی پکڑ لی۔ وہ کلائی چھڑانے لگی تو منگیتر کو اس پر قابو پانے کا موقع مل گیا۔ اس نے پیچھے ہو کر نوشی کی کمر میں بازو ڈالے اور اسے جکڑ لیا۔ نوشی آزاد ہونے کو ترپنے لگی۔

”چھوڑ دو اسے!“ — ایک آواز گرجی۔

تینوں بے حس و حرکت ہو گئے اور جہاں تھے وہیں رہے۔ پھر آہستہ آہستہ سیدھے ہو کر اس طرف دیکھنے لگے جدھر سے آواز آئی تھی۔

○

وہ ایک گھوڑ سوار تھا۔ کالی داڑھی سلیقے سے تراشی ہوئی تھی۔ عمر پینتیس سال کے لگ بھگ اور وہ تو مندور و زائد آدمی تھا۔ اس کا لباس ایسا تھا جیسا بدوؤں کے سردار اور سرکردہ افراد پہنا کرتے تھے۔ اس کی وجاہت ایسی تھی کہ دیکھنے والے پر اثر انداز ہوتی تھی۔

اس کی شخصیت نوشی اور اس کے منگیتر پر کچھ ایسی اثر انداز ہوئی کہ نوشی نے تلوار نیچے کر لی اور اسے کچھ حیرت سے دیکھنے لگی۔ اس کے منگیتر پر بھی ایسا ہی اثر ہوا تھا۔ وہ بھی چپ چاپ اس شخص کو دیکھنے لگا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ ان دونوں پر اس شخص کا رعب طاری ہو گیا ہے۔ بدو بے چارہ تو تھا ہی ملازم اس لئے وہ الگ ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

گھوڑ سوار ان کے قریب آیا اور ان کے ارد گرد خاموشی سے گھوما اور انہیں دیکھتا رہا۔ آخر اس نے گھوڑا روکا اور نوشی سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔

نوشی جیسے اچانک بیدار ہو گئی ہو۔ اس نے فخریہ لہجے میں اسے بتایا کہ وہ ایک جرنیل کی بیٹی ہے اور اس کا تعلق ہرقل کے شاہی خاندان سے ہے۔

”یہ میرا منگیتر ہے“ — نوشی نے جواب دیا — ”یہ فوج میں عہدے دار ہے اور یہ ہمارا ملازم ہے۔“

”مجھے تمہارے معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں ہونا چاہئے“ — اس شخص نے گھوڑا روک کر کہا — ”لیکن میں نے کچھ اور دیکھا تھا۔ میں اس لئے دخل دے رہا ہوں کہ تم لوگ میرے علاقے میں ہو اور میرا فرض ہے کہ جو کوئی مصیبت میں ہو اس کی مدد کروں.... اے لڑکی! تم شاہی خاندان کی لڑکی ہو یا کسی غریب آدمی کی بیٹی، مجھے

اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم پر یہ دونوں زبردستی کر رہے تھے۔ کیا تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے؟“

”ہو سکتا ہے تم میری کچھ مدد کر سکو“ — نوشی نے کہا — ”یہ دونوں مجھ پر ویسی زبردستی نہیں کر رہے تھے جو تم سمجھ رہے ہو۔ یہ مجھے واپس اپنے ماں باپ کے پاس لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ میرے دشمن نہیں۔“

”پہلے میری بات کا جواب دو“ — نوشی کے منگیتر نے اس آدمی سے پوچھا — ”تم کون ہو؟.... میں تمہیں اس قابل سمجھتا ہوں کہ تمہاری عزت کروں۔ میں تمہارے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں کہ تم اس لڑکی کی مدد کے لئے رک گئے ہو۔“

”کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہم بیٹھ کر اور آرام سے بات کریں؟“ — اس آدمی نے کہا۔ یہ تینوں اور وہ آدمی اپنے گھوڑے کھلے چھوڑ کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ ”میرا نام سیلی نوش ہے“ — اس اجنبی نے کہا — ”میں اصلاً مصری بدو ہوں اور عیسائیت میرا مذہب ہے۔ میں اپنے قبیلے کا سردار تو نہیں ہوں لیکن تمام قبیلوں کے سردار میری عزت اس طرح کرتے ہیں جیسے میں سب کا سردار ہوں۔“

”تم کس کے وفادار ہو؟“ — نوشی نے پوچھا — ”اپنے بدوؤں کے یا شاہ روم کے؟“

”شاہ روم کو میں اپنا بادشاہ سمجھتا ہوں“ — سیلی نوش نے جواب دیا — ”یہ نہ سمجھنا کہ تم نے کہا ہے کہ تم شاہی خاندان کی لڑکی ہو تو میں نے تمہارے ڈر سے اپنی وفاداری بتائی ہے۔ میں شاہ روم ہرقل کا وفادار ہوں اور اس کی عیسائیت کو مانتا ہوں۔“

”میں نہیں مانتی“ — نوشی نے کہا — ”تم شاہ روم کے وفادار ہوتے تو تمہارے قبیلے کے تمام جوان آدمی شاہ روم کی فوج میں ہوتے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ مسلمانوں نے عریش کے بعد فرما پر بھی قبضہ کر لیا ہے؟.... میں تمہیں یہ بھی بتا دیتی ہوں کہ فرما کی فوج کی کمان میرے باپ کے ہاتھ میں تھی۔ یہ بھی سن لو کہ میں اپنے باپ اور اپنے اس منگیتر کو بزدل اور بھگوڑا سمجھتی ہوں۔“

”میں نے اپنی وفاداری کی بات کی ہے“ — سیلی نوش نے کہا — ”بدوؤں کے قبائل کی اپنی اپنی سوچ ہے۔ بہت عرصہ پہلے انہیں حکم دیا گیا تھا کہ فوج میں شامل ہو جائیں لیکن بدوؤں نے انکار کر دیا۔ وہ آزاد لوگ ہیں، کسی کا حکم نہیں مانتے۔ انہیں تم

اپنے راستے پر چلانا چاہو گی تو اس طریقے سے بات کرو گی جو ان کے دلوں کو اچھی لگے گی۔ اگر انہیں اپنی رعایا سمجھ کر موسیٰوں کی طرح ہانکنا چاہو گی تو وہ تمہارے پیچھے نہیں چلیں گے۔“

”کیا تمہیں معلوم ہے“۔ نوشی نے پوچھا۔ ”کہ ساڑھے تین چار ہزار بدو مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہو گئے ہیں....“

”مجھے معلوم ہے“۔ سیلی نوش نے نوشی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”کوئی ایسے آدمی پیدا کرو جو مسلمانوں کی طرح بات کرنا جانتے ہوں اور ان کا رویہ مسلمانوں جیسا ہو.... پہلے یہ بتاؤ تم کتنا کیا چاہتی ہو پھر یہ بتاؤ کہ تمہارا یہ منگیتر بات کیوں نہیں کرتا؟“

”یہ بھی بات کرے گا“۔ نوشی نے اپنے منگیتر کے متعلق کہا۔ ”پہلے مجھ سے سن لو کہ میں کیا چاہتی ہوں.... میں بدوؤں کی ایک فوج بنانا چاہتی ہوں۔ میرا یہ ملازم مجھے اپنے ساتھ لایا ہے۔ یہ انہی بدوؤں کے ایک قبیلے کا فرد ہے۔ یہ مجھے ایک جادوگر ہاموں کے پاس لے جا رہا ہے اور کہتا ہے کہ بدو اسے مانتے ہیں۔ کیا اس مسئلے میں میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟“

”میں ہاموں کو جانتا ہوں“۔ سیلی نوش نے کہا۔ ”کہو گی تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ میں اس لئے تمہارے ساتھ چلوں گا کہ میری وفاداری رومیوں سے ہے۔“

نوشی نے سیلی نوش کے ساتھ وہ ساری باتیں کیں جو وہ اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ اور پھر منگیتر کے ساتھ اور بدو ملازم کے ساتھ بھی کر چکی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ کس طرح اس ملازم کو ساتھ لے کر اپنے خاندان سے نظر بچا کر الگ ہوئی اور چھپتی چھپاتی اس طرف آگئی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ منگیتر کس طرح اس کے پیچھے آیا اور یہاں آکر اسے آن لیا۔

”یہ لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں“۔ نوشی نے کہا۔ ”یہ بیچارہ تو میرا ملازم ہے اس لئے میرا ساتھ دے رہا ہے لیکن منگیتر مجھے واپس لے جانے آیا تھا۔ میں سلطنت روم کی آن پر اپنی محبت ہی نہیں اپنی جان بھی قربان کر دوں گی۔ تم سوچو ملک شام ہم سے چھن گیا ہے اور مسلمان مصر کا دوسرا بڑا شہر بھی ہم سے لے چکے ہیں۔ ہم جب تک قوی جذبے کی شدت سے پاگل نہیں ہو جائیں گے ان مسلمانوں کو جو دراصل عرب

کے بدو ہیں، پیچھے نہیں دھکیل سکیں گے۔ ان سے ہمیں ملک شام بھی لینا ہے۔“

”آفریں!“۔ سیلی نوش نے کہا۔ ”تمہارے اس جذبے کی قدر صرف میں کر سکتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ بدوؤں کی ایک فوج تیار ہو جائے گی لیکن پہلے ہاموں کے ساتھ بات کرنی ہو گی۔“

”میں پہلے زبردستی والی بات صاف کر دوں“۔ نوشی نے کہا۔ ”میرے قوی جذبے کی شدت کا یہ عالم ہے کہ میں نے تلوار نکال لی تھی اور تم نہ آجائے تو میں منگیتر کو قتل کر دیتی یا اس کے ہاتھوں قتل ہو جاتی۔ ان دونوں نے مجھ سے تلوار چھیننے کے لئے مجھے جکڑ لیا تھا اور تم آگئے۔“

”دیکھ شہزادی!“۔ سیلی نوش نے کہا۔ ”ان کا تم پر یہ جبر غلط نہیں تھا۔ جس کام کے لئے تم آئی ہو یہ تم جیسی ایک لڑکی کے بس کی بات نہیں۔ تمہاری عمر اور تمہارا حسن ایسا ہے کہ ہمارے کسی مذہبی پیشوا کی نیت بھی خراب ہو سکتی ہے۔ قبیلوں کے سردار آسمان سے اترے ہوئے فرشتے نہیں.... اب تمہارا منگیتر بھی آگیا ہے اور میں بھی آگیا ہوں۔ میں جانتا کہ میں رہا تھا لیکن مجھ میں بھی وہ جذبہ ہے جو تمہیں پاگل کئے ہوئے ہے۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔“

”کام دو ہیں“۔ نوشی نے کہا۔ ”ایک یہ کہ ان بدوؤں کو رومی فوج میں لانا ہے اور دوسرا کام یہ کہ جو بدو مسلمانوں کے پاس چلے گئے ہیں انہیں مسلمانوں کے خلاف بدظن کر کے واپس لانا ہے۔“

”یہ دوسرا کام آسان نہیں“۔ سیلی نوش نے کہا۔ ”اس کے لئے ہمیں اپنے کچھ آدمی وہاں بھیجے پڑیں گے جو یہ ظاہر کریں گے کہ وہ مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہونے کے لئے آئے ہیں اور وہ مسلمانوں کے کردار سے بہت ہی متاثر ہیں۔ پھر یہ آدمی درپردہ ایسے حالات پیدا کر لیں گے جو بدوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بدظن کریں گے۔“

اس کے بعد سیلی نوش نے ایسی دانشمندانہ باتیں کیں کہ نوشی اور اس کا منگیترا اس سے پوری طرح متاثر ہو گئے اور منگیتر نے نوشی کو واپس لے جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور سیلی نوش کے ساتھ جانے پر تیار ہو گیا۔

”تم فوج میں عمدے دار ہو اور شاہی خاندان کے فرد بھی ہو“۔ سیلی نوش نے

ہیں۔ اب انہیں بدو ملازم کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن ہامون کا ٹھکانہ صحیح طور پر اسے ہی معلوم تھا۔

○

ہامون کے ٹھکانے تک پہنچتے شام ہو گئی۔ وہ بڑے جانوروں کی کھالوں کا بنا ہوا خیمہ تھا جو عام قسم کے خیموں سے دو گنا کشادہ تھا۔ خیمے کے باہر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا جس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا، آنکھیں لال سرخ اور دانت زردی مائل تھے۔ اس کے چہرے پر کراہت اور نحوست کا تاثر تھا جسے چھپایا نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے سر کے بال شانوں تک آئے ہوئے تھے اور اس نے سر پر بڑا ہی میلا اور بد رنگ سا کپڑا باندھ رکھا تھا۔ دو آدمی اس کے پاؤں میں بیٹھے اس کی ٹانگیں دبا رہے تھے۔ یہ تھا وہ شخص ہامون جو ان بدوؤں کا پیر و مُرشد بنا ہوا تھا۔

سیلی نوش، نوشی، اس کا منگیترا اور بدو ملازم اس کے سامنے گئے اور بک گئے۔ بدو ملازم نے جھک کر اسے سلام کیا۔ ہامون نے انہیں اس طرح دیکھا جیسے وہ خود نہیں بلکہ یہ چاروں حقیر اور قابل نفرت انسان ہوں۔

”اے ہامون!“ — سیلی نوش نے کہا — ”میں تیرے لئے مہمان لایا ہوں۔ یہ کوئی عام لوگ نہیں بلکہ یہ شاہی خاندان کے لوگ ہیں۔ یہ لڑکی شہزادی ہے اور یہ اس کا منگیترا ہے اور یہ فوج میں عمدے دار ہے اور یہ شخص ان کا ملازم ہے۔“

ہامون نے ہاتھ سے اشارہ کیا جو یہ تھا کہ زمین پر بیٹھ جاؤ۔ اس کے انداز میں شاہی خاندان کا ذرا سا بھی احترام معلوم نہیں ہوتا تھا۔ چاروں زمین پر بیٹھ گئے۔

”کوئی بادشاہ ہو یا بھکاری، یہاں آکر سب ایک ہوتے ہیں“ — ہامون نے جھومتی ہوئی سی آواز میں کہا — ”ہر قل بادشاہ ہے لیکن رومی بادشاہی کا رس صحراؤں کی ریت نے چوس لیا ہے.... کہاں ہے ہر قل؟.... اس نے اپنی شہزادی کو کیوں بھیجا ہے؟“

”ہم سے پوچھ ہامون!“ — سیلی نوش نے کہا — ”ہم یہی معلوم کرنے آئے ہیں کہ رومی بادشاہی کو ریت کے ڈنوں نے چوس لیا ہے اور باقی جو رہ گئی ہے کیا وہ نیل کے دریا میں ڈوب تو نہ جائے گی؟“

”ریت کی آندھی جو عرب سے اٹھی ہے وہ نیل تک پہنچ رہی ہے“ — ہامون نے کہا — ”ہر قل برنظیہ میں بیٹھا حکم چلا رہا ہے، مقوقس اور اطربون سکندریہ میں بیٹھے

نوشی کے منگیترا سے کہا — ”تم وہ باتیں بھی جانتے ہو گے جو فوج کے بعض بڑے افسروں کو بھی معلوم نہیں ہوتیں۔ میں تم سے کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ میں حیران ہوں کہ عریش کے بعد مسلمانوں نے فرما جیسا شہر بھی فتح کر لیا ہے جس کے متعلق اب تک یہی سنا جا رہا تھا کہ اس شہر کو کوئی طاقت فتح نہیں کر سکتی کیونکہ یہ پاڑی پر آباد کیا گیا ہے، اور اس کی ایک نہیں کئی قلعہ بندیاں ہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد بہت ہی تھوڑی ہے اور اگر تین ساڑھے تین ہزار بدو ان سے جا ملے ہیں پھر بھی رومی فوج اتنی زیادہ ہے کہ مسلمانوں کی یہ تھوڑی سی فوج رومی فوج کے سائے میں گم ہو جاتی ہے!“

”اس شکست کی ایک وجہ ہے“ — منگیترا نے کہا — ”مقوقس اور اطربون نے یہ سوچا ہے کہ مسلمانوں کو اور آگے آنے دیا جائے۔ اس سے یہ حملہ آور اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے کہ مصر کو فتح کر لینا کوئی مشکل کام نہیں....“

نوشی کے منگیترا نے وہ تمام وجوہات تفصیل سے بیان کیں جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اس نے ایک بات یہ بھی بتائی کہ رومی فوج کو ایک ذمہ داری یہ بھی سونپی گئی ہے کہ وہ قطعی عیسائیوں پر نظر رکھے کیونکہ خطرہ ہے کہ وہ بغاوت کر دیں گے۔ اس طرح رومی فوج سارے ملک میں بکھر گئی ہے جو ایک کمزوری ہے۔

”اس سے آگے بلیس ایک اور بڑا شر ہے“ — سیلی نوش نے کہا — ”کیا اس شہر کا دفاع بھی کمزور رکھا جائے گا تاکہ مسلمان اور آگے آجائیں؟“

”شاید نہیں!“ — منگیترا نے جواب دیا — ”جہاں تک میں جانتا ہوں، بلیس مسلمانوں کے لئے ایک پھندہ ہو گا جس میں وہ آکر نکل نہیں سکیں گے۔ وہاں مقوقس یا اطربون فوج کی قیادت سنبھالے گا.... مسلمانوں کو پیچھے سے کمک نہیں مل رہی۔ وجہ معلوم نہیں۔ ہم مدینہ تک اپنے جاسوس بھیج رہے ہیں جو وہاں کی کمزوریاں بھی بتائیں گے۔“

نوشی کا منگیترا سیلی نوش سے اس قدر متاثر ہو گیا تھا کہ اس نے کچھ گہرے راز کی فوجی باتیں بھی اسے بتا دیں۔ سیلی نوش کا انداز ایسا تھا جیسے وہ جنگی اور سیاسی امور کو بروی اچھی طرح سمجھتا ہے۔

بہت سی باتیں کہہ سن کر سیلی نوش نے انہیں کہا کہ چلو اب ہامون کے پاس چلتے

اپنی تباہی کا تماشا دیکھ رہے ہیں، پھر اس آندھی کو کون روکے گا؟“

”تو روکے گا ہامون!“ — سیلی نوش نے کہا — ”ہم تیرے پاس یہی فریاد لے کر آئے ہیں.... جو بات تو نے کسی ہے کہ سب دور بیٹھے تماشا دیکھ رہے ہیں یہی بات اس شہزادی کے دل میں ہے اور اس کے دل کو جلا رہی ہے۔ یہ اپنی ایک فوج بنانا چاہتی ہے جس میں اس علاقے کے بدو شامل ہوں گے.... ذرا غیب کے پردوں کے پیچھے جھانک اور بتا کہ اس میں اس شہزادی کو کامیابی ہوگی یا نہیں یا سلطنتِ روم کے لئے ان سیاہ پردوں کے پیچھے کیا ہے!“

”جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے“ — ہامون نے مخمور سی آواز میں کہا — ”کبھی تو میرا حال ایسا ہو جاتا ہے کہ کچھ جانتا چاہتا ہوں تو کچھ سراغ نہیں ملتا۔ زمین بھی چپ اور آسمان بھی چپ رہتا ہے۔ بعض پردے سفید ہوتے ہیں۔ اٹھاؤ تو ان کے پیچھے ساری فضا اور ہر چیز سیاہ کالی ہوتی ہے اور بعض پردے سیاہ کالے ہوتے ہیں، ہٹاؤ تو ان کے پیچھے صبح کے دودھ جیسے سفید اجالے نظر آتے ہیں.... اندر چلو۔“

ہامون اٹھا اور خیمے کے اندر چلا گیا۔ سیلی نوش، نوشی اور اس کا منگیتر بھی اس کے پیچھے خیمے میں چلے گئے اور سب کے بعد بدو ملازم بھی جھکا جھکا سا خیمے میں گیا اور اپنے آقاؤں کے پیچھے زمین پر بیٹھ گیا۔ ان چاروں نے خیمے میں لگائیں دوڑائیں تو انہیں یوں لگا جیسے کسی بڑے ہی پُر اسرار اور دُراؤنے ماحول میں آگے ہوں جس کا اس زمین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ تاثر یہ پیدا ہوتا تھا جیسے یہ خیمہ نہ زمین پر ہے نہ آسمان پر بلکہ زمین اور آسمان کے درمیان پھیلے ہوئے خلا میں معلق ہے اور یہ ان جیسے انسانوں کا ٹھکانہ نہیں۔

یہ ہامون کی دنیا تھی۔ خیمے میں پانچ چھ خشک انسانی کھوپڑیاں لٹک رہی تھیں۔ خیمے کے کچھ حصے میں ہامون نے زمین پر لگا رکھ کر اپنے بیٹنے کی جگہ بنا رکھی تھی۔ دو انسانی کھوپڑیاں اور بازوؤں کی تین چار ہڈیاں وہاں بھی رکھی تھیں اور کچھ اور سامان بھی تھا اور سب سے زیادہ خوفناک چیز ایک سیاہ کالا ناگ تھا جو کھلی ہوئی نوکری سے باہر نکل رہا تھا۔

ہامون اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ نوکری سے لٹکتا ہوا ناگ اس کی گود میں سے گزرنے لگا لیکن آگے جانے کی بجائے اس نے پھن پھیلایا اور اس کی گود میں جھونسنے لگا۔ ہامون

کے دائیں طرف ایک کالا پردہ لٹک رہا تھا۔ ہامون نے یہ پردہ ایک چھڑی سے دھکیل کر ہٹا دیا اور اس کے پیچھے سے جو چیز برآمد ہوئی وہ دیکھ کر نوشی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ انسانی ہڈیوں کا مکمل ڈھانچہ تھا۔

”مت ڈر شہزادی!“ — ہامون نے کہا — ”کبھی تیرا بھی یہ حسین و جمیل جسم اسی حالت میں لوگوں کے سامنے آئے گا اور دیکھنے والے سوچیں گے یہ کون تھا؟ وہ خود ہی اپنے آپ کو جواب دیں گے کہ یہ کوئی انسان ہی تھا.... یہ ڈھانچہ مجھے میرے استاد نے دیا تھا اور میرے استاد کو اس کے استاد نے دیا تھا اور روایت یہ چلی آرہی ہے کہ یہ کبھی مصر کی ملکہ ہوا کرتی تھی۔ اس کا شغل میلہ یہ تھا کہ ایک تو انسانوں کو قتل کر دیا کہ ان کے ترپنے کا، خون بننے کا اور آخری سانس نکل جانے کا تماشا دیکھا کرتی تھی۔ پھر اس کا ایک شغل اور بھی تھا۔ کسی غلام کو ساری رات اپنے ساتھ رکھتی اور صبح اسے خنجر دے کر کہتی کہ اس سے اپنا پیٹ اس طرح چاک کر لو کہ سب کچھ باہر آجائے۔ غلام اس حکم کی تعمیل کرتا اور ملکہ کی تفریح طبع کا ذریعہ بنتا تھا۔ آخر یہ اپنے ایک غلام کے ہی ہاتھوں اس انجام کو پہنچی۔ اس غلام نے ساری رات ملکہ کے ساتھ گزاری، لطف اندوز ہوا اور صبح جب ملکہ نے اسے اپنا خنجر دے کر کہا کہ اپنا پیٹ چاک کر لو تو غلام نے خنجر لیا اور ملکہ کا پیٹ چاک کر دیا۔ اس کے پیٹ سے سب کچھ باہر آگیا اور غلام اسے ترپا دیکھ کر قہقہے لگاتا رہا۔ ملکہ ترپ ترپ کر مر گئی تو غلام نے اپنا پیٹ چاک کر لیا.... آج اس ملکہ کو دیکھ لو“ — اس نے اس ڈھانچے کی طرف اشارہ کیا اور کہنے لگا — ”میں نے بڑی مشکل سے اس کی ہرج کا سراغ لگایا ہے اور کبھی کبھی اس کی روح کو بلایا کرتا ہوں۔“

ہامون کی یہ بات سننے والے تین آدمی اور ایک نوجوان لڑکی تھی۔ ان پر ایسا تاثر چھا گیا جیسے ان کی روہیں ان کے جسموں سے نکل گئی ہوں اور پیچھے گوشت پوست کے اکڑے ہوئے جسم رہ گئے ہوں۔ ایک تو بات ایسی تھی اور دوسرے ہامون کے سننے کا انداز ایسا تھا کہ سننے والوں پر بڑا ہی عجیب تاثر پیدا ہوتا تھا۔

”ایک بات بتاؤ گے ہامون!“ — نوشی نے دل مضبوط کر کے پوچھا — ”اس ملکہ کی روح کے ساتھ تمہاری کیا باتیں ہوتی ہیں!“

”بڑی لمبی باتیں ہوتی ہیں“ — ہامون نے کہا — ”ابھی میں تمہیں اس قابل نہیں

سمجھتا کہ ایک روح کی باتیں تمہیں سناؤں۔ سناؤں گا ضرور!.... تمہارے کام آئیں گی۔ اگر تم شہزادی ہو تو ملکہ بھی بن سکتی ہو۔ اس ملکہ کی روح نے مجھے بتایا تھا کہ ملکہ اتنی زیادہ خوبصورت تھی کہ اس کے حکم سے اپنا پیٹ اپنے ہاتھوں چاک کرنے والے نخر محسوس کرتے تھے کہ وہ اس ملکہ کے حکم کی تعمیل کر رہے ہیں۔ وہ تم جیسی ہی خوبصورت ہوگی۔ کوئی عورت ملکہ بھی اور تجھ جیسی حسین بھی ہو وہ اپنے آپ کو دیوی سمجھ کر خدا کو بھول جاتی ہے لیکن خدا اپنے کسی بندے کو نہیں بھولتا اور ہر بندے کے وہ اعمال بھی دیکھتا ہے جو بندہ اپنے آپ سے بھی چھپاتا پھرتا ہے۔ آج کا ہر قل کل بڑیوں کا ڈھانچہ ہو گا.... لمبی باتیں ہیں، بڑی لمبی باتیں.... تم اپنی بات کرو۔“

سیلی نوش نے نوشی کی ساری بات ہامون کو سنائی اور پھر اسے یاد دلایا کہ وہ بتائے کہ یہ لڑکی کامیاب ہوگی یا نہیں اور کامیابی نظر نہ آئے تو کیا کوئی ایسی صورت پیدا کی جاسکتی ہے کہ اسے کامیابی حاصل ہو؟

○

اُس وقت تک اتنا لمبا کالا ناگ ہامون کی گردن کے گرد ایک چکر لپٹ چکا تھا اور اس کا منہ دوسرے کندھے پر تھا۔ ناگ نے ہامون کے اشارے پر منہ اٹھا کر پھین پھیلا دیا جو اتنا ہی چوڑا ہو گیا جتنا چوڑا ہامون کا چہرہ تھا۔ اب تو ہامون اور ہی زیادہ خوفناک نظر آنے لگا تھا۔ ناگ کا باقی حصہ ہامون کی گود میں اکٹھا ہو گیا تھا اور کنڈلی مارنے کے انداز سے حرکت کر رہا تھا۔

ہامون نے ہاتھ لمبا کر کے ایک ڈنڈا اٹھایا جو کم و بیش دو فٹ لمبا اور دو اڑھائی انچ موٹا تھا۔ اس پر مختلف رنگوں کا کپڑا لپیٹا ہوا تھا اور اس کے ایک سرے پر مختلف پرندوں کے رنگ برنگے پر بندھے ہوئے تھے۔ ہامون نے اوپر دیکھنا شروع کر دیا۔ ذرا ہی دیر بعد اس کا جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے ڈنڈا اوپر کر دیا اور ڈنڈا بھی لرزنے لگا۔ یہ لرزہ یا رعشہ بڑھتا گیا اور ہامون آہستہ آہستہ اٹھنے لگا۔

وہ جب کھڑا ہو گیا تو اس کا جسم اتنی زور سے لرزنے لگا جیسے یہ شخص گر پڑے گا اور شاید زندہ نہ رہ سکے۔ اس کا سر پیچھے ہی پیچھے ہوتا جا رہا تھا اور اس طرح اس کا منہ پوری طرح آسمان کی طرف ہو گیا۔ ناگ اس کی گردن سے لپٹا ہوا تھا۔

ہامون نے دوسرے ہاتھ سے ناگ اپنی گردن سے الگ کرنا شروع کر دیا اور اس کا

جسم پہلے سے زیادہ کانپنے لگا۔ ہامون نے اس قدر زیادہ لرزتے ہوئے ہاتھ سے نہ جانے کس طرح ناگ کو پکڑ لیا اور اسے اپنے پیچھے ایک کالے کپڑے پر رکھ دیا۔ ناگ نے کچھ دیر ادھر ادھر ریگ کر سرائٹھایا اور پھین پھیلا دیا۔

”ہٹا دے پردہ!“ — ہامون نے منہ اور زیادہ اوپر کر کے بڑی بلند آواز میں کہا۔
”دکھا دے جو کچھ بھی ہے.... ہٹا دے پردہ!“

اس کے جسم نے اور ہی زیادہ تھرکنا اور لرزنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ وہ اپنا سر بڑی زور زور سے کبھی دائیں کبھی بائیں اور کبھی آگے اور پیچھے مارتا تھا۔ اس نے کچھ اور بھی کہا جو کوئی بھی نہ سمجھ سکا نہ یہ پتہ چلتا تھا کہ یہ کون سی زبان ہے۔ اب تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کوئی اور ہی غیر مرئی طاقت ہے جس نے ہامون کے بدن پر قبضہ کر لیا ہے اور یہ طاقت اس کے جسم کو توڑ پھوڑ کر پھینک دے گی۔ دیکھنے والوں پر خوف طاری ہوا جا رہا تھا۔

خاصی دیر بعد ہامون کا جسم سکون میں آنے لگا۔ تھرکنا کم ہوتا گیا پھر رعشہ سارہ گیا اور آخر جسم ساکن ہو گیا۔

ہامون کے چرے اور کچھ حرکات سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ ابھی نارمل حالت میں نہیں آیا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی ایسا تاثر تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دور کی کوئی چیز دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کبھی وہ ڈنڈے کو زور زور سے ہلاتا اور اسے ہوا میں اس طرح مارتا جیسے کسی آدمی یا جانور کو ڈنڈا مارا جاتا ہے۔ وہ بڑی تیزی سے پیچھے کو مڑا۔ اس کا ناگ سیاہ کپڑے پر ادھر ادھر ریگ رہا تھا۔

اس نے ڈنڈا سرے اوپر کیا اور اس طرح اوپر سے نیچے کو مارا جیسے وہ ناگ کو مارنا چاہتا ہو۔ اب ہامون کی پیٹھ ان لوگوں کی طرف تھی۔ اس نے ڈنڈے سے سانپ کو چھیڑا تو سانپ نے پھین پھیلا لیا۔

”بتا تو نے کیا دیکھا ہے!“ — ہامون نے ناگ سے پوچھا — ”جلدی.... صبح بول!“

”سب کچھ تاریک ہے“ — یہ آواز ہامون کی نہیں تھی بلکہ کسی چھوٹے سے بچے کی تھی یا کسی بوڑھی عورت کی۔

سیلی نوش، نوشی، اس کے منگیتر اور بڑو ملازم نے حیرت سے ایک دوسرے کی

طرف دیکھا۔

”پھر دیکھ!“ — ہامون نے ناگ سے کہا — ”میں نے پردے اٹھا دیے ہیں۔ جو تو دیکھ سکتا ہے وہ میں نہیں دیکھ سکتا.... پھر دیکھ!“

ہامون بار بار ڈنڈے کا وہ سرا جس پر پرندوں کے رنگ برنگ پر بندھے ہوئے تھے ناگ کے پھن کے قریب لے جا کر زور زور سے ہلاتا تھا اور اسی زوردار طریقے سے ناگ پھن دائیں بائیں ہلاتا اور کبھی پیچھے لے جا کر ڈنڈے پر جھپٹتا تھا۔

”تاریکی میں ایک مدھم سی کرن نظر آتی ہے“ — پھر اسی بچے یا بوڑھی عورت کی آواز سنائی دی جو پہلے بھی سنائی دی تھی۔

ہامون نے دو تین مرتبہ پھر ناگ سے کچھ ایسے ہی سوالات پوچھے اور اسے جواب بچے یا بوڑھی عورت کی زبان سے ملے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ڈنڈا بڑی زور زور سے ہوا میں مارنے لگا۔ وہ اچھلتا بھی تھا اور اس کی حرکتیں پاگلوں جیسی تھیں۔

وہ اکڑوں بیٹھ گیا اور اب اس کا منہ ان لوگوں کی طرف تھا۔ اس نے سر جھکا لیا اور خاصی دیر بعد سر اٹھایا اور نوشی کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ اسے ہنسنے کی باندھ دیکھتا رہا پھر اٹھا اور نوشی کے سر سے ایک بال اکھاڑ لیا۔ واپس اپنی جگہ گیا۔ قریب پڑی ایک انسانی کھوپڑی اٹھا کر اپنے سامنے رکھی اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر نوشی کے بال پر پھونک ماری اور بال کھوپڑی کے سر پر رکھ دیا۔

”تمہیں دو تین دن یہاں رہنا پڑے گا“ — ہامون نے انہیں کہا — ”ہو سکتا ہے ایک دو دن زیادہ رکنا پڑے۔ پورا جواب نہیں مل رہا۔ مل جائے گا۔ کامیابی صاف طور پر نظر نہیں آ رہی۔ میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا.... تمہارے رہنے کا انتظام موجود ہے۔ میں نے مہمانوں کے لئے خیمے لگا رکھے تھے۔ تمہیں پورا آرام ملے گا اور کھانے پینے کا انتظام بھی موجود ہے۔ شاہی محل والا آرام نہیں ملے گا، زمین پر سونا پڑے گا.... اب جاؤ باہر دو آدمی موجود ہیں، انہیں کوہ تمہیں مہمانوں والے خیموں میں لے جائیں گے۔

ہامون کے خیمے میں بڑے دیئے جل رہے تھے جن کی پہلی اور لرزتی روشنی میں ہامون پہلے سے زیادہ ڈراؤنا اور پراسرار نظر آ رہا تھا۔ وہ چاروں اٹھے اور خیمے سے نکل گئے۔ باہر جو دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے، وہ انہیں ایک طرف لے گئے۔ تقریباً ایک سو

قدم دور ایک سرسبز ٹیکری تھی جس کے قریب تین چار خیمے لگے ہوئے تھے۔ ان آدمیوں نے انہیں بتایا کہ یہ مہمانوں کے خیمے ہیں اور ان میں اپنا ٹھکانا بنالیں۔ دونوں آدمی یہ کہہ کر پھلے گئے کہ وہ ان کے لئے کھانا لائیں گے۔

○

اگلی صبح ہامون نے چاروں کو اپنے خیمے میں بلایا اور پھر وہی ہی حرکتیں کیں جیسی اس نے گذشتہ رات کی تھیں۔ اس روز تو وہ بالکل ہی پاگل ہو گیا تھا اور نظریہ آتا تھا کہ ہوش و حواس میں نہیں آ سکے گا۔ اسی کیفیت میں اس نے اپنے ناگ سے کچھ سوال پوچھے اور اسے اسی بچے یا بوڑھی عورت کی آواز میں جواب ملے۔ ایک بار اس نے غصے کی حالت میں ناگ کی گردن پکڑی اور اس کا منہ اپنے منہ میں ڈال کر زور زور سے جھنجھوڑا اور پھر اسے منہ سے نکال دیا۔

دو اڑھائی گھنٹے بعد اس نے ان چاروں سے کہا کہ وہ چلے جائیں اور سورج غروب ہونے کے بعد آئیں۔

وہ شام کے بعد ہامون کے خیمے میں گئے۔ اس شام خیمے میں دو کی بجائے چار دیئے جل رہے تھے۔ ہامون نے انہیں وہیں بٹھایا جہاں پہلے بٹھایا کرتا تھا۔ ہامون خود ان کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ وہی ڈنڈا اس کے قریب پڑا تھا جس پر رنگا رنگ کپڑے لپٹے ہوئے تھے اور ایک سرے پر پرندوں کے رنگ برنگ پر بندھے ہوئے تھے۔ اس نے ڈنڈا اٹھایا اور اس کے ساتھ ہی چاروں دیئے بجھ گئے۔

ہامون نے کسی انجینی زبان میں بڑے غصے میں کچھ کہا اور ڈنڈا زمین پر مارا۔ پہلے ایک دیا جلا۔ ہامون نے اسی زبان میں کوئی لفظ بولا تو دو سرا دیا جل اٹھا۔ اسی طرح باقی دو دیئے بھی باری باری جل اٹھے۔ پھر ہامون نے وہی حرکتیں شروع کر دیں لیکن اب اس کا انداز کچھ مختلف تھا۔

اس نے کہا کہ نوشی وہیں بیٹھی رہے اور باقی تینوں باہر نکل جائیں۔ تینوں آدمی خیمے سے نکل گئے اور خیمے کے پردے گر پڑے۔

کوئی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ہامون نے تینوں کو پکارا اور اندر بلایا۔ تینوں اندر چلے گئے۔

”یہ سارا معاملہ اس لڑکی کا ہے“ — ہامون نے کہا — ”مجھے اشارہ بھی مل گیا ہے

اور استاد کی روح نے بھی بتایا ہے کہ ایسی بات ہے ہی نہیں کہ یہ لڑکی جو چاہتی ہے اس میں فوراً کامیاب ہو جائے گی۔ میں نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا ہے۔ میں اپنی ذمہ داری پوری کروں گا لیکن اس لڑکی کو اپنے عمل میں شامل کرنا پڑے گا۔ وہ میں تمہاری موجودگی میں بھی کر سکتا ہوں لیکن نہیں کروں گا کیونکہ تم اس لڑکی کو اس حالت میں دیکھو گے تو کھو گے کہ یہ تو پاگل ہو گئی ہے اور پھر ہو سکتا ہے کہ اس کا یہ منگیتر لڑکی کو گھسیٹ کر باہر لے جائے۔ اگر اس کام میں کسی نے دخل اندازی کی تو اس کا تو کچھ نہیں بگڑے گا لیکن یہ ناگ مجھے اور اس لڑکی کو بھی دس لے گا اور ہمیں مرنے میں ایک دولٹے ہی لگیں گے۔“

”ہمیں تجھ پر اعتماد ہے۔“ سیلی نوش نے کہا۔ ”ہم میں سے کوئی بھی دخل نہیں دے گا لیکن یہ کام ہو جانا چاہئے۔ یہ لڑکی اور اس کا یہ منگیتر شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سے جو انعام مانگو گے تمہیں دے دیں گے۔“

”مجھے کوئی انعام نہیں چاہئے۔“ ہامون نے کہا۔ ”میری یہ دنیا جو تم خیمے کے اندر دیکھ رہے ہو، آباد رہنے دی جائے تو میرے لئے یہی انعام کافی ہے۔“

اُس رات نوشی کے ساتھیوں نے محسوس کیا کہ نوشی جو پہلے اتنا زیادہ بولتی تھی آج اس پر خاموشی طاری ہے اور وہ گہری سوچ میں چلی جاتی ہے۔ اس سے کسی نے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ سب جانتے تھے کہ وہ قوی جذبے کے معاملے میں کتنی حساس ہے اور سلطنت روم کی عظمت کو وہ اپنی ذاتی عزت اور آبرو سمجھتی ہے اور چونکہ اسے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا اس لئے پریشان رہنے لگی ہے۔

○

ایک اور دن گزر گیا اور پھر ایک رات آئی۔ وہ رات آدھی گزر گئی تھی۔ چاند نے زمین پر چاندنی بکیر رکھی تھی۔ سیلی نوش کی ویسے ہی آنکھ کھلی اور وہ خیمے سے نکلا کیونکہ کچھ گھبراہٹ سی محسوس کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ باہر ذرا بیٹھ کر پھر آکر سو جائے گا۔ وہ باہر نکلا تو اسے یوں نظر آیا جیسے کچھ دور درخت کے ساتھ کوئی بیٹھا ہوا ہے۔

سیلی نوش کی فطرت میں تجسس کچھ زیادہ پایا جاتا تھا۔ اس کا ایک مظاہرہ تو اس نے یہ کیا تھا کہ نوشی کے منگیتر اور ملازم کو اس نے نوشی سے کھتم گتھا دیکھا تو ان سے جا

پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور جب نوشی نے ساری بات واضح کی تو اس کے ساتھ چل پڑا کہ دیکھیں ہامون کیا کرتا ہے۔ اس رات اس نے کسی کو درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر بیٹھے دیکھا تو اس کی طرف چل پڑا حالانکہ وہ گہری نیند سے اٹھا تھا اور نیند اس پر غالب آرہی تھی۔

وہاں جا کر دیکھا تو وہ نوشی تھی جو ایکلی گہری سوچ میں کھوئی ہوئی بیٹھی تھی۔ سیلی نوش کو اپنے پاس دیکھ کر وہ چوکی نہیں بلکہ اس نے اطمینان کا اظہار کیا کہ سیلی نوش اس کے پاس آگیا ہے۔ اس نے سیلی نوش کو اپنے پاس بٹھالیا۔ سیلی نوش نے اس سے پوچھا کہ وہ یہاں کیوں آ بیٹھی ہے۔

”میں نہیں جانتی تم کیسے آدمی ہو۔“ نوشی نے کہا۔ ”میرے لئے یہ یقین کر لینا مشکل ہے کہ میں تمہیں اعتماد میں لوں یا نہ لوں۔“

”میرے ماتھے پر کچھ بھی نہیں لکھا۔“ سیلی نوش نے کہا۔ ”اتنا تو سوچ سکتی ہو کہ میں کہیں اور جا رہا تھا اور تمہاری باتیں سنیں تو تمہارے ساتھ یہاں تک آگیا۔ میرے گھر والے ڈھونڈ رہے ہوں گے کہ میں کہاں غائب ہو گیا ہوں۔ مجھے تم سے کوئی لالچ نہیں۔ کیا یہ کافی نہیں کہ تم مجھے اعتماد میں لو؟.... کیا تمہارے لئے یہ کافی نہیں کہ تمہارا منگیتر تمہارے اعتماد کا آدمی ہے؟“

”نہیں!“ نوشی نے کہا۔ ”اس سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔ اب میں تنہا ہوں۔ میرے پاس گھوڑا ہے، خیال آتا ہے یہاں سے بھاگ جاؤں۔“

”نوشی!“ سیلی نوش نے کہا۔ ”اب تو میں پوچھ کر ہی رہوں گا کہ وہ کیا بات ہے جس نے تمہیں اپنے منگیتر سے بھی بدظن کر دیا ہے!“

”پھر ایک وعدہ کرو۔“ نوشی نے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ جو بات بھی کروں گی وہ میرے منگیتر کو نہیں بتاؤ گے اور میرے ملازم کو بھی اس بات کا علم نہیں ہونا چاہئے۔“

سیلی نوش نے اسے یقین دلانے کے لئے کہ وہ اس کی بات کو اپنے دل میں دفن کر دے گا، ہمت کچھ کہا اور اسے بات کرنے پر آمادہ کر لیا۔

”مجھے اس ہامون جادوگر سے بچاؤ۔“ نوشی نے کہا۔ ”اس نے مجھے اپنے پاس تنہا بٹھا کر تم تینوں کو باہر نکال دیا تھا۔ اس نے اپنے اوپر کچھ اور ہی کیفیت طاری کر لی۔“

”کیا تم نے اپنے منگیتر کو نہیں بتایا؟“ — سیلی نوش نے پوچھا۔

”بتایا ہے“ — نوشی نے جواب دیا — ”لیکن وہ بے غیرت اور لالچی نکلا۔ اس نے کہا کہ اس میں کوئی گناہ نہیں، کوئی حرج نہیں، اس شخص کے ساتھ ایک رات بسر کر لو پھر تم ملکہ ہوگی اور میں بادشاہ ہوں گا۔ میں نے منگیتر کو بتادیا تھا کہ ہامون نے یہ بھی کہا ہے کہ مجھے ہر قتل مصر کا بہت بڑا حصہ دے دے گا جہاں میری بادشاہی ہوگی۔ یہ بات منگیتر کو بتائی تو وہ میرے پیچھے پڑ گیا کہ میں ہامون کی یہ بات پوری کر دوں۔ آج شام جب ہم ہامون کے خیمے سے یہاں آئے تو منگیتر کے ساتھ میری لڑائی ہو گئی۔ ہم دونوں نے اپنا خیمہ الگ رکھا تھا کہ راز و نیاز اور پیار و محبت کی باتیں کیا کریں گے لیکن وہ بالکل ہی کچھ اور نکلا.... تم بتاؤ سیلی نوش! میں بھاگ جاؤں یا اپنی جان اپنے ہاتھوں لے لوں!“

”اپنی جان کیوں لے لو؟“ — سیلی نوش نے کہا — ”دنیا اس منگیتر پر ختم نہیں ہو جاتی۔ میں تمہیں اب بتاتا ہوں جو میں تین چار روز پہلے سے محسوس کر رہا ہوں۔ کسی وقت میں بھی ہامون کی کرامات کو مانتا تھا لیکن اب نہیں۔ میں دیکھتا رہا ہوں کہ اس کی نظر صرف تم پر رہتی تھی۔ تم ہو بھی اتنی زیادہ خوبصورت اور اتنی دلکش کہ پردہت اور پوشوا بھی اپنی حیثیت اور اپنا مذہب بھول جائیں۔ یہ شخص ہامون مجھے صرف شعبہ باز لگتا ہے۔ وہ جو دیئے اپنے آپ ہی مجھ گئے اور جل اٹھے تھے، یہ ایک شعبہ بازی ہے۔ اب تم نے اس سے سارا پردہ ہی اٹھا دیا ہے۔ تم نے کہا ہے کہ میں تمہیں ہامون سے بچاؤں۔ میں تمہیں بچاؤں گا۔“

”کیا کرو گے؟“ — نوشی نے پوچھا۔

”یہ مت پوچھو“ — سیلی نوش نے کہا — ”یہ بتا دیتا ہوں کہ تم اپنی جان نہیں لو گی بلکہ ہامون کی جان لی جائے گی۔ اس کی جان کس طرح لی جائے گی، یہ میں تمہیں بتاؤں گا اور تم نے وہی کرنا ہے جو میں کہوں گا۔“

”مجھے ابھی بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے“ — نوشی نے پتائی سے کہا — ”تم شاید نہیں سمجھ سکتے کہ میں کیسی پریشان کن صورت حال میں پھنس گئی ہوں۔ میں نے تمہیں اپنے منگیتر کی ذہنی حالت نہیں بتائی۔ وہ تو مرنے مارنے پر آمرا ہوا ہے۔ کتا ہے ہامون کی فرمائش پوری کرو۔“

کبھی میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تمام کر میری آنکھوں میں جھانکتا اور ایک باز یہ اپنا منہ میرے منہ کے اتنی قریب لے آیا کہ اس کی پیشانی میری پیشانی کے ساتھ لگ گئی۔ اس کے منہ سے مجھے جو بدبو آئی اس سے معلوم نہیں میں بے ہوش کیوں نہ ہو گئی۔ اس کی سانسیں اتنی گرم کہ میرے چہرے پر جلن محسوس ہونے لگی۔ اچھا ہوا کہ اس نے اپنا منہ جلدی پیچھے کر لیا۔ پھر اس نے کچھ عجیب و غریب حرکتیں کیں جو میری سمجھ سے باہر تھیں....

”پھر یہ اپنے ناگ کے پاس جا بیٹھا اور میری طرف پیٹھ کر لی۔ اس نے ناگ سے کچھ پوچھنا شروع کر دیا۔ مجھے تو یوں پتہ چل رہا تھا جیسے ناگ اسے جواب دے رہا ہے۔ آواز ویسی ہی تھی جو تم نے بھی سنی ہے۔ آخر ناگ نے اسی باریک اور کانپتی سی آواز میں کہا کہ یہ لڑکی تھوڑی سی قربانی دے دے تو یہ ملکہ بنے گی اور وہ سب کچھ پائے گی جو یہ چاہتی ہے....

”ناگ سے کچھ اور باتیں کر کے اس نے منہ میری طرف کیا اور مجھے اپنے قریب بلایا۔ میں اس کے سامنے بالکل قریب جا بیٹھی۔ اس نے اپنے ہی انداز اور لہجے میں کچھ اور باتیں کیں اور آخر بات کو یہاں پر لے آیا کہ میں اس کے ساتھ بالکل ہر بند ہو کر ایک رات گزاروں تو میرا عزم مکمل کو پہنچ جائے گا۔ اس نے کہا کہ مجھے تمہارے اس حسن اور اس دلکش جسم کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں لیکن اس غیبی طاقت کا جس کے قبضے میں میں ہوں حکم ہے کہ تم دونوں کے جسم ایک ہو جائیں اور دونوں کی روحیں اوپر جائیں پھر ہر مشکل آسان ہو جائے گی اور ہر ارادہ پورا ہو گا۔“

”میں جان گیا ہوں“ — سیلی نوش نے کہا — ”یہ شخص جو چاہتا ہے وہ میں سمجھ گیا ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہارا کیا خیال اور کیا ارادہ ہے۔“

”تمہیں یاد ہو گا میں پہلے کیا کہتی رہی ہوں“ — نوشی نے کہا — ”میں یہ کہتی رہی اور اب بھی کہوں گی کہ میں سلطنت روم کی عظمت پر اپنی جان قربان کر دوں گی لیکن سیلی نوش! میں عصمت قربان نہیں کر سکتی۔ میں اپنی آبرو کو اپنے منگیتر کی امانت سمجھتی ہوں۔ میرا مذہب اجازت نہیں دیتا کہ اپنی عصمت کسی کو دے دوں خواہ وہ میرا ملک ہی کیوں نہ ہو۔ اگر گناہ ہی کرنا ہے تو کیا اس بدبودار اور منحوس اور مکروہ آدمی کے ساتھ کیا جائے؟“

”کرتا یہ ہے“ — سیلی نوش نے کہا — ”آج رات ہامون کے خیمے میں چلی جانا۔ اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ تم رضامند نہیں ہو۔“

”مجھے مشکل میں نہ ڈالو سیلی نوش!“ — نوشی نے کہا — ”وہ فوراً مجھے برہنہ ہو جانے کو کہے گا۔ وہ پہلے ہی مجھے ہتھکڑیاں پہنے گا کہ میں اس کے پاس جاؤں گی تو وہ کیا کرے گا۔“

”وہ کہے بھی تو برہنہ نہ ہوتا“ — سیلی نوش نے کہا — ”ہو سکتا ہے وہ زبردستی تمہارے کپڑے اتارے گا لیکن گھبرانا نہیں، تمہارا جسم بنگا نہیں ہوگا۔“

ایک طرف تو نوشی اس قدر جرات مند اور جوش و جذبے والی تھی کہ صرف ایک ملازم کو ساتھ لے کر فرما سے چل پڑی اور دشت و جبل سے گزرتی اُن دیکھے اجنبی بڈوؤں کے علاقے میں جا پہنچی تھی اور اب اس کا یہ حال کہ دل پر خوف طاری تھا اور وہ مدد اور ہٹائیوں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ سیلی نوش کو اس نے اپنا امراز اور ہمدرد تو بنا لیا تھا لیکن اسے پوری طرح یقین نہیں آیا تھا کہ سیلی نوش اس کے حق میں مخلص ہے لیکن ڈوبے کو تنکے کا سہارا ڈھونڈنے والی بات تھی، اس نے یہ خطرہ مول لے لیا کہ ایک ایسے شخص کو اعتماد میں لے لیا جو بڈو تھا اور ہامون کی جادوگری کو مانتا تھا۔ یہ شخص سیلی نوش اسے دھوکہ دے سکتا تھا اور یہ خطرہ بھی کہ نوشی پر اس کی بھی نیت خراب ہو سکتی تھی۔ مختصر یہ کہ نوشی کا لاپتہ ہو جانا صاف نظر آ رہا تھا۔

نوشی وہاں سے انٹھی اور اپنے خیمے کی طرف چل دی۔ نوشی اور اس کے منگیترا کا خیمہ سیلی نوش کے خیمے کے قریب ہی تھا لیکن نوشی ذرا چکر کاٹ کر اپنے خیمے کی طرف جا رہی تھی۔ سیلی نوش سیدھا اپنے خیمے میں آگیا۔

نوشی نے ابھی آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ اچانک اس کا منگیترا اس کے سامنے آ گیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو نوشی کو غائب پایا اور اس کے پیچھے خیمے سے نکل گیا تھا۔ رات چاندنی تھی اس لیے اس نے نوشی کو سیلی نوش کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔

”آدھی رات کے وقت اس بڈو کے پاس کیوں گئی تھی؟“ — منگیترا نے حکم کے لہجے میں پوچھا۔

نوشی نے اسے صبح بات بتادی اور کہا کہ وہ اپنی آبرو قربان نہیں کرے گی۔
”یہ بات تم دن کے وقت بھی اس کے ساتھ کر سکتی تھیں“ — منگیترا نے کہا۔

”تم ان بڈوؤں کی ملکہ بننا چاہتی ہو اور اس کے لئے یہ بڈو سیلی نوش تمہیں موزوں آدمی نظر آیا ہے۔“

نوشی پہلے ہی پریشانی اور تذبذب میں مبتلا تھی، منگیترا کی یہ بات سن کر اور اس کا تحکمانہ انداز دیکھ کر جل انٹھی اور اس کے دل سے اس منگیترا کی محبت نکلنے لگی۔

”میں جہاں جاؤں گی وہاں شہزادی اور ملکہ ہی ہوں گی“ — نوشی نے کہا — ”شاہ ہر قل کا خاندان میری پہچان ہے۔ اس خاندان کے ساتھ تمہارا تعلق بہت دور کا ہے۔ میں چاہوں تو تمہیں دھتکار بھی سکتی ہوں لیکن یہ چاہتی ہوں کہ تم اپنا رشتہ درست کر لو اور مجھ پر گھٹیا الزام نہ لگاؤ۔“

دونوں کی جذباتی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ انہوں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ ایک دوسرے کی غلط فہمیاں دور کر کے صلح جوئی کی بات کریں۔ نوشی کے الفاظ سن کر اور اس کا انداز دیکھ کر منگیترا آگ بگولہ ہو گیا اور اس نے اس قسم کی دھمکی دے دی کہ وہ سیلی نوش کو قتل کر دے گا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ بڈو ان کی رعایا ہیں۔

نوشی خود سر اور باغی فطرت کی شہزادی تھی۔ اس نے منگیترا کی دھمکی کو چیلنج سمجھ لیا اور کہا کہ وہ سیلی نوش کو قتل نہیں کرے گا، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ سیلی نوش کے ہاتھوں قتل ہو جائے۔

نوشی نے منگیترا کو اس سے آگے بولنے کا موقع ہی نہ دیا اور وہاں سے تیز قدم چل پڑی۔ اپنے خیمے تک پہنچی تو سیلی نوش اپنے خیمے کے باہر کھڑا تھا۔ اس نے نوشی سے پوچھا کہ وہ اتنی دیر بعد کیوں آئی ہے۔ نوشی نے اسے بتا دیا کہ وہ کیوں دیر سے آئی ہے اور منگیترا کے ساتھ اس کی جو باتیں ہوئی تھیں سنا دیں۔

”تم دو بڑے وزنی پتھروں کے درمیان آگئی ہو نوشی!“ — سیلی نوش نے کہا۔
”اپنے آپ کو تنہا سمجھنا۔ کل رات ہامون کے خیمے میں چلی جانا۔ باقی کام میرا ہے۔“
نوشی ابھی سیلی نوش کے ساتھ باتیں کر رہی تھی کہ اس کا منگیترا آگیا اور نوشی کو حکم دیا کہ وہ اپنے خیمے میں آئے۔ وہ شاید بھول گیا تھا کہ نوشی کس قدر سرکش اور خود سر لڑکی ہے۔

”میں تمہارے حکم کی پابند نہیں“ — نوشی نے کہا۔ ”اپنی ذات کے متعلق فیصلے خود کرنے کی عقل اور ہمت رکھتی ہوں۔ میں اس خیمے میں نہیں جاؤں گی۔ میں سیلی

نوش کے خیمے میں جا رہی ہوں۔“

”نہیں نوش!“۔ سیلی نوش نے کہا۔ ”میں یہ صورت حال قبول نہیں کروں گا۔“ پھر سیلی نوش نے نوش کے منگیتر سے کہا۔ ”غلط فہمی میں نہ پڑو شہزادے! یہ دیکھو تم کہاں ہو اور یہاں کیوں آئے ہو۔ اپنے مقصد کو سامنے رکھو۔ یہ وقت زاتی اور جذباتی باتوں کا نہیں۔“

”تو خاموش رہ بڑو!“۔ منگیتر نے شاہی رعب سے کہا۔ ”اسے اپنے پاس رکھ لے پھر اس کا نتیجہ دیکھ لینا۔“

”آ جاؤ نوش!“۔ سیلی نوش نے نوش کو بازو سے پکڑا اور اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ”اس لڑکے کا دماغ چل گیا ہے، تم ہوش میں ہو۔ میرے خیمے میں آ جاؤ ورنہ تم دونوں باقی رات لڑتے جھگڑتے گزار دو گے۔“

نوش سیلی نوش کے ساتھ اس کے خیمے میں چلی گئی۔ اس کا منگیتر جلتا بھڑکتا اپنے خیمے میں گیا اور بستر جا بیٹھا۔ وہ سیلی نوش کو اپنا دشمن سمجھنے لگا تھا۔

”میں اب اس شخص کو اپنا منگیتر نہیں سمجھوں گی۔“ خیمے میں نوش سیلی نوش سے کہہ رہی تھی۔ ”میں سلطنت روم کی عظمت کو بحال کرنا چاہتی ہوں اور مسلمانوں کو شکست دے کر ان کا نام و نشان مٹا دینا میری زندگی کا مقصد ہے لیکن یہ جسے میں منگیتر بنا بیٹھی تھی صرف میرے حسن اور نوجوانی اور اس جسم کے ساتھ دلچسپی رکھتا ہے۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں کہ میں کتنی خوبصورت اور دلکش ہوں۔ اپنے اس جسم کے ساتھ مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔“

اگلا روز اس طرح گزرا کہ کچھ وقت ہامون کے خیمے میں گئے اور اس کا وہی پاگل پن، تھرکنا، تڑپنا اور ناگ کے ساتھ باتیں کرنا دیکھا۔ سیلی نوش نے نوش اور اس کے منگیتر میں صلح صفائی کرانے کی بہت کوشش کی لیکن منگیتر پہلے سے زیادہ بھڑکا اور پھرا ہوا تھا۔ نوش نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ رات ہامون کے خیمے میں جائے گی۔ یہ سن کر اس کا منگیتر کچھ ٹھنڈا ہو گیا۔

○

رات گہری ہوئی تو نوشی ہامون کے خیمے کی طرف چل پڑی۔ ہامون نے سب کو بتایا تھا کہ صرف نوشی اس کے پاس آئے گی اور باقی سب لوگ اپنے اپنے خیموں میں رہیں

گے۔

نوشی ہامون کے خیمے میں پہنچی تو اس نے نوشی کو اپنے سامنے بٹھالیا۔ سامنے بھی ایسا بٹھایا کہ دونوں کے گھٹنے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ ہامون نے نوشی کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنے چہرے کے قریب کیا۔ نوشی نے اس سے آزاد ہونے کی کوشش تو نہ کی لیکن نفرت کی ایک لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔

صاف پتہ چلتا تھا کہ ہامون بُری طرح نشے میں ہے۔ اس نے کھڑے ہو کر وہ ڈنڈا جو اس نے اپنے پاس رکھا ہوا تھا اٹھایا اور ناپنے کو دے لگا پھر اس نے نوشی کو کھڑا ہونے کو کہا۔ نوشی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تمام کپڑے اتار دو۔“ ہامون نے نوشی سے کہا۔ ”اس طرح برہنہ ہو جاؤ جس طرح تم پیدا ہوئی تھیں.... یہ جسم کچھ بھی نہیں۔ مجھے تمہاری روح چاہئے۔ اپنی روح مجھے دے دو.... اتار دو یہ کپڑے۔“

”نہیں!“۔ نوشی نے کہا۔ ”اگر تمہیں صرف روح چاہئے تو یہ تم جسم کو ننگا کئے بغیر لے سکتے ہو۔ میں کپڑے نہیں اتاروں گی۔“

ہامون نے نوشی پر اپنا ظلم طاری کرنے کے لئے کچھ اوٹ پانگ سی حرکتیں کیں اور کچھ شعبہ بھی آڑایا لیکن نوشی نے کپڑے اتارنے سے صاف انکار کر دیا۔

ہامون نے پہلے کی طرح ڈنڈا ہاتھ میں لے کر ناپنا کھڑا ہوا اور عجیب عجیب حرکتیں کرنا شروع کر دیا۔ نوشی کھڑی دیکھتی رہی۔ ناپتے کو دتے ہوئے ہامون نوشی کے قریب گیا اور گریبان سے اس کی قمیض پر ہاتھ رکھا اور اتنی زور کا جھٹکا دیا کہ قمیض گریبان سے دامن تک پھٹ گئی۔ نوشی نے مزاحمت کی اور اپنے آپ کو بچانے کے لئے ادھر اُدھر بھاگنے کی کوشش کی لیکن ہامون آخر مرد تھا۔ اس نے نوشی کے کپڑے یوں نوچنے شروع کر دیئے جیسے کوئی درندہ اپنے شکار کو چیر پھاڑ رہا ہو۔

نوشی ابھی نیم برہنہ ہی ہوئی تھی کہ ہامون کے پاؤں زمین سے اوپر اٹھے اور دوسرے لمحے وہ فرش پر پیٹھ کے بل گرا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا۔ اس کے سر پر سیلی نوش کھڑا تھا۔ سیلی نوش نے بڑی تیزی سے خیمے میں داخل ہو کر ہامون کو دو جاؤ اور اٹھایا اور زمین پر بڑی زور سے پٹخ دیا تھا۔

سیلی نوش نے ہامون کو اتنی زور سے پٹخا تھا کہ وہ فوراً اٹھ نہ سکا۔ سیلی نوش نے اپنا

پاؤں ہامون کے پیٹ پر رکھ کر دلیا اور بجلی کی سرعت سے نیام سے تلوار نکالی اور اس کی نوک ہامون کی شہرہ رگ پر رکھ کر ذرا سا دباؤ ڈالا۔ ہامون نے پہلے تو سیلی نوش کو ڈرایا کہ وہ اپنے جنوں بھوتوں کو بلا کر اس کی بوٹی بوٹی باہر نکھیر دے گا لیکن سیلی نوش پر کچھ اثر نہ ہوا۔

”دبی آکر تمہیں مجھ سے چھڑائیں گے“۔ سیلی نوش نے کہا اور اپنا پاؤں ہامون کے پیٹ پر اور زیادہ دلیا اور تلوار کی نوک اس کی شہرہ رگ میں چھو دی۔ ہامون ترپ رہا تھا۔

”اب دیکھ کون کسے قتل کرتا ہے“۔ سیلی نوش نے کہا۔ ”تیرے زندہ رہنے کی ایک ہی صورت ہے، اپنی اصلیت بتا دے اور اپنی زبان سے کہہ دے کہ یہ سب شعبہ بازی اور فریب کاری ہے۔“

ہامون نے پھر بھی سیلی نوش کو ڈرانے کے لئے کچھ باتیں کیں جو بڑی خوفناک دھمکیاں تھیں لیکن سیلی نوش اس کا کوئی اثر قبول کر ہی نہیں رہا تھا۔

”اپنی غیبی طاقت استعمال کر“۔ سیلی نوش نے کہا۔ ”تیرے ہاتھ میں کوئی طاقت ہوئی تو اب تک مجھ پر جوابی وار کر چکا ہوتا۔ تو اس لڑکی کی عزت کے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا۔ فوراً بول۔“

سیلی نوش نے تلوار کی نوک اتنی سی اور دبا دی کہ ہامون کی شہرہ رگ سے ذرا سا خون پھوٹ آیا۔

”تلوار ہٹالے“۔ ہامون نے کہا۔ ”ایک وعدہ کر کہ کسی اور کو نہیں بتائے گا۔ اس لڑکی سے بھی کہہ دے کہ زبان بند رکھے۔“

سیلی نوش نے تلوار کی نوک اس کی شہرہ رگ سے اٹھالی لیکن وہاں سے تلوار ہٹائی نہیں۔ اپنا ایک پاؤں اس کے پیٹ پر ہی رکھا، ذرا سا دباؤ کم کر دیا۔ پھر سیلی نوش نے اسے یقین دلایا کہ اس کا راز کسی کو معلوم نہیں ہو گا اور یہ لڑکی تو یہاں سے چلی ہی جائے گی۔ یہ بھی سوچ لے کہ یہ شاہی خاندان کی لڑکی ہے۔ اگر تو نے جھوٹ بولا تو یہ تجھے بہت ہی جبری موت مروائے گی لیکن اس سے پہلے میری تلوار تیری شہرہ رگ کاٹ چکی ہوگی۔

”تو ٹھیک سمجھا ہے“۔ ہامون نے کہا۔ ”میں صرف جادو کے کرتب دکھا سکتا

ہوں اور یہ صرف شعبہ بازی ہے۔ میں جو اچھل کود اور دوسری حرکتیں کرتا ہوں ان کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگ مجھ سے متاثر بھی ہوں اور خوف زدہ بھی۔ مجھے کیا ملتا ہے؟.... قبیلوں کے سردار بھی یہاں آکر میرے قدموں بیٹھتے ہیں۔ مجھے عیش و عشرت کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ جب بھی میں ایک لڑکی کی فرمائش کرتا ہوں تو کوئی نہ کوئی سردار چن کر ایک خوبصورت لڑکی میرے پاس بھیج دیتا ہے۔“

”تو ناگ سے سوال پوچھتا تھا“۔ سیلی نوش نے پوچھا۔ ”کیا ناگ جواب دیتا تھا یا وہ باریک اور کانپتی ہوئی آواز کس کی تھی؟“

”وہ میری ہی بولی ہوئی آواز تھی“۔ ہامون نے جواب دیا۔ ”یہ کوئی دیکھتا ہی نہیں کہ اُس وقت میری پیٹھ خیمے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف ہوتی ہے اور منہ ناگ کی طرف۔ کوئی بھی نہیں جان سکتا کہ باریک اور کانپتی ہوئی آواز میری ہوتی ہے۔“

”اور وہ جو دیئے مجھ کو اپنے آپ ہی جل اٹھے تھے؟“

”یہ میری شعبہ بازی ہے“۔ ہامون نے جواب دیا۔ ”میں ایسے کئی اور کرتب دکھا سکتا ہوں۔ میں خوبصورت لڑکیوں کا شکاری ہوں۔ یہ لڑکی ایسی ہے کہ میں سب کچھ بھول گیا اور اس لڑکی کو حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ تم نہ آجاتے تو میرا ارادہ پورا ہو جاتا۔“

”تو غلط سمجھا ہے“۔ سیلی نوش نے کہا۔ ”اس لڑکی نے مجھے کل بتا دیا تھا کہ تو کیا چاہتا ہے۔ یہ لڑکی اپنی آبرودہی پر کسی قیمت پر رضامند نہیں تھی اور اس نے مجھے کہا کہ میں اسے تجھ سے بچا لوں۔ اسے آج میں نے بھیجا اور خیمے کے پاس کھڑا رہا اور پردے سے اندر دیکھتا رہا اور عین موقع پر تجھے پکڑ لیا۔“

”میں حیران ہوں تم نے ایسا کیوں کیا؟“۔ ہامون نے کہا۔ ”اس کی عزت کا خیال تو اس کے منگیترو کو ہونا چاہئے تھا لیکن اس نے تم سے الگ ہو کر اور میرے پاس آ کر کہا تھا کہ اس لڑکی کو ایک چھوڑو راتیں اپنے پاس رکھو لیکن اپنا یہ وعدہ پورا کرو کہ تم اسے ملکہ اور مجھے بادشاہ بنا دو گے اور شہنشاہ ہر قتل ہمیں مصر کا کچھ حصہ دے دے گا جہاں ہماری بادشاہی ہوگی۔“

سیلی نوش نے لڑکی کی طرف اور لڑکی نے سیلی نوش کی طرف دیکھا۔

”میں تجھے جینے کا حق نہیں دے سکتا۔“ سیلی نوش نے کہا۔ ”تو سیدھے اور بے سمجھ لوگوں کے ساتھ فریب کاری کر رہا ہے اور ان کی بیٹیوں کی عزت کے ساتھ کھیل رہا ہے۔“

یہ کہہ سیلی نوش نے تلوار کی نوک ہامون کی شہرہ رگ پر رکھ کر اتنا دباؤ ڈالا کہ تلوار ہامون کی گردن میں سے گزر کر زمین میں چلی گئی۔ سیلی نوش نے تلوار نکالی اور ایک بار پھر شہرہ رگ میں نوک اتار کر تلوار اپنی طرف کھینچی اور گردن میں لمبا کٹ دے دیا۔ اپنا پاؤں ہامون کے پیٹ سے ہٹایا اور پیچھے ہٹ آیا۔ ہامون ذبح کئے ہوئے بکرے کی طرح تڑپنے لگا اور اس کی گردن سے خون کا فوارہ پھوٹ آیا۔

”چلو نوشی!“ سیلی نوش نے تلوار نیام میں ڈال کر کہا۔ ”اسے تڑپ تڑپ کر مرنے دو۔“

سیلی نوش اور نوشی خیمے سے نکل آئے۔



”میں منگیتر کے پاس نہیں جانا چاہتی۔“ باہر آ کر نوشی نے کہا۔ ”تم بتاؤ میں کیا کروں.... یہ تو تم جانتے ہو میں اس طرف کیوں آئی تھی۔ یہاں معاملہ ہی کچھ اور ہو گیا۔ تم تو میرے ساتھ رہ نہیں سکتے۔ ملازم میری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ منگیتر کو میں نے دیکھ لیا ہے کہ اسے میرے عزم اور میرے جذبے کا کوئی احساس نہیں۔ اسے میرے حسن اور جسم کے ساتھ دلچسپی ہے۔ یہ مجھے گمراہ اور خراب کر سکتا ہے، میرا ساتھ نہیں دے سکتا۔“

”میری بات مانو!“ سیلی نوش نے کہا۔ ”جو عزم لے کر آئی تھیں اس میں تم کامیاب نہیں ہو سکو گی۔ وہ بدو جو مسلمانوں کے ساتھ جانے ہیں وہ کچھ اور قسم کے لوگ ہیں۔ یہ بدو ان سے مختلف ہیں، ان سے دور ہی رہو تو اچھا ہے۔ تم واپس چلی جاؤ۔“

”کیا تم میرے ساتھ چل سکتے ہو؟“ نوشی نے کہا۔ ”میں اتنا ڈر گئی ہوں کہ اکیلے جاتے خوف آتا ہے۔ تم چلو، میں تمہیں اتنا انعام دلاؤں گی کہ حیران رہ جاؤ گے۔“

”میں نے تمہیں اس شیطان سے کسی لالچ میں آکر نہیں بچایا۔“ سیلی نوش نے

کہا۔ ”یہ میرا ذاتی اخلاق ہے اور اسے میں اپنا فرض سمجھتا تھا۔ تمہیں تمہارے باپ تک پہنچانے جاؤں گا تو بھی اپنا فرض سمجھ کر جاؤں گا۔“

”تو پھر ابھی چلے چلتے ہیں۔“ نوشی نے کہا۔ ”میرے منگیتر کو بھی پتہ نہ چلے اور میرے ملازم کو بھی۔ میں ذرا اُدھر جا کر رک جاتی ہوں، تم اپنا اور میرا گھوڑا لے آؤ۔“

سیلی نوش واپس ہامون کے خیمے میں گیا۔ ہامون بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان آنکھوں سے زندگی کی چمک ختم ہو چکی تھی۔ سیلی نوش نے اسے حقارت سے دیکھا اور خیمے سے نکل آیا۔ اس نے نوشی سے کہا کہ وہ کچھ دور جا کر اس کا انتظار کرے۔ وہ خود اپنے خیمے میں چلا گیا۔

سیلی نوش اور بدو ملازم ایک ہی خیمے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ گھوڑے خیموں سے کچھ دور بندھے رہتے تھے اور ان کی زینیں خیموں میں رکھی ہوئی تھیں۔ سیلی نوش نے اپنے خیمے میں جا کر ملازم کو دیکھا۔ وہ گہری نیند سویا ہوا تھا۔ سیلی نوش نے اپنی اور ملازم کی زین اٹھائی۔ دو زینوں کا وزن زیادہ تھا لیکن سیلی نوش نے یہ وزن اٹھالیا اور دبے پاؤں خیمے سے نکل گیا۔ گھوڑوں تک پہنچا، اپنے اور ایک اور گھوڑے پر زین کئی اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور دوسرے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔ وہ اُس جگہ جا پہنچا جہاں نوشی اُس کے انتظار میں کھڑی تھی۔

نوشی گھوڑے پر سوار ہوئی اور دونوں چل پڑے۔

